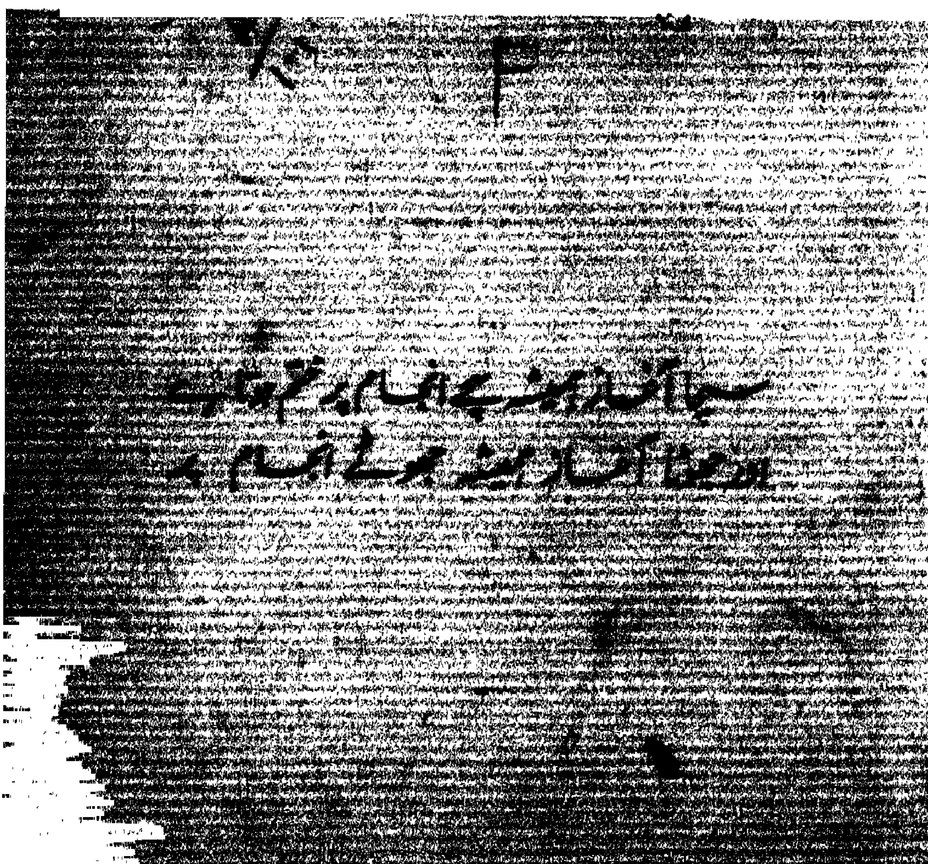
الرسالہ

سرپرست

مولانا وحیدالدین خان



اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جنوری ۱۹۸۳
شمارہ ۷۴

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز نے نومبر ۱۹۸۲ میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ اس سفر کی تفصیل روداد الرسالہ کے آئندہ کسی شمارہ میں آئے گی۔

اس دورہ میں مولانا موصوف کی متعدد تقریریں ہوئیں۔ مولانا نے اہل حیدرآباد کے سامنے اسلامی مرکز کے مشن اور اس کے طریق عمل کی بھی وضاحت کی۔ تمام تقریریں بہت دلچسپی سے سنی گئیں۔ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں اجتماعات میں شریک ہوتے رہے۔

اس کے بعد لوگوں کے اصرار کے مطابق حیدرآباد میں اسلامی مرکز کی مقامی شاخ قائم کردی گئی۔ اس شاخ کا دفتر مندرجہ ذیل پتہ پر قائم ہے۔ مقامی لوگ اسلامی مرکز کے لئے یا اس کی مطبوعات حاصل کرنے کے لئے یہاں سے ربط فرمائیں۔

اسلامی مرکز۔ بیت المدینہ۔ سلطان پورہ۔ حیدرآباد ۲۴
فون نمبر 51793

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۱۰ ڈالر

دو قسم کی روحیں ۲۷۰۲

قرآن کی سورہ نمبر ۹۱ میں ارشاد ہوا ہے: قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا (وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور وہ شخص برباد ہوگیا جس نے اپنے آپ کو گندا کیا) موجودہ زندگی آخرت سے پہلے کا ایک امتحانی موقع ہے۔ جو شخص یہاں سے نیک اور ستھری روح لے کر آخرت کی دنیا میں پہنچے گا وہ وہاں جنت کی پرمسرت فضاؤں میں بسایا جائے گا اور جو شخص یہاں سے برائیوں میں لپٹی ہوئی روح لے کر آخرت کی دنیا میں جائے گا اس کو وہاں جہنم کے پُرعذاب ماحول میں دھکیل دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا گویا خدا کی نرسری ہے۔ نرسری میں مختلف قسم کے پودے اگائے جاتے ہیں۔ زمین میں روئیدگی کی قوت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کے پودے اگ آتے ہیں۔ مالی ان سب کی جانچ کرتا ہے۔ جو پودے غیر مطلوب پودے ہیں ان کو وہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ اور جو پودے اس کے مطلوب پودے ہیں ان کو اہتمام سے نکال کر لے جایا جاتا ہے تاکہ کسی باغ میں ان کو پھلنے پھولنے کے لئے نصب کر دیا جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے بیک وقت دونوں مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو اپنی روح کو پاک کرے اور چاہے تو گندا کرتا رہے۔ کوئی وہ شخص ہے جو اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔ اس کے سامنے جب کوئی حق آتا ہے تو وہ بے جھجک اس کا اعتراف کرلیتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ خیرخواہی اور انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہرحال میں وہ خدا کی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ اپنے نفس کی مرضی پر۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔ اس کو اس کا خدا جنت کی پُربہار دنیا میں بسائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو خود اپنی بڑائی میں گم رہتا ہے۔ اس کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ معاملات میں وہ سرکشی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ خدا کی مرضی پر۔ یہی وہ آدمی ہے جس نے اپنی روح کو گندا کیا۔ کائنات کا مالک اس کو اپنے پڑوس کے لئے قبول نہیں کرے گا۔ وہ اس کو جہنم میں دھکیل دے گا تاکہ وہ ابدی طور پر اپنے جرم کی سزا بھگتتا رہے۔

ہم کہاں ہیں

من الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون ۔ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون (المائدہ ۷۹ – ۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے ۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر گئے تھے ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو برے کام سے روکتے نہ تھے جو وہ کر رہے تھے ۔ کیسی بری روش تھی جو انھوں نے اختیار کی ۔

یہود کی حیثیت قدیم زمانہ میں وہی تھی جو آج مسلمانوں کی ہے ۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلم معاشرہ کے بارے میں خدا کے قانون کو بتا رہی ہے ۔ اس کے مطابق مسلم معاشرہ کا حد سے گزرنا یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو ستائیں اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں ۔ ایسے وقت میں خدا کی طرف سے یہ فرض ہو جاتا ہے کہ جو شخص یہ دیکھے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے وہ فوراً اس کو روکنے کے لئے متحرک ہو جائے ۔ کسی معاشرہ کے افراد میں اگر یہ روح ختم ہو جائے تو وہ مسلم معاشرہ خدا کی نظر میں ملعون ہے ۔ اس پر خدا کی لعنت نازل ہوگی نہ کہ خدا کی رحمت ۔

موجودہ مسلم معاشرہ کو دیکھئے تو آج اس کی حالت یہی ہو رہی ہے ۔ ہر بستی اور ہر محلہ میں ہر روز ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستا رہا ہے ۔ جس شخص کے پاس بھی کوئی پیسہ یا کوئی زور آ گیا ہے اس کا دماغ گھمنڈ کا کارخانہ بنا ہوا ہے ۔ کسی مسلمان بھائی سے اگر اس کو معمولی شکایت بھی پہنچ جائے تو اس کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک وہ اس مسلمان کو ذلیل نہ کرے ۔ وہ اس کی بربادی کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کے بس میں ہے ۔

مسلم معاشرہ میں آج ہر جگہ اور ہر وقت یہ سب کچھ ہو رہا ہے ۔ مگر کوئی کسی کو روکنے والا نہیں ۔ کوئی کسی کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ۔ البتہ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی فوج کی فوج تیار ہو گئی ہے جو مسلمانوں کی مظلومیت پر تقریریں کرنے اور مضامین لکھنے کو اپنا قیادتی پیشہ بنائے ہوئے ہے ۔ مسلمانوں کی قومی مصیبت پر لفظی بیان دینے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے ۔ مگر مسلمانوں کی انفرادی مصیبت کے لئے کوئی نہیں دوڑتا ۔ دوسرے کی یزیدیت کا اعلان ہر ایک کر رہا ہے مگر اپنی یزیدیت کی خبر کسی کو نہیں ——— آدمی کے الفاظ کو سننے والا سب سے پہلے خدا ہوتا ہے ، پھر یہ لوگ اپنے جھوٹے الفاظ آخر کس کو سنا رہے ہیں ۔

جوابی مذہبیت

مئی ۱۹۲۲ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ جاگ اٹھا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی ہونا چاہیے۔ جس فضا میں مندر کے کلس چمک رہے ہیں وہاں مسجد کے مینار کی عظمت بھی دکھائی دینا ضروری ہے۔ چنانچہ فوراً چندہ ہوا اور مندر کے پاس ایک زمین مسجد کے لئے حاصل کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ ساری رات کام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ مندر کے مقابلہ میں ایک مسجد بنی ہوئی کھڑی ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا:

مسجد تو بنالی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بیشتر سرگرمیوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری اکثر دینی سرگرمیاں حقیقۃً جوابی سرگرمیاں ہیں۔ ان کا اصل محرک کسی غیر قوم کا کوئی عمل ہے نہ کہ حقیقۃً خدا اور رسول کا حکم۔

اس قسم کی مذہبیت جوابی مذہبیت ہے۔ وہ قومی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہے نہ کہ خدائی محرک کے تحت۔ چنانچہ مسلمانوں نے مادی اور جغرافی اور سیاسی اسباب کے تحت دیگر اقوام کو اپنا حریف سمجھ لیا ہے۔ وہ ان کو نیچا دکھا کر اپنے لئے قومی تسکین حاصل کرتے ہیں ——— ایسی تمام کارروائیاں بلاشبہ قومی کارروائیاں ہیں، خواہ بظاہر ان کو مذہب کے لباس میں کیوں نہ پیش کیا گیا ہو۔

مومن وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔ جس کی تمام سرگرمیاں خدا کے زیر اثر انجام پاتی ہوں۔ اس کا رکنا خدا کے لئے ہوتا ہو اور ٹھہرنا خدا کے لئے۔ جو کام اس طرح کے جذبات کے ساتھ کیا جائے اس کے ساتھ خدا کی مدد شامل رہتی ہے۔ وہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ مگر جو کام دوسری قوموں کی ضد میں کیا جائے اس سے صرف نفرت اور کشمکش بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ صورت حال مزید پیچیدہ ہوتی چلی جائے اور کبھی وہ حسن خاتمہ تک نہ پہنچے۔

ڈر کی طاقت

حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس کا نام صُبیغ تھا۔ وہ عراق میں گھوم گھوم کر سورہ ذاریات کے بارے میں تقریریں کرتا اور اس سورہ کے مضامین میں عجیب عجیب قسم کے سوالات پیدا کر کے مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرتا۔

اس آدمی کو لوگوں نے سمجھایا، مگر وہ نہ مانا اس نے اپنی تقریریں جاری رکھیں۔ آخر کار عراق کے حاکم نے اس کو گرفتار کیا اور اپنے ایک قاصد کے ذریعہ اس کو خلیفہ ثانی کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا اور لکھا کہ یہ شخص قرآن کی سورہ ذاریات کے بارے میں عجیب و غریب باتیں نکال کر مسلمانوں کو شک و شبہ میں مبتلا کرتا ہے اور ان کے عقائد کو بگاڑ رہا ہے۔

حضرت عمر نے خط کو پڑھا۔ اس کے بعد مجرم سے باتیں کیں۔ اس کو سمجھایا۔ مگر وہ شخص نہ مانا اور اپنی باتوں کو دہراتا رہا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے درہ منگوایا اور اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آئی کہ وہ شخص خون میں نہا اٹھا اور مار اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ اب اس نے سپر ڈال دی۔ اور چلا کر کہا:

قد ذھب الذی کنت اجد فی رأسی — وہ چیز چلی گئی جس کو میں اپنے سر میں پا رہا تھا

(الاصابہ لابن حجر)

اس کے بعد حضرت عمر نے اس کو چھوڑ دیا۔ اپنی بقیہ عمر اس نے اس طرح گزاری کہ مذکورہ قسم کی باتیں دوبارہ اس سے نہیں سنی گئیں۔ دلیل کی زبان اس کے لئے بے اثر ثابت ہوئی تھی، مگر کوڑے کی زبان اس کے لئے اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ وہ ہمیشہ کے لئے اصلاح یافتہ ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی خرابیاں صرف بے خوفی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر آدمی کو سزا کا ڈر ہو تو وہ خود بخود درست ہو جائے۔ ڈر آدمی کو سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ اور جو شخص کسی معاملہ میں سنجیدہ ہو وہ کبھی بے معنی کلام اپنی زبان سے نہیں نکالے گا، وہ الٹی حرکتیں نہیں کرے گا۔ ڈر بظاہر ایک چیز ہے۔ مگر وہ آدمی کی تمام خرابیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔

بے معنی مسائل

حدیث میں آیا ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الاغلوطات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغلوطات سے منع کیا ہے۔ اغلوطات سے مراد وہ مسائل ہیں جو واقع ہونے سے پہلے فرضی طور پر قائم کئے جاتے ہیں (ھی المسائل التی لم تقع)

دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال — اللہ نے تمھارے لیے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

یہ تعلیم بے حد حکمت پر مبنی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج باقی نہ رہے تو وہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنائیں گے، ہر چیز کو منطق کے پیمانہ سے ناپیں گے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دین کا اصل سرا چھوٹ جائے گا اور بے معنی مسائل پر لفظی بحث کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ خدا کا سادہ دین انسانی اضافوں کے بعد مشکل اور پیچیدہ دین ہو کر رہ جائے گا۔

ایک مثال لیجئے۔

ایک مرتبہ کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو۔ اس کی زبان سے نکلا: انا مومن ان شاء اللہ (خدا نے چاہا تو میں مومن ہوں) یہ بات بحث کی نہ تھی۔ مگر ماہرین فقہ نے غیر ضروری طور پر اس کو بحث کا موضوع بنایا۔ اب ان کے درمیان یہ بحث چل پڑی کہ اس قسم کا جواب دینا جائز ہے یا ناجائز۔ ایک گروہ نے کہا کہ جائز ہے۔ کیونکہ کسی کا مومن ہونا یا نہ ہونا خدا کی مشیت ہی پر ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ایمان میں شک ہے۔

شافعی مسلک کے لوگ اس کے قائل تھے کہ انا مومن ان شاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اس کے برعکس حنفی مسلک کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا کہنا جائز نہیں۔ جب یہ بحث بڑھی تو یہ سوال پیدا ہوگیا کہ ایسے لوگوں کے درمیان نکاح درست ہوگا یا نہیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ حنفی عورت کا نکاح شافعی مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ اس کو اس کے ایمان پر شک ہے (لا یصح لانہا تشک فی ایمانہا) دوسروں کا فتویٰ یہ تھا ذمی عورت پر قیاس کرتے ہوئے نکاح درست ہوگا (یصح قیاسا علی الذمیۃ)

اس سے اندازہ کیجئے کہ غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بعد صراط مستقیم کا سرا کس طرح چھوٹ جاتا ہے۔

آزمائش

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ بس ضرور ہے کہ اللہ یہ جان لے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون (عنکبوت ۳) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: کیا تم لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ تم کو جنت کا داخلہ مل جائے گا۔ حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں گزریں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سن لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے (بقرہ ۲۱۴)

اسی طرح ارشاد ہوا ہے کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے جانا ہی نہیں کہ تم میں کون لوگ ہیں جنھوں نے جہاد کیا اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (توبہ ۱۶) اسی طرح ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے سمجھا ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ جانا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں جنھوں نے جہاد کیا اور کون ہیں جو صبر کرنے والے ہیں (آل عمران ۱۴۲)

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل۔ یبتلی الرجل علی حسب دینہ فان کان فی دینہ صلابۃ زید لہ فی البلاء (تفسیر ابن کثیر)

سب سے زیادہ سخت آزمائش پیغمبروں کی ہے۔ ان کے بعد صالحین کی، پھر درجہ بدرجہ ان سے مشابہت رکھنے والوں کی۔ آدمی کا امتحان اس کے دین کے مطابق ہوتا ہے۔ پس اگر اس کے دین میں مضبوطی ہو تو اس کی آزمائش میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کی جنت یا اس کی ترقی درجات کا فیصلہ معمول کی دین داری پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان خاص لمحات میں ہوتا ہے جب کہ اس کا رب اس کے دین کا امتحان لے رہا ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی ٹھیک اسی مقام پر ناکام ہو جاتا ہے جہاں اس کو کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

بے کاری

کان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یقول: اری الرجل یعجبنی فاذا قیل لا صناعۃ لہ سقط من عینی (التراتیب الاداریۃ للکتانی، جزء ۲ صفحہ ۲۳)

حضرت عمر فرماتے تھے کہ میں کسی آدمی کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھے پسند آتا ہے۔ مگر جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا تو وہ میری نگاہوں سے گر جاتا ہے۔

یہی روایت ابن الجوزی نے تلبیس ابلیس میں ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن محمد بن عاصم قال: بلغنی ان عمر بن الخطاب کان اذا رای غلاما فاعجبہ سأل ھل لہ حرفۃ۔ فان قیل لا، سقط من عینہ

محمد بن عاصم کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر جب کسی نوجوان کو دیکھتے اور وہ انھیں اچھا معلوم ہوتا تو پوچھتے کیا اس کا کوئی کام ہے۔ اگر کہا جاتا کہ نہیں تو وہ ان کی نگاہ سے گر جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بے کاری نہایت بری چیز ہے۔ وہ آدمی کی تمام بہترین صلاحیتوں کو کھا جاتی ہے۔ بے کار آدمی بظاہر دیکھنے میں زندہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقۃً وہ ایک مرا ہوا انسان ہوتا ہے۔ اس کے اندر سے وہ تمام لطیف احساسات ختم ہو جاتے ہیں جو کسی انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بناتے ہیں۔

بے کاری کی ایک صورت وہ ہے جب کہ آدمی محنت اور مشقت کی چیزوں سے گھبراتا ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیت موجود نہیں ہوتی کہ کوئی بے مشقت کا کام اسے مل جائے۔ چنانچہ وہ اپنے پسندیدہ کام کے انتظار میں بے کار پڑا رہتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کو وراثت میں یا اور کسی اتفاقی سبب سے ایسے ذرائع معاش حاصل ہو جائیں جن کے لئے اس نے کوئی ذاتی کسب نہیں کیا تھا۔ مثلاً بینک میں جمع شدہ رقم۔ یا جائداد جس کی آمدنی یا کرایہ اس کو اپنے آپ ہر ماہ ملتا رہے۔ اس قسم کی ہر صورت بے کاری کی صورت ہے اور وہ آدمی کے لئے قاتل ہے، خواہ بظاہر وہ خوش پوش ہو اور چلتا پھرتا نظر آتا ہو۔

ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے کوئی جائز کام اختیار کرے اور صبح شام اپنے آپ کو اس میں مشغول رکھے۔ جس کے پاس کام کی مشغولیت نہیں اس کے پاس زندگی بھی نہیں۔ بے کار آدمی کو کبھی بھی آپ اصلی انسان نہیں پائیں گے۔

جرم کی نفسیات

لینن (Lennon) اور چیپ مین Chapman امریکہ کے دو بیٹل سنگر (Beatle Singer) تھے۔ لینن کو نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی۔ وہ کافی مشہور ہوگیا۔ یہ بات چیپ مین کو برداشت نہ ہوسکی۔ اس کے دل میں لینن کے خلاف حسد کا جذبہ جاگ اٹھا۔ یہ جذبہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک روز موقع پاکر لینن کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔

اخباری رپورٹ کے مطابق اس قتل کا سبب پیشہ ورانہ رقابت (Professional Rivalry) تھی۔ اس کے بعد چیپ مین کے خلاف مقدمہ چلا۔ قاتل نے اس سلسلے میں عدالت میں اپنا جو بیان دیا، اس میں اپنی برأت ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

> There is something bad within me, and there is something good within me too. When this little bad within me overpowers my goodness, I do bad deeds.

میرے اندر کچھ برائی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے اندر کچھ بھلائی بھی ہے، جب میری برائی میری بھلائی پر غالب آجاتی ہے تو اس وقت میں برا کام کر بیٹھتا ہوں۔

قاتل کا یہ جملہ اگر سنجیدہ ذہن کے تحت نکلا ہے تو یقیناً وہ فطرت کی ترجمانی ہے۔ بلا شبہ کچھ مجرم عادی مجرم ہوتے ہیں، ان کو معاف کرنا انسانیت کے اوپر ظلم کرنا ہے۔ مگر بہت سے جرم کرنے والے محض وقتی جذبہ کے تحت جرم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی فطرت زور کرتی ہے۔ اپنے جرم پر انھیں اس قدر افسوس لاحق ہوتا ہے کہ ان کا افسوس خود ان کے لئے ایک داخلی سزا بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ غلطیوں کو معاف کرو۔ وقتی جذبہ کے تحت جب ایک آدمی کوئی برائی کر بیٹھتا ہے تو اس کے بعد اس کے دل میں خود ہی اس کے خلاف شرمندگی اور افسوس کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ اس وقت اگر ہم اس کو معاف کر دیں تو گویا ہم نے اس کے احساس ندامت کو سہارا دیا اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور دوبارہ ایسی غلطی کرنے سے بچے۔

اسلام میں اگرچہ قتل کی سزا قتل ہے تاہم ایک خاص صورت کے ساتھ اس کو قابل معافی بھی رکھا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقتول کے ورثاء اگر قاتل سے دیت لینے پر راضی ہو جائیں تو اس کو دیت لے کر چھوڑ دیا جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے۔

داعی بننے کے لئے

مائیکل فیراڈے (Michael Faraday) اور لارنس براگ (Lawrence Bragg) عہد جدید کے بہت کامیاب معلم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لندن کے رائل انسٹی ٹیوٹ میں لکچر دیا کرتے تھے۔

کامیاب لکچر کا راز کیا ہے، اس کے بارے میں دونوں کی یادداشتیں شائع ہوئی ہیں۔ ہم بالترتیب دونوں کا ایک ایک فقرہ یہاں نقل کرتے ہیں جو گویا ان کے تجربات کا خلاصہ ہے۔

I am sorry to say that the generality of mankind cannot accompany us one short hour unless the path is strewn with flowers

میں افسوس کے ساتھ یہ کہوں گا کہ بشیتر انسان ایک گھنٹہ کے مختصر وقت میں بھی ہمارے ہم سفر نہیں بن سکتے الّا یہ کہ راستہ پھولوں سے سجا دیا گیا ہو۔

The essential feature for success of the lecture is the emotional contact between the lecturer and the students

لکچر کی کامیابی کے لئے ضروری بات یہ ہے کہ استاد اور طالب علم کے درمیان جذباتی ربط قائم ہو جائے۔

فیراڈے اور براگ نے جو بات کامیاب معلم بننے کے لئے لکھی ہے، وہی زیادہ شدت کے ساتھ کامیاب داعی بننے کے لئے ضروری ہے۔

داعی اور مدعو کا تعلق بے حد نازک تعلق ہے۔ وہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس کی نزاکتوں کی پوری رعایت نہ کی جائے۔ اپنے مدعو کو اپنا ہم سفر بنانے کے لئے آپ کو اس کے راستہ میں پھول بکھیرنا ہوگا۔ راستہ میں کانٹے اور پتھر بچھا کر آپ مدعو کو اپنا ہم سفر نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح اپنی بات کو اس کے لئے قابل سماعت بنانے کی خاطر آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اس کو اتنے موثر انداز میں کہیں کہ آپ کی بات محض ایک خشک تلقین نہ معلوم ہو بلکہ وہ سننے والے کے لئے ایک ایسا تجربہ بن جائے جس میں وہ اپنے لئے ایک کیفیاتی کشش پاتا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے

برطانی فلسفی راشڈل ہیسٹنگز (۱۸۵۸ — ۱۹۲۴) نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جب ابن رشد کی کتابیں یورپ میں پھیلیں تو اس کا فلسفہ عیسائیوں کو اپنے حق میں شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ ۱۲۱۰ء میں پیرس یونیورسٹی کونسل نے ایک متفقہ فیصلہ کیا اور اس کے مطابق ارسطو کی طبیعی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کو تعلیم و تدریس کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر یہ فیصلہ بہت دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو احساس ہوا کہ انھوں نے ایسا کرکے اپنے طلبہ کو علم کے خزانہ سے محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ نہ صرف ممنوعہ کتابیں دوبارہ داخل نصاب کی گئیں بلکہ نئے قاعدہ کے مطابق یونیورسٹی کے فارغ طلبہ سے یہ حلف لیا جانے لگا کہ وہ صرف ان چیزوں کو اپنی تعلیم و تدریس میں استعمال کریں گے جو ابن رشد کی شرح کے مطابق ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگ ہو:

Rashdall Hastings, Universities, p. 368

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے اندر کوئی خوبی ہو تو مخالف بھی کس طرح اس کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کچھ لوگ تعصب یا ضد میں ابتداءً آپ کو نہ مانیں تو اس نہ ماننے کو بھی مستقل نہ سمجھئے۔ اگر فی الواقع آپ کے اندر کوئی قابل قدر چیز ہے تو جلد وہ دن آئے گا جب کہ نہ ماننے والے کو اپنے نہ ماننے پر پچھتاوا ہو اور وہ دوبارہ آپ کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔

ابن رشد دنیا میں موجود نہ تھا کہ وہ اپنا دفاع کرے یا اپنے حق کے حصول کے لئے احتجاج و مطالبہ کی مہم چلائے۔ تاہم اس کا عمل لوگوں کے سامنے موجود تھا۔ پیرس یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے ابن رشد کی تعلیم تو بند کر دی۔ مگر بہت جلد ان کو احساس ہوا کہ ابن رشد کی کتابوں کا بدل ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ابن رشد خواہ ان کے لئے ایک غیر مطلوب انسان ہو مگر اپنی نسلوں کی تعلیم تو بہر حال ان کے لئے ایک مطلوب چیز تھی۔ بالآخر انھیں محسوس ہوا کہ ابن رشد کو چھوڑنا صرف اس قیمت پر ممکن ہے کہ خود اپنی نسلوں کی تعلیم ناقص رہ جائے۔ وہ ابن رشد کو نظر انداز کر سکتے تھے مگر اپنے آپ کو نظر انداز کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ابن رشد کی کتابوں کو دوبارہ اختیار کر لیا —— کوئی شخص اگر یہ حیثیت حاصل کر لے کہ وہ دوسروں کی ضرورت بن جائے تو دوسرے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے، خواہ یہ دوسرے اس کے حریف کیوں نہ ہوں۔

غلط استدلال

وکیع بن الجراح (۱۹۷-۱۲۹ھ) اپنے زمانہ کے ایک بڑے محدث تھے۔ وہ نہایت متقی انسان تھے چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی کا عہدہ پیش کیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور اپنی تمام عمر حدیث کی جمع و تدوین میں گزار دی۔ وہ اپنے وطن کوفہ سے حج کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوئے تھے کہ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وکیع بن الجراح کے ایک معاصر نے (تعریفی طور پر) ان کے بارے میں کہا کہ میں نے وکیع کو دیکھا۔ میں نے ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ وہ حدیثوں کے حافظ تھے (رأیت وکیعا وما رأیت بیدہ کتابا قط، انما ھو یحفظ، التہذیب لابن حجر، جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۹)

گولڈ زیہر نے اس قول کو لے کر لکھا ہے کہ وکیع نے کتاب اور کاغذ چھوڑ رکھا تھا، وہ صرف زبانی طور پر حدیث سنتے اور سناتے تھے۔ گولڈ زیہر کا مقصد اس سے حدیث کی صحت کو مشکوک ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ تحریر کے مقابلہ میں یادداشت بہر حال ایک غیر معتبر ذریعہ ہے۔

مگر گولڈ زیہر کا یہ استدلال اس وقت غلط معلوم ہوتا ہے جب کہ ہم اسی کتاب میں یہ دیکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے شاگردوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا: تمہارے لئے لازم ہے کہ تم وکیع کی کتابوں کو پڑھو (علیکم بمصنفات وکیع، التہذیب لابن حجر جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۶) اگر ان کی کتابیں نہ ہوتیں تو احمد بن حنبل اس طرح کا مشورہ کیوں دیتے۔ امام وکیع کی کتابوں میں سے چند کتابیں یہ ہیں:

کتاب الزہد

المصنف

التفسیر (الکشف والبیان للثعلبی)

وکیع بن الجراح کے واقعات بتاتے ہیں کہ ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا۔ وہ اگرچہ احادیث کو باقاعدہ لکھتے تھے۔ مگر مجالس میں اکثر حافظہ کی مدد سے احادیث کو بیان کرتے تھے۔ امام وکیع سے متعلق تمام واقعات کو دیکھئے تو مذکورہ قول میں کوئی ہرج نظر نہیں آتا۔ مگر گولڈ زیہر نے بقیہ چیزوں کو چھوڑ کر صرف ایک جزء کو لے لیا تو وہ اس کے لئے اس بات کی دلیل بن گیا کہ حدیث کا موجودہ ذخیرہ مشتبہ ذخیرہ ہے، اس کی صحت پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کا فتنہ

سأل ابوزرعة شيخه البلقيني قائلا : ما تقصير الشيخ تقي الدين السبكي عن الاجتهاد وقد استكمل آلته۔ فسكت البلقيني۔ فقال ابوزرعة : فما عندي ان الامتناع عن ذلك الا للوظائف التي قدرت للفقهاء على المذاهب الاربعة وان من خرج عن ذلك لم ينله شئ من ذلك وحرم ولاية القضاء وامتنع الناس عن افتائه ونسبت اليه البدعة فابتسم البلقيني ووافقه على ذلك (السيد سابق، فقہ السنۃ، المجلد الاول، صفحہ ۱۴-۱۳)

ابوزرعہ نے اپنے استاد بلقینی سے پوچھا کہ شیخ تقی الدین سبکی اجتہاد کیوں نہیں کرتے جب کہ ان کے اندر اس کی شرائط موجود ہیں۔ بلقینی چپ رہے۔ ابوزرعہ نے کہا کہ ان کے اجتہاد سے رکنے کی وجہ میرے نزدیک تو صرف وہ وظائف ہیں جو مذاہب اربعہ کے فقہاء کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ جو ان مذاہب سے نکلے گا وہ ان وظائف میں سے کچھ نہیں پا سکتا، وہ قاضی کے عہدہ پر باقی نہ رہے گا، لوگ اس کے فتوے کو قبول نہیں کریں گے۔ اور اس کو بدعتی کہنے لگیں گے۔ یہ سن کر بلقینی ہنسے اور ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

دین کے نام پر جو چیز شروع کی جائے، اگر وہ ایک مدت تک باقی رہے تو بالآخر وہ مقدس سمجھی جانے لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ نوبت آتی ہے کہ اس کے ساتھ دنیوی قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے منسوب ہو کر آدمی کو ماحول میں عزت ملتی ہے، اس سے وابستگی سے آدمی کے لئے عہدوں اور مفادات کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس کے نام پر "آج" کے ایک آدمی کو وہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جو "کل" کے ایک آدمی کو تاریخی روایات کے نتیجہ میں حاصل ہو چکی ہے۔

ایسے ماحول میں لوگ اس حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس کے ساتھ تاریخی شخصیت کا نام شامل نہ ہو۔ وہ "تاریخ" کے پرستار بن کر رہ جاتے ہیں، حق کے پرستار کی حیثیت سے ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

لوگ ہمیشہ زندہ شخصیت کو نظر انداز کرتے ہیں اور تاریخی طور پر مسلّمہ شخصیت کے ساتھ خوب تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلّمہ شخصیتوں کے ساتھ مادی مفادات وابستہ ہو جاتے ہیں، جب کہ زندہ شخصیت کے ساتھ اس قسم کا کوئی پہلو وابستہ نہیں ہوتا۔

جب جھٹکا لگتا ہے

ابتدائی زمانہ کے ترک سلطان بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ لوگوں کے درمیان ایک عام انسان کی طرح رہتے تھے۔ حتی کہ وہ دربار میں بھی کسی غیر معمولی اہتمام کے بغیر بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا اور اس نے ترک سلاطین کے انداز کو بالکل بدل دیا۔

سلطان محمد ثانی (۱۴۸۱-۱۴۵۱) وہ ترک حکمراں ہے جس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس کے بعد سلطان محمد فاتح کے عظیم نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے وزیروں کے ساتھ مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس اثنا میں ایک کسان کوئی فریاد لے کر حاضر ہوا۔ یکساں قسم کے لوگوں کے درمیان وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہو۔ اس نے کہا:

تم میں سے سلطان کون ہے

سلطان محمد فاتح نے ایک دیہاتی کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو وہ اس کو بہت ناگوار گزرے۔ اس نے محسوس کیا کہ دیہاتی نے بھرے مجمع میں اس کی توہین کر دی۔ وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے محل کے اندر چلا گیا۔ اس کی سادہ مزاجی پر اس کا احساس سلطانی غالب آ گیا اور اس کے بعد سے اس نے وزیروں اور درباریوں کی مجلس میں بیٹھنا بند کر دیا۔

سلطان نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ لوگوں سے الگ ایک دریچہ کے پیچھے بیٹھتا اور وہاں بیٹھ کر اپنے وزیروں کی باتیں یا لوگوں کی درخواستیں سنتا۔ دھیرے دھیرے مزید تبدیلی آئی اور بعد کو یہ اصول بھی باقی نہ رہ سکا۔

سلطان سلیمان اعظم (۱۵۶۶-۱۵۲۰) کے دور سے ایسا ہوا کہ سلاطین ترکی نے وزیروں کی مجلس میں شرکت بالکل بند کر دی۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ وزراء کی مجلس صدر اعظم کے ساتھ بیٹھ کر بحث و مشورہ کرتی اور اس کے بعد وہ جس فیصلہ تک پہنچتی اس کو صدر اعظم سلطان تک پہنچا دیتا۔ سلطان اس کو سن کر اپنا حکم سنا دیتا جو اس باب میں آخری ہوتا۔

آدمی بظاہر اچھا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے والوں کو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ صورت حال اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کوئی جھٹکا نہ پڑے۔ جب اس کے نفس کو کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اس کے بعد وہ بدل کر دوسرا انسان بن جاتا ہے۔

حالات کے نتیجہ میں

امام مالک سے پوچھا گیا کہ جبری طور پر کسی سے طلاق لی جائے تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جبری طلاق طلاق نہیں ہے۔ یہ خلیفہ منصور کا زمانہ تھا۔ مدینہ میں اس کا جو گورنر تھا اس نے امام مالک کو ایسا فتویٰ دینے سے روکا۔ مگر امام مالک نہ مانے۔ اس کے بعد گورنر نے حکم دیا کہ امام مالک کو نوے کوڑے مارے جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ان کی پیٹھ ننگی کرکے اس پر ۹۰ کوڑے مارے گئے (مرآۃ الجنان)

کوڑے کی مار سے اگرچہ امام مالک کی پیٹھ خون آلود ہو گئی تھی۔ لیکن گورنر نے دیکھا کہ اب بھی امام مالک کے اندر کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں زنجیر ڈالی جائے اور چہرہ پر سیاہی لگا کر مدینہ کے راستوں میں گھمایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اونٹ پر بٹھا کر ان کو مدینہ کے راستوں میں گھمایا گیا۔ امام مالک کا حال یہ تھا کہ اس وقت بھی وہ کہتے جاتے تھے: جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو میں مالک بن انس ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ زبردستی کی طلاق کچھ نہیں ہے (من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا مالک بن انس، اقول ان طلاق المکرہ لیس بشیئ)

ایک خالص غیر سیاسی فتوے پر وقت کے سیاسی حاکم نے اتنا شدید ردعمل کیوں ظاہر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فتویٰ اگرچہ بذات خود غیر سیاسی تھا۔ مگر وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے اس کے اندر سیاسی اہمیت پیدا ہو گئی تھی۔

اس زمانہ میں عملاً نسلی بادشاہت چل پڑی تھی۔ تاہم اسلام کے اثر سے حکمراں اس کو بھی ضروری سمجھتے تھے کہ وہ لوگوں سے بیعت لیں اور عوام کو یہ تاثر دیں کہ وہ عوامی رائے سے خلیفہ بنے ہیں نہ کہ محض شاہی خاندانی تعلق کی وجہ سے۔ مگر عوام ان حکمرانوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ خلفاء جبری طور پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔ اس پس منظر میں امام مالک کا فتویٰ بہت معنی خیز تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جبری طلاق جس طرح بے اعتبار ہے اسی طرح جبری بیعت بھی بے اعتبار ہے۔ گورنر کو اندیشہ ہوا کہ امام مالک کے فتوے کی وجہ سے خلیفہ کی بیعت لوگوں کی نگاہ میں غیر معتبر نہ ہو جائے۔ اسی لئے اس نے اس کا اتنا سخت نوٹس لیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خالص غیر سیاسی مسئلہ بھی مخصوص حالات کے نتیجہ میں سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں مشرک بادشاہوں کا دعوت توحید کے خلاف شدید ردعمل بھی اسی قسم کے حالات کا نتیجہ تھا۔

قومی کردار

۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ ہندستان کے ایک صنعت کار مغربی جرمنی گئے۔ وہاں ان کو ایک کارخانہ میں جانے کا موقع ملا۔ وہ اِدھر اُدھر گھوم کر کارخانہ کی کارکردگی دیکھتے رہے۔ اس درمیان میں وہ ایک کاریگر کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس سے کچھ سوالات کرنے لگے۔ بار بار خطاب کرنے کے باوجود کاریگر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگا رہا۔

کچھ دیر کے بعد کھانے کے وقفہ کی گھنٹی بجی۔ اب کاریگر اپنی مشینوں سے اٹھ کر کھانے کے ہال کی طرف جانے لگے۔ اس وقت مذکورہ کاریگر ہندستانی صنعت کار کے پاس آیا۔ اس نے صنعت کار سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد تعجب کے ساتھ کہا: کیا آپ اپنے ملک کے کاریگروں سے کام کے وقت بھی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اس وقت میں آپ کی باتوں کا جواب دیتا تو کام کے چند منٹ ضائع ہو جاتے اور کمپنی کا نقصان ہو جاتا جس کا مطلب پوری قوم کا نقصان تھا۔ ہم یہاں اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے آتے ہیں، ملک کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں آتے۔

یہی وہ کردار ہے جو مغربی قوموں کی ترقی کا راز ہے۔ ۱۹۴۵ میں اتحادی طاقتوں (الائڈ پاورس) نے جرمنی کو بالکل تباہ کر دیا تھا، مگر صرف ۲۵ سال بعد جرمنی دوبارہ پہلے سے زیادہ طاقت ور بن چکا ہے اور اس ترقی کا راز یہی ہے کہ وہاں کا ہر فرد اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی کو بخوبی طور پر انجام دے۔ وہ اپنی ذات کو اپنی قوم کے تابع سمجھتا ہے۔ ہر آدمی اپنی ذات کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ مگر قومی مفاد کی قیمت پر نہیں بلکہ ذاتی جدوجہد کی قیمت پر۔ جہاں ذات اور قوم کے مفاد میں ٹکراؤ ہو، وہاں وہ قوم کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنی ذاتی خواہش کو دبا لیتا ہے۔

قوم کی حالت کا انحصار ہمیشہ فرد کی حالت پر ہوتا ہے۔ فرد کے بننے سے قوم بنتی ہے اور فرد کے بگڑنے سے قوم بگڑ جاتی ہے۔ قوم کا معاملہ وہی ہے جو مشین کا معاملہ ہوتا ہے۔ مشین اسی وقت صحیح کام کرتی ہے جب کہ اس کے پرزے صحیح ہوں۔ اسی طرح قوم اس وقت درست رہتی ہے جب کہ اس کے افراد اپنی جگہ پر درست کام کر رہے ہوں۔ مشین بنانا یہ ہے کہ پرزے بنائے جائیں۔ اسی طرح قوم بنانا یہ ہے کہ افراد بنائے جائیں۔ فرد کی اصلاح کے بغیر قوم کی اصلاح اسی طرح ناممکن ہے جس طرح پرزے تیار کئے بغیر مشین کھڑی کرنا۔

نظام تعلیم

چارلس ایڈمس ایک امریکی عیسائی تھے۔ انھوں نے مصر میں رہ کر وہاں کی اسلامی تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے:

Islam and Modernism in Egypt

اس کتاب میں ایک جگہ وہ جامعہ ازہر (قاہرہ) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "روایت پرستی کی روح صدیوں سے جامعہ ازہر کی تعلیمی سرگرمیوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ علمی تحقیق اور چھان بین کے ذریعہ متعلقہ علوم کو ترقی دی جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قدمار کا ذہنی سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے، بعینہ اسی حالت میں جیسا کہ اسلاف نے اپنے بعد والوں کو دیا تھا۔ آزادانہ تحقیق اور آزادانہ رائے قائم کرنے کا دروازہ اسلام میں تیسری صدی ہجری سے بند ہے۔ اس لئے مذہب کے مستند شارحین صرف دور ماضی میں ملتے ہیں اور بعد والوں کے لئے صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کی شرح کرتے رہیں۔"

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مصر کی جامعہ ازہر میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ مصنف کا تبصرہ اب اس پر صرف جزئی طور پر ہی صادق آتا ہے۔ تاہم ہندستان اور دوسرے بہت سے ملکوں کے اسلامی مدارس کے لئے یہ الفاظ آج بھی پوری طرح درست ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسلامی تعلیم کا معاملہ عام سیکولر تعلیم سے مختلف ہے۔ سیکولر تعلیم مطلق طور پر آزادانہ تحقیق کی قائل ہے۔ جب کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد ہمیشہ قرآن وسنت پر ہوتی ہے۔ مگر ہمارے مدارس میں آج جو تعلیم دی جارہی ہے اس کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس کی بنیاد کتاب وسنت پر نہیں بلکہ ایک خاص دور میں پیدا ہونے والے کتاب وسنت کے شارحین پر ہے۔ کتابوں کی ایک خاص فہرست ہے جن کو مقدس مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حتی کہ اب قرآن وحدیث بھی انھیں کتابوں کی روشنی میں پڑھائے جاتے ہیں نہ کہ ان کتابوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پڑھایا جائے۔

اس طرز تعلیم کا براہ راست نتیجہ جمود اور تنگ نظری ہے۔ یہ جمود اور تنگ نظری آج مسلم قوم کا سب سے بڑا خاصہ بن چکی ہے اور ہم اس کے وہ تمام نتائج بھگت رہے ہیں جو ایسی ذہنیت سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

کامیابی کا راز

ایک جاہل شخص ہندستان سے عراق گیا۔ وہاں سے وہ دو سال کے بعد واپس آیا تو ایک آدمی نے پوچھا کہ کتنا پیسہ کما کر لائے۔ اس نے کہا کہ میں زیادہ تو نہیں کما سکا۔ پھر بھی کھا پی کر پچاس ہزار روپے لایا ہوں۔ آدمی نے دوبارہ پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ پیسہ حاصل کرنے کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا:

بھائی صاحب، میں نے تو یہ جانا کہ من مارو گے تو منی پاؤ گے۔

منی (دولت) پانے کا راز یہ ہے کہ آدمی صبر کے ساتھ کام کرے، اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے جدوجہد کرے۔ کیونکہ دولت حاصل کرنے کا مطلب دوسروں کی جیب سے دولت نکالنا ہے۔ پھر اگر آپ دوسروں کی رعایت نہ کریں گے تو دوسرا شخص آپ کو یہ موقع کیوں دے گا کہ آپ اس کے جیب کی دولت نکال کر اپنی جیب میں ڈالیں۔

دولت حاصل کرنے کا راز من کو مارنا ہے۔ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے دوسرے کے ذوق پر چلنا ہے۔ یہی بات دوسرے مقاصد کے لئے بھی صحیح ہے اور یہی بات دینی مقصد کے لئے بھی۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسرے بہت سے لوگوں کے درمیان کام کرنا پڑتا ہے۔ اپنے سے باہر بہت سے حالات سے مقابلہ کر کے اپنا سفر جاری کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں کوئی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ نہ ہو کہ آدمی اپنے ذاتی خول سے باہر آئے، وہ اپنی من مانی کارروائی کرنے کے بجائے دوسرے افراد اور خارجی حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالے۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کرے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آدمی اپنے آپ کو کھو کر دوسرے کو پاتا ہے۔ خارجی تقاضوں کا اعتراف کر کے وہ خارج سے اپنا اعتراف کروانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اپنے سے باہر کی دنیا کو کچھ دینے کے بعد ہی اس کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے اپنے آپ کے لئے کچھ پا سکے۔

یہ تضاد کیوں

آسمان کے نیچے ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہاں داداگیری کی صلاحیت کا استعمال ہے مگر سنجیدگی کی صلاحیت کا کوئی استعمال نہیں۔ یہاں شاطر آدمی اپنی پوری قیمت پالیتا ہے مگر شریف آدمی کو یہاں کوئی قیمت نہیں ملتی۔ ہر ایک کو خوش کرنے والی زبان بولنے والے کو یہاں خوب مقبولیت حاصل ہوتی ہے مگر جو شخص غیر مصلحت پرستانہ انداز میں بولے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اس کو یہاں کوئی عزت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جو اپنی ذات میں بالکل بے عیب ہے۔ جہاں درخت کمال کا ایک انتہائی خوش منظر نمونہ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں چڑیاں اس کے سوا کوئی اور بولی نہیں جانتیں کہ وہ حسن اور سلامتی کے نغمے گائیں۔ جہاں سورج اور چاند صرف روشنی بکھیرتے ہیں، ان کو تاریکی بکھیرنا اور اندھیرا پھیلانا نہیں آتا جہاں ستارے صرف اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں، کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑنے کے لئے نہیں دوڑتا۔

انسان اور بقیہ کائنات میں یہ تضاد دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں دو خدا ہیں، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت کا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں یہ الل ٹپ نظام کیوں کر جاری رہتا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ مثالی دنیا اس کے بعد آنے والی ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات اسی کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ امتحان کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ انسان کو عمل کی پوری آزادی ہو۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور کچھ لوگ ٹیڑھے راستہ پر چلتے ہیں۔ مگر قیامت کے بعد جب مثالی دنیا قائم ہوگی تو وہاں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہو گا کہ وہ مثالی انداز میں سوچنے اور مثالی کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقیہ تمام لوگ چھانٹ کر اسی طرح دور پھینک دئے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

ایک شہر، دو کہانی

ستمبر ۱۹۸۲ میں ملک کے ایک شہر میں فساد ہوا۔ جانیں ضائع ہوئیں۔ دکان اور مکان جلا دئے گئے۔ تجارتوں اور صنعتوں کو تقریباً ایک ارب روپے کا نقصان پہنچا۔ اور ان تمام نقصانات میں ۹۰ فی صد سے زیادہ حصہ مسلمانوں کا تھا۔

مگر اسی شہر میں ایک مدرسہ ہر قسم کے نقصان سے بالکل محفوظ رہا۔ ایک ہی شہر میں دو قسم کے انجام کا راز صرف یہ تھا کہ شہر کے بقیہ مسلمانوں نے مقابلہ آرائی کی پالیسی پر عمل کیا اور مدرسہ والوں نے صبر کی پالیسی پر۔

یہ مدرسہ "دشمنوں" کے علاقہ میں تھا۔ وہ ہر طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ عین اس وقت جب کہ سارے شہر میں قیامت برپا تھی، ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کی رات کو دس بجے تقریباً پانچ سو آدمیوں کا غول آیا اور مدرسہ کو گھیر لیا۔ وہ لوگ نعرے لگا رہے تھے —— مدرسہ میں آگ لگا دو، ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑو وغیرہ۔ مدرسہ کے پاس ایک میدان میں کنکر پتھر کافی پڑے ہوئے تھے۔ یہاں سے اٹھا اٹھا کر ان لوگوں نے مدرسہ میں پتھر پھینکنے شروع کئے۔ ۸۔۱۰ آدمی مدرسہ کی چھت پر چڑھ گئے اور اوپر سے چیخنا شروع کیا۔

اس حالت میں مدرسہ والوں نے کیا کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ فسادیوں کا غول ان کی طرف آرہا ہے تو پہلے سے سوچے ہوئے منصوبہ کے مطابق انھوں نے تمام روشنیاں بجھا دیں۔ حالات کے تحت انھیں قطعی اندیشہ تھا کہ فسادی ان کے اوپر حملہ کرنے آئیں گے۔ انھوں نے باہم مشورہ سے طے کیا تھا کہ جب ایسا ہوگا تو ہم مدرسہ میں بالکل اندھیرا کر دیں گے اور کمروں میں داخل ہو کر یہ آیت پڑھنا شروع کریں گے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ ہم اس وقت تک کوئی جوابی کارروائی نہ کریں گے جب تک وہ بالکل ہمارے پاس نہ آجائیں۔

فسادیوں کا غول پتھر پھینک رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا اور مدرسہ کے تمام لوگ روشنیاں بجھا کر اپنے کمروں میں آیت قرآنی کا ورد کر رہے تھے۔ شہر کے عام مسلمانوں کے برعکس مدرسہ والوں کی اس خاموشی نے فسادیوں پر رعب ڈال دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی گہری سازش ہے اور انھوں نے کوئی خاص تیاری کر رکھی ہے جس کو وہ اس وقت سامنے لائیں گے جب کہ ہم لوگ اندر داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجمع کی طرف سے کچھ لوگوں نے پکار کر کہنا شروع کیا "واپس چلو، آگے نہ بڑھو، ورنہ تم میں سے کوئی بچ کر نہیں جائے گا" اس کے بعد چھت پر چڑھنے والے نیچے اتر آئے اور سارے کے سارے فسادی جدھر سے آئے تھے ادھر ہی واپس چلے گئے۔

تلوار سے زیادہ

سابق صدر مصر انور سادات (۱۹۸۱ - ۱۹۱۸) کے قتل کے بعد امریکہ کے ٹائم میگزین (۱۹ اکتوبر ۱۹۸) نے اس واقعہ کے بارے میں خصوصی مضمون شائع کیا تھا۔ اس مضمون کا آغاز اس نے نپولین کے ایک قول سے کیا۔ نپولین نے اپنے آخری زمانہ میں سوال کیا: "کیا تم جانتے ہو کہ دنیا کے بارے میں کیا چیز مجھے سب سے زیادہ تعجب میں ڈالتی ہے" اس کے بعد خود ہی جواب دیا کہ وہ چیز طاقت کی یہ بے بسی ہے کہ اس کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بالآخر ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ تلوار کو فتح کر لیتا ہے:

In the end, the sword is always conquered by the mind

انور سادات نے مصر میں ہر قسم کی طاقت حاصل کر لی مگر ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ کو وہ عین اس وقت قتل کر دیے گئے جب کہ قاہرہ میں وہ اپنی تمام افواج کے ساتھ فتح سوئز (۱۹۷۳) کی تقریب منا رہے تھے۔ انور سادات کی عالی شان نشست گاہ میں آنے والے تمام لوگوں کی جانچ مخصوص آلات (Metal Detector) کے ذریعہ کی جا رہی تھی حتیٰ کہ پریڈ میں حصہ لینے والے تمام فوجیوں کی رائفلوں کو کارتوس سے خالی کر دیا گیا تھا۔ مگر سادات کی فوج ہی کا ایک آدمی پریڈ سے نکل کر تیزی سے ڈائس کی طرف آیا اور قبل اس کے حفاظتی عملہ اس کو روکے وہ سادات کو اپنی گولی کا نشانہ بنا چکا تھا۔

یہ واقعہ تلوار کے اوپر دماغ کی فتح کا واقعہ تھا، انور سادات کے کچھ مخالفین نے یہ تصور پھیلایا کہ انور سادات مرتد ہو چکے ہیں اور شریعت اسلام کے مطابق مرتد شخص قتل کا مستوجب ہوتا ہے۔ یہ تصور فوج تک پہنچا۔ لفٹننٹ خالد استانبولی شدت کے ساتھ اس سے متاثر ہوا۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے خفیہ منصوبہ بنایا اور فتح کی پریڈ کے دن منصوبہ کے مطابق سادات کو گولی مار کر قتل کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ذہن تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مگر تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان نے اس ذہن کو زیادہ تر منفی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ مثبت مقاصد کے لئے ذہن کو استعمال کرنے کی مثالیں تاریخ میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عمل کرنے والوں نے انسانیت کو صرف تخریب کا تحفہ دیا ہے۔ بہت کم عمل کرنے والے ہیں جن کے عمل سے انسانیت کو تعمیر کا تحفہ ملا ہو۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا
كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ
ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ
مُبِينٍ ﴿٦١﴾ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
كَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ
لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ
جَمِيعًا ۚ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾

اور تم جس حال میں بھی ہو اور قرآن میں سے جو حصہ بھی سنا رہے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو، ہم تمھارے اوپر گواہ رہتے ہیں جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔ سن لو، اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں؛ اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ زور سب اللہ ہی کے لئے ہے، وہ سننے والا جاننے والا ہے ۶۵-۶۱

دعوت اس دنیا کے تمام کاموں میں مشکل ترین کام ہے۔ داعی اپنے پورے وجود کو دعوتی عمل میں شامل کرتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی پیغام کا داعی بن سکے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ وہ ہے جو مخاطبین کی طرف سے پیش آتا ہے۔

داعی جب خدا کے دین کو بے آمیز صورت میں پیش کرتا ہے اور اس کو کھلے دلائل کی زبان میں مبرہن کر دیتا ہے تو وہ تمام لوگ بھڑک اٹھتے ہیں جو خود ساختہ دین کو خدا کا دین بتا کر دیندار بنے ہوئے ہوں یا دینی پیشوائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہوں۔ وہ داعی کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے بنیاد پروپیگنڈا، سازشیں، حتیٰ کہ جارحانہ کارروائیاں، ہر چیز کو وہ اپنے لئے جائز کر لیتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ملی ہوئی آزادی انھیں موقع دیتی ہے اور وہ داعی کے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال یہاں تک پہنچتی ہے کہ دلیل کی طاقت تمام تر ایک طرف ہوجاتی ہے اور مادیات کی طاقت تمام تر دوسری طرف۔

یہ صورت حال بلاشبہ بے حد سخت ہے۔ اس کے بعد ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ مخالفین حق کے حوصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے کو کامیاب سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف داعی پر بھی یہ خیال گزرتا ہے کہ کیا خدا اس معاملہ میں غیر جانب دار ہے۔ کیا وہ مجھے حق و باطل کے اس معرکہ میں ڈال کر خود علیحدہ ہو گیا ہے۔

مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا حق کا ساتھ نہ دے۔ مخالفین کا بے دلیل ہو جانا اور دلیل کی قوت کا تمام تر داعی کی طرف ہونا یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا داعی کے ساتھ ہے نہ کہ دوسرے گروہ کے ساتھ۔ کیونکہ دلیل موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جس کے ساتھ دلیل ہے اس کے ساتھ گویا خدا ہے۔ مخالفین حق کو جارحیت کا موقع صرف اس آزادی کی وجہ سے مل رہا ہے جو امتحان کی خاطر انھیں دی گئی ہے۔ امتحانی دنیا کے ختم ہوتے ہی یہ صورت حال بدل جائے گی۔ اس وقت عزت و برتری اس کے لئے ہوگی جو دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوا تھا۔ جو لوگ دلیل سے خالی تھے وہ وہاں کی دنیا میں رسوا اور ناکام ہو کر رہ جائیں گے۔ اللہ کے سچے داعیوں کا گروہ خدا کے دوستوں کا گروہ ہے۔ اللہ ان کو آخرت میں ایک ایسی اعلیٰ زندگی کی خوش خبری دیتا ہے جہاں نہ انھیں پچھلی زندگی کے لئے کوئی پچھتاوا ہوگا اور نہ اگلی زندگی کے لئے کوئی اندیشہ۔

أَلَآ إِنَّ لِلَّهِ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ ٱلَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ شُرَكَآءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾ هُوَ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلَّيْلَ لِتَسْكُنُوا۟ فِيهِ وَٱلنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾

سنو، جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں وہ کس چیز کی پیروی کر رہے ہیں، وہ صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ محض اٹکل دوڑا رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لئے رات بنائی تاکہ تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن بنایا۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں ۶۷ ـ ۶۶

زمین و آسمان کے پیچھے کون ہے جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ یہ سوال ہر زمانہ میں انسان کی تلاش کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ مگر اس سوال کا صحیح جواب پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی ماوراء طبیعیات دنیا تک دیکھ سکے اور ماوراء طبیعیات تک دیکھنے والی آنکھ کسی کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ جواب جو وہ بطور خود قائم کرتا ہے وہ محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ

حقیقی علم کی بنیاد پر

اس دنیا میں حقیقی علم کی بنیاد پر بولنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لوگ ہیں جن کا ربط عالم بالا سے براہ راست قائم ہوتا ہے۔ خدا خود انھیں اپنی طرف سے حقیقت کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں پیغمبر کا علم ہی واحد علم ہے جس پر یقینی طور پر بھروسہ کیا جاسکے۔ پیغمبروں کے دعوے کی صداقت کو جانچنے کے لئے اگرچہ ہمارے پاس کوئی براہ راست ذریعہ نہیں ہے۔ تاہم ایک بالواسطہ ذریعہ یقینی طور پر موجود ہے۔ اور وہ کائنات کی آیات (نشانیاں) ہیں۔ یہ نشانیاں پیغمبروں کے بیان کردہ معنوی حقائق کی عملی تصدیق کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زمین پر رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات آتی ہے۔ یہ گردش ایک انتہائی محکم نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جو ریاضیاتی صحت کی حد تک منظم ہے۔ مزید یہ کہ یہ گردش حیرت ناک حد تک ہماری زندگی کے موافق ہے۔ اس کے پیچھے واضح طور پر ایک بامقصد منصوبہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال یقینی طور پر ایک ایسے قادر مطلق اور رحمان و رحیم کے وجود کا ثبوت ہے جس کی خبر پیغمبر دیتے ہیں۔

جو لوگ اپنے خیال کے مطابق "شریکوں" کی پیروی کر رہے ہیں، وہ شرکار خواہ قدیم الٰہیاتی شرکار ہوں یا جدید مادی شرکار، وہ کسی واقعی حقیقت کی پیروی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف اپنے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والی حقیقت کی تصدیق ساری کائنات کر رہی ہے مگر "مشرکین" جس چیز کے مدعی ہیں اس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ وہ پاک ہے، بے نیاز ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ کیا تم اللہ پر ایسی بات گھڑتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ کہو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لئے بس دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھالینا ہے پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ان کو ہم اس انکار کے بدلے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے ۶۸ - ۷۰

خدا کے لئے بیٹے بیٹیاں ماننا خدا کو انسان کے اوپر قیاس کرنا ہے۔ انسان کمیوں اور محدودیتوں کا شکار ہے، اس لئے اس کو اولاد کی ضرورت ہے تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی تلافی کرے مگر خدا کے معاملہ میں یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے۔

مخلوقات کا نظام خود ہی اس قسم کے خالق کی تردید ہے۔ مخلوقات کا عالمی نظام جس خدا کی شہادت دے رہا ہے وہ یقینی طور پر ایک ایسا خدا ہے جو اپنی ذات میں آخری حد تک کامل ہے۔ وہ ہر قسم کے عیبوں اور کمیوں سے پاک ہے۔ خدا اگر اپنی ذات میں کامل نہ ہوتا، اگر وہ عیبوں اور کمیوں والا خدا ہوتا تو کبھی وہ موجودہ کائنات جیسی کائنات کو نہیں بنا سکتا تھا اور نہ اس کو اس طرح چلا سکتا تھا جس طرح وہ انتہائی معیاری صورت میں چل رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس خدائے واحد کا تصور پیش کر رہا ہے اس کا وجود تو زمین و آسمان کی تمام نشانیوں سے ثابت ہے۔ مگر مشرکین نے خدا کا جو تصور بنا رکھا ہے، اس کا کوئی ثبوت موجودہ کائنات میں موجود نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ بے ثبوت خدا کو ماننا خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو خدا سرے سے موجود نہ ہو وہ کیسے کسی کی مدد پر آئے گا اور کیسے کسی کو بامراد کرے گا۔ جو خدا حقیقی طور پر موجود ہے، مشرکین اس کو مانتے نہیں، اور جس خدا کو مانتے ہیں اس کا کہیں وجود نہیں۔ ایسی حالت میں مشرکین موجودہ کائنات میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے جو واحد انجام مقدر ہے وہ صرف یہ کہ بالآخر وہ بے بس اور بے سہارا ہو کر رہ جائیں اور ہمیشہ کے لئے ذلت و ناکامی میں پڑے رہیں۔

موجودہ دنیا میں انکار یا شرک کا رویہ اختیار کرنے سے کسی کا کچھ بگڑتا نہیں۔ اس سے آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ مگر موجودہ صورت حال صرف امتحان کی مہلت کی بنا پر ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان کی وجہ سے عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی موجودہ صورت حال بھی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے جس کا وہ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر سرکش بنا ہوا تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے عقل سے کہا: "اے عقل، اس کائنات میں میں نے تجھ سے افضل، تجھ سے حسین اور تجھ سے بہتر مخلوق پیدا نہیں کی"۔ انسان کو ایسی عظیم نعمت دینے کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک سچائی کا انکار سب سے بڑا جرم ہے۔ سچائی کو جب دلیل سے ثابت کر دیا جائے تو آدمی کے اوپر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو مانے۔ عقلی طور پر ثابت شدہ ہو جانے کے بعد اگر وہ سچائی کا انکار کرتا ہے تو وہ ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ خدا نے جب انسان کو ایسی عقل دی جس سے وہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا جان سکے تو اس کے بعد کیا چیز ہوگی جو خدا کے یہاں اس کے لئے عذر بن سکے۔

تضاد کی زمین پر

۱۹۷۷ کے الکشن میں کانگرس کو شکست ہوئی اور ہندستان میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ میں ایک مسلمان کانگرسی لیڈر نے دہلی میں "ملت بچاؤ" کے نام پر "جیل بھرو" کی تحریک چلائی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جب تک ہماری مانگیں پوری نہ ہوں ہماری تحریک جاری رہے گی۔

جلد ہی جنتا پارٹی کی حکومت ختم ہوگئی اور کانگرس پارٹی کی حکومت دوبارہ قائم ہوگئی۔ ملت کے تمام مسائل اب بھی بدستور پوری شدت کے ساتھ موجود تھے۔ مگر جنتا حکومت کے خاتمہ کے ساتھ مذکورہ لیڈر کے مطالبات بھی ختم ہو گئے۔ جنتا پارٹی کے زمانہ میں جیل بھرو کی تحریک چلانے والے مجاہد نے کانگرس کی حکومت کے زمانہ میں راجیہ سبھا کی کرسی شکریہ کے ساتھ قبول کرلی۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم لیڈر اسی قسم کے تضاد پر زندہ ہیں۔ ان کو جو لیڈری حاصل ہے وہ صرف ان کے تضاد کی قیمت ہے نہ کہ فی الواقع ان کی حق پرستی کی قیمت۔

ایک بزرگ ہندستان میں اس مہم کی قیادت کریں گے کہ کسی دینی ادارہ میں صدر کا بیٹا صدر نہ ہو۔ مگر عرب میں جاکر وہ اس پر راضی ہو جائیں گے کہ ایک بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا ملک کا بادشاہ بنے۔ ایک قائد پاکستان میں عوامی جمہوریت کی تحریک چلائیں گے مگر پٹرو ڈالر کے دیس میں غیر جمہوری نظام کے ساتھ سازگاری کرلیں گے۔ ایک جماعت مصر اور شام میں "مکمل اسلام" سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگی۔ مگر اسی جماعت کے افراد دولت مند عرب ممالک میں جزئی اسلام پر مطمئن ہو کر بڑے بڑے مشاہرے قبول کرلیں گے۔

یہی موجودہ زمانہ میں تمام اسلامی شخصیتوں اور مسلم جماعتوں کا حال ہے۔ وہ ایک مقام پر جس باطل کے خلاف جھنڈا اٹھانے کے چیمپین بنیں گے، دوسرے مقام پر اسی باطل کی موجودگی پر خاموش رہیں گے، صرف اس لئے کہ اس خاموشی کی قیمت ان کو اعزازات اور مفادات کی صورت میں مل رہی ہے۔

مگر ہمارے ان قائدین اور مفکرین کو جاننا چاہئے کہ تضاد کی زمین پر صرف شخصی عظمت کا محل کھڑا ہوتا ہے، ملت کی عظمت کا محل کبھی تضاد کی زمین پر کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔

زبان والے بے زبان ہو جائیں گے

قدیم عرب میں ایک شخص جمیل بن معمر الجمی تھا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ اس کے اندر یہ عجیب صلاحیت تھی کہ وہ دو متضاد نقطہ نظر پر یکساں قدرت کے ساتھ تقریر کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا نام ذوالقلبین (دو دل والا) پڑ گیا۔

اس قسم کے کردار مختلف شکلوں میں ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں۔ مگر ذوالقلبین ہونا خدا کے مقرر کئے ہوئے فطری نقشہ سے انحراف کرنا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے نہ کہ کوئی پسندیدہ چیز۔ اسی لئے قرآن میں فرمایا گیا کہ اللہ نے کسی انسان کے دو دل نہیں بنایا (الاحزاب ۴) یعنی جب عضویاتی تخلیق میں انسان کو دو دل والا نہیں بنایا گیا ہے تو سوچ اور جذبات کے اعتبار سے بھی دو دل والا ہونا اس کے لئے صحیح نہیں ہو سکتا۔

موجودہ دنیا میں چونکہ انسان کو آزادی حاصل ہے اس لئے یہاں کوئی شخص ایسا کر سکتا ہے کہ وہ ایک معاملہ میں ایک طرز پر سوچے اور دوسرے معاملہ میں دوسرے طرز پر سوچے، وہ ایک مجمع میں ایک ڈھنگ پر بولے اور دوسرے مجمع میں دوسرے ڈھنگ پر تقریر کرے۔ وہ جسم کے اعتبار سے ایک دل والا انسان ہونے کے باوجود ذہن اور زبان کے اعتبار سے دو دل والا انسان بن کر رہے۔ بلکہ کئی دل والا انسان بن جائے۔ مگر ایسی ہر صورت خدا کے تخلیقی نقشہ کی خلاف ورزی ہے۔ وہ فطرت کے مقررہ راستہ سے انحراف کرنا ہے۔ موجودہ دارالامتحان میں کوئی شخص ایسا متضاد رویہ اختیار کر کے کامیاب ہو سکتا ہے مگر آخرت کی حقیقی اور معیاری دنیا میں اس قسم کا خلاف فطرت رویہ بالکل بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اس قسم کا انداز اختیار کرنے والا آدمی موجودہ دنیا میں خوب کامیاب رہتا ہے۔ وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے حسب حال بات کرتا ہے۔ وہ جس سے ملتا ہے یا جہاں جاتا ہے، ہر جگہ وہی بات کہتا ہے جو وہاں کے لوگوں کی پسند کے مطابق ہو۔ مگر اس کی ہوشیاری صرف موجودہ دنیا میں کسی کے کام آسکتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیا سچائی کے ظہور کی دنیا نہیں۔ آخرت سچائی کے ظہور کی دنیا ہوگی۔ وہاں حق حق کی صورت میں اور باطل باطل کی صورت میں ظاہر ہو جائے گا۔ وہاں جمیل بن معمر الجمی جیسے ماہرین بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ ساری مہارت کے باوجود ایسا محسوس کریں گے جیسے ان کے پاس زبان ہی نہیں جس سے وہ بولیں اور ان کے پاس قلم ہی نہیں جس سے وہ کچھ لکھ سکیں۔

اپنے کو تول لو اس سے پہلے کہ تمہیں تولا جائے

حضرت ثابت بن حجاج کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق نے کہا: اپنے آپ کو تول لو قبل اس کے کہ تمہیں تولا جائے۔ اپنا حساب کر لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب کیا جائے کیونکہ کل کے حساب کے مقابلہ میں آج اپنا حساب کر لینا زیادہ آسان ہے اور بڑی پیشی کے لئے اپنے کو تیار کر لو (زنوا انفسکم قبل ان توزنوا وحاسبوها قبل ان تحاسبوا فانه اهون علیکم فی الحساب غداً ان تحاسبوا انفسکم وتزینوا للعرض الاکبر، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۱)

ایک نے مار کھائی دوسرا بچ گیا

سالم بن ابی جعد کہتے ہیں کہ حضرت ابو الدرداء کے سامنے سے دو بیل گزرے جو ایک گاڑی میں جتے ہوئے تھے۔ ایک ان میں سے کام پر لگا رہا اور دوسرا رک گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو الدرداء نے کہا: اس میں بھی عبرت ہے۔ یعنی رکنے والے نے ڈنڈا کھایا اور دوسرا بچ گیا (مرّ ثوران علی ابی الدرداء وهما یعملان فقام احدهما ووقف الآخر فقال ابو الدرداء: ان فی هذا لمعتبرا، صفوۃ الصفوۃ جلد ۱)

سوچنا اور عبرت پکڑنا سب سے بڑا عمل ہے

حضرت عون بن عبد اللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ام الدرداء سے پوچھا کہ حضرت ابو الدرداء کا اکثر عمل کیا ہوتا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: سوچنا اور عبرت پکڑنا (قیل لام الدرداء ما کان اکثر عمل ابی الدرداء رضی اللہ عنہ قالت التفکر والاعتبار، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۱)

صحابہ کرام کی عبادت خدا اور آخرت میں غور کرنا تھا

حضرت محمد بن واسع کہتے ہیں کہ حضرت ابو ذر کی وفات کے بعد ایک شخص بصرہ سے سوار ہو کر مدینہ آیا اور ان کی اہلیہ ام ذر سے ملا تاکہ حضرت ابو ذر کی عبادت کے بارے میں معلوم کرے۔ ام ذر نے کہا: وہ سارے دن تنہا غور و فکر کرتے رہتے تھے (ان رجلاً من البصرۃ رکب الی ام ذر رضی اللہ عنها بعد وفاۃ ابی ذر رضی اللہ عنہ یسألها عن عبادۃ ابی ذر فاتاها فقال: جئتک لتخبرینی عن عبادۃ ابی ذر رضی اللہ عنہ قالت: کان النهار اجمع خالیاً یتفکر، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۱)

ہر چیز میں عبرت اور نصیحت ہے

حضرت دارانی نے کہا کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر بھی میری نگاہ پڑتی ہے مجھے اس میں خدا کی کوئی نعمت نظر آتی ہے اور میرے لئے کوئی عبرت ہوتی ہے (قال الدارانی: انی لاخرج من منزلی فما یقع بصری علی شیء الا رأیت للہ علی فیہ نعمۃ ولی فیہ عبرۃ، تفسیر ابن کثیر)

ایک سفر

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ (لیبیا) کی دوسری عالمی کانفرنس ۱۴۔ ۱۹ اگست ۱۹۸۲ کو طرابلس میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں طرابلس کا سفر ہوا۔ ۱۳ اگست کو میں طرابلس پہنچا اور ۳۰ اگست تک وہاں قیام رہا۔ مولانا محمد ہاشم القاسمی بھی اس سفر میں میرے ساتھ تھے۔

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے تخیل اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جو تعارفی کتاب ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے، اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

پہلی دعوتی کانفرنس جو طرابلس میں ۱۳ شوال ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہوئی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ خدا کی طرف اور اس کے سچے دین اسلام کی طرف دعوت دینے کے معاملات کو سنبھالے اور دین اسلام کو آباد دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچائے۔ یہ ایک فرض ہے جو مسلمانوں کے کندھوں پر ان کے بھائیوں کے حق میں ڈالا گیا ہے۔ یہ اسلامی دعوت کی ادائگی ہے جس کی امت اسلامیہ مکلف ہے جو کہ خیر امت ہے اور لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تاکہ وہ انسان کی خدمت کرے، جو حیرت کے اندھیروں میں گم ہے اور اسلام کا محتاج ہے۔ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانیت کو حیرانگی اور گمراہی سے نکالے اور اس کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے اور اس کی مشکلات کو حل کرے اور اس کو اس سعادت سے ہم کنار کرے جس کو دنیا کے تمام نظام فراہم کرنے سے عاجز رہے ہیں (عربی سے ترجمہ)

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے موجودہ ذمہ دار (امین) دکتور محمد احمد الشریف ہیں۔ اس ادارہ کے مقاصد میں سے خاص مقاصد یہ ہیں ——— داعی اور استاد تیار کرنا، اسلامی دعوت کے اداروں کو تعاون دینا، قرآن اور دوسری اسلامی کتابیں شائع کرنا۔ جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ نے افریقہ، ایشیا، یورپ، امریکہ، اور آسٹریلیا میں تقریباً ساڑھے تین سو داعی اور اساتذہ بھیجے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف ملکوں میں، ہزاروں آدمیوں کو اسلام میں داخل کیا ہے۔ جمعیۃ الدعوۃ نے مختلف ممالک میں مسجدیں اور اسلامی مراکز قائم کیے ہیں اور ایک سو سے زیادہ اسلامی اداروں کو گراں قدر امداد فراہم کی ہے بڑی تعداد میں اسلامی کتابیں چھاپ کر ساری دنیا میں تقسیم کی گئی ہیں۔ وغیرہ

جمعیۃ الدعوۃ کے تحت ۱۹۷۴ میں ایک تربیتی کالج قائم کیا گیا جس کا نام کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ ہے۔

یہ ادارہ طرابلس میں قائم ہے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ادارہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو اسلام کے ماضی اور حال سے واقف کرایا جائے۔ اسلام کی فکری عظمت اور اس کی عملی افادیت ان کے ذہن پر بٹھائی جائے۔ ایسے داعی تیار کئے جائیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام کی دعوت کا کام کریں۔ اس کلیہ میں تعلیم کی مدت چار سال ہے اور اس میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے درجہ تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ اس کا نصاب کلیہ کے مطبوعہ پمفلٹ کے مطابق حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے:

التفسیر وعلوم القرآن، الحدیث وعلوم السنہ، الفقہ الاسلامی، تاریخ التشریع الاسلامی، التاریخ الاسلامی، الاستشراق والتبشیر، حاضر العالم الاسلامی، علم النفس العام، علم الاجتماع، الادیان ومقارنتہا، الفرق الاسلامیہ، التیارات الفکریہ المعاصرہ، التصوف وتاریخہ، علم الاخلاق، الحضارۃ الاسلامیہ، الفلسفۃ الاسلامیہ، علم النفس الاجتماعی، اللغات الاوروبیہ، اللغات الشرقیہ

ہندستان اور طرابلس کے درمیان چھ ہزار کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ہندستان میں "طرابلس" کا لفظ غالباً سب سے پہلے ۱۹۱۱ میں عام ہوا جب کہ اٹلی کی ۲۵ سالہ حکومت نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے لیبی عوام پر مظالم کئے۔ اس وقت ہندستان کے اخبارات نے مضامین لکھے اور شاعروں نے نظمیں کہیں۔ اسی زمانہ میں اقبال نے اپنی مشہور نظم کہی تھی اس کے دو اشعار یہ تھے:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

میں طرابلس ایسے موقع پر پہنچا جب کہ لبنان میں فلسطینی مسلمانوں کے اوپر اسرائیل کے وحشیانہ مظالم (۱۹۸۲) جاری تھے۔ اس کے بعد جس طرح ذلت کے ساتھ فلسطینیوں کو لبنان چھوڑنا پڑا، اس کی چیخ پکار سے تمام عرب اخبارات بھرے ہوئے نظر آئے۔ اگر مذکورہ تقابل کو دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ملت اسلامیہ نے ۱۹۱۱ سے لے کر ۱۹۸۲ تک آگے کی طرف سفر طے نہیں کیا۔ ملت اسلامیہ ستر سال پہلے جس طرح ظالموں کے مقابلہ میں بے بس تھی۔ اسی طرح وہ ستر سال بعد بھی ظالموں کے مقابلہ میں بے بس ہے ـــــ جس ملت کے لئے دور اول میں غلبہ مقدر کیا گیا تھا، کیا بعد کے دور میں اس کے لئے مظلومیت اور مغلوبیت مقدر کر دی گئی ہے۔

دہلی سے لیبیا کے لئے ابھی تک براہ راست ہوائی سروس نہیں ہے۔ ہم نے دہلی سے ایتھنز تک ڈچ ہوائی کمپنی (KLM) کے ذریعہ سفر کیا اور ایتھنز سے طرابلس کے لئے اولمپک ایرویز کے ذریعہ۔

۱۳ اگست کو ایک دن ایتھنز (یونان) میں قیام رہا۔ یونان کی زمین پر یہ مختصر قیام بڑا عبرت انگیز تھا۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں دور قدیم کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفر پیدا ہوئے۔ اسپین کے بعد یہ دوسرا مقام ہے جہاں سے اسلام نے "مغرب" کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ مگر آج انھیں راستوں سے "مغرب" اسلامی دنیا میں داخل ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کو اپنے نفوذ کے لئے قدیم روایتی راستوں کی ضرورت نہیں۔ وہ بے شمار نئے راستوں سے اس طرح عالم اسلام میں گھس رہا ہے کہ اس پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں ۔ ۔ ۔ وھم من کل حدب ینسلون

۱۳ اگست کو جب کہ ہم طرابلس سے بہت دور ایک غیر ملک (یونان) میں تھے۔ ہوائی اڈہ کی ایک خاتون آئیں اور ہمارا تعارف حاصل کرنے کے بعد ہم کو خوش آمدید کہا۔ ان کو حکومت لیبیا کی طرف سے ٹیلکس پر ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ہم سے ملیں اور ہماری مدد کریں۔ چنانچہ وہ ہم کو عام ہوائی مسافروں کی صف سے نکال کر ایک خصوصی مہمان خانہ میں لے گئیں۔ یہاں کھانے اور دوسری ضروریات کا اعلیٰ انتظام تھا۔ جب اگلے جہاز کا وقت آیا تو خاتون دوبارہ آئیں اور عام مسافروں سے الگ ایک خصوصی گاڑی پر سوار کر کے ہم کو طرابلس جانے والے جہاز تک پہنچایا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے آخرت کا معاملہ یاد آگیا۔ جنت میں کسی آدمی کا داخلہ اگرچہ حشر میں حساب کتاب کے بعد ہوگا۔ مگر حدیث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کا اخروی انجام اس کی موت کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ قیامت کے بعد ہوگا تو قیامت سے پہلے کسی آدمی کے لئے اس کا تجربہ کیسے ممکن ہے۔ مذکورہ واقعہ تمثیلی انداز میں اس کا ایک جواب ہے ــــ ہماری میزبانی کا اصل مقام اگرچہ براعظم افریقہ کے ایک ملک (لیبیا) میں تھا۔ مگر چونکہ یہ سرکاری میزبانی تھی اس لئے اس کا آغاز بہت پہلے براعظم یورپ کے ایک ملک (یونان) سے شروع ہو گیا جب کہ ابھی ہم میزبان ملک کی سرحد میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے۔

طرابلس میں ایک روز میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں تھا کہ دروازہ باہر سے مقفل ہو گیا۔ یہ کمرے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ نہ باہر کی آواز اندر آئے اور نہ اندر کی آواز باہر جائے۔ ایسی حالت میں دروازہ کو دوبارہ کھلوانے کے لئے مجھے کافی شور وغل کرنا ہوتا۔ مگر مجھے سادہ طور پر صرف یہ کرنا پڑا کہ میں نے انٹرکام پر نمبر 17 کو ڈائل کیا۔ اُدھر سے ہلو کی آواز آئی تو میں نے بتایا کہ میں کمرہ نمبر 1148 میں ہوں اور میرا کمرہ باہر سے مقفل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایک منٹ میں ہوٹل کا آدمی آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ان کے پاس ماسٹر کی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک ہی کنجی سے پوری منزل کے تمام دروازے کھول سکتے

Ladies and Gentlemen

I am very thankful to you for according me the honour of presiding over this international assembly of Muslim scholars and preachers. May God help us to carry out His will.

First, I congratulate the Govt. of Libya, Dr M.A. Sharief, and other members of the *Jamiat Ad-Dawah Al-Islamia* for affording us the opportunity of having Muslims from all over the world under one roof, discussing matters of Islamic *Dawah.*

The most obvious lesson of this universal gathering of Muslims is that Islamic *Dawah* is the most certain base of unity among Muslims. *Dawah* is the only issue about which there is no controversy among different sects of Muslims; moreover, this is the only field of work where we can enjoy the cooperation of the Muslim rulers of our day. This great conference of Islamic Call is an incontrovertible proof of this.

Let us avail of this opportunity and open a new page of our history, one of unity, of joint effort, and of result-oriented struggle. May Allah bless you and bestow upon you the wisdom which leads to ultimate success and salvation.

Finally, I would request all the learned speakers to observe the time limit (for speech) and in this too, set an example of Islamic discipline.

Now I request Shaikh Dr Mostafa Al-Hamshary to carry on the proceedings.

Presidential address delivered by Maulana Wahiduddin Khan at the second Islamic Conference, Tripoli 15th August 1982

ہیں ـــــــ جہاں لوگوں کے پاس صرف اپنے تالے کی کنجیاں ہوں وہاں لوگ اکثر یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ کوئی ایسی شاہ کلید بھی ہوسکتی ہے جس کے ذریعہ ان کے اپنے تالے سمیت تمام تالوں کو کھولا جاسکے۔

ہندستان میں "بائیں چلو" کا اصول ہے اور لیبیا میں "دائیں چلو" کا اصول۔ نئی دہلی کا کوئی آدمی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ طرابلس کی سڑک پر "بائیں چلو" کے اصول پر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ اسی طرح طرابلس کا ایک آدمی کبھی ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ نئی دہلی کی سڑک پر "دائیں چلو" کے اصول پر عمل کرے اور اپنی گاڑی لے کر دائیں رخ پر دوڑنے لگے۔ سڑکوں کے بارے میں ہر آدمی اس قانون کو جانتا ہے مگر زندگی کے معاملہ میں ہر آدمی اس اصول کو بھول جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اسے کسی "خارجی قانون" کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ذوق کے مطابق خواہ دائیں طرف اپنی زندگی کی گاڑی دوڑائے یا بائیں طرف۔

کانفرنس کا افتتاح ۱۴ اگست کی شام کو ہوا۔ اس کے بعد پانچ روز تک باقاعدہ کارروائی جاری رہی۔ ہر روز کا اجلاس کسی خاص آدمی کی صدارت میں ہوا۔ ایک دن (۱۵ اگست) کی نشست کے لئے راقم الحروف کو صدر جلسہ (یہاں کی اصطلاح میں امین جلسہ) بنایا گیا۔ میں نے اپنی صدارتی تقریر انگریزی میں کی اور اس میں چند باتیں کہیں۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس وقت دنیا بھر کے مسلمان یہاں ایک چھت کے نیچے جمع ہیں۔ ان کو جس چیز نے یکجا کیا ہے وہ اسلامی دعوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت ایک ایسا عنوان ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتحاد ہوسکتا ہے۔ پھر کیوں ہم ان عنوانات پر زور آزمائی کریں جن میں مسلمان ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ اس کے بجائے ہم کو دعوت کے مقصد کو لے کر آگے بڑھنا چاہیے جو اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور اتحاد و اتفاق بلاشبہ سب سے بڑی قوت ہے۔

کانفرنس کی کارروائی چھ دن جاری رہی۔ پروگرام کی تفصیل مطبوعہ نقشہ کے مطابق حسب ذیل تھی:

۱۴ اگست	الافتتاح
۱۵ اگست	الدعوة الاسلامیہ فی عالمنا المعاصر
۱۶ اگست	الدعوة الاسلامیہ ومشکلات المسلمین
۱۷ اگست	قضیۃ الحریہ فی العالم الاسلامی
۱۸ اگست	الاسلام و تحدیات العصر
۱۹ اگست	بیان المؤتمر والتوصیات الختامیہ

آخری دن کی کارروائی میں اتفاق رائے سے اسلامی دعوت کا کام انجام دینے کے لئے مختلف ملکوں سے ایک عالمی کونسل (مجلس عالمی للدعوۃ الاسلامیہ) بنائی گئی جو اس مؤتمر عام کے لئے مجلس تنفیذی کے طور پر کام کرے گی۔ اس کونسل میں راقم الحروف کا نام شامل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس عالمی کونسل کا ہر سال کم از کم ایک اجلاس طرابلس میں ہوا کرے گا۔ اس کے ممبران کی مجموعی تعداد ۲۰۴ ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کو میرا مقالہ تھا۔ میرے مقالہ کے ساتھ عجیب قصہ پیش آیا۔ طرابلس کے سفر سے پہلے مجھے لندن کا سفر کرنا پڑا۔ وہاں سے واپسی کے فوراً بعد طرابلس کے لئے روانگی تھی۔ اس ہنگامی صورت حال کی وجہ سے طرابلس کی کانفرنس کے لئے کوئی مستقل مقالہ تیار کرنے کا موقع نہ تھا۔ لندن کے سفر پر جاتے ہوئے میں نے برادرم مولانا محسن عثمانی ندوی ایم اے کو اپنی مطبوعہ کتاب الاسلام یتحدی (دی اداہان) سے کہا کہ اس سے معلومات لے کر ایک مقالہ تیار کر دیں۔ انھوں نے مقالہ تیار کیا اور وہ ہندستان کے لیبی سفارت خانہ کی معرفت طرابلس پہنچ کر وہاں سائیکلو اسٹائل بھی ہو گیا۔

میں اسی مقالہ کو لے کر طرابلس پہنچا اور ذہن میں یہ تھا کہ اسی کو وہاں کی کانفرنس میں پڑھنا ہے۔ اس درمیان میں ایسا ہوا کہ میں نے ایک امریکی نومسلم کو ایک دن پہلے یہ مقالہ پڑھنے کے لئے دیا جو عربی زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ تو آپ کی کتاب الاسلام یتحدی کا خلاصہ ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو آدمی جو مقالہ پڑھتے وقت ہال میں موجود ہوں گے ان میں سے بیشتر الاسلام یتحدی کو پڑھ چکے ہیں۔ وہ یقینی طور پر محسوس کریں گے کہ وہی پچھلی بات ان کے سامنے دہرا دی گئی ہے۔

یہ خبر میرے لئے بڑی سخت تھی۔ کیونکہ اگلے ہی دن مقالہ پڑھا جانے والا تھا اور درمیان میں صرف ایک رات کا موقع تھا۔ بہرحال میں نے اللہ کے بھروسہ پر ایک نیا فیصلہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ میں ایک نیا مقالہ تیار کروں گا۔ میں نے ذمہ داروں سے نیا مقالہ پڑھے جانے کی اجازت لی۔ اس کے بعد ایک مصری نوجوان کو معاونت کے لئے تیار کیا۔ یہ تھے :

محمد سعید مراد۔ ۱۲ شارع سعید متفرع من شارع طومان بای۔ حلیۃ الزیتون۔ القاہرہ

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم دونوں فندق باب البحر (طرابلس) کی گیارھویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۱۴۸ میں عشاء کی نماز پڑھ کر بیٹھے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مقالہ کا مضمون میں اپنی ہندستانی عربی میں کہتا اور کبھی کبھی انگریزی میں اس کی تشریح کرتا۔ اس کے بعد محمد سعید مراد مصری اس کو اپنی فصیح عربی میں لکھتے۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب فجر کی اذان ہوئی تو ہمارا مقالہ تیار ہو چکا تھا۔ اگلے دن دوپہر بعد کی نشست میں اس کو پڑھنا تھا۔ اس وقت تک سائیکلو اسٹائل ہو کر اس کی کاپیاں بھی تیار ہو گئیں۔

آدھ گھنٹہ کے اس مقالہ کا عنوان تھا " القرآن فی مواجہۃ التحدیات العصریۃ "۔ مقالہ پیش کرنے کے بعد جو ملاقاتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے اس کو غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ کسی نے کہا: واللہ اسلوب فریدا۔ کسی نے کہا: کان ممتازا جدا۔ کسی نے کہا: لقد اعجبنی کثیرا۔ وغیرہ۔ یہ عربی مقالہ اولاً مؤتمر کی طرف سے سائیکلو اسٹائل کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد وزیر اطلاعات عبدالرحمٰن شلقم کی خصوصی ہدایت کے تحت فوری طور پر اس کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ موتمر میں پڑھے جانے والے مقالات میں راقم الحروف کا مقالہ واحد مقالہ تھا جس کو اس طرح پمفلٹ کی صورت میں چھاپا گیا۔

آدھ گھنٹہ کے مقالہ میں میں نے یہ دکھایا کہ جدید تحدیات دراصل جدید امکانیات ہیں۔ اگر ان کو قرآن کی رہنمائی میں استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے نیا مستقبل پیدا کرنے کا زینہ بن سکتے ہیں۔ آخری پیراگراف یہ تھا:

" رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں بظاہر اسلام کو العدو القوی سے معاملہ پیش آیا۔ مگر اس العدو القوی کے اندر حقیقۃً المومن القوی کے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اگرچہ ہم کو سخت ترین حالات کا سامنا ہے مگر یہ حالات اسلام کے لئے زینے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو لے کر اٹھ جائیں تو تاریخ دوبارہ ثابت کرے گی کہ یہ ساتویں صدی ہجری کی مانند گویا ایک تاتاری تلوار تھی جو صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر خدا کے دین کی خدمت وحمایت کے لئے وقف ہو جائے۔"

ایک صاحب امریکہ سے آئے تھے۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانیں یکساں روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ کھانے کی میز پر ان کا ساتھ ہوگیا۔ بات چیت کے دوران انھوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا " وحیدالدین " انھوں نے کہا " وحیدالدین خان " میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد وہ بڑے زور کے ساتھ لپٹ گئے۔ وہ میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح کا واقعہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آیا۔ عربی کتابیں، خاص طور پر الاسلام یتحدیٰ، بار بار چھپ کر تقریباً پوری مسلم دنیا میں پھیل ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اس کو پڑھ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ ہیں تقریباً سارے ہی لوگ الاسلام یتحدی کو پڑھے ہوئے نظر آئے۔ ایسے لوگ بھی ملے جنھوں نے کہا کہ الاسلام یتحدیٰ ابھی میں نے پڑھی نہیں ہے مگر اس کا نام کافی سنا ہے اور پڑھنے کا اشتیاق ہے۔

مزید معلوم ہوا کہ الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) کا ترجمہ عربی کے علاوہ اور کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مثلاً یوگوسلاویہ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ماہوار رسالہ (Bdukata Islame) نکالتے ہیں۔ یہ رسالہ یوگوسلاویہ کی البانوی زبان میں ہے۔ انھوں نے اس یوگوسلاوی زبان میں الاسلام یتحدی

کا ترجمہ کیا ہے۔ فی الحال اس کو انھوں نے اپنے رسالہ کے نمبر کے طور پر شائع کیا ہے اور آئندہ کتابی صورت میں چھاپنے والے ہیں۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Mr Sherif Ahmad, direktor medrese Alauddin
P. F. 89, Pristina, Yugoslavia

اس طرح ہماری معلومات کے مطابق یہ کتاب اردو کے علاوہ عربی، ترکی، فرانسیسی اور یوگوسلاوی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

الاسلام یتحدی عرب دنیا میں اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی اس سے باخبر ہے اور اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی سے پوچھا گیا کہ آپ نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے، اس کا جواب یہ ہوتا تھا : عدۃ مرات (کئی بار)

ہماری معلومات کے مطابق، الاسلام یتحدی اب تک پانچ عرب ملکوں کی جامعات میں باقاعدہ طور پر داخل نصاب ہو چکی ہے ——— قاہرہ، طرابلس، قطر، خرطوم اور تیونس۔ یہاں آنے والوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ کئی عرب یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اساتذہ مستقل طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے مضامین کو اپنے لکچروں میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک راقم الحروف کا علم ہے، ہندستان اور پاکستان کی کسی بھی درس گاہ کے نصاب میں اب تک وہ داخل نہ کی جا سکی۔ ہمارے قائدین اور ہمارے مدارس کے ذمہ دار یہ اعلان تو بار بار کرتے رہتے ہیں کہ "معقولات اور علم کلام پر جدید انداز میں کتاب لکھنے کی ضرورت ہے"۔ مگر جب ایسی کتاب لکھ کر شائع کر دی جائے تو ان کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ اس کو اپنائیں اور عملاً اس کو استعمال کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہر آدمی صرف کہنے کا کریڈٹ لینا چاہتا ہے، عمل کا کریڈٹ لینے کا شوق کسی کے اندر نہیں۔

طرابلس میں الاسلام یتحدی سے متعلق ایک عجیب کہانی معلوم ہوئی۔ طرابلس میں محمد سلیمان القائد اور علی مختار الجیعدی ہمارے دعوتی مشن سے بہت متاثر ہیں۔ ۱۹۷۷ میں وہ ڈاکٹر عبداللہ الصونی (رئیس قسم اللغۃ العربیۃ، کلیۃ التربیۃ، جامعہ طرابلس) سے ملے اور ان سے کہا کہ اسلامی مرکز کے لئے آپ تعاون دیجئے۔ وہ مذکورہ لیبی نوجوانوں کے قریبی ملاقاتی تھے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم میں تو ایک غریب آدمی ہوں (واللہ انا مفلس)

عبداللہ الصونی کے پاس واقعۃً مال نہ تھا۔ تاہم وہ ایک شریف آدمی تھے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹے تو ان کے دل نے انھیں ملامت کی کہ تمھارا دوست تم سے ایک نیک کام میں مدد لینے کے لئے آیا اور

تم اس کی کچھ مدد نہ کرسکے۔ یہ احساس ان پر اس قدر غالب آیا کہ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہ سکے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ان کے احتساب خویش نے ان کے سامنے ایک نیا وسیع تر دروازہ کھول دیا۔ وہ "الاسلام یتحدیٰ" کو پڑھے ہوئے تھے اور اس کی اہمیت کے معترف تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگرچہ میرے پاس مال نہیں ہے اور مال کے ذریعہ میں اس دینی مشن کی مدد نہیں کرسکتا۔ مگر میں ایک تعلیمی ادارہ کا صدر ہوں اور میں ایسا کرسکتا ہوں کہ الاسلام یتحدیٰ کو اپنے یہاں تعلیمی نصاب میں داخل کردوں۔

اگلی صبح کو وہ خود مذکورہ لیبی نوجوان کے گھر پہنچے اور اس سے کہا کہ میں نے تمھارے مشن کی مدد کے لئے ایک اور راستہ پالیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میں نے تمھارے مشن کے تحت شائع شدہ کتاب (الاسلام یتحدیٰ) کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کردیا ہے۔ اسی وقت انھوں نے کتاب کے پانچ ہزار نسخوں کا آرڈر لکھ محمد سلیمان القائد کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کی فراہمی کا فوراً انتظام کریں۔ چنانچہ کتاب بہت جلد قاہرہ سے منگالی گئی۔

اس کے بعد اگلے چند سالوں میں مزید کتابیں منگائی گئیں۔ اندازہ ہے کہ اس کے بعد مجموعی طور پر تقریباً پچاس ہزار کتابیں لیبیا میں پہنچیں۔ اس کی قیمت مصری سکہ میں ۵۰ قرش تھی جو لیبیا میں بشکل ۵۰ پیسہ کے بقدر ہے۔ چنانچہ طلبا اور غیر طلبا نے کثرت سے خریدا۔ لیبیا اگرچہ رقبہ کے اعتبار سے بڑا ملک ہے۔ مگر اس کی آبادی بہت تھوڑی ہے۔ چنانچہ چند سالوں کے اندر ایسا ہوا کہ الاسلام یتحدیٰ لیبیا کے تقریباً ہر پڑھے لکھے آدمی تک پہنچ گئی۔

لیبیا نیز دوسرے ملکوں کے کئی صحافی حضرات نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات میں دو سوال بہت مشترک ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ آپ نے الاسلام یتحدیٰ کے بعد اور کیا کیا تحریری کام کئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ اس کے بعد کافی تحریری کام ہوچکا ہے مگر عربی میں ان کے ترجمہ اور اشاعت کا کام ابھی باقی ہے۔ دوسرا سوال جو تقریباً ہر اخبار یا رسالہ والے نے کیا وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو مشکلات و مسائل در پیش ہیں ان کا آپ کے نزدیک کیا حل ہے۔ میں نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ وہ یہ کہ تمام مسائل کا ایک ہی یقینی حل دعوت الی اللہ ہے۔ دوسرا کوئی حل نہ اب تک کامیاب ہوا ہے اور نہ آئندہ کامیاب ہوسکتا ہے۔

۲۳ اگست کو طرابلس کے ٹیلی وژن پر میرا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ اس طرح کا انٹرویو عام طور پر ۱۵ منٹ کا ہوتا ہے مگر میرا انٹرویو خاص طور پر ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ سوالات زیادہ تر دو چیزوں سے متعلق تھے۔ ایک یہ کہ آپ کے مرکز اسلامی کے تحت کیا کیا کام ہورہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جدید تحدیات کے مقابلہ میں آپ کے نزدیک اسلام کا موقف کیا ہونا چاہیئے۔

چودہ منزلہ فندق باب البحر کی بالکنی پر کھڑے ہوکر طرابلس کے شہر پر نظر ڈالیں تو وہ خشک عمارتوں کا ایک پتھریلا جنگل معلوم ہوتا ہے۔ نئی دہلی جیسے سبزہ اور درخت کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ ہوٹل میں چاروں طرف کثرت سے ہرے بھرے درخت اور پودے نظر آئے۔ ہم سمجھے کہ یہ ہمارے ملک کی طرح واقعی درخت اور پودے ہیں۔ مگر قریب جاکر گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا تو وہ سب پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے۔ مگر ڈنٹھل اور پتی اور پھول، ہر چیز میں اتنی کامل مشابہت تھی کہ دور سے کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ پلاسٹک کے بنے ہوئے ہیں ——— صحرائی ملکوں میں سبزہ کی کمی نے پلاسٹک انڈسٹری کے لئے تجارت کا ایک نیا میدان کھول دیا ہے۔

ہندستان کے تقریباً پچاس ہزار افراد لیبیا میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جو طرابلس میں رہتے ہیں ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں، پردیس میں اپنے ہم وطنوں سے ملنا ہمیشہ بہت خوشی کا باعث ہوتا ہے، جن سے میری ملاقاتیں ہوئیں وہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کے ساتھ چند شام گزری جو بہت دن تک یاد رہے گی۔ ان کے ایک اجتماع میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسلام کے دعوتی پہلو پر اپنے خیالات پیش کئے۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو مختلف تحفے دئے گئے۔ ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز ایک جانماز تھا۔ اس جانماز میں ایک خاص قسم کا قطب نما چپکایا ہوا تھا جس کا نام کاشف الاتجاہات (Direction Finder) رکھا گیا ہے۔ یہ قطب نما دنیا کے کسی بھی مقام پر قبلہ کا رخ بتاتا ہے۔ اس میں گھڑی کی طرح چالیس اعداد چاروں طرف گولائی میں لکھے ہوئے ہیں اور سامنے ایک مینار بنا ہوا ہے۔ ہر عدد دنیا کے کسی خاص شہر کو بتاتا ہے۔ آپ جہاں کہیں ہوں، گائڈ بک میں اس مقام کا عدد دیکھیں اور پھر جانماز کو بچھا کر گھمائیں۔ قطب نما کی سوئی جب مطلوبہ نمبر پر ٹھہر جائے تو اس وقت مینار کا رخ جس جانب ہوگا وہی اس مقام پر قبلہ کا رخ ہوگا۔

طرابلس کی کانفرنس میں دنیا کے تمام حصوں کے لوگ ساڑھے چار سو کی تعداد میں آئے۔ مختلف ممالک سے تقریباً ۵۰ تنظیموں اور اداروں کی نمائندگی یہاں موجود تھی۔ دعوت دین اور احیاء اسلام کے عنوانات پر اس طرح کے اجتماعات مختلف مسلم ملکوں میں کثرت سے کئے جارہے ہیں۔ سعودی عرب خاص طور پر اس معاملہ میں کافی آگے ہے۔ وہ ساری دنیا میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی خدمت کرنے والوں کی مدد کر رہا ہے۔ موجودہ مسلم حکمراں اگرچہ سیاسی اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو برداشت نہیں کرتے۔ مگر دعوتی اسلام کی کوششوں کو وہ ہر طرح کا تعاون دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ملے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے نہ یہ کہ ہم اپنی جدوجہد کو اس میدان سے شروع کرنا چاہیں جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا۔

۲۹ اگست کو راقم الحروف کے اعزاز میں فندق باب المدینہ میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ اس عشائیہ میں وزراء اور سفراء شریک تھے، طرابلس میں ہندستان کے سفیر مسٹر ارجن اسرانی نے بھی شرکت کی۔ اس قسم کی تقریب شرکاء موتمر میں راقم الحروف کے سوا اور کسی کے لئے منعقد نہیں کی گئی۔ دوسرے معززین کے علاوہ ڈاکٹر طاہر محمد الشویھدی (الامین العام للہیئۃ المشترکۃ لتاسیس المراکز الثقافیۃ الاسلامیہ) بھی اس موقع پر موجود تھے۔

طرابلس کا سوق المجمع (سپر بازار) دیکھا۔ اس طرح کے یہاں چار بازار ہیں، نئی دہلی کے سپر بازار کے مقابلہ میں یہاں کے سوق المجمع کی عمارت کافی زیادہ شاندار تھی۔ کئی منزلہ عمارت میں خودکار سیڑھیوں کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ حساب کتاب کرنے کے لئے جدید طرز کی درآمد شدہ مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ تاہم خریداری اور سامان کے اعتبار سے وہ نئی دہلی کے سپر بازار سے کم نظر آیا، اس فرق کے ساتھ کہ دہلی میں تمام سامان ملکی ہوتا ہے اور یہاں تمام سامان باہر سے درآمد کیا ہوا۔

طرابلس کا متحف (میوزیم) کافی بڑا ہے۔ مگر وہ ترکوں کے ایک قدیم قلعہ میں قائم کیا گیا ہے اس لئے عمارتی اعتبار سے اس میں وہ خوبیاں نہیں ہیں جو اس عمارت میں ہوتی ہیں جو خاص طور پر میوزیم کے مقصد سے بنائی گئی ہو۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کا میوزیم مقابلتہً کافی چھوٹا ہونے کے باوجود عمارتی اعتبار سے طرابلس کے میوزیم سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ایک ہندستانی عالم کے ساتھ عرب دنیا میں بعض اوقات یہ صورت حال پیش آتی ہے کہ وہ بظاہر عربی بولتا ہے مگر عرب اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ عربی لفظ کو اس کے اردو مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں رائج ہیں۔ اس لحاظ سے اردو دانی کو عربی دانی کے لئے کارآمد ہونا چاہئے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی کے اکثر الفاظ کے معنی اردو میں آکر بدل گئے ہیں۔

مثلاً اردو میں جس چیز کو ہم انقلاب کہتے ہیں، اس کے لئے عربی میں ثورہ کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں ثورہ کے معنی ریوولیوشن کے ہیں اس کے مقابلہ میں انقلاب کا لفظ اس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو انگریزی میں (Coup) کہتے ہیں۔ ہندستان کے ایک مصنف نے اپنی کتاب کا نام الاقدار الاسلامیہ رکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد اسلامک ویلوز ہے۔ مگر ویلو (Value) کے لئے عربی میں قیمت کا لفظ استعمال ہوتا ہے نہ کہ قدر کا۔ اگرچہ قیمت اور قدر دونوں ہی عربی الفاظ ہیں۔ تاہم عربی میں اس کو القیم الاسلامیہ کہیں گے نہ کہ الاقدار الاسلامیہ۔ وہ چیز جس کو اردو میں استحصال کہا جاتا ہے اس کے لئے عربی میں استغلال کا

لفظ استعمال ہوتا ہے، وغیرہ۔

اس سلسلہ میں دوسری مشکل تلفظ کی ہے۔ مثلاً موجودہ عرب القرق کا تلفظ گ سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اقول لاٹ دیں (میں آپ سے کہتا ہوں) کو اگل لاٹ بولیں گے۔ اسی طرح مثلاً وہ الاستقلال (آزادی) کو اس طرح بولتے ہیں کہ وہ الاستغلال سنائی دیتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسی صورت پیش آتی ہے کہ ہندستان کا ایک آدمی کسی لفظ کے معنی جانتے ہوئے عربوں کی گفتگو کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ کبھی لفظ کے دہرے مفہوم کی وجہ سے اور کبھی تلفظ کے فرق کی وجہ سے۔ اردو داں مسلمانوں کی انفرادیت پسندی کی یہ عجیب قیمت ہے جو ان کو خود مسلم دنیا میں دینی پڑتی ہے۔

۲۷ اگست کو لیبیا میں ہندستان کے سفیر مسٹر ارجن اسرانی سے ملاقات ہوئی۔ نہایت ذہین اور با اخلاق آدمی ہیں۔ بہت شریفانہ طور پر ملے اور اس کے بعد مزید تفصیلی ملاقات کی غرض سے ۲۹ اگست کو باصرار اپنے گھر پر کھانے کی دعوت کی۔ کھانے کی میز پر سفیر صاحب کے ساتھ جناب عبدالخالق دہلوی بھی تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک دلچسپ اور مفید گفتگو رہی۔ سفیر صاحب نے اسلامیات کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں نے چند پمفلٹ ان کی خدمت میں پیش کئے۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک تعلیم یافتہ عرب سے ہوئی۔ وہ ایک ملک میں اچھے عہدہ پر ہیں۔ ان کو میں جانتا تھا۔ مگر مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ہمارے مشن سے کس حد تک قریب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میری عربی کتابیں انھوں نے بار بار پڑھی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اردو کتابوں اور الرسالہ کے بہت سے مضامین کو ہندستانی یا پاکستانی عربی دانوں کے ذریعہ ترجمہ کرا کر سمجھا ہے۔ اب وہ ہمارے مشن کو پوری طرح پا گئے ہیں اور صدق صدا اس سے متفق ہیں۔

مذکورہ عرب بزرگ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے ملک میں لوگوں کا معاملہ آپ کے ساتھ کیا ہے۔ میں نے کچھ تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک طبقہ ہمارا سخت مخالف ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس پر تل گیا ہے کہ ہماری جڑ اکھاڑ کر اس مشن کا خاتمہ کر دے۔ یہ لوگ ہمارے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کر رہے ہیں۔ ہماری معاشیات کو برباد کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہم کو اتنا زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تنگ آکر اس مشن کو چھوڑ دیں۔

یہ سن کر عرب بزرگ بولے ——— آپ کا یہ اسلامی مشن بالآخر ایک تاریخ بننے والا ہے۔ پھر آئندہ بننے والی تاریخ میں یہ لوگ اپنا نام آخر کس خانہ میں لکھوانا چاہتے ہیں۔

دعا

دعا کا تصور عام لوگوں کے ذہن میں تقریباً وہی ہے جو عاملین کے یہاں پر اسرار کلمات کا ہوتا ہے۔ عامل یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں الفاظ کسی خاص ترتیب یا خاص تعداد میں زبان سے ادا کر دیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ فلاں صورت میں بر آمد ہوگا۔ اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ دعا الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام ہے جس میں خاص تاثیرات چھپی ہوئی ہیں۔ اگر آدمی دعا کے ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر دے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام تاثیرات لازماً ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔

مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی خاص قسم کے لفظی مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جو احساس احتیاج کے تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور پھر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔

قرآن میں بہت سے انبیاء اور صلحاء کی دعائیں مذکور ہیں (مثلاً حضرت موسیٰ کی دعا، اصحاب کہف کی دعا، امرأۃ فرعون کی دعا) یہ ثابت ہے کہ ان لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی۔ انبیاء کے متعلق قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ مختلف علاقوں میں آئے اور وہ جہاں آئے وہیں کی مقامی زبان میں کلام کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی دعا ان کی اپنی مادری زبان (مقامی زبان) میں ہوتی تھی نہ کہ عربی زبان میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ان کی دعا صرف معناً مذکور ہے نہ کہ لفظاً۔

اسی طرح حدیث میں بہت سے انبیاء کی دعائیں مذکور ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی یہ دعا جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو سکھائی:

اللّٰھم فارجَ الھم وکاشفَ الغم ومجیبَ دعوۃَ المضطرین رحمٰن الدنیا والآخرۃ رحیمَھُما انت ترحمُنی فارحمنی برحمۃٍ تُغنینی بھا عن رحمۃ مَن سواک (رواہ البزار والحاکم والاصبہانی)

اے غم کو دور کرنے والے اور مجبور کی پکار کو سننے والے، دنیا اور آخرت کے رحمان اور رحیم، تو ہی مجھ پر رحم کرتا ہے۔ مجھ پر ایسی رحمت کر جس کے بعد میں تیرے سوا دوسرے کی رحمت سے بے نیاز ہو جاؤں۔

ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کی زبان عربی نہیں تھی اس لیے یقینی طور پر یہ دعا انھوں نے اس زبان میں بتائی جو ان کی اور حواریوں کی پیدائشی زبان تھی۔ حدیث میں یہ دعا اگرچہ عربی زبان میں نقل ہوئی ہے مگر یہ نقل بالمعنی ہے نہ کہ نقل بالالفاظ۔

اسباق سیرت

قرآن میں اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر و ذکر اللہ کثیرا (الاحزاب ۲۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہر انسان کے لئے مکمل نمونہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ نمونہ صرف اس شخص کے لئے ہے جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والا ہو، جو اللہ اور آخرت کا امیدوار بن چکا ہو۔

گویا رسول کی زندگی کا نمونہ، پوری طرح موجود ہونے کے باوجود، اپنے آپ ہر آدمی کے لئے نمونہ نہیں بن جائے گا۔ وہ صرف اس بندۂ خدا کے لئے نمونہ بنے گا جس نے اللہ کو اتنی گہرائی کے ساتھ پایا ہو کہ وہ اس کی یادوں میں سما جائے۔ اللہ جس کی تمناؤں کا سرمایہ بن چکا ہو۔ جس کا حال یہ ہو کہ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرنے لگے اور آخرت کا انعام جس کی نظر میں اتنا اہم بن جائے کہ وہ دل و جان سے اس کا آرزومند ہو۔

رسول کے اسوۂ حسنہ کو پانے کے لئے یہ شرط کیوں لگائی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حقیقت کے ادراک کے لئے اس کے بارے میں سنجیدہ ہونا شرط لازم ہے۔ خدا اور آخرت سے مذکورہ قسم کا تعلق ہونا آدمی کو خدا اور آخرت کی باتوں میں سنجیدہ بناتا ہے۔ یہی سنجیدگی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو صحیح نظر سے دیکھے اور اس سے مطلوبہ سبق لے سکے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قتل دون مالہ فہو شہید۔ ومن قتل دون دمہ فہو شہید ومن قتل دون دینہ

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے خون کی حفاظت میں مارا جائے

فهو شهید۔ ومن قتل دون اھلہ فہو شہید
(ترمذی، نسائی، ابوداؤد)

وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے گھر والوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے، یہ حدیث "لڑنے" کے بارے میں نہیں ہے بلکہ "مارے جانے" کی صورت میں مومن کے انجام کو بتانے سے متعلق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ نہیں ہے کہ جب بھی کہیں کوئی مال یا خون یا دین یا اہل وعیال کا مسئلہ پیش آئے، تم فوراً لڑ جاؤ، خواہ اس کے نتیجہ میں ہی کیوں نہ ہو کہ تم قتل کر دئے جاؤ۔ بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ مذکورہ اسباب سے کوئی شخص مومن کو قتل کر دے تو اس کا قتل قتل نہیں بلکہ شہادت ہوگا۔ گویا یہ حدیث اصلاً لڑائی پر اکسانے کے لئے نہیں ہے بلکہ قتل کر دئے جانے کی صورت میں شہادت کا درجہ پانے سے متعلق ہے۔

اب جو شخص دین کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو، جس کو اپنے ذاتی ذوق کے لئے رسول اللہ کا جواز مطلوب ہو وہ بس حدیث کے الفاظ کو لے لے گا اور اپنے نفسانی جھگڑوں اور قومی لڑائیوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کو بطور دلیل پیش کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اسلام آدمی کو مردانگی کی تعلیم دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اپنے دین وایمان، جان ومال، زمین وجائداد، بیوی بچوں اور خویش واقارب کی حفاظت کے لئے لڑ جاؤ۔ اگر تم جیت گئے تو تم نے اپنا مقصد پالیا۔ اگر تم ہار گئے تو تم شہید ہوئے۔ اور شہادت وہ رتبہ بلند ہے جو خوش قسمت انسانوں ہی کو ملتا ہے۔

مگر جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو وہ اس کو نہایت سنجیدہ ہو کر دیکھے گا۔ اس کی سنجیدگی اس کو اس سوال تک پہنچائے گی کہ جب مال اور خون اور دین اور خاندان کے دفاع میں لڑنا مرنا مطلوب ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس قسم کی برعکس مثالیں کیوں ہیں کہ آپ بہت سے مواقع پر صریح ظلم کے باوجود صبر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

۱۔ مثال کے طور پر ابن ہشام نے ابوعثمان النہدی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

بلغنی ان صہیباً حین اراد الھجرۃ قال لہ کفار قریش اتیتنا صعلوکاً حقیراً فکثر مالک عندنا وبلغت الذی بلغت ثم ترید ان تخرج بمالک ونفسک، واللہ لا یکون ذلک۔ فقال

مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت صہیب نے جب مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے ان سے کہا کہ تم ہمارے یہاں آئے تو بالکل غریب تھے۔ پھر تمہارے پاس یہاں بہت مال ہو گیا اور تم اس درجہ کو

ثم صهيب ارأيتم ان جعلت لكم مالي اتخلون سبيلي۔ قالوا نعم۔ قال فاني جعلت لكم مالي۔ قال فبلغ ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ربح صهيب ربح صهيب۔
(سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۸۹)

پہنچے جس درجہ میں تم اب ہو۔ تم چاہتے ہو کہ اپنے جان ومال کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ تو خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ حضرت صہیب نے ان سے کہا، اگر میں اپنا مال تمھارے حوالے کردوں تو تم مجھ کو جانے دوگے۔ انھوں نے کہا، ہاں۔ حضرت صہیب نے کہا پھر میں نے اپنا مال تمھارے حوالے کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی۔

مذکورہ حدیث میں مال کے مقابلہ میں لڑکر جان دینا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہئے تھا کہ حضرت صہیب کو ناکامی کا الزام دیں نہ کہ انھیں کامیابی کا کریڈٹ عطا فرمائیں۔

۲۔ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے آگے بڑھ کر روکا۔ اس موقع پر فریقین کے درمیان صلح کی گفت وشنید ہورہی تھی کہ وہاں ابوجندل بن سہیل آگئے۔ انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس کی وجہ سے مکہ والے ان کو سخت تکلیفیں دے رہے تھے اور ان کے پیروں میں لوہے کی زنجیریں ڈال دی تھیں۔ انھوں نے جب سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب حدیبیہ میں ہیں تو وہ کسی طرح بھاگ کر مکہ سے حدیبیہ پہنچے۔ اس وقت بھی ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ان کا جسم خون آلود ہورہا تھا۔ ان کو دیکھ کر قریش کے سردار سہیل بن عمرو (ابوجندل کے والد) نے کہا کہ ابوجندل کو ہمیں واپس کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے بہت چاہا کہ انھیں دوبارہ مکہ نہ بھیجا جائے۔ مگر سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر آپ نے ابوجندل کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم آپ سے کسی طرح کی کوئی صلح نہیں کریں گے۔

یہ بڑا جذباتی لمحہ تھا۔ ابوجندل بیڑیوں میں خون آلود سامنے کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا: اے مسلمانو، کیا میں مشرکین کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا، حالانکہ میں اسلام قبول کرچکا ہوں۔ کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ ان لوگوں نے مجھے کس قدر عذاب پہنچایا ہے۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ کی طرف لوٹا دیا اور ان سے کہا:

یا ابا جندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا ومخرجا	اے ابو جندل، صبر کرو، اللہ تمھارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کرے گا۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام ۔الجزء الثالث، صفحہ ۳۶۷)

مذکورہ حدیث میں لڑنا اور شہید ہوجانا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر حضرت ابوجندل کو صبر و رضا کی نصیحت نہ فرماتے۔ بلکہ انھیں شہادت کا راستہ بتاتے اور خود بھی اپنے اصحاب سمیت قریش سے لڑ جاتے۔

۳۔ اسی حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ قریش نے آپ کو روکا اور کہا کہ ہم اس سال آپ کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ اس پر راضی ہوکر واپس مدینہ چلے آئے۔ اور عمرہ کے لئے مکہ جانے پر اصرار نہیں کیا۔ حالانکہ یہ خالص دینی معاملہ تھا اور آپ خدائی بشارت کی بنیاد پر اپنے اصحاب کو لے کر زیارت حرم کے لئے جارہے تھے۔ اگر مذکورہ حدیث میں دین کے لئے لڑکر شہید ہونا مطلق معنوں میں ہو تو آپ کو چاہئے تھا کہ اسی سال عمرہ کرنے کے لئے اصرار کریں، خواہ اس کے نتیجہ میں عمرہ ملے یا شہادت۔

۴۔ مکہ میں عمار بن یاسر اور ان کے والدین بنو مخزوم کے غلام تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اسلام میں داخل ہوگئے۔ بنو مخزوم کو ان کا اسلام لانا سخت ناپسند تھا۔ چنانچہ وہ ان کو عین دوپہر کے وقت صحرا میں لے جاتے اور تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر انھیں سخت عذاب دیتے۔ حتی کہ عمار کی والدہ کو انھوں نے قتل کردیا۔ ابن ہشام اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فیمر بھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقول فیما بلغنی: صبرًا آل یاسر موعدکم الجنۃ (الجزء الاول صفحہ ۳۴۲)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے اور جیسا کہ مجھے روایت پہنچی ہے ان سے کہتے: اے خاندان یاسر، صبر کرو، تمھارے لئے جنت کا وعدہ ہے۔

مذکورہ حدیث اگر مطلق معنوں میں ہو تو ایسا کہنا، نعوذ باللہ، بزدلی کی تعلیم دینا ہوگا۔ پھر تو آپ کو آل یاسر سے کہنا چاہئے تھا کہ تم لوگ لڑکر شہید ہوجاؤ اور خود بھی اس مقدس جنگ میں ان کے ساتھ شریک ہوجاتے۔ خواہ آل یاسر کو بچاسکیں یا اسی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کرلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوۂ رسول ان چیزوں میں سے ہے جن کی ایک سے زیادہ تعبیر ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسوۂ رسول کے معاملہ میں آدمی ہمیشہ صحیح تعبیر اور غلط تعبیر کے درمیان رہتا ہے۔ اور جو چیز کسی کو غلط تعبیر سے بچاتی ہے وہ صرف ایک ہے۔ یہ کہ خوف خدا نے آدمی کو حقیقت پسندی کی اس سطح پر پہنچا رکھا ہو جس کو سنجیدگی کہا جاتا ہے۔

آدمی اگر فی الواقع سنجیدہ ہو تو اس کی سنجیدگی اس کو اسوۂ رسول کے بارے میں مذکورہ سوالات سے دوچار کرے گی۔ اس کو چونکہ صرف مفید مطلب بات نہیں لینی تھی بلکہ یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقی طور پر اسوۂ نبوت کیا ہے۔ اس کا یہ ذہن اس کو غلط تعبیر سے بچائے گا۔ وہ بے آمیز ذہن کے تحت اس مسئلہ پر غور کرے گا اور خدا کی توفیق سے بات کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ اب اس کو معلوم ہوگا کہ اس کا راز ہے ——— بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا۔

اہل ایمان کے لئے سب سے اہم چیز دعوتی مصلحت ہے نہ کہ شخصی مصلحت۔ اگر دعوتی مصلحت اور شخصی مصلحت میں ٹکراؤ ہو تو شخصی مصلحت کو قربان کرکے دعوتی مصلحت کو حاصل کیا جائے گا۔ مذکورہ واقعات میں رسول کی طرف سے صبر کی تلقین کی وجہ یہی دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی کام کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے خدا کے رسول نے جان، مال اور خاندان کی قربانیاں برداشت کیں۔ حتیٰ کہ دشمنوں کی طرف سے "دین میں مداخلت" کو بھی وقتی طور پر گوارا کرلیا۔ تاکہ دعوت کا کام جاری رہے جو اہل ایمان کے لئے ہر قسم کی کامیابیوں کا واحد ذریعہ ہے۔

جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ مقصد کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ دوسرے تمام نقصانات کو نظر انداز کرتا رہتا ہے تاکہ اصل مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اور جب کوئی مقصد سامنے نہ رہے تو وہ ہر چیز میں الجھتا ہے۔ وہ ہر بات کے لئے دوسروں سے لڑتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ چھوٹے نقصان کو برداشت نہ کرنے کی بنا پر اس کو زیادہ بڑا نقصان برداشت کرنا پڑے ——— داعی اس دنیا کا سب سے زیادہ بامقصد انسان ہے، اس لئے وہ ہمیشہ پہلے رویہ کو اختیار کرتا ہے نہ کہ دوسرے رویہ کو۔ اس کلیہ سے مستثنیٰ صرف وہ امور ہیں جب کہ معاملہ خالص دفاعی ہو، اس کا دعوتی مقصد سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس تمہید کے بعد یہاں ہم مختلف پہلوؤں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ واقعات نقل کرتے ہیں جن میں ہماری زندگی کے لئے زبردست سبق اور نصیحت موجود ہے۔

بچّے کی بھلائی
عورت کا احترام
مُلک کی شان

ننھا پودا بنتا گلشن
کل کی جوانی آج کا بچپن
بچّے مُلک کا پاسدار ہے
اس پر مُستقبل کا بار ہے

نئے 20 نکاتی پروگرام کے تحت بچوں کی صحت، بھلائی اور مربُوط نشوونما کا ایک پروگرام چلایا جا رہا ہے۔

ماں بچے کو محض جنم ہی نہیں دیتی بلکہ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار بھی ہے۔ اس طرح وہ صحیح معنوں میں ملک کی معمار ہے۔

عورت اور بچوں کی فلاح پر ہی ملک کی بہبودی اور تحفّظ کا انحصار ہے۔ اس لیئے بچوں کی بھلائی اور عورت کی وقر و احترام کے لئے اس پروگرام میں ایک نئی روح پھونکی جا رہی ہے۔

بچّے کو پُر غذا خوراک تبھی میسّر ہوگی
جب کُنبہ مختصر ہو

davp 81/449

تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کیجئے:۔

ڈپٹی ڈائریکٹر،
ماس میلنگ یونٹ،
ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژوئل پبلسٹی،
"ٹی" بلاک، کستوربا گاندھی مارگ،
نئی دہلی 110001
نئے 20 نکاتی پروگرام کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے براہ کرم مجھے اردو/ہندی/انگریزی میں کتابچے روانہ کریں۔

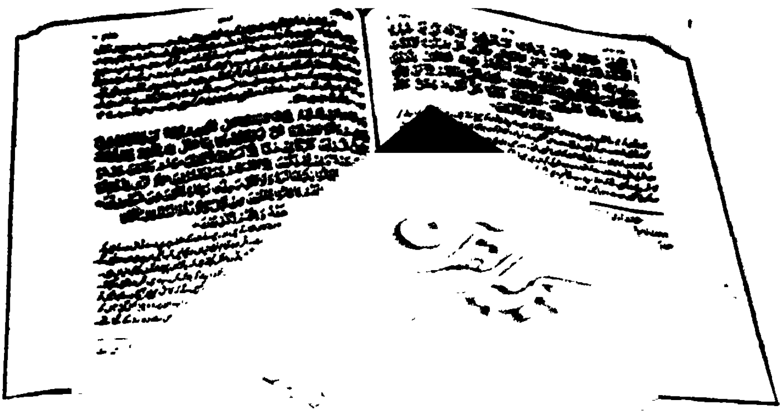
نام ____________________

پتہ ____________________

____

____________________ پن کوڈ نمبر ________

نیا 20 نکاتی پروگرام



تذکیر القرآن

جلد اوّل — سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ ۔ قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. R.N No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

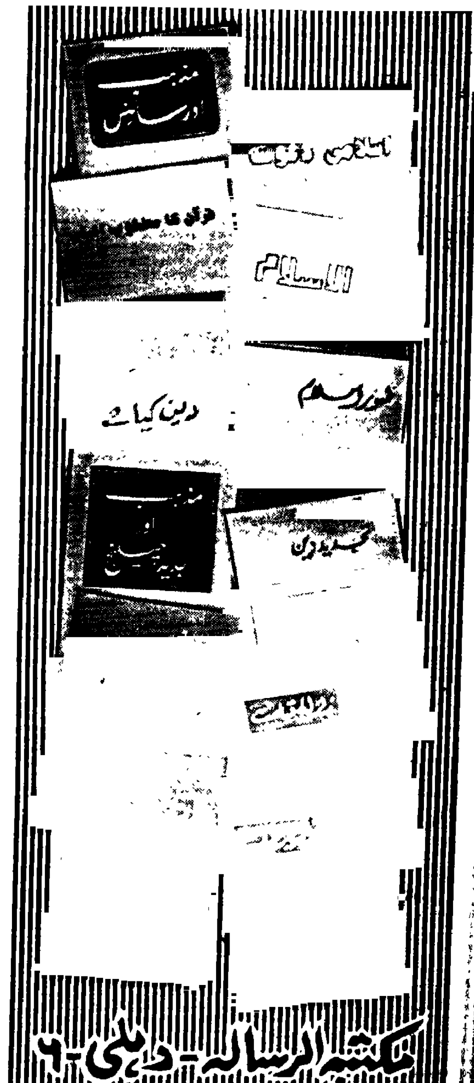
January 1983
Issue No.. 74

AL-RISALA MONTHLY
Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

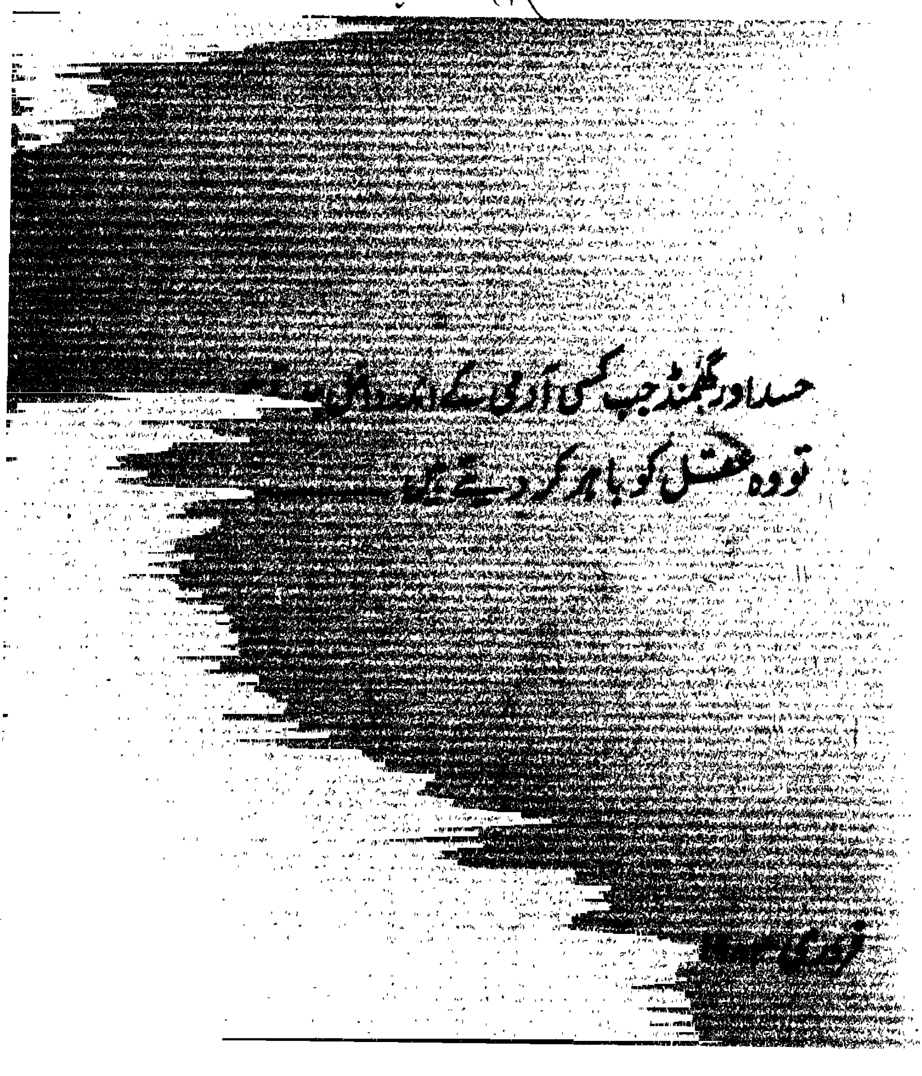
مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱. تذکیر القرآن — ۵۰—۰
۲. الاسلام — ۱۵—۰
۳. مذہب اور جدید چیلنج — ۱۵—۰
۴. ظہور اسلام — ۱۵—۰
۵. دین کیا ہے ؟ — ۲—۰
۶. قرآن کا مطلوب انسان — ۵—۰
۷. تجدید دین — ۳—۰
۸. اسلام دین فطرت — ۳—۰
۹. تعمیر ملت — ۳—۰
۱۰. تاریخ کا سبق — ۳—۰
۱۱. مذہب اور سائنس — ۵—۰
۱۲. عقلیات اسلام — ۳—۰
۱۳. فسادات کا مسئلہ — ۲—۰
۱۴. انسان اپنے آپ کو پہچان — ۱—۰
۱۵. تعارف اسلام — ۲—۵۰
۱۶. اسلام پندرھویں صدی میں — ۲—۰
۱۷. راہیں بند نہیں — ۳—۰
۱۸. دینی تعلیم — ۳—۰
۱۹. ایمانی طاقت — ۳—۰
۲۰. اتحاد ملت — ۳—۰
۲۱. سبق آموز واقعات — ۳—۰
۲۲. اسلامی دعوت — ۳—۰
۲۳. زلزلۂ قیامت — ۴—۰
۲۴. سچا راستہ — ۱—۰
۲۵. نار جہنم — ۳—۰
۲۶. باغ جنت — ۳—۰



الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان



اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

فروری ۱۹۸۳
شمارہ ۷۵

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے

۱۔ سچا راستہ	ایک روپیہ پچاس پیسے
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	دو روپیہ پچاس پیسے
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سیٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک ۲۰ ڈالر امریکی

حکم آنے کے بعد

شراب اور جوا اسلام میں حرام ہیں۔ مگر ان کے بارے میں احکام بتدریج اتارے گئے۔ شروع میں یہ آیت اتری کہ شراب اور جوا گناہ کے فعل ہیں، اگرچہ اس میں لوگوں کے لئے کچھ ظاہری فائدے بھی ہیں (البقرہ ۲۱۹)

اس وقت عرب کے لوگ جوئے اور شراب کے عادی تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ انھیں صاف لفظوں میں منع نہیں کیا گیا ہے تو یہ کہہ کر بدستور ان میں مشغول رہے کہ یہ دونوں چیزیں ہم پر حرام نہیں کی گئی ہیں۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ان میں گناہ ہے اور کچھ فائدہ بھی (فقال الناس ما حرما علینا، انما قال: فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ)

اس کے بعد سورہ مائدہ میں صاف حکم اترا کہ شراب اور جوا گندی چیزیں ہیں اور شیطانی فعل ہیں، تم ان سے بچو۔ یہ حکم دیتے ہوئے جب قرآن میں یہ الفاظ آئے کہ فهل انتم منتهون (کیا تم ان سے باز آؤ گے) تو صحابہ کرام بول اٹھے: انتهينا ربنا، انتهينا ربنا (اے ہمارے رب ہم باز آئے، اے ہمارے رب ہم باز آئے)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو اسے سنایا۔ وہ شراب پیتا تھا اور اس کے گھر میں شراب موجود تھی۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یافلان اما علمت ان اللہ حرمها۔ فاقبل الرجل علی غلامه فقال اذهب فبعها۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یافلان بماذا امرته۔ فقال امرته ان یبیعها۔ قال ان الذی حرم شربها حرم بیعها فامربها فافرغت فی البطحاء (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے شخص، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے شراب کو حرام کر دیا ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے اپنے لڑکے سے کہا کہ جاؤ شراب کو بیچ دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے شخص تم نے اپنے لڑکے کو کیا حکم دیا ہے۔ آدمی نے کہا میں نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ شراب کو بیچ لے۔ آپ نے

فرمایا جس چیز کا پینا حرام ہے اس کا بیچنا بھی حرام ہے
اس کے بعد اس نے حکم دیا اور اس کی شراب بطحائے میں
بہا دی گئی

مومن کے اندر بھی وہی جذبات ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہوتے ہیں۔ کبھی خواہش کے زیر اثر وہ لفظی تاویل کرتا ہے، کبھی اس کے اوپر مال کی محبت غالب آ جاتی ہے۔ مگر یہ سب اسی وقت تک ہے جب تک خدا کا حکم اس کے سامنے نہ آئے۔ خدا کا واضح حکم سامنے آتے ہی وہ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لفظی تاویلوں کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مال یا کسی دوسری چیز کی محبت کو بھی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ نہیں ہے کہ وہ فرشتہ ہونے کا ثبوت دے۔ یعنی کبھی کوئی غلطی نہ کرے اور نہ کبھی کوئی برا خیال اس کے دل میں آئے۔ اس قسم کی پارسائی فرشتوں سے مطلوب ہے نہ کہ انسان سے۔ انسان سے اس کے رب کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ تنبیہہ کے بعد غلطی پر اصرار نہ کرے۔

انسان کو جن جذبات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور جس قسم کی دنیا میں اس کو رکھا گیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دل میں غلط خیالات آئیں گے۔ وہ غلط باتیں سوچے گا اور عملاً بھی غلط کام کر گزرے گا۔ مگر اس قسم کی کسی غلطی کو وقتی غلطی ہونا چاہئے نہ کہ مستقل۔ جب بھی آدمی کا ضمیر ٹوکے یا کوئی خارجی آواز اس کی غلطی پر اس کو متنبہ کرے تو اس وقت اس کو ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے سیدھے طریقہ پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہئے اور فوراً اپنی اصلاح کی کوشش میں لگ جانا چاہئے۔

انسان کا کمال غلطی کر کے دوبارہ پلٹ آنے میں ہے نہ کہ سرے سے غلطی نہ کرنے میں۔ غلطی ہو جانا جرم نہیں ہے۔ بلکہ غلطی پر قائم رہنا جرم ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جنت ان متقیوں کے لئے ہے جن کا حال یہ ہو کہ جب وہ کوئی برائی کر بیٹھیں یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر ڈالیں تو وہ اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ جانتے ہوئے اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے (آل عمران ۱۳۵)

کیسا عجیب

گاندھی جی کی مشہور شاگرد میرا بہن ایک انگریز خاتون تھیں، جن کا اصل خاندانی نام میڈیلین سلیڈ (Madeleine Slade) تھا۔ وہ سر ایڈمنڈ سلیڈ کی لڑکی تھیں۔ ان کو اپنے لئے ایک "زندہ خدا" کی تلاش تھی۔ ابتداءً انھوں نے مشہور موسیقار بیتھوون میں اپنی اس تلاش کا جواب پایا۔ تاہم ان کی فطرت اس پر پوری طرح مطمئن نہ تھی۔ اس کے بعد ان کی ملاقات مشہور فرانسیسی مفکر رولینڈ رولاں سے ہوئی۔ رولینڈ رولاں گاندھی جی سے بہت متاثر تھا۔ اس نے مس سلیڈ سے کہا "کیا تم نے گاندھی جی کے بارے میں نہیں سنا" مس سلیڈ نے کہا۔ "نہیں" رولینڈ رولاں نے کہا "وہ دوسرے مسیح ہیں"۔

He is another Christ

اس کے بعد مس سلیڈ نے مہاتما گاندھی کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی اتنی گرویدہ ہوئیں کہ اپنا وطن چھوڑ کر مستقل طور پر ہندستان آنے کے لئے تیار ہوگئیں۔

یہ ۱۹۲۴ کا واقعہ ہے۔ مس سلیڈ نے سمندری جہاز پر اپنے لئے ایک برتھ رزرو کی تاکہ وہ جلد سے جلد ہندستان پہنچ سکیں۔ اس کے بعد اچانک انھیں خیال آیا کہ میں گاندھی جی کے ملک میں جارہی ہوں مگر میں گاندھی جی کے ملک کی زبان نہیں جانتی۔ انھوں نے ہندستان کی زبان کے بارے میں معلومات کیں تو انھیں بتایا گیا کہ ہندستان کی عام زبان اردو ہے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان سیکھنے کے لئے اپنے سفر ہند کو ایک سال کے لئے ملتوی کردیا۔ وہ اس سے پہلے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں جانتی تھیں، انھوں نے دوبارہ محنت کرکے اردو سیکھی اور پھر ۱۹۲۵ میں ہندستان آئیں۔

گیٹا سرینی (Gitta Sereny) نے میرا بہن (سابق مس میڈیلین سلیڈ) کے حالات لکھے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ دسمبر ۱۹۸۲) انھوں نے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

In the fall of 1924, four months into her training included learning Urdu and converting to vegetarianism.

۱۹۲۴ کی موسم خزاں کے چار مہینے مس سلیڈ کے لئے تربیتی مہینے تھے، ان میں اس نے اردو زبان سیکھی اور اپنے آپ کو سبزی خوری کا عادی بنایا ——— پچاس سال پہلے ملک کی عام زبان اردو تھی۔ یہ دین کی عمومی اشاعت کا بہت بڑا موقع تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں نے لایعنی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے یہ موقع ان سے چھین لیا۔ اب اردو کے ذریعہ یہاں نہ سیاست کا کام کیا جا سکتا ہے اور نہ اشاعت دین کا۔

حقیقت کی تلاش

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی ۶

مطبوعات اسلامی مرکز

سال اشاعت ۱۹۸۳

قیمت تین روپے

ناشر مکتبہ الرسالہ
جمعیتہ بلڈنگ
قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

طابع جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے ستمبر ۱۹۵۸ میں اسلامی تقریروں کا ایک ہفتہ منایا گیا جس میں مختلف علماء اور مفکرین نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں کیں۔ اس سلسلہ کا عنوان تھا ـــــــــــــ سلسلۂ تقاریر اسلام،

Series of lectures on Islam

اس موقع پر راقم الحروف نے ۶ ستمبر ۱۹۵۸ کو یونیورسٹی کے یونین ہال میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر بعد کو اردو میں "حقیقت کی تلاش" اور عربی میں "الفحص عن الحق" کے نام سے شائع ہوئی۔ زیر نظر کتاب اسی تقریر کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔

مکتبہ الرسالہ کی طرف سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے کچھ علمی اسلوب میں ہیں اور کچھ سادہ اسلوب میں۔ زیر نظر کتاب سادہ اسلوب والی کتابوں کی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔ اس کو اسلام کے عمومی تعارف کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وحید الدین

۵ دسمبر ۱۹۸۲ء

حقیقت کی تلاش

کائنات ایک بہت بڑی کتاب کی مانند ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے مگر یہ ایک ایسی انوکھی کتاب ہے جس کے کسی صفحے پر اس کا موضوع اور اس کے مصنف کا نام تحریر نہیں، اگرچہ اس کتاب کا ایک ایک حرف بول رہا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہوسکتا ہے اور اس کا مصنف کون ہے۔

جب کوئی شخص آنکھ کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ ایک وسیع و عریض کائنات کے درمیان کھڑا ہے تو بالکل قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ ــــ "میں کیا ہوں اور یہ کائنات کیا ہے" وہ اپنے آپ کو اور کائنات کو سمجھنے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ اپنی فطرت میں سموئے ہوئے اشارات کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا میں وہ جن حالات سے دوچار ہو رہا ہے، چاہتا ہے کہ ان کے حقیقی اسباب معلوم کرے۔ غرض اس کے ذہن میں بہت سے سوالات اٹھتے ہیں جن کا جواب معلوم کرنے کے لئے وہ بے قرار ہوتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ ان کا جواب کیا ہے۔

یہ سوالات محض فلسفیانہ قسم کے سوالات نہیں ہیں بلکہ یہ انسان کی فطرت اور اس کے حالات کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن سے دنیا میں تقریباً ہر شخص کو ایک بار گزرنا ہوتا ہے۔ جن کا جواب نہ پانے کی صورت میں کوئی پاگل ہوجاتا ہے، کوئی خودکشی کرلیتا ہے، کسی کی ساری زندگی بے چینیوں میں گذر جاتی ہے، اور کوئی اپنے حقیقی سوال کا جواب نہ پاکر نشہ آور چیزوں یا ظاہر فریب تماشوں میں کھوجاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان میں گم ہوکر اس ذہنی پریشانی سے نجات حاصل کرے وہ جو کچھ حاصل کرسکتا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں اس کو بھلادیتا ہے جس کو وہ حاصل نہ کرسکا۔

اس سوال کو ہم ایک لفظ میں "حقیقت کی تلاش" لکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کریں تو یہ بہت سے سوالات کا مجموعہ نکلے گا۔ یہ سوالات کیا ہیں ان کو مختلف الفاظ میں ظاہر کیا جاسکتا ہے مگر میں آسانی کے لئے ان کو مندرجہ ذیل تین عنوانات کے تحت بیان کروں گا۔

۱۔ خالق کی تلاش

۲۔ معبود کی تلاش

۳۔ اپنے انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش دراصل نام ہے ان ہی تینوں سوالات کا جواب معلوم کرنے کا۔ آپ خواہ جن الفاظ میں بھی اس سوال کی تشریح کریں مگر "حقیقت" وہ اسی کی بدلی ہوئی تعبیر ہوگی اور ان ہی تین عنوانات کے تحت انھیں اکٹھا کیا جاسکے گا۔

بظاہر یہ سوالات ایسے ہیں جن کے بارہ میں ہم کچھ نہیں جانتے، اور نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے جہاں ان کا جواب لکھ کر رکھ دیا گیا ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو سوال ہے اسی کے اندر اس کا جواب موجود ہے۔ کائنات اپنی حقیقت کی طرف آپ اشارہ کرتی ہے، اگرچہ وہ ہم کو یقینی علم تک نہیں لے جاتی۔ لیکن یہ اشارہ اتنا واضح اور قطعی ہے کہ اگر ہم کو کسی ذریعہ سے حقیقت کا علم حاصل ہو جائے تو ہمارا ذہن پکار اٹھتا ہے کہ یقیناً یہی حقیقت ہے، اس کے سوا کائنات کی کوئی اور حقیقت نہیں ہو سکتی۔

خالق کی تلاش

کائنات کو دیکھتے ہی جو سب سے پہلا سوال ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ اس کا بنانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو چلا رہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی اَن دیکھی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں۔ ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب بھی بہت سے لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر علمی دنیا میں عام طور پر اب یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔ آج یہ ایک مردہ نظریہ ہے نہ کہ زندہ نظریہ۔ موجودہ زمانہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں۔ وہ شرک کے بجائے الحاد کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے

تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آئیں گے۔ اس طرح اسباب و واقعات کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلۂ اسباب ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک اتفاق اور دوسرے قانون علت (Law of Causation)

یہ توجیہ بتاتی ہے کہ اب سے تقریباً دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال) پہلے کائنات کا وجود نہ تھا اس وقت ستارے تھے اور نہ سیارے، مگر فضا میں مادہ موجود تھا۔ یہ مادہ اس وقت جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا، بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ گویا انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا، اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ ریاضی کے نقطۂ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا بھی خلل ڈال دے تو پھر یہ قائم نہیں رہ سکتا، یہ خلل بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اگر اس ابتدائی خلل کو مان لیجئے تو ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد کے تمام واقعات علم ریاضی کے ذریعہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مادے کے اس بادل میں خفیف سا خلل واقع ہوا جیسے کسی حوض کے پانی کو کوئی ہاتھ ڈال کر ہلا دے۔ کائنات کی پرسکون دنیا میں یہ اضطراب کس نے پیدا کیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ لیکن خلل ہوا اور یہ خلل بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے سیارے اور سحابیئے کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدر بودی اور کمزور توجیہ ہے کہ خود سائنس دانوں کو بھی اس پر کبھی شرح صدر حاصل نہ ہو سکا۔ یہ توجیہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی مگر اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کائنات کے محرکِ اول کو معلوم کر لیا ہے، اور اس محرکِ اول کا نام اس کے نزدیک اتفاق ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا، اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب و غریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی۔ جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادہ کے باہر۔ وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے۔ اس توجیہ کا یہ نہایت دل چسپ تضاد ہے کہ وہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے مگر اس توجیہ کی ابتدا ایک ایسے واقعہ

سے ہوتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں ۔ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پر کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔

پھر یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انہوں نے اختیار کیا۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔ مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے اور حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔

آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کر دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظامِ شمسی کو وجود دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس سے ہمارے کرۂ زمین پر وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک کائنات کی بیشمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں بھی معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جو ایک خاص مرحلہ پر بے جان مادہ سے جاندار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لئے درکار تھیں، پھر وہ کون سی منطق ہے جو ان حالات کو ہمارے لئے باقی رکھے ہوتے ہے۔ کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسنِ ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک ان کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آنے والے واقعہ میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی اور اتنے عجیب و غریب طریقہ پر مسلسل ارتقاء کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہو گیا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ اس کا چلانے والا کون ہے۔ وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظم طریقہ پر حرکت دے

رہا ہے۔ اس توجیہ میں جس کو کائنات کا خالق قرار دیا گیا ہے اسی کو کائنات کا حاکم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ توجیہ علت اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے۔ کیوں کہ حرکتِ اول کی توجیہ کے لئے تو اتفاق کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اس کے بعد کی مسلسل حرکت کو کسی حال میں بھی اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی توجیہ کے لئے دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اصول تعلیل (Principle of Causation) پیش کیا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ جس صورت میں تاریخ عالم کا آغاز ہوا، اس نے آئندہ سلسلۂ واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ جب ابتدائی صورت ایک دفعہ معین ہو گئی تو قدرت صرف ایک ہی طریق سے منزل مقصود تک پہنچ سکتی تھی۔ گویا کائنات جس روز پیدا ہوئی اس کی آئندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی ہے۔

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آگئی۔ یہ زمانہ سائنس داں انجینیروں کا تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں۔ اسی زمانہ میں ہیلم ہولٹز (Helm Holtz) نے کہا تھا کہ تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر لینا ہے۔ اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنسدانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی مگر ان کا یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں ہو سکتی ہے وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا۔

ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ اصول تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت

کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے اختیار انسانی پر یقین کرنا محال بنا دیا، کیوں کہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی اس سے کیوں مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔ اس طرز فکر کے نتیجہ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے میکانکی فلسفے وجود میں آئے جب یہ دریافت ہوا کہ (Living Cell) جاندار خلیہ بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزا جن سے ہمارے جسم و دماغ بنے ہوئے ہیں کیوں کر اصول تعلیل کے دائرہ سے باہر ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ گمان کیا گیا بلکہ بڑے جوش کے ساتھ دعویٰ کر دیا گیا کہ زندگی بھی ایک خالص مشین ہے یہاں تک کہا گیا کہ نیوٹن، باخ (Bach) اور مائیکل انجلو (Michel Angelo) کے دماغ کسی پرنٹنگ مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔

مگر سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصول علیت کی اب قائل نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت اصول تعلیل کو دھوکے (Elusion) کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر ہی میں سائنس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر، بالخصوص روشنی اور قوت کشش، میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا ایسی مشین بنائی جا سکتی ہے جو نیوٹن کے افکار، باخ کے جذبات اور مائیکل انجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے مگر سائنس دانوں کو بڑی تیزی سے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شمع کی روشنی اور سیب کا گرنا کوئی مشین نہیں دہرا سکتی۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو اول روز سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لئے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پر اس کے مستقبل کا سبب نہیں ہے جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (Non-mechanical Reality) کی طرف لئے جا رہا ہے۔

کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارہ میں یہ دونوں نظریئے جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اس نظریہ کی تردید کر رہی ہے، اب انسان دوبارہ اسی منزل پر پہونچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا

نیا سفر شروع کیا تھا۔

معبود کی تلاش

یہ خالق کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ اس کے بعد دوسری چیز جو انسان جاننا چاہتا ہے وہ یہ کہ "میرا معبود کون ہے" ہم اپنی زندگی میں صریح طور پر ایک خلا محسوس کرتے ہیں مگر ہم نہیں جانتے کہ اس خلا کو کیسے پر کریں۔ یہی خلا کا احساس ہے جس کو میں نے "معبود کی تلاش" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ احساس دو پہلوؤں سے ہوتا ہے۔

اپنے وجود اور باہر کی دنیا پر جب ہم غور کرتے ہیں تو دو نہایت شدید جذبے ہمارے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا شکر اور احسان مندی کا اور دوسرا کمزوری اور عجز کا۔

ہم اپنی زندگی کے جس گوشہ میں بھی نظر ڈالتے ہیں ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ ہماری زندگی کسی کے احسانات سے ڈھکی ہوئی ہے یہ دیکھ کر دینے والے کے لئے ہمارے اندر بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بہترین عقیدتوں کو اپنے محسن پر قربان کرسکیں۔ یہ تلاش ہمارے لئے محض ایک فلسفیانہ نوعیت کی چیز نہیں ہے بلکہ ہماری نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ہے یہ سوال محض ایک خارجی مسئلہ کو حل کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ ہماری ایک اندرونی طلب ہے اور ہمارا پورا وجود اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے۔

غور کیجئے، کیا کوئی شریف آدمی اس حقیقت کو نظر انداز کرسکتا ہے کہ وہ کائنات میں ایک مستقل واقعہ کی حیثیت سے موجود ہے حالانکہ اس میں اس کی اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسے جسم میں پا رہا ہے جس سے بہتر جسم کا وہ تصور نہیں کرسکتا حالانکہ اس جسم کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ اس کو ایسی عجیب و غریب قسم کی ذہنی قوتیں حاصل ہیں جو کسی بھی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئی ہیں حالانکہ ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے اور نہ وہ کچھ کرسکتا ہے۔ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ عطیہ ہے۔ یہ عطیہ کس نے دیا ہے، انسانی فطرت اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے اس عظیم محسن کا شکر ادا کرسکے۔

پھر اپنے جسم کے باہر دیکھئے۔ دنیا میں ہم اس حال میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا، نہ ہم کو کائنات کے اوپر کوئی اختیار حاصل ہے کہ ہم اس کو اپنی ضرورت

کے مطابق بنا سکیں۔ ہماری ہزاروں ضرورتیں ہیں۔ مگر کسی ایک ضرورت کو بھی ہم خود سے پورا نہیں کر سکتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں حیرت انگیز طور پر ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس بات کی منتظر ہے کہ انسان پیدا ہو اور وہ اس کی خدمت میں لگ جائے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجئے جس کے ذریعہ سے ہم اپنا خیال دوسروں تک پہونچاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات زبان کا ارتعاش بن کر دوسرے کے کان تک پہونچیں اور وہ ان کو قابل فہم آوازوں کی صورت میں سن سکے۔ اس کے لئے ہمارے اندر اور باہر بیشمار انتظامات کئے گئے ہیں جن میں سے ایک وہ درمیانی واسطہ ہے جس کو ہم ہوا کہتے ہیں۔ ہم جو الفاظ بولتے ہیں وہ بے آواز لہروں کی صورت میں ہوا پر اسی طرح سفر کرتے ہیں جس طرح پانی کی سطح پر موجیں پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میرے منہ سے نکلی ہوئی آواز کے آپ تک پہونچنے کے لئے درمیان میں ہوا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ درمیانی واسطہ نہ ہو تو آپ میرے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھیں گے مگر میری آواز نہ سنیں گے۔ مثال کے طور پر ایک بند فانوس کے اندر برقی گھنٹی رکھ کر اسے بجایا جائے تو اس کی آواز صاف سنائی دے گی۔ لیکن اگر فانوس کے اندر کی ہوا کو پوری طرح نکال دیا جائے اور اس کے بعد گھنٹی بجائی جائے تو آپ شیشہ کے اندر گھنٹی کو بجتا ہوا دیکھیں گے مگر اس کی آواز بالکل سنائی نہ دے گی۔ کیوں کہ گھنٹی کے بجنے سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس کو قبول کر کے آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لئے فانوس کے اندر ہوا موجود نہیں ہے۔

مگر یہ ذریعہ بھی ناکافی ہے کیونکہ ہوا کے ذریعہ ہماری آواز پانچ سکنڈ میں صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہوا کا ذریعہ صرف قریبی ماحول میں گفتگو کے لئے کار آمد ہے، وہ ہماری آواز کو دور تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر آواز صرف ہوا کے ذریعہ پھیلتی تو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ مگر قدرت نے اس کے لئے ہمیں ایک اور انتہائی تیز رفتار ذریعہ مہیا کیا ہے، یہ روشنی یا برقی رو ہے جس کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ لاسلکی پیغامات میں اسی ذریعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی مقرر ریڈیو اسٹیشن میں لگے ہوئے مائکروفون کے قریب آواز نکالتا ہے تو مائکروفون آواز کو جذب کر کے اسے برقی رو میں تبدیل کر دیتا ہے اور تار کے ذریعہ اس کو آلہ نشریا ٹرانس میٹر تک بھیج دیتا ہے۔

آلات نشر آواز کے پہونچتے ہی مرتعش ہو کر فضا میں وہی ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح پانچ سکنڈ میں ایک میل چلنے والی آواز برقی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک سکنڈ میں دو لاکھ میل کی رفتار حاصل کر لیتی ہے۔ اور دم بھر میں ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یہی لاسلکی موجیں ہیں جن کو ہمارے ریڈیو سٹ کی آواز گیر مشین قبول کر کے بلند آواز میں ان کا اعادہ کر دیتی ہے اور پھر ہزاروں میل دور بولی ہوئی آواز کو ہم کسی تاخیر کے بغیر سننے لگتے ہیں۔

یہ ان بیشمار انتظامات میں سے ایک ہے جس کو میں نے بیان نہیں کیا ہے بلکہ اس کا صرف نام لیا ہے۔ اگر اس کا اور دوسری چیزوں کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو اس کے لئے کروروں صفحے درکار ہوں گے اور پھر بھی ان کا بیان ختم نہ ہوگا۔

یہ عطیات جن سے ہر آن آدمی دوچار ہو رہا ہے اور جن کے بغیر اس زمین پر انسانی زندگی اور تمدن کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا، انسان جاننا چاہتا ہے کہ یہ سب کس نے اس کے لئے مہیا کیا ہے ہر آن جب وہ کسی نعمت سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو پائے اور اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دے۔ محسن کے احسانات کو ماننا، اس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا اور اس کی خدمت میں اپنے بہترین جذبات کو نذر کرنا یہ انسانی فطرت کا شریف ترین جذبہ ہے۔ ہر آدمی جو اپنی زندگی اور کائنات پر غور کرتا ہے اس کے اندر نہایت شدت سے یہ جذبہ ابھرتا ہے۔ پھر کیا اس جذبہ کا کوئی جواب نہیں۔ کیا انسان اس کائنات کے اندر ایک یتیم بچہ ہے جس کے اندر امنڈتے ہوئے جذبات محبت کی تسکین کے لئے کوئی ہستی موجود نہ ہو۔ کیا یہ ایک ایسی کائنات ہے جہاں احسانات ہیں مگر محسن کا پتہ نہیں جہاں جذبہ ہے مگر جذبہ کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہیں۔

یہ معبود کی تلاش کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کے حالات فطری طور پر تقاضا کرتے ہیں کہ کائنات کے اندر اس کا کوئی سہارا ہو۔ اگر ہم آنکھ کھول کر دیکھیں تو ہم اس دنیا میں ایک انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہیں۔ ذرا اس خلا کا تصور کیجئے جس میں ہماری یہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کی گولائی تقریباً ۲۵ ہزار میل ہے۔ اور وہ ناچتے ہوئے لٹو کے مانند اپنے محور پر مسلسل اس طرح گھوم رہی ہے کہ ہر ۲۴ گھنٹے میں ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی رفتار تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ سورج کے چاروں طرف اٹھارہ کرور ساٹھ لاکھ میل کے لمبے دائرہ میں نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہے۔

خلا کے اندر اس قدر تیز دوڑتی ہوئی زمین پر ہمارا وجود قائم رکھنے کے لئے زمین کی رفتار کو ایک خاص اندازہ کے مطابق رکھا گیا ہے اگر ایسا نہ ہو تو زمین کے اوپر انسان کی حالت ان سنگ ریزوں کی مانند ہو جائے جو کسی متحرک پہیہ پر رکھ دیئے گئے ہوں، اسی کے ساتھ مزید انتظام یہ ہے کہ زمین کی کشش ہم کو کھینچے ہوئے ہے اور اوپر سے ہوا کا زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑ رہا ہے وہ جسم کے ہر مربع انچ پر پندرہ پونڈ تک معلوم کیا گیا ہے یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ۔ ان حیرت انگیز انتظامات نے ہم کو خلا میں مسلسل دوڑتی ہوئی زمین کے چاروں طرف قائم کر رکھا ہے۔

پھر ذرا سورج پر غور کیجئے۔ سورج کی جسامت آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج آگ کا دہکتا ہوا سمندر ہے جس کے قریب کوئی بھی چیز ٹھوس حالت میں نہیں رہ سکتی۔ زمین اور سورج کے درمیان اس وقت تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے، اگر اس کے بجائے وہ اس کے نصف فاصلہ پر ہو تو سورج کی گرمی سے چیزیں جلنے لگیں۔ اور اگر وہ چاند کی جگہ یعنی دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر آجائے تو زمین پگھل کر بخارات میں تبدیل ہو جائے۔ یہی سورج ہے جس سے زمین پر زندگی کے تمام مظاہر قائم ہیں۔ اس مقصد کے لئے اس کو ایک خاص فاصلہ پر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ دوچلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے اور اگر قریب آجائے تو ہم سب لوگ جل بھن کر خاک ہو جائیں۔

پھر ذرا اس کائنات کی وسعت کو دیکھئے اور اس قوتِ کشش پر غور کیجئے جو اس عظیم کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کائنات ایک بے انتہا وسیع کارخانہ ہے، اس کی وسعت کا اندازہ ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ ہے کہ روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے اس کو کائنات کے گرد ایک چکر طے کرنے میں کئی ارب برس درکار ہوں گے۔ یہ نظام شمسی جس کے اندر ہماری زمین ہے، بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے مگر پوری کائنات کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اس سے بہت بڑے بڑے بے شمار ستارے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں بہت سے اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا پورا نظام شمسی اس کے اوپر رکھا جا سکتا ہے۔ جو قوت کشش ان بیشمار دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کی عظمت کا تصور اس سے کیجئے کہ سورج جس بے پناہ طاقت سے زمین کو

اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کو وسیع ترین فضا میں گر کر برباد ہو جانے سے روکتا ہے، یا یہ غیر مرئی طاقت اس قدر قوی ہے کہ اگر اس مقصد کے لئے کسی مادی شے سے زمین کو باندھنا پڑتا تو جس طرح گھاس کی پتیاں زمین کو ڈھانکے ہوئے ہیں، اسی طرح دھاتی تاروں سے کرۂ ارض ڈھک جاتا۔

ہماری زندگی بالکلیہ ایسی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہے جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں. انسان کی زندگی کے لئے دنیا میں جو انتظامات ہیں اور جن کی موجودگی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، وہ اتنے بلند پیمانہ پر ہو رہے ہیں اور ان کو وجود میں لانے کے لئے اتنی غیر معمولی قوت تصرف درکار ہے کہ انسان خود سے انھیں وجود میں لانے کا تصور نہیں کر سکتا موجودات کے لئے جو طریق عمل مقرر کیا گیا ہے، اس کا مقرر کرنا تو درکنار اس پر کنٹرول کرنا بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگر کائنات کی غیر معمولی قوتیں میرے ساتھ ہم آہنگی نہ کریں تو میں زمین پر ٹھہر بھی نہیں سکتا، اس کے اوپر ایک متمدن زندگی کی تعمیر تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسی ایک کائنات کے اندر جب انسان اپنے حقیر وجود کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ بے بس محسوس کرنے لگتا ہے جتنا کہ سمندر کی موجوں کے درمیان ایک چیونٹی اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کر رہی ہو۔ وہ بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو اس اتھاہ کائنات میں اس کا سہارا بن سکے۔ وہ ایک ایسی ہستی کی پناہ ڈھونڈھنا چاہتا ہے جو کائنات کی قوتوں سے بالاتر ہو اور جس کی پناہ میں آجانے کے بعد وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور کر سکے۔

یہ دو جذبے ہیں جن کو میں نے معبود کی تلاش کا عنوان دیا ہے۔ معبود کی تلاش در اصل ایک فطری جذبہ ہے جس کا مطلب ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے جو آدمی کی محبت اور اس کے اعتماد کا مرکز بن سکے۔ موجودہ زمانہ میں قوم، وطن اور ریاست کو انسان کی اس طلب کا جواب بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جدید تہذیب یہ کہتی ہے کہ اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنی ریاست کو یہ مقام دو کہ وہ تمہاری عقیدتوں کا مرکز بنے اور اس سے وابستگی کو اپنا سہارا بناؤ۔ ان چیزوں کو معبود کے نام پر پیش نہیں کیا جاتا مگر زندگی میں ان کو جو مقام دیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو در اصل ایک معبود کا ہونا چاہئے۔ مگر ان چیزوں

کو معبود کی جگہ دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کو ایک رفیق زندگی کی ضرورت ہو تو اس کی خدمت میں آپ پتھر کی ایک سل پیش کر دیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے اندر تلاش کا یہ جذبہ جو ابھرتا ہے اس کے اسباب انسانی نفسیات میں بہت گہرائی تک پھیلے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسی ہستی کی تلاش میں ہے جو ساری کائنات پر محیط ہو۔ اس طلب کا جواب کسی جغرافیائی خط میں نہیں مل سکتا۔ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ ایک سماج کی تعمیر میں کچھ مدد دے سکتی ہیں مگر وہ انسان کے تلاش معبود کے جذبے کی تسکین نہیں بن سکتیں، اس کے لئے ایک کائناتی وجود درکار ہے۔ انسان کو اپنی محبتوں کے مرکز کے لئے ایک ایسا وجود چاہیے جس نے زمین و آسمان کو بنایا ہو، اپنے سہارے کے لئے اسے ایک ایسی طاقت کی تلاش ہے جو کائنات کے اوپر حکمراں ہو۔ جب تک انسان ایسے ایک وجود کو نہیں پائے گا اس کا خلا بدستور باقی رہے گا، کوئی دوسری چیز اسے پر کرنے والی نہیں بن سکتی

انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش کا تیسرا جزء اپنے انجام کی تلاش ہے۔ آدمی یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ وہ اپنے اندر بہت سے حوصلے اور تمنائیں پاتا ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کی تسکین کس طرح ہوگی۔ وہ موجودہ محدود زندگی کے مقابلہ میں ایک طویل تر زندگی چاہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ وہ اس کو کہاں پائے گا۔ اس کے اندر بہت سے اخلاقی اور انسانی احساسات ہیں جو دنیا میں بری طرح پامال کئے جا رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ اپنی پسندیدہ دنیا کو حاصل نہ کر سکے گا۔ یہ سوالات کس طرح انسان کے اندر سے ابلتے ہیں اور کائنات کا مطالعہ کس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتا ہے، اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل مناسب ہوگی۔

ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں تین لاکھ برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس کے مقابلہ میں کائنات کی عمر بہت زیادہ ہے یعنی دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال) اس سے پہلے کائنات برقی ذرات کے ایک غبار کی شکل میں تھی، پھر اس میں حرکت ہوئی اور مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے، سیارے یا سحابئے کہتے ہیں۔ یہ مادی ٹکڑے گیس کے

مہیب گولے کی شکل میں نامعلوم مدت تک فضا میں گردش کرتے رہے۔ تقریباً دو ارب سال پہلے ایسا ہوا کہ کائنات کا کوئی بڑا استارہ فضا میں سفر کرتا ہوا آفتاب کے قریب آنکلا جو اس وقت اب سے بہت بڑا تھا۔ جس طرح چاند کی کشش سے سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اسی طرح اس دوسرے ستارے کی کشش سے ہمارے آفتاب پر ایک عظیم طوفان برپا ہوا، زبردست لہریں پیدا ہوئیں جو رفتہ رفتہ نہایت بلند ہوئیں اور قبل اس کے کہ وہ ستارہ آفتاب سے دور ہٹنا شروع ہو، اس کی قوت کشش اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ آفتاب کی ان زبردست گیسی لہروں کے کچھ حصے ٹوٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور فضا میں نکل گئے۔ یہی بعد کو ٹھنڈے ہوکر نظام شمسی کے توابع بنے۔ اس وقت یہ سب ٹکڑے آفتاب کے گرد گھوم رہے ہیں اور ان ہی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

زمین ابتداءً ایک شعلہ کی حالت میں سورج کے گرد گھوم رہی تھی، مگر پھر فضا میں مسلسل حرارت خارج کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، یہ عمل کروڑوں برس ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہوگئی۔ مگر سورج کی گرمی اب بھی اس پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے بخارات اٹھنا شروع ہوئے اور گھٹاؤں کی شکل میں اس کی فضا کے اوپر چھاگئے۔ پھر یہ بادل برسنا شروع ہوئے اور ساری زمین پانی سے بھر گئی۔ زمین کا اوپری حصہ اگرچہ ٹھنڈا ہوگیا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ اب بھی گرم تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سکڑنے لگی۔ اس کی وجہ سے زمین کے اندر کی گرم گیسوں پر دباؤ پڑا اور وہ باہر نکلنے کے لئے بے قرار ہوگئیں، تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد زمین پھٹنے لگی۔ جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ گئے، اس طرح بحری طوفانوں، خوفناک زلزلوں اور آتش فشاں دھماکوں میں ہزاروں سال گزر گئے۔ ان ہی زلزلوں سے زمین کا کچھ حصہ اوپر ابھر آیا اور کچھ حصہ دب گیا۔ دبے ہوئے حصوں میں پانی بھر گیا اور وہ سمندر کہلائے اور ابھرے ہوئے حصوں نے براعظم کی صورت اختیار کی بعض اوقات یہ ابھار اس طرح واقع ہوا کہ بڑی بڑی اونچیں باڑھیں سی بن گئیں، یہ دنیا کے پہلے پہاڑ تھے۔

ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ ایک ارب ۲۳ کروڑ سال ہوئے، جب پہلی بار زمین پر زندگی پیدا ہوئی۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جو پانی کے کنارے وجود میں آئے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے جانور پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ کئی ہزار سال تک زمین پر صرف

جانور رہے۔ اس کے بعد سمندری پودے نمودار ہوئے اور خشکی پر بھی گھاس اگنا شروع ہوئی۔ اس طرح لمبی مدت تک بے شمار واقعات ظہور میں آتے رہے، یہاں تک کہ انسانی زندگی کے لئے حالات سازگار ہوئے اور زمین پر انسان پیدا ہوا۔

اس نظریہ کے مطابق انسان کی ابتدا پچھلے تین لاکھ سال سے ہوئی ہے۔ یہ مدت بہت ہی کم ہے۔ وقت کے جو فاصلے کائنات نے طے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں انسانی تاریخ چشم زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر اگر انسانیت کی اکائی کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی عمر کا اوسط سو سال سے بھی کم ہے۔ ایک طرف اس واقعہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ کائنات میں انسان سے بہتر کوئی وجود معلوم نہیں کیا جاسکا ہے۔ زمین و آسمان کی اربوں اور کھربوں سال کی گردش کے بعد جو بہترین مخلوق اس کائنات کے اندر وجود میں آئی ہے وہ انسان ہے۔ مگر یہ حیرت انگیز انسان جو ساری دنیا پر فوقیت رکھتا ہے، جو تمام موجودات میں سب سے افضل ہے اس کی زندگی چند سال سے زیادہ نہیں۔ ہمارا وجود جن مادی اجزار سے مرکب ہے ان کی عمر تو اربوں اور کھربوں سال ہو اور وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائیں مگر ان مادی اجزار کی یکجائی سے جو اعلیٰ ترین وجود بنتا ہے وہ صرف سو برس زندہ رہے۔ جو کائنات کا حاصل ہے وہ کائنات سے بھی کم عمر رکھتا ہے تاریخ کے طویل ترین دور میں بے شمار واقعات کیا صرف اس لئے جمع ہوئے تھے کہ ایک انسان کو چند دنوں کے لئے پیدا کر کے ختم ہو جائیں۔

زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو اس پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جاسکتا ہے جو طول و عرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جاکر ایک ہلکا سا دھکا دے دیں تو یہ صندوق پانی کی گہرائی میں جا گرے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی، نسل انسانی اپنے کفن میں لپٹی ہوئی ہمیشہ کے لئے پڑی رہے گی، دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں کبھی انسان کی قسم کی کوئی نسل آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا، کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور چکر کرتا رہے گا، کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے

حادثہ کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ کئی صدیوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

کیا انسان کی قیمت بس اسی قدر رہے، مادہ کو کوٹیے، پیٹیے، جلائیے، کچھ بھی کیجئے، وہ ختم نہیں ہوتا، وہ ہر حال میں اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے مگر انسان جو مادہ سے برتر مخلوق ہے کیا اس کے لئے بقا نہیں۔ یہ زندگی جو ساری کائنات کا خلاصہ ہے، کیا وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ اتنی آسانی سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا انسانی زندگی کا منتہا بس یہی ہے کہ وہ کائنات میں اپنے ننھے سے وطن پر چند دنوں کے لئے پیدا ہو اور پھر فنا ہو کر رہ جائے تمام انسانی علم اور ہماری کامرانیوں کے سارے واقعات ہمارے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں اور کائنات اس طرح باقی رہ جائے گویا نسل انسانی کی اس کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز جو صریح طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے تو یہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں ہماری امنگوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان لامحدود مدت تک زندہ رہنا چاہتا ہے، کسی کو بھی موت پسند نہیں، مگر اس دنیا میں ہر پیدا ہونے والا جانتا ہے کہ وہ ایسی زندگی سے محروم ہے۔ آدمی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے، ہر آدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ دکھ درد اور ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہ کر زندگی گزارے، مگر حقیقی معنوں میں کیا کوئی شخص بھی ایسی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔

ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو اپنے حوصلوں کی تکمیل کا آخری حد تک موقع ملے، وہ اپنی ساری تمناؤں کو عمل کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے مگر اس محدود دنیا میں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، یہ کائنات اس کے لئے بالکل ناسازگار معلوم ہوتی ہے وہ ہر چند قدم کے بعد ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے، کائنات صرف ایک حد تک ہمارا ساتھ دیتی ہے، اس کے بعد ہم کو مایوس اور ناکام لوٹا دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی محض غلطی سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے جو در اصل اس کے لئے نہیں بنائی گئی تھی اور جو بظاہر زندگی اور اس کے متعلقات سے بالکل بے پروا ہے۔ کیا ہمارے تمام جذبات وخیالات اور ہماری تمام

خواہشیں غیر حقیقی ہیں جن کا واقعی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے تمام بہترین تخیلات کائنات کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں بالکل الل ٹپ طریقے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ تمام احساسات جن کو لے کر انسانی نسل پچھلے ہزاروں سال سے پیدا ہو رہی ہے اور جن کو اپنے سینہ میں لئے ہوئے وہ اس حال میں دفن ہو جاتی ہے کہ وہ انھیں حاصل نہ کر سکی، کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں۔ کیا وہ انسانوں کے ذہن میں بس یونہی پیدا ہو رہے ہیں جن کے لئے نہ تو ماضی میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مستقبل میں ان کا کوئی مقام ہے۔

ساری کائنات میں صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچتا ہے اور اپنے آیندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جانور مثلاً چیونٹیاں خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا گھونسلے بناتا ہے۔ مگر ان کا یہ عمل غیر شعوری طور پر محض عادتاً ہوتا ہے۔ ان کی عقل اس کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انھیں خوراک جمع کر کے رکھنا چاہئے تاکہ کل ان کے کام آسکے یا ایسا گھر بنانا چاہئے جو موسموں کے ردوبدل میں تکلیف سے بچائے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ موقع ملنا چاہئے، جانوروں کے لئے زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے، کیا اسی طرح انسانی زندگی کا بھی کوئی کل نہیں ہے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، فردا کا تصور جو انسان میں پایا جاتا ہے اس کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کی زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہو جتنی آج اسے حاصل ہے انسان "کل" چاہتا ہے مگر اس کو صرف "آج" دیا گیا ہے!

اسی طرح جب ہم سماجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک خلا کا زبردست احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف مادی دنیا ہے جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل نظر آتی ہے۔ وہ ایک متعین قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کی ہر چیز اپنے مقرر راستہ پر چلی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادی دنیا ویسی ہی ہے جیسی کہ اسے ہونا چاہئے مگر انسانی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے۔ یہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔

ہم صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے اور دونوں اس حال میں مر جاتے ہیں کہ ایک ظالم ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم۔ کیا ظالم کو اس کے ظلم کی سزا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ دیئے بغیر دونوں کی زندگی کو مکمل کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص سچ بولتا ہے اور حق داروں کو ان کے حقوق ادا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی مشکل کی زندگی بن جاتی ہے، دوسرا شخص جھوٹ اور فریب سے کام لیتا ہے اور جس کی جو چیز پاتا ہے ہڑپ کر لیتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی نہایت عیش و عشرت کی زندگی بن جاتی ہے۔ اگر یہ دنیا اسی حال میں ختم ہو جائے تو کیا دونوں انسانوں کے اس مختلف انجام کی کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر ڈاکہ ڈالتی ہے اور اس کے وسائل و ذرائع پر قبضہ کر لیتی ہے مگر اس کے باوجود دنیا میں وہی نیک نام رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس نشر و اشاعت کے ذرائع ہیں اور دبی ہوئی قوم کی حالت سے دنیا ناواقف رہتی ہے کیونکہ اس کی آہ کے دنیا کے کانوں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں، کیا ان دونوں کی صحیح حیثیت کبھی ظاہر نہیں ہوگی۔ دو اشخاص یا دو قوموں میں ایک مسئلہ پر اختلاف ہوتا ہے اور زبردست کش مکش تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو برسر حق کہتے ہیں اور ایک دوسرے کو انتہائی برا ثابت کرتے ہیں مگر دنیا میں ان کے مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہوتا، کیا ایسی کوئی عدالت نہیں ہے جو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر سکے۔

موجودہ دور کو ایٹمی دور کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کو خود سری کا دور کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ آج کا انسان صرف اپنی رائے اور خواہش پر چلنا چاہتا ہے خواہ اس کی رائے اور خواہش کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ہر شخص غلط کار ہے مگر ہر شخص گلے کی پوری قوت کے ساتھ اپنے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔ اخبارات میں لیڈروں اور حکمرانوں کے بیانات دیکھئے، ہر ایک انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے ظلم کو عین انصاف اور اپنی غلط کاریوں کو عین حق ثابت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیا اس فریب کا پردہ کبھی چاک ہونے والا نہیں ہے۔

یہ صورت حال صریح طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ یہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک ایسی دنیا چاہیئے جہاں ہر ایک کو اس کا صحیح مقام مل سکے۔

مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کوئی خلا ہے اس کو پُر کرنے کے اسباب موجود ہیں۔ مادی دنیا میں کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس انسانی دنیا میں ایک زبردست خلا ہے۔ جس قدرت نے مادی دنیا کو مکمل حالت میں ترتی دی ہے کیا اس کے پاس انسانی دنیا کا خلا پر کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ ہمارا احساس بعض افعال کو اچھا اور بعض کو برا سمجھتا ہے۔ ہم کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ وہ ہوں اور کچھ باتوں کو چاہتے ہیں کہ وہ نہ ہوں۔ مگر ہماری فطری خواہش کے علی الرّغم وہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے جس کو انسانی فطرت برا سمجھتی ہے، انسان کے اندر اس طرح کے احساس کی موجودگی یہ معنیٰ رکھتی ہے کہ کائنات کی تعمیر حق پر ہوئی ہے۔ یہاں باطل کے بجائے حق کو غالب آنا چاہئے۔ پھر کیا حق ظاہر نہیں ہوگا۔ جو چیز مادی دنیا میں پوری ہو رہی ہے کیا وہ انسانی دنیا میں پوری نہیں ہوگی۔

یہی وہ سوالات ہیں جن کے مجموعہ کو میں نے اوپر "انسانیت کے انجام کی تلاش" کہا ہے۔ ایک شخص جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو وہ سخت بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر نہایت شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ زندگی اگر یہی ہے جو اس وقت نظر آرہی ہے تو یہ کس قدر لغو زندگی ہے۔ وہ ایک طرف دیکھتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے کائنات میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہے گویا سب کچھ صرف اسی کے لئے ہے، دوسری طرف انسان کی زندگی اس قدر مختصر اور اتنی ناکام ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس سوال کے سلسلہ میں آج لوگوں کا رجحان عام طور پر یہ ہے کہ اس قسم کے جھنجھٹ میں پڑنا فضول ہے۔ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں، اور حقیقت پسندی یہ ہے کہ زندگی کا جو لمحہ تمہیں حاصل ہے اس کو پر مسرت بنانے کی کوشش کرو۔ آیندہ کیا ہوگا یا جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، اس کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اس جواب کے بارہ میں کم از کم بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں انھوں نے ابھی انسانیت کے مقام کو نہیں پہچانا، وہ مجاز کو حقیقت سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ واقعات انھیں ابدی زندگی کا راز معلوم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں مگر وہ چند روزہ زندگی پر قانع ہو گئے ہیں۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے

کہ اپنی امنگوں اور حوصلوں کی تکمیل کے لئے ایک وسیع تر دنیا کی تلاش کرو مگر یہ نادان روشنی کے بجائے اس کے سایہ کو کافی سمجھ رہے ہیں۔ کائنات پکار رہی ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نامکمل ہے، دوسری مکمل دنیا کا کھوج لگاؤ۔ مگر ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اسی نامکمل دنیا میں اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں گے، ہم کو مکمل دنیا کی ضرورت نہیں۔ حالات کا صریح اشارہ ہے کہ زندگی کا ایک انجام آنا چاہئے، مگر یہ لوگ صرف آغاز کو لے کر بیٹھ گئے ہیں اور انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ حالانکہ یہ اسی قسم کی ایک حماقت ہے جو شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے۔ اگر فی الواقع زندگی کا کوئی انجام ہے تو وہ آکر رہے گا اور کسی کا اس سے غافل ہونا اس کو روکنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ البتہ ایسے لوگوں کے حق میں وہ ناکامی کا فیصلہ ضرور کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو کل زندگی سمجھنا اور صرف آج کو پر مسرت بنانے کی کوشش کو اپنا مقصد بنا لینا بڑی کم ہمتی اور بے عقلی کی بات ہے۔ آدمی اگر اپنی زندگی اور کائنات پر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس نقطۂ نظر کی لغویت فوراً واضح ہو جاتی ہے ایسا فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو حقیقتوں کی طرف سے آنکھیں بند کرے اور بالکل بے سمجھی بوجھی زندگی گزارنا شروع کر دے۔

یہ ہیں وہ چند سوالات جو کائنات کو دیکھتے ہی نہایت شدت کے ساتھ ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہئے، مگر اس کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ اس کا ایک چلانے والا اور اس کو سنبھالنے والا ہونا چاہئے، مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ ہم کسی کے احسانات سے ڈھکے ہوئے ہیں اور مجسم شکر و سپاس بن کر اس ہستی کو ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جس کے آگے اپنے عقیدت کے جذبات کو نثار کر سکیں، مگر ایسا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہم اس کائنات کے اندر انتہائی عجز اور بے بسی کے عالم میں ہیں، ہم کو ایک ایسی پناہ کی تلاش ہے جہاں پہونچ کر ہم اپنے آپ کو محفوظ تصور کر سکیں، مگر ایسی کوئی پناہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ پھر جب ہم اپنی زندگی اور اپنی عمر کو دیکھتے ہیں تو کائنات کا یہ تضاد ہم کو ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی عمر تو کھربوں سال ہو اور انسان جو کائنات کا خلاصہ ہے اس کی عمر

صرف چند سال ۔ فطرت ہم کو بے شمار امنگوں اور حوصلوں سے معمور کرے مگر دنیا کے اندر اس کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرے۔

پھر سب سے زیادہ سنگین تضاد وہ ہے جو مادی دنیا اور انسانی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ مادی دنیا انتہائی طور پر مکمل ہے، اس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا، مگر انسانی زندگی میں زبردست خلا ہے۔ اشرف المخلوقات کی حالت ساری مخلوق سے بدتر نظر آتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اگر پٹرول کا کوئی نیا چشمہ دریافت ہو یا بھیڑ بکریوں کی نسل بڑھے تو اس سے انسان خوش ہوتا ہے، مگر انسانی نسل کا اضافہ ہمارے لئے گوارہ نہیں۔ ہم اپنی مشکلوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ انسان کی پیدائش کو روک دینا چاہتے ہیں۔

انسان کی نارسائی

یہ سوالات ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، وہ اندر سے بھی ابل رہے ہیں اور باہر سے بھی ہمیں گھیرے ہوئے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا جواب کیا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کا سوال ہے، مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمیں زندگی تو مل گئی مگر اس کی حقیقت ہمیں نہیں بتائی گئی۔

اس حقیقت کی دریافت کے لئے جب ہم اپنی عقل اور اپنے تجربات کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح اور قطعی جواب معلوم کرنا ہماری عقل اور ہمارے تجربہ کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک ہم نے جو رائیں قائم کی ہیں وہ اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے کے اجسام کو نہیں دیکھ سکتے، اسی طرح کائنات کے متعلق ہمارا علم بھی ایک تنگ دائرہ میں محدود ہے جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہمارا علم نامکمل ہے، ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں۔ ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ میدہ اور کالک کو اگر ملایا جائے تو بھورے خاکستری رنگ کا ایک سفوف سا بن جاتا ہے، لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو سفوف کے ذروں ہی کے برابر ہوتا ہے اور صرف خوردبین کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے وہ اس کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے

اس کے مشاہدہ کے پیمانہ میں خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔

نوع انسانی کی زندگی اس زمانہ کے مقابلہ میں جب کہ یہ کرۂ ارض وجود میں آیا اس قدر مختصر ہے کہ کسی شمار میں نہیں آتی، اور خود کرۂ ارض کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کائنات کی حقیقت کے بارہ میں جو خیال آرائی کرتا ہے، اس کو اندھیرے میں ٹٹولنے سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہوجاتی ہے جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر آپ اس بات کو سامنے رکھیں کہ آفتاب اسیّ کھرب سال سے موجود ہے اس زمین کی عمر جس پر ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے، اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تین کرور سال گذر چکے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں زمین پر ذی عقل انسان کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں، اس طویل زمانہ کا ایک بہت حقیر جزء ہے جو کہ دراصل کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لئے درکار ہے۔ کائنات کے بے حد طویل ماضی اور نامعلوم مستقبل کے درمیان انسانی زندگی محض ایک لمحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا وجود ایک نہایت حقیر قسم کا درمیانی وجود ہے جس کے آگے اور پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی وسعت لامحدود ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ہماری عقل اور ہمارا تجربہ بالکل ناکافی ہیں ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے ذریعہ کبھی بھی اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اب تک کی کوششوں کی ناکامی اس کو ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی ہے

اس طرح ہمارا علم اور ہمارا مطالعہ ہم کو ایک ایسے مقام پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہیں، ایسے سوالات جو لازمی طور پر اپنا جواب چاہتے ہیں۔ جن کے بغیر انسانی زندگی بالکل لغو اور بے کار نظر آتی ہے۔ مگر جب ہم ان پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے ان کا جواب معلوم نہیں کرسکتے۔ ہم کو وہ آنکھ ہی نہیں ملی جس سے حقیقت کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ اور وہ ذہن ہمیں حاصل نہیں ہے جو براہ راست حقیقت کا ادراک کرسکے۔

پیغمبر کی ضرورت

اس موقع پر ایک شخص ہمارے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ جس حقیقت کو تم معلوم کرنا چاہتے ہو، اس کا علم مجھے دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"اس کائنات کا ایک خدا ہے جس نے سارے عالم کو بنایا ہے، اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔ جو چیزیں تمہیں حاصل ہیں وہ سب اسی نے تمہیں دی ہیں اور سارے معاملات کا اختیار اسی کو ہے۔ یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ مادی دنیا کے اندر کوئی تضاد نہیں، وہ ٹھیک ٹھیک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے اور اس کے برعکس انسانی دنیا ادھوری نظر آتی ہے، یہاں زبردست خلفشار برپا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اسے آزمایا جا رہا ہے۔ تمہارا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کا قانون جو مادی دنیا میں براہ راست نافذ ہو رہا ہے اس کو انسان اپنی زندگی میں خود سے اختیار کرے یہی وجود کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مدبر اور منتظم ہے، وہی تمہارے جذبات شکر کا مستحق ہے اور وہی ہے جو تم کو پناہ دے سکتا ہے۔ اس نے تمہارے لئے ایک لامحدود زندگی کا انتظام کر رکھا ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے، جہاں تمہاری امنگوں کی تسکین ہو سکے گی، جہاں حق و باطل الگ الگ کر دیئے جائیں گے اور نیکوں کو ان کی نیکی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس نے میرے ذریعہ سے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی ہے جس کا نام قرآن ہے۔ جو اس کو مانے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس کو نہ مانے گا ذلیل کر دیا جائے گا۔"

یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے جو چودہ سو برس پہلے عرب کے ریگستان سے بلند ہوئی تھی اور آج بھی ہم کو پکار رہی ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ اگر حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری آواز پر کان لگاؤ اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر غور کرو۔

کیا یہ آواز حقیقت کی واقعی تعبیر ہے، کیا ہمیں اس پر ایمان لانا چاہئے۔ وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حقیقت کو وہ اس وقت تسلیم کریں گے جب کہ وہ انھیں نظر آئے۔ وہ حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ مطالبہ

بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فلکیات کا مطالعہ ریاضی کے بغیر کرنے کی کوشش کرے اور کہے کہ وہ فلکیاتی سائنس کی صرف ان ہی دریافتوں کو تسلیم کرے گا جو کھلی آنکھوں سے اسے نظر آتی ہوں، ریاضیات کی دلیل اس کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، یہ مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی قوتوں کا صحیح علم نہیں ہے۔

انسان کے پاس مشاہدہ کی جو قوتیں ہیں وہ نہایت محدود ہیں، حقیقت ہمارے لئے ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے۔ ہم اسے محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ایک زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا چار چیزوں سے مل کر بنی ہے۔ "آتش و آب و خاک و باد"۔ دوسرے لفظوں میں قدیم انسان اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ حقیقت ایک ایسی چیز ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے، مگر جدید تحقیقات نے اس کی غلطی واضح کر دی ہے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنے آخری تجزیہ میں ایٹم کے باریک ترین ذرات پر مشتمل ہیں۔ ایٹم ایک اوسط درجہ کے سیب سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے جتنا کہ سیب ہماری زمین سے۔ یہ ایٹم ایک طرح کا نظام شمسی ہے جس کا ایک مرکز ہے، اس مرکز میں پروٹان اور نیوٹران ہوتے ہیں اور اس کے چاروں طرف الکٹران (برقیے) مختلف مداروں میں اسی طرح حرکت کرتے ہیں جیسے سورج کے گرد اس کے تابع سیارے حرکت کرتے ہیں۔ ایک برقیہ جس کا قطر سینٹی میٹر کا پانچ ہزار کروڑواں حصہ ہو اور جو اپنے مرکز کے چاروں طرف ایک سکنڈ میں کروڑوں مرتبہ چکر کاٹتا ہو اس کے تصور کی کوشش کرنا سعی لاحاصل ہے۔ جب کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ اندرونی عالموں کی آخری حد ہے۔ ممکن ہے ان عالموں کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری مشاہدہ کی قوت کس قدر کمزور ہے، پھر سوال یہ ہے کہ پروٹان اور نیوٹران کے وہ انتہائی چھوٹے ذرے جو باہم مل کر مرکز بناتے ہیں وہ کس طرح قائم ہیں۔ آخر یہ پروٹان اور نیوٹران مرکز سے باہر کیوں نہیں نکل پڑتے۔ وہ کیا چیز ہے جو انھیں ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان مادی ذرات کے درمیان ایک توانائی موجود ہے اور یہی توانائی مرکز کے برقی اور غیر برقی ذرات کو آپس میں جکڑے ہوئے ہے۔ اس کو طاقت یکجائی

(Binding Energy) کا نام دیا گیا ہے۔ گویا مادہ اپنے آخری تجزیہ میں توانائی ہے، میں پوچھتا ہوں، کیا یہ توانائی قابل مشاہدہ چیز ہے۔ کیا کسی بھی خوردبین کے ذریعہ اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید سائنس نے خود یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے اس کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اب اگر رسول کی بات کو ماننے کے لئے ہم یہ شرط لگائیں کہ وہ جن حقیقتوں کی خبر دے رہا ہے وہ ہمیں چھونے اور دیکھنے کو ملنی چاہئیں تب ہم اسے مانیں گے تو یہ ایک نہایت نامعقول بات ہوگی۔ یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے تاریخ ہند کا کوئی طالب علم ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے استاد سے کہے کہ کمپنی کے تمام کردار کو میرے سامنے لاکر کھڑا کر دو اور وہ میرے سامنے تمام گزرے ہوئے واقعات کو دہرائیں، تب میں تمہاری تاریخ کو تسلیم کروں گا۔

پھر وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں دیکھ کر ہم یہ فیصلہ کریں کہ یہ دعوت صحیح ہے یا غلط، اور ہم کو اسے قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ میرے نزدیک اس دعوت کو جانچنے کے تین خاص پہلو ہیں۔ اول یہ کہ اس کی توجیہ حقیقت سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے انجام کے بارہ میں اس کا دعویٰ محض دعویٰ ہے یا اس کی کوئی دلیل بھی اس کے یہاں ملتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس کے پیش کئے ہوئے کلام میں کیا ایسی کوئی نمایاں خصوصیت پائی جا رہی ہے کہ اس کو خدا کا کلام کہا جا سکے۔ ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے جب ہم رسول کے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر وہ نہایت کامیابی کے ساتھ پورا اتر رہا ہے۔

۱۔ رسول نے کائنات کی جو توجیہ کی ہے اس میں ہماری تمام پیچیدگیوں کا حل موجود ہے۔ ہمارے اندر اور ہمارے باہر جتنے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سب کا وہ بہترین جواب ہے۔

۲۔ زندگی کے انجام کے بارہ میں اس کا جو دعویٰ ہے اس کے لئے وہ ایک قطعی دلیل بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زندگی میں وہ اس انجام کا

ایک نمونہ ہمیں دکھا دیتا ہے جس کو بعد کی زندگی میں آنے کی وہ خبر دے رہا ہے۔

۳۔ وہ جس کلام کو خدا کا کلام کہتا ہے اس کے اندر اتنی غیر معمولی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ یقیناً یہ ایک فوق الانسانی طاقت کا کلام ہے۔ کسی انسان کا کلام ایسا نہیں ہو سکتا۔

آئیے اب ان تینوں پہلوؤں سے رسول کی دعوت کا جائزہ لیں۔

پیغمبر کی صداقت

۱۔ اس کی پہلی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی پیدائش جس فطرت پر ہوئی ہے وہی فطرت اس توجیہ کی بھی ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد ایک خدا کے وجود پر رکھی گئی ہے، اور ایک خدا کا شعور انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے دو نہایت مضبوط قرینے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی تاریخ کے تمام معلوم زمانوں میں انسانوں کی اکثریت بلکہ تقریباً ان کی تمام تعداد نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ انسان پر کبھی بھی ایسا کوئی دور نہیں گزرا ہے جب اس کی اکثریت خدا کے شعور سے خالی رہی ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر آج تک انسانی تاریخ کی متفقہ شہادت یہی ہے کہ خدا کا شعور انسانی فطرت کا نہایت طاقت ور شعور رہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ انسان پر جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو اس کا دل بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے، جہاں کوئی سہارا نظر نہیں آتا، وہاں وہ خدا کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ جاہل ہو یا عالم۔ خدا پرست ہو یا ملحد، روشن خیال ہو یا تاریک خیال جب بھی اس پر کوئی ایسا وقت گزرتا ہے جہاں عام انسانی تو تیں جواب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں تو وہ ایک ایسی ہستی کو پکارتا ہے جو تمام طاقتوں سے بڑھ کر طاقتور ہے اور جو تمام طاقتوں کا خزانہ ہے۔ انسان اپنے نازک ترین لمحات میں خدا کو یاد کرنے پر مجبور رہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ہمیں سٹالن کی زندگی میں ملتی ہے جس کا ذکر مسٹر چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے حالات کے متعلق اپنی کتاب کی چوتھی جلد صفحہ ۴۳۳ میں کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے نازک حالات میں جب کہ ہٹلر سارے یورپ کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا، چرچل نے ماسکو کا

سفر کیا تھا، اس موقع پر چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجی کارروائی کے متعلق اپنی اسکیم کی تفصیلات بتائیں۔ چرچل کا بیان ہے کہ اسکیم کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ سٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں، اس کی زبان سے نکلا "خدا اس مہم کو کامیاب کرے"۔

May God prosper this undertaking

اسی کے ساتھ نبی کی آواز کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ ان تمام سوالات کی مکمل توجیہ ہے جو انسان معلوم کرنا چاہتا ہے اور جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ کائنات کے مطالعہ نے ہمیں اس نتیجہ پر پہونچایا تھا کہ یہ محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو سکتی، ضرور اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہونا چاہئے۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ ہم کو نظر آ رہا تھا کہ کائنات محض ایک مادی مشین نہیں ہے اس کے پیچھے کوئی غیر معمولی ذہن ہونا چاہئے جو اسے چلا رہا ہو۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو اپنے محسن کی تلاش تھی اور ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جو ہمارا سہارا بن سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہو رہی تھی کہ انسانی زندگی اتنی مختصر کیوں ہے۔ ہم اس کو لامحدود دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم اپنے لئے ایک ایسے وسیع میدان کی تلاش میں تھے جہاں ہماری امنگوں کی تکمیل ہو سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ پھر انسانی حالات کا شدید تقاضا تھا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو اور اچھے اور برے الگ الگ کر دئے جائیں، ہر ایک کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ اس سوال کا جواب بھی اس توجیہ میں موجود ہے۔ غرض زندگی سے متعلق سارے سوالات کا مکمل جواب ہے اور اتنا بہتر جواب ہے کہ اس سے بہتر جواب کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس سے وہ سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔

۲۔ اس کی دعوت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے انجام کے بارہ میں وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے اس کا ایک واقعاتی نمونہ خود اپنی زندگی میں ہمیں دیکھا دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا اسی طرح ظالم اور مظلوم کو لئے ہوئے ختم نہیں ہو جائیگی

بلکہ اس کے انجام پر کائنات کا رب ظاہر ہوگا اور سچوں اور جھوٹوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دے گا، اس دن کے آنے میں جو دیر ہے وہ صرف اس مہلتِ کار کے ختم ہونے کی ہے جو تمہارے لئے مقدر ہے۔

یہ بات وہ صرف کہہ کر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ اسی کے ساتھ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس عدالت کا ایک نمونہ مالک کائنات میرے ذریعہ سے اسی دنیا میں تم کو دکھائے گا۔ میرے ذریعہ سے وہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرے گا، اپنے فرماں برداروں کو عزت دے گا اور اپنے نافرمانوں کو ذلیل کر کے انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا۔ یہ واقعہ بہر حال ظہور میں آئے گا خواہ دنیا کے لوگ کتنی ہی مخالفت کریں اور ساری طاقت اس کے مٹانے پر لگا دیں جس طرح آخرت کا ہونا قطعی طور پر مقدر ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اسی طرح میری زندگی میں اس کا نمونہ دکھایا جانا بھی لازمی ہے، یہ ایک نشان ہوگا آنے والے دن کا اور یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ کائنات کی تعمیر عدل پر ہوئی ہے اور یہ کہ میں جس طاقت کا نمائندہ ہوں وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی طاقت سب پر بالا ہے یہ طاقت ایک روز تم کو اپنے سامنے کھڑا کر کے تمام اگلے پچھلے انسانوں کا فیصلہ کرے گی۔

یہ چیلنج وہ اس وقت دیتا ہے جب کہ وہ تنہا ہے، پوری قوم اس کی دشمن ہوگئی ہے، خود اپنا ملک اس کو جگہ دینے کے لئے تیار نہیں، اس کے قریب ترین اعزا نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس کے پاس مادی وسائل و ذرائع میں سے کچھ بھی نہیں۔ ایسا ایک شخص پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ میں غالب ہوں گا اور میرے ذریعہ سے خدا کی عدالت زمین پر قائم ہوگی۔ سننے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں مگر وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنا کام کرتا چلا جا رہا ہے ملک کی اکثریت اس کے قتل کا فیصلہ کرتی ہے، اس کی معاشیات تباہ کر دیتی ہے، اس کو جلا وطنی پر مجبور کرتی ہے۔ اس کو مٹانے پر اپنا سارا زور صرف کر دیتی ہے، مگر اس کے مقابلہ میں یہ سب کچھ بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت تھوڑے لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں، ایک طرف معمولی اقلیت ہوتی ہے اور دوسری طرف زبردست

اکثریت۔ ایک طرف سازوسامان ہوتا ہے اور دوسری طرف بے سروسامانی۔ ایک طرف ملکی باشندوں اور ہمسایہ قوموں کی حمایت ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنوں اور غیروں کی متفقہ مخالفت۔ حالات کی انتہائی ناسازگاری سے اس کے ساتھی اکثر گھبرا اٹھتے ہیں مگر وہ ہر بار یہی کہتا ہے کہ انتظار کرو خدا کا فیصلہ آکر رہے گا، اس کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

اس کے چیلنج پر چوتھائی صدی بھی گزرنے نہیں پاتی کہ وہ مکمل شکل میں پورا ہو جاتا ہے اور تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ظہور میں آتا ہے کہ ایک شخص نے جن دعووں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا تھا ٹھیک اسی شکل میں اس کا دعویٰ پورا ہوا اور اس کے مخالفین اس میں کوئی کمی بیشی نہ کر سکے۔ حق اور باطل الگ الگ ہو گیا۔ خدا کے فرماں برداروں کو عزت اور غلبہ حاصل ہوا، اور خدا کے نافرمانوں کا زور توڑ کر انھیں محکوم بنا دیا گیا۔

اس طرح اس دعوت نے انسانوں کے لئے جس انجام کی خبر دی تھی اس کا ایک نمونہ دنیا میں قائم کر دیا گیا جو قیامت تک کے لئے عبرت کا نشان ہے، اس نمونہ کی تکمیل آخرت میں ہوگی جب سارے انسانوں کو خدا کی عدالت میں حاضر کرکے ان کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

۳۔ اس شخص کے دعوے کے برحق ہونے کا تیسرا ثبوت وہ کلام ہے جس کو وہ کلام الٰہی کہہ کر پیش کرتا ہے۔ اس کلام کے اوپر کتنی ہی صدیاں گزر چکی ہیں مگر اس کی عظمت، اس کی سچائی اور حقیقت کے بارہ میں اس کے بیان کا ایک حرف بھی غلط ثابت نہ ہو سکا جب کہ کوئی بھی انسانی کتاب ایسی نہیں ہے جو ان نقائص سے پاک ہو۔

دوسرے لفظوں میں قرآن بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں مگر میں یہاں صرف تین پہلوؤں کا ذکر کروں گا، ایک اس کا غیر معمولی انداز بیان، دوسرے اس کے معانی کا تضاد سے پاک ہونا، تیسرے اس کی ابدیت۔

قرآن اپنی دلیل آپ

۱۔ قرآن ایک غیر معمولی کلام ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ایک ایسے بلند مقام سے بول رہا ہے جو کسی بھی انسان کو حاصل نہیں۔ اس کی عبارتوں کا شکوہ، اس کی بے پناہ روانی اور اس کا فیصلہ کن انداز بیان اتنا حیرت انگیز طور پر انسانی کلام سے مختلف ہے کہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالک کائنات کی آواز ہے کسی انسان کی آواز نہیں۔ اس کا پر یقین اور با عظمت کلام خود ہی بول رہا ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے جس میں خدا اپنے بندوں سے مخاطب ہوا ہے۔ قرآن میں کائنات کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ انسان کے انجام کی خبر دی گئی ہے اور زندگی سے متعلق تمام کھلے اور چھپے حالات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس قدر قطعی انداز میں بیان ہوا ہے کہ واقعہ کا اظہار واقعہ کا مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آدمی کو حقیقت کا علم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ اس کو حقیقت کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ وہ واقعہ کو کتاب کے صفحات میں نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ اسکرین کے اوپر اس کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کلام کی یہ قطعیت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ یہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جس کو حقیقتوں کا براہ راست علم ہے۔ کوئی انسان جو حقیقتوں کا ذاتی علم نہ رکھتا ہو، وہ اپنے کلام میں ہرگز ایسا زور پیدا نہیں کرسکتا۔

یہاں میں نمونہ کے طور پر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت نقل کروں گا۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝	جب آسمان پھٹ جائے گا،
وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝	جب ستارے بکھر جائیں گے،
وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝	جب دریا ابل پڑیں گے،
وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝	جب قبریں الٹ دی جائیں گی،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ	اس دن ہر شخص جان لے گا جو
وَاَخَّرَتْ ۝ يٰۤاَيُّهَا	اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے
الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ	چھوڑا اے انسان تجھکو خدائے عظیم
بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝	کے بارہ میں کس چیز نے دھوکے

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ
فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ
رَكَّبَكَ ○ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ
بِالدِّينِ ○ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ
لَحَافِظِينَ ○ كِرَامًا كَاتِبِينَ
يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ○
إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ
الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ يَصْلَوْنَهَا
يَوْمَ الدِّينِ وَمَا هُمْ عَنْهَا
بِغَائِبِينَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا
يَوْمُ الدِّينِ ○ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ
مَا يَوْمُ الدِّينِ ○ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ
نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط
وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ○

میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھے خلق کیا
تیرا تسویہ فرمایا اور پھر مناسبت قائم کی۔
اس نے جیسا چاہا ویسا تم کو بنایا، نہیں
بلکہ تم فیصلہ کے دن کا انکار کرتے ہو۔
حالاں کہ تمہارے اوپر نگہبان مقرر ہیں
صحیح صحیح لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم
کرتے ہو۔ یقیناً اچھے لوگوں کے لئے نعمتیں
ہیں اور یقیناً برے لوگوں کے لئے جہنم
ہے۔ وہ فیصلہ کے روز اس میں ڈالے
جائیں گے اور وہ ہرگز اس سے بھاگ
نہیں سکتے اور کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ
کا دن کیا ہے پھر کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ
کا دن کیا ہے وہ ایک ایسا دن ہے جب
کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے
کچھ نہ کر سکے گا اور اس دن اقتدار صرف خدا کے لئے ہوگا

کس قدر یقین سے بھرا ہوا ہے یہ کلام جس میں زندگی کی ابتدا اور انتہا سب کچھ بیان کر دی گئی ہے۔ کوئی بھی انسانی کتاب جو زندگی اور کائنات کے موضوع پر لکھی گئی ہو، اس یقین کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ سیکڑوں سال سے انسان کائنات کی حقیقت پر غور کر رہا ہے، بڑے بڑے فلسفی اور سائنس داں پیدا ہوئے، مگر کوئی اس یقین کے ساتھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سائنس آج بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ کسی قطعی اور صحیح علم سے ابھی بہت دور ہے جب کہ قرآن اس قدر یقین کے ساتھ بات کہتا ہے گویا وہ علم کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور حقیقت سے آخری حد تک واقف ہے۔

۲۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس نے مابعد الطبیعی حقائق سے لے کر تمدنی مسائل تک تمام اہم امور پر گفتگو کی ہے مگر کہیں بھی اس کے بیانات میں تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کلام کے اوپر تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پورے

ہو رہے ہیں۔ اس دوران میں بہت سی نئی نئی باتیں انسان کو معلوم ہوئی ہیں مگر اس کی باتوں میں اب بھی کوئی تضاد ظاہر نہ ہو سکا، حالاں کہ انسانوں میں سے کسی ایک فلسفی کا بھی اس حیثیت سے نام نہیں لیا جا سکتا کہ اس کا کلام تضاد اور اختلاف سے پاک ہے۔ اس دوران میں ہزاروں فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی عقل سے زندگی اور کائنات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت جلد ان کے کلام کا تضاد ظاہر ہو گیا اور زمانہ نے انھیں رد کر دیا۔

کسی کلام کا تضاد سے پاک ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت سے کلی مطابقت رکھتا ہے۔ جو شخص حقیقتوں کا علم نہ رکھتا ہو یا صرف جزئی علم اسے حاصل ہو وہ جب بھی حقیقت کو بیان کرنے بیٹھے گا لازمی طور پر تضادات کا شکار ہو جائے گا۔ وہ ایک پہلو کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے پہلو کی رعایت نہ کر سکے گا۔ وہ ایک رخ کو کھولے گا تو دوسرے رخ کو بند کر دے گا۔ زندگی اور کائنات کی توجیہ کا سوال ایک ہمہ گیر سوال ہے۔ اس کے لئے ساری حقیقتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر ساری حقیقتوں کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ سارے پہلوؤں کی رعایت بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے فلسفوں میں تضاد کا پایا جانا لازمی ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کہ وہ اس قسم کے تضادات سے پاک ہے اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ حقیقت کی صحیح ترین تعبیر ہے، اس کے سوا تمام تعبیریں غلط ہیں، اس واقعہ کو میں مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔

۱۔ زندگی کے موضوع پر جو کتاب لکھی جائے اس کا ایک ضروری باب زندگی کے فرائض متعین کرنا ہے۔ یہ فرائض متعین کرنے میں ضروری ہے کہ ان کے مختلف پہلوؤں کی ٹھیک ٹھیک رعایت کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک پہلو سے کوئی ایسا حکم دیا جائے جو دوسرے پہلو سے ٹکراتا ہو۔ مثلاً عورت اور مرد کی حیثیت متعین کرنا تمدنی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور نے یہ قرار دیا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات ہونی چاہئے اور زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں کو یکساں طور پر کام کرنے کا موقع دینا چاہئے، مگر یہاں انسانی ساخت کا یہ تمدنی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکرا رہا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں یکساں طور پر

زندگی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اس کے برعکس قرآن نے تمدنی زندگی میں عورت اور مرد کا جو مقام متعین کیا ہے وہ دونوں کی پیدائشی ساخت کے عین مطابق ہے اور قانون اور حقیقت کے درمیان کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ مارکس نے انقلاب کا فلسفہ یہ بتایا ہے کہ جس طرح ایک عالمگیر قانون کشش سے ستارے حرکت کر رہے ہیں اسی طرح کچھ ناگزیر تاریخی قوانین ہیں جو سماجی تبدیلیوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہ قوانین مسلسل طور پر اپنا کام کر رہے ہیں اور اسی کے مطابق انسانی زندگی میں انقلابات آتے ہیں مگر اس فلسفہ کو مرتب کرنے کے ساتھ ہی اس نے یہ نعرہ بھی لگایا کہ

"دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ"

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر سماجی تبدیلیوں کا کوئی ناگزیر تاریخی قانون ہے تو سیاسی جدوجہد کی ضرورت نہیں اور اگر سیاسی جدوجہد کے ذریعہ انقلاب آتا ہے تو پھر ناگزیر تاریخی قانون کے کیا معنیٰ۔

اس کے برعکس قرآن انسانی ارادہ کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مادی دنیا کی طرح ان واقعات کی کوئی لازمی منطق نہیں ہے۔ بلکہ انسانی کوشش انھیں کوئی بھی شکل دے سکتی ہے۔ یقیناً فطرت کے کچھ قوانین ہیں اور اس سلسلہ میں وہ اہم کام کرتے ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انسانی کوششوں کا ساتھ دے کر اسے منزل تک پہونچا دیتے ہیں نہ کہ خود انسانی کوششیں ان قوانین کا خارجی ظہور ہیں۔ اس طرح قرآن کے نظریہ اور اس کی دعوت میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جب اپنے نظریہ کو قائم کرنے کے لئے لوگوں کو پکارتا ہے تو وہ اپنے فلسفہ کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ اس کی تردید۔ اس کے برعکس مارکسی فلسفہ اس کے عملی پروگرام سے صاف ٹکرا رہا ہے، کمیونسٹ پارٹیوں کا وجود حقیقی معنوں میں مارکسی فلسفہ کی تردید ہے، کمیونسٹ مینی فسٹو کا آخری فقرہ اس کے پہلے فقرہ کو رد کر دیتا ہے۔

قرآن کی تعلیمات کو اگر آپ انسانی فلسفوں کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھیں تو اس قسم کی بہت مثالیں پائیں گے۔

۳۔ قرآن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس زمانے میں کتنے انقلابات آئے ہیں، تاریخ میں کتنی الٹ پلٹ ہوئی ہے، زمانہ نے کتنی کروٹیں بدلی ہیں، مگر اب تک اس کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ وہ ہر زمانہ کے عقلی امکانات اور تمدنی ضروریات کا مسلسل ساتھ دیتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی تعلیمات کی ہمہ گیری کسی مقام پر بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانہ کے مسائل پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ اس کتاب عظیم کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی انسانی کتاب کو اب تک حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ہر فلسفہ چند ہی دنوں بعد اپنی غلطی ظاہر کر دیتا ہے، مگر صدیوں پر صدیاں گزرتی جا رہی ہیں اور اس کتاب کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ قانون اس وقت بنایا گیا تھا جب عرب کے غیر متمدن اور منتشر قبائل میں اسلامی ریاست قائم کرنے کا مسئلہ در پیش تھا، مگر اس کے بعد صدیوں تک وہ اسلامی حکومتوں کی تمام ضرورتیں پوری کرتا رہا اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی نہ صرف یہ کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے بلکہ صرف وہی ایک ایسا نظام ہے جو حقیقی معنوں میں زندگی کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے جس طرح اس نے اپنی برتری ثابت کی تھی آج بھی وہ اسی طرح تمام فلسفوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ زندگی کے بارہ میں اس نے جو نظریات پیش کئے تھے اور فرد اور جماعت کے عمل کے لئے جو خاکہ تجویز کیا تھا وہ آج بھی نہ تو پرانا ہوا ہے اور نہ اس میں کسی نقص کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس دوران میں کتنے فلسفے پیدا ہوئے اور مر گئے کتنے نظام بنے اور بگڑ گئے مگر قرآن کے نظریہ کی صداقت اور اس کے عملی نظام کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔ وہ ہوا اور پانی کی طرح زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔

میں یہاں دونوں پہلوؤں سے ایک ایک مثال پیش کروں گا۔

قرآن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کائنات کا محرک ایک ذہن ہے جو بالارادہ اسے حرکت دے رہا ہے۔ قرآن نے یہ دعویٰ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے بہت پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے فلسفی اور سائنس داں اٹھے جنھوں نے بڑے زور شور کے ساتھ

یہ دعویٰ کیا کہ کائنات محض ایک مادی مشین ہے جو خود بخود حرکت کر رہی ہے۔ یہ نظریہ دو سو برس تک انسانی ذہنوں پر حکومت کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوا کہ علم کی ترقی نے قرآن کے دعویٰ کو رد کر دیا ہے۔ مگر اس کے بعد خود کائنات کے مطالعہ سے سائنس دانوں پر یہ منکشف ہوا کہ زندگی اور کائنات کی توجیہ محض مادی قوانین کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی اب سائنس دن بدن قرآن کے اس نظریہ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ذہن ہے جو اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے۔ مشہور سائنس داں سر جیمز جینز اس تبدیلی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> علم کے دریا نے پچھلے چند برسوں میں نہایت تیزی سے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔ تیس سال پہلے ہمارا خیال تھا یا ہم نے فرض کر لیا تھا کہ ہم ایک ایسی آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکٹھا ہو گئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لئے ایک بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اس خالص مشینی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی ایک حادثہ کے طور پر بالکل اتفاق سے آپہونچی ہے۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لئے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے ہیں۔ مگر موجودہ معلومات کی روشنی میں طبعیات کی حد تک سائنس کا اب اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر مشینی حقیقت (Non-Mechanical Reality) کی طرف لے جا رہا ہے۔

اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے

> جدید معلومات ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم اپنے پچھلے خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لئے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں آپڑے ہیں جس کو خود زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے

یا وہ باقاعدہ طور پر زندگی سے عداوت رکھتی ہے۔ اب ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک ایسی خالق یا مدبر طاقت (Designing or Controlling Power) کا ثبوت فراہم کر رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔"

(ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحہ ۱۰۴)

یہ نظری پہلو کی مثال تھی، اب عملی پہلو سے متعلق ایک مثال لیجیے۔ اسلام نے معاشرتی زندگی کا جو قانون بنایا ہے اس میں ایک مرد کو اجازت دی ہے کہ وہ چار عورتوں تک سے شادی کر سکتا ہے۔ اسلام کے بعد جب مغربی تہذیب اٹھی تو اس نے اس قانون کا بہت مذاق اڑایا اور اس کو جاہلیت کے زمانہ کا وحشی قانون قرار دیا۔ اس کے نزدیک یہ قانون عورتوں کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی اور اس بنیاد پر کبھی بھی کوئی ترقی یافتہ تمدن تعمیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مسیحیت میں اگرچہ اس کی گنجایش موجود تھی مگر مغربی تہذیب نے اس کو یک قلم اپنے یہاں سے خارج کر دیا اور اس کو ایک نہایت ذلیل فعل قرار دیا کہ کوئی شخص ایک عورت رکھتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرے۔ اس کی تبلیغ اس زور شور سے کی گئی کہ اب یہ حال ہے کہ نہ کوئی مرد اس کی جرأت کر سکتا ہے اور نہ کوئی عورت اپنے بارہ میں ایسا سوچ سکتی ہے کہ وہ کسی شخص کی دوسری یا تیسری بیوی بنے۔

مگر حالات نے ——— اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے حالات نے ——— اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دراصل زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے۔ کبھی بعض افراد کی زندگی میں اور کبھی پوری جماعت کے لئے ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یا تو فواحش اور بدکاری کو قبول کیا جائے جس کا مطلب پورے تمدن کو ہولناک خطرہ میں مبتلا کر دینا ہے یا تعدد ازواج کو اختیار کیا جائے جس سے مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ان تمام ملکوں میں جو جنگ میں شریک تھے، یہ صورت حال پیش آئی کہ عورتیں زندہ رہیں اور مرد کثرت سے ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی جس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔

۱۹۵۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق جاپان میں ہر ایک مرد کے مقابلہ میں آٹھ عورتیں تھیں۔ اس جنگ کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا جہاں بے شمار عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہو گئے اور لڑکیوں کے لئے شوہر ملنا مشکل ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ان ملکوں میں لاوارث اور ناجائز بچوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ جو یتیم ہو گئے تھے ان کا کوئی وارث نہیں رہا اور جو عورتیں شوہر سے محروم ہو گئی تھیں انھوں نے فطری تقاضے سے مجبور ہو کر اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے ناجائز طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ جرمنی میں بعض عورتوں کے گھروں پر اس قسم کا بورڈ نظر آنے لگا کہ،

(Wanted an Evening Guest)

(رات گزارنے کے لئے ایک مہمان چاہئے)

دوسری جنگ عظیم میں لڑنے والے ملکوں کے بیشمار مرد مارے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں شادی شدہ زندگی سے مایوس ہو کر طوائف کی زندگی گزارنے لگیں۔ جیمز کیمرون (James Cameron) دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں نامہ نگار تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی یادداشت شائع کی ہے۔ یہ برطانی نامہ نگار اس میں لکھتا ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر جب میں برلن گیا تو شکست خوردہ شہر بنیادی طور پر بھوکی طوائفوں (Hungry Whores) سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ذہن سے نکالنا چاہا مگر میں نہ نکال سکا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

It is not so much that I have no stomach for the fight, I had no stomach for the victory.

ایسا نہ تھا کہ جنگ کی برداشت کی طاقت مجھ میں نہ ہو۔ مگر فتح کو برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی (گارجین ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

اگرچہ مغربی ذہن نے ابھی تک اس معاملہ میں اپنی غلطی تسلیم نہیں کی ہے مگر واقعات نے صریح طور پر اس کا غلط ہونا ثابت کر دیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب زبان سے بھی اس کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ نکاح کے معاملہ میں جس اصول کو مغرب نے اختیار کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج کو فحاشی میں مبتلا کر کے بے شمار جرائم کا دروازہ کھول دیا جائے۔ جب کہ اسلام کا اصول اصل مسئلہ کو بہترین طریقہ پر حل کرتا ہے اور سماج کو بہت شدید نقصانات سے بچا لیتا ہے۔

قرآن کے نظریات اور اس کے قوانین کی ابدیت کی یہ دو مثالیں تھیں جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسانی ساخت کے نظریے اور قوانین بن بن کر بگڑتے رہے مگر قرآن نے پہلے دن جو کچھ کہا تھا آخر دن تک اس کی سچائی میں کوئی فرق نہیں آیا وہ پہلے جس طرح حق تھا آج بھی اسی طرح حق ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہے جس کا علم ماضی اور مستقبل پر محیط ہے۔ قرآن کی ابدیت قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

آخری بات

ہمارے مطالعہ نے اب ہمارے لئے حقیقت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز اس سوال سے کیا تھا کہ "ہم کیا ہیں اور یہ کائنات کیا ہے" اس کا جواب بہت سے لوگوں نے اپنے ذہن سے دینے کی کوشش کی ہے، مگر ہم نے دیکھا کہ یہ جوابات حقیقت کی صحیح تشریح نہیں کرتے۔ پھر ہمارے کانوں میں عرب سے نکلی ہوئی ایک آواز آئی۔ ہم نے اس پر غور کیا، اس کو کائنات کے فریم میں رکھ کر دیکھا، انسانی تاریخ میں اسے آزمایا اور فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کو پہچاننے کی کوشش کی۔ ہم نے دیکھا کہ کائنات، تاریخ اور انسانی نفسیات متفقہ طور پر اس کی تصدیق کر رہے ہیں، ہمارا تمام علم اور ہمارے بہترین احساسات بالکل اس کی تائید میں ہیں۔ جس حقیقت کی ہمیں تلاش تھی اس کو ہم نے پالیا۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

انسان کا المیہ

ڈاکٹر اتم پرکاش (۱۹۸۲ - ۱۹۲۸) ہندستان کے ایک نامور سرجن تھے۔ وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں شعبہ سرجری کے ہیڈ تھے۔ ڈاکٹر پرکاش کو پدم بھوشن کا انعام ملا تھا۔ سرجری کی عالمی کانگرس ۱۷ فروری کو دہلی میں ہونے والی تھی جس کی صدارت کی کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر ۱۴ فروری کو ان پر دل کا دورہ پڑا اور اسپتال پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۵۴ سال تھی۔

سرجری پر ہونے والی ورلڈ کانگرس کی کامیابی ان کے ذاتی وقار کو بہت زیادہ بڑھا دیتی۔ اس بنا پر وہ اس کے معاملات میں غیر معمولی دل چسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے راشٹرپتی سنجیوا ریڈی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ کانگرس کا افتتاح کریں۔ مگر جب سارے انتظامات مکمل ہو چکے تو راشٹرپتی بھون سکریٹریٹ سے بتایا گیا کہ راشٹرپتی ان کے اجلاس میں صرف اس وقت شرکت کر سکیں گے جب کہ مرکزی وزیر صحت بھی وہاں موجود ہوں۔ پروٹوکول (آداب شاہی) کے مطابق ایسا ہونا ضروری ہے۔

اس سے پہلے ڈاکٹر پرکاش کے منصوبہ میں وزیر صحت کو بلانا شامل نہ تھا۔ مگر اب ضروری ہو گیا کہ وزیر صحت کو بھی شرکت اجلاس کی دعوت دی جائے۔ ڈاکٹر پرکاش نے وزیر صحت کے دفتر کا طواف شروع کیا۔ مگر اب یہاں دوسری رکاوٹ حائل تھی۔ وزیر صحت اجلاس میں شرکت پر راضی نہ ہو سکے۔ ایک ایسے اجلاس میں شرکت کرنا ان کی عزت نفس کے خلاف تھا جس کے اولین پروگرام میں ان کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہ صدمات ڈاکٹر اتم پرکاش کے لئے اتنے سخت ثابت ہوئے کہ اجلاس کے تین دن پہلے ان پر دل کا سخت دورہ پڑا اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کوئی شخص اپنے وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ مگر ایک اخباری مبصر (ہندستان ٹائمس ۱۶ فروری ۱۹۸۲) کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ موت کے طویل سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ دہلی کے سب سے زیادہ پریشان آدمی تھے:

He was the most worried man in town before he took the long road

آج آدمی وقار کے کھونے کو بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ پھر آنے والی دنیا میں آدمی کا کیا حال ہوگا۔ جب اس کو بھوک اور پیاس لگے گی مگر وہاں کھانا نہ ہوگا جس کو وہ کھائے اور پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنی پیاس بجھائے۔ وہ تیز دھوپ میں جل رہا ہوگا مگر اس کے لئے کوئی سایہ نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے۔ عذاب اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگا مگر وہاں کوئی مددگار نہ ہوگا جو اس کی مدد کو پہنچے۔ آہ وہ انسان جو کنکری کی چوٹ برداشت نہیں کر پاتا حالانکہ اس کے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔

داعی اور مدعو

سڑک پر ہر وقت آدمی چلتے رہتے ہیں۔ مگر آنے جانے والوں میں کبھی "ملاقات" نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک دائیں سے نکل جاتا ہے اور دوسرا بائیں سے۔ جب کہ ملاقات کے لئے ضروری ہے کہ دونوں آدمی ایک رخ پر چل رہے ہوں۔

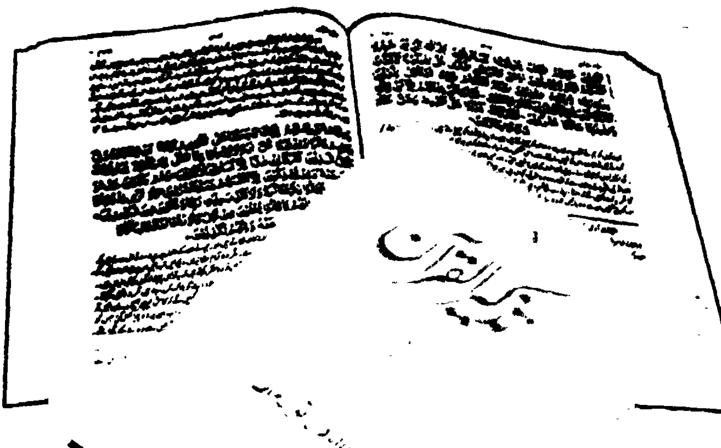
"دائیں بائیں" کا اصول سڑک کے لئے بہت کارآمد ہے مگر وہ ہر موقع کے لئے کارآمد نہیں۔ زندگی کے ایسے راستے بھی ہیں جہاں ملاپ درکار ہے نہ کہ ادھر اُدھر سے کترا کر نکل جانا۔ ان راستوں میں آپ کو بھی اسی رخ پر چلنا پڑے گا جس رخ پر دوسرا چل رہا ہے۔ ورنہ آپ ان راستوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

دعوت کا راستہ ایسا ہی ایک راستہ ہے۔ یہاں اعراض کے بجائے ملاقات کا اصول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ داعی اور مدعو کا سامنا ہی نہ ہوگا اور جب سامنا نہ ہوگا تو دعوت کس طرح پیش کی جائے گی اور وہ کس کے کان میں پڑے گی۔

مدعو اگر انگریزی زبان بولنے والا ہے تو آپ ہندی زبان بول کر اس کو اپنی دعوت سے باخبر نہیں کر سکتے۔ ضروری ہے کہ داعی بھی وہی زبان بولے جو مدعو کی زبان ہے۔ مدعو اگر ایک قومیت کا ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہے تو آپ دوسری قومیت کا ہنگامہ کھڑا کر کے اس کو اپنے پیغام سے قریب نہیں کر سکتے۔ اس کے بجائے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ قومیت سے بلند ہو کر ایسی اجتماعی اساس تلاش کریں جو دونوں کے درمیان مشترک ہو۔ مدعو اگر آپ سے روٹھ کر اپنا منھ پھیرے ہوئے ہے تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنا منھ بھی دوسری طرف پھیر لیں۔ اس کے بجائے آپ کو یک طرفہ طور پر شکایات کو ختم کرنا ہوگا تاکہ دونوں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جو کسی سنجیدہ پیغام کو سنانے کے لئے ضروری ہے۔

قومی مسلک میں جو چیز امرت ہے وہ دعوتی مسلک میں زہر ہے۔ مفاد پرستانہ سیاست میں جو اصول زندگی کا پہلا گر ہے وہ دعوت حق کی سیاست میں صرف اس قابل ہے کہ اس کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے۔ شخصی قیادت کے کاروبار میں جو چیز کامیابی کا زینہ ہے وہ دعوت کے عمل میں صرف ناکامی تک پہنچانے والا ہے۔ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

داعی ہمیشہ مدعو کی رعایت کرتا ہے اور غیر داعی صرف اپنی رعایت کرنا جانتا ہے۔ داعی کو حق کا جھنڈا کھڑا کرنے کی فکر ہوتی ہے اور غیر داعی کو صرف اپنا جھنڈا کھڑا کرنے کی۔ داعی مدعو کا خیر خواہ ہوتا ہے اور غیر داعی صرف اپنا۔



تذکیر القرآن

جلد اول — سورۃ فاتحہ — سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ — قاسم جان اسٹریٹ — دہلی ۱۱۰۰۰۶

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ـــــ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ـــــ الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

Regd. D(DN) No. 552 Issue No. 75

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

الرسالہ

سرپرست

مولانا وحیدالدین خاں

اس دنیا میں زندہ رہنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ
ہر آدمی کے پاس ایک ایسا قبرستان ہو
جس میں وہ لوگوں کے قصوروں کو دفن کر سکے

مارچ ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۶

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

مارچ ۱۹۸۳
شمارہ ۷۶

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے

۱۔ سچا راستہ	ایک روپیہ پچاس پیسے
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	دو روپیہ پچاس پیسے
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک ۲۰ ڈالر امریکی

اصلاح کا طریقہ

ایک ہے برائی کو برا سمجھنا اور ایک ہے برے آدمی کو برا سمجھنا۔ دونوں میں ظاہری الفاظ کے اعتبار سے معمولی فرق نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا فرق ہے کہ ایک اسلام بن جاتا ہے اور دوسرا غیر اسلام۔ ایک خدا سے ڈرنے والا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ ان لوگوں کا ہے جو خدا سے بے خوف ہو چکے ہوں۔

قرآن میں ہے کہ شیطان انسان کا دشمن ہے (ان الشیطان للانسان عدو مبین، یوسف ۱۲) دوسری طرف فرمایا کہ آخرت کے عذاب سے وہ لوگ محفوظ رہیں گے جو لوگوں کو برائی سے روکتے تھے (انجینا الذین ینھون عن السوء، الاعراف۔ ۱۶۵)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف مہم چلانا شیطانی فعل ہے۔ اس کے برعکس آدمی اگر برائی کو نشانہ بنائے اور برائی کو (نہ کہ برے آدمی کو) مٹانے کی کوشش کرے تو یہ فعل خدا کو اتنا پسند ہے کہ اس کی وجہ سے وہ آدمی کو آخرت میں بخش دے گا اور اس کو جنت کے باغوں میں داخل کرے گا۔

آج اگر مسلم معاشرہ کو دیکھئے تو ہر جگہ آپ کو یہ منظر دکھائی دے گا کہ لوگ برائی کو مٹانے کے نام پر ایک یا زیادہ آدمیوں کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کوئی خاندان ہو یا کوئی محلہ، کوئی قوم ہو یا کوئی ملک ہر جگہ کچھ افراد لوگوں کی مخالفانہ کارروائیوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ لوگ برائی کے نام پر کسی شخص خاص کو مٹانے کے لئے اپنی ساری توجہ لگائے ہوئے ہیں۔

اگر برائی کو مٹانے کا ذہن ہو تو آدمی کو برائی سے دشمنی ہوتی ہے نہ کہ کسی شخص خاص سے جس کو برا مشہور کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی آدمی میں برائی پائی جائے تو ایسا آدمی صرف معلوم برائی کی حد تک اس کو برا سمجھتا ہے۔ جب کہ دوسرے ذہن کے لوگ ایک برائی کی بنا پر اس کی پوری شخصیت ہی کو قابل نفرت سمجھنے لگتے ہیں۔ برائی کو برا سمجھنے والوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ اگر برا آدمی اپنی اصلاح کرے تو اس کے بعد وہ ان کا دوست بن جاتا ہے۔ جبکہ دوسری قسم کے لوگوں کو اس کی اصلاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اس کی ذات کے دشمن بن جاتے ہیں اور اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک اس کو ہلاک نہ کر لیں، اسی طرح برائی کو برا سمجھنے والا اپنے اور غیر میں فرق نہیں کرتا۔ مگر جو شخص برے فرد کو نشانہ بنانے کا مزاج رکھتا ہو وہ اپنے حلقہ کے آدمی کو ایک نظر سے دیکھے گا اور دوسرے حلقہ کے آدمی کو دوسری نظر سے۔ برائی کے خلاف اٹھنے والا آدمی عین اس وقت بھی برے آدمی کے لئے دعائیں کر رہا ہوتا ہے جب کہ وہ اس کی برائی کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔

خدا کی نظر سے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص کسی شخص کو مار ڈالے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو مار ڈالا ہو یا زمین میں فساد کیا ہو، تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا۔ اور جس نے کسی کو زندگی دی تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندگی دی (مائدہ ۳۲)

عام طور پر لوگ ان بڑے بڑے مجرمین کو مجرم سمجھتے ہیں جنھوں نے "ایٹم بم" گرا کر پوری پوری بستی کو تباہ کر ڈالا ہو۔ مگر اللہ کی نظر میں ایک شخص کو قتل کر دینے والا بھی اتنا ہی بڑا مجرم ہے جتنا سارے انسانوں کو قتل کرنے والا۔ کیونکہ ایک شخص کو قتل کر کے وہ آدمی اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ انسانی جان کے بارے میں اس کے اندر احترام کی نفسیات نہیں۔ اور جو شخص ایک بندہ خدا کے قتل کے بارے میں بے خوف ہو وہ سارے بندگان خدا کے بارے میں بے خوف ہو سکتا ہے۔

خدا کی نظر میں انفرادی جرم بھی اتنا ہی بڑا ہے جتنا کوئی اجتماعی جرم۔ کسی مقام پر بڑا فساد ہو جائے یا قومی سطح پر کوئی مصیبت پیش آجائے تو تمام لوگ اس کے سلسلہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جب ایک شخص کو ستایا جا رہا ہو یا ایک شخص کو کوئی ظالم اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہو تو ایسے واقعہ کو لوگ معمولی سمجھتے ہیں، اس کے دفعیہ کے لئے کوئی نہیں اٹھتا۔ مگر خدا کی نظر میں فرد کے خلاف ظلم بھی اتنا ہی بڑا ہے جتنا کسی اجتماع کے خلاف ظلم۔

جو لوگ اجتماعی ظلم کے موقع پر سرگرمی دکھائیں اور جب انفرادی ظلم کا موقع سامنے آئے تو وہ متحرک نہ ہوں وہ معاملہ کو اپنی نظر سے دیکھ رہے ہیں نہ کہ خدا کی نظر سے اور جو لوگ معاملہ کو اپنی نظر سے دیکھیں وہ خدا کے یہاں کسی انعام کے مستحق کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ معاملہ کو خدا کی نظر سے دیکھتے تو دونوں قسم کے مواقع پر متحرک ہوتے۔ جب وہ ایک قسم کے موقع پر متحرک ہوئے اور دوسری قسم کے موقع پر خاموش بیٹھے رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اٹھنا ان کے اپنے جذبات و خواہشات کے زیر اثر تھا نہ کہ خدا کے حکم کے زیر اثر۔

انسان کو رب بنانا

قرآن میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں صرف ایک معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں (التوبہ ۳۱)

امام احمد اور امام ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ انھوں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کی عبادت تو کبھی نہیں کی۔ آپ نے فرمایا:

بلیٰ اِنھم حرموا علیھم الحلال واحلوا لھم الحرام فاتبعوھم فذالک عبادتھم ایاھم (تفسیر ابن کثیر)	ہاں، ان کے علماء و مشائخ نے ان پر حلال کو حرام کیا اور حرام کو ان کے لئے حلال کیا۔ تو انھوں نے ان کی پیروی کی۔ ان کا یہی فعل علماء و مشائخ کی عبادت ہے۔

عبادت کی یہ قسم کوئی انوکھی نہیں۔ اس کو آج بھی آپ ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارا ایک قائد یا ایک بزرگ کسی شخص سے بگڑ جائے اور اس کے خلاف انتقامی کارروائی کرے تو اس کے تمام معتقدین اس میں اس کا ساتھ دیں گے۔ حالانکہ خدا کی شریعت میں یہ حرام ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف انتقامی کارروائی کرے۔ اس کے بعد اس بزرگ کے تمام معتقدین اس کو جائز سمجھ لیں گے کہ اس شخص کو ہر طریقہ سے ستائیں۔ اس کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی باتیں مشہور کریں۔ اس شخص کے بارے میں خدا کے ان تمام احکام کو بھول جائیں جو انسان کے حقوق یا مسلمان کے احترام کے بارے میں دئے گئے ہیں۔ ایسی صورت پیش آنے کے بعد وہ اپنے بزرگ کو خوش کرنے والے دین پر چلیں گے نہ کہ خدا کو خوش کرنے والے دین پر۔ اس کے لئے وہ حرام کو حلال کریں گے اور حلال کو حرام بنائیں گے اور انھیں کبھی خیال تک نہ آئے گا کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا رب بنانے کی غلطی کر رہے ہیں۔

کسی بزرگ سے آدمی کو اتنا شدید تعلق کیوں ہوتا ہے کہ اس کی خاطر وہ خدا کے احکام تک کو بھول جاتا ہے، اس کا راز اداراتی مذہب (Institutionalised Religion) ہے۔ اداراتی مذہب دراصل مذہب کے گدی بن جانے کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح جائداد کے وراثتی نظام میں ایک شخص محض اس لئے ایک بڑی جائداد کا مالک بن جاتا ہے کہ وہ اس کو وراثت میں مل گئی ہے۔ اسی طرح اداراتی مذہب میں یہ ہوتا ہے کہ ماضی سے بزرگوں کی جو ایک گدی چلی آرہی ہے، بس اسی کی اصل اہمیت ہوتی ہے۔ اور جو شخص اس گدی پر بیٹھ جائے وہ مذکورہ گدی کا گدی نشین ہونے کی وجہ سے ان تمام کرامات و اوصاف کا حامل سمجھ لیا جاتا ہے جو روایتی طور پر اس گدی کے بارے میں ماضی سے چلی آرہی ہیں۔

دو قسم کے بیج

زمین میں ایک سڑا ہوا بیج ڈالا جائے تو وہ مزید سڑ گل کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کو نہ کوئی ہرا لباس ملتا اور نہ اس پر کبھی بہار آتی۔ اس کے اجزاء اگرچہ زمین میں موجود رہتے ہیں مگر ان کے وجود کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ دنیا میں نہ ان کا کوئی مقام ہوتا اور نہ دنیا کی چیزوں میں ان کا کوئی حصہ ہوتا۔

اس کے برعکس زمین میں اگر ایک اچھا بیج ڈالا جائے تو وہ دوبارہ ایک زندہ وجود کے طور پر باہر آتا ہے۔ وہ ایک ہرا بھرا درخت بن کر پہلے سے زیادہ بہتر صورت میں زمین کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ ساری کائنات اس کے لئے غذائی دسترخوان بن جاتی ہے۔ وہ ایک انتہائی مکمل وجود کی صورت میں زمین کے اوپر اپنی جگہ حاصل کرتا ہے۔

یہ خدا کی ایک نشانی ہے جو آخرت کے معاملہ کو ہمیں واقعات کی زبان میں بتاتی ہے۔ وہ آخرت کے معاملہ کو ہماری آنکھوں کے سامنے مصوّر کرتی ہے۔

ایک انسان وہ ہے جو غیر صالح ہے۔ ایسے انسان کی مثال خراب بیج کی ہے۔ وہ مرنے کے بعد زمین میں دفن ہوگا، صرف اس لئے کہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے۔ ایک سڑے ہوئے وجود کے سوا اس دنیا میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو صالح انسان ہے۔ اس کی مثال عمدہ بیج کی ہے۔ وہ بھی اگرچہ مرنے کے بعد زمین میں دفن ہوگا۔ مگر وہ اس لئے دفن ہوگا کہ پہلے سے زیادہ شاداب ہو کر ایک نئی زندگی کی صورت میں نمایاں ہو۔ وہ کائنات میں اپنے لئے دوبارہ بہترین مقام پا سکے۔ وہ خدا کے باغ میں سرسبز درخت کی طرح نشوونما پائے۔

اسی سے جہنم کا معاملہ اور جنت کا معاملہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جہنم گویا ایک خراب زمین ہے جہاں تمام سڑے ہوئے بیج پھینک دئے جائیں گے۔ اس کے برعکس جنت گویا بہترین زرخیز زمین ہے جہاں تمام بہترین بیج چھانٹ کر ڈالے جائیں گے تاکہ وہ سرسبز و شاداب فصل کی صورت میں اُگیں اور بہترین موافق ماحول میں لہلہائیں۔

پھر بھی انھیں الفاظ مل گئے

مکہ کے سردار قبیلہ بنی ہاشم سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کردیں تاکہ وہ آپ کو قتل کردیں۔ مگر بنو ہاشم کے سردار ابو طالب نے کہا: خدا کی قسم محمد کو ہم تمھارے حوالے نہیں کریں گے، یہاں تک کہ ہمارا ایک ایک شخص ہلاک ہو جائے۔ بالآخر نبوت کے ساتویں سال قریش نے بنو ہاشم کے خلاف بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا جو کعبہ کے اندر آویزاں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم مجبور ہوئے کہ مکہ کے باہر ایک گھاٹی (شعب بنی المطلب) میں پناہ لیں

یہ بے حد سخت امتحان تھا۔ گھر کا اندوختہ شروع کے کچھ دنوں میں کام آتا رہا۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ درخت کی جڑوں اور پتوں سے لوگ پیٹ بھرنے لگے۔ باہر کا قافلہ مکہ آتا تو آپ کے ساتھی بازار جاتے کہ کچھ کھانے پینے کا سامان خرید کر لائیں۔ مگر ابولہب نکل کر تاجروں سے کہتا کہ تم لوگ محمد کے ساتھیوں کو اتنی زیادہ قیمت بتاؤ کہ وہ خریدنے سے عاجز رہیں۔ چنانچہ وہ قیمتیں بہت بڑھا دیتے اور آپ کے ساتھی اسی حال میں واپس آتے کہ ان کے بچے بھوک سے رو رہے ہوتے اور ان کا پیٹ بھرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہ ہوتا۔

جب تین سال گزر گئے تو ایسا ہوا کہ دیمک کعبہ کے اندر داخل ہوئی اور مذکورہ ظالمانہ معاہدہ (صحیفہ) کو کھا گئی۔ اللہ کے نام کے سوا اس میں کچھ باقی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر کردی۔ آپ نے ابو طالب سے اس کو بیان کیا۔ ابو طالب نے کہا، کیا آپ کے رب نے آپ کو اس سے باخبر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ اس کے بعد ابو طالب قریش کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے، اور وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کہ تمھارے صحیفہ پر خدا نے دیمک مسلط کردی اور وہ اس کی تمام ظلم وجور کی دفعات کو کھا گئی، اب اس میں صرف خدا کا نام باقی رہ گیا ہے، اس لئے تم لوگ کعبہ کا دروازہ کھول کر اس صحیفہ کو دیکھو۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو تم کو چاہئے کہ تم اپنے ظلم سے باز آجاؤ۔

قریش کے سردار اس پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے کعبہ کا دروازہ کھول کر صحیفہ نکالا تو واقعۃً وہ خبر بالکل صحیح تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دی تھی، مگر اس کے باوجود وہ اپنے ظلم اور سرکشی سے باز نہ آئے اور ابو طالب سے کہا: یہ تمھارے بھتیجے کا جادو ہے (ھٰذا سحر ابن اخیک)

چھوڑی ہوئی سنت

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکی دور میں قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن بنے ہوئے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ آپ پھر بھی ان کی نصیحت اور خیر خواہی میں لگے ہوئے تھے۔ آپ برابر ان کی ہدایت اور نجات کے لئے دعا کرتے رہتے (یبذل لھم النصیحۃ ویدعوھم الی النجاۃ مما ھم فیہ)

اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ طفیل بن عمرو الدوسی مکہ آئے۔ قریش نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس طرح بدگمان کر دیا کہ وہ آپ سے ملتے ہوئے ڈرتے تھے۔ تاہم ایک روز انھوں نے بیت اللہ میں آپ سے قرآن سنا اور اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ مسلمان ہو گئے۔

اس کے بعد طفیل بن عمر الدوسی اپنے وطن گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے قبیلہ والوں کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر باپ اور بیوی کے سوا کسی نے اسلام قبول نہ کیا۔ وہ دوبارہ مکہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ انھوں نے قبیلہ دوس کے بارے میں سخت تاثر کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں ابن اسحاق نے ان کی جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثم دعوتُ دوسا الی الاسلام فأبطؤا علیّ ثم جئت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ فقلت لہ یا نبیّ اللہ انہ قد غلبنی علی دوس الزنا فادع اللہ علیھم فقال اللھم اھدِ دوسًا، ارجع الی قومک فادعُھم وارفق بھم

(سیرۃ ابن ہشام)

پھر میں نے قبیلہ دوس کو اسلام کی دعوت دی، مگر انھوں نے ماننے میں دیر کی۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ آیا اور آپ سے کہا کہ اے خدا کے رسول، قبیلہ دوس کھیل تماشے میں منہمک ہے، اس کے لئے بددعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا، اے اللہ قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔ مجھ سے فرمایا کہ تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ۔ اس کو اسلام کی دعوت دو اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔

کہنے والے نے آپ سے بددعا کی درخواست کی تھی مگر آپ اس کے جواب میں دعا کرنے لگے۔

دعوت سے غفلت

ترکی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہاں ایک قابل لحاظ تعداد عیسائیوں کی بھی ہے۔ ترکی کے سلطان سلیم نے ایک بار ارادہ کیا کہ ترکی کے تمام غیر مسلم باشندوں کو اسلام قبول کرنے کا حکم دے دے۔ جو لوگ اسلام قبول کریں وہ ترکی میں رہیں اور جو لوگ اسلام قبول نہ کریں ان کو ملک سے نکال دیا جائے۔

اس وقت ترکی کے ایک عالم مفتی جمال سامنے آئے۔ انھوں نے بادشاہ سے صاف لفظوں میں کہا کہ تمھارے لئے ایسا کرنا جائز نہیں (لا یحل لک ذلک) امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ اگر سلطان سلیم کا یہ ارادہ پورا ہو جاتا تو آج ترکی میں عیسائیوں کا وجود نہ ہوتا۔ مگر مفتی جمال نے اس قوت کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کیا اور اس کے حق میں ایسی دلیلیں دیں کہ سلطان سلیم کا عزم اس کے بعد ٹھنڈا ہو کر رہ گیا (تعلیقات بر مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۱۷۷)

اس طرح کی جرأت کی مثالیں ہماری جدید تاریخ میں بہت ملتی ہیں۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اسی طرح کی قوت اور اہمیت کے ساتھ کسی عالم نے دعوت الی اللہ کے فریضہ کی طرف عوام یا ارباب کار کو توجہ دلائی ہو۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ ہمارے علماء کے ذہن پر فقہی نقطۂ نظر کا غلبہ ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام علماء کے اندر جو مزاج بناتا ہے اس میں فقہی امور تو پوری شدت کے ساتھ ان کے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ مگر دعوتی امور ان کے ذہن کے خانہ میں جگہ نہیں پاتے۔

ہمارے موجودہ نظام تعلیم کی بنیاد فقہ پر ہے نہ کہ دعوت پر۔ اس کا نصاب اور اس کا نظام تمام تر فقہی ضروریات و مسائل کے اعتبار سے بنا ہے۔ دعوتی مسائل و ضروریات کی اس میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ ایسی حالت میں یہی ممکن ہے کہ فقہی امور کے بارے میں لوگ بے حد حساس ہوں مگر دعوتی امور کے بارے میں ان کے اندر حساسیت نہ پائی جائے۔

مفتی جمال نے سلطان ترکی سے جو بات کہی وہ بجائے خود بالکل صحیح تھی۔ لیکن اگر ان کے اندر دعوتی ذہن ہوتا تو سلطان سے وہ یہ کہتے کہ دوسری قوموں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں لانا عین مطلوب ہے اور اس اعتبار سے تمھارا جذبہ قابل قدر ہے۔ مگر یہ کام تم کو تبلیغ و دعوت کے ذریعہ کرنا چاہئے نہ کہ جبر و قوت کے ذریعہ۔

اسلوب بیان

عبداللہ بن ابی نے اگرچہ اسلام قبول کرلیا تھا۔ مگر اس کی جاہ پسندی اسے ایک ایسے اسلام کا مخلص اور وفادار نہ بنا سکی جس کی سرداری اس کے سوا کسی اور کو حاصل ہو۔ چنانچہ وہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے خلاف سازشیں کیا کرتا تھا۔

ایک بار آپ کے اصحاب نے آپ سے کہا کہ آپ عبداللہ بن ابی کے یہاں تشریف لے چلیں۔ اس سے اس کی عزت افزائی ہوگی اور ممکن ہے کہ اس کی ضد میں کمی ہو اور وہ اسلام کا مخلص بن جائے۔ چنانچہ آپ ایک گدھے پر سوار ہو کر اپنے بعض اصحاب کے ساتھ اس کے مقام کی طرف روانہ ہوئے۔

آپ عبداللہ بن ابی کے مکان پر پہنچے تو اس کے گھمنڈ میں اور اضافہ ہوگیا۔ اس نے آپ کو گدھے پر دیکھ کر کہا: "ذرا دور رہیے، آپ کی سواری کی بو سے مجھ کو تکلیف ہو رہی ہے"۔ اس کو سن کر ایک انصاری کو غصہ آگیا۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گدھا تجھ سے زیادہ خوشبودار ہے:

واللہ لحمار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطیب ریحاً منک (مسند احمد، جلد ۳)

صحابی کے اس جملہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ واقعی وہ گدھے میں ایسی خوشبو پا رہے تھے جو انسانی جسم سے زیادہ بہتر تھی۔ یہ صرف جواب کا ایک انداز تھا۔ عبداللہ بن ابی نے خوشبو اور بدبو کی زبان میں اپنی بات کہی تھی، صحابی نے بھی اسی زبان میں اس کا جواب دیا۔ یہ دراصل جوابی اسلوب میں یہ بتانا تھا کہ تم جانور سے نفرت کر رہے ہو۔ حالانکہ تم منافقت میں مبتلا ہو، اور منافقت خدا کے نزدیک جانور سے بھی زیادہ بدتر چیز ہے۔

تغلق خاندان کے ایک بادشاہ نے ایک عالم دین کو بلایا اور اس سے کسی مسئلہ پر گفتگو کی۔ عالم کا جواب سلطان کی مرضی کے خلاف تھا۔ سلطان نے بگڑ کر کہا: کیا تم میری تلوار سے نہیں ڈرتے (اما تخاف سیفی) عالم نے کہا: ہاں، اور اسی لئے میں اپنی پگڑی کو اپنا کفن سمجھتا ہوں (نعم ولذا احسب عمامتی کفنی، نزہتہ الخواطر)

عالم کا یہ جملہ بھی حقیقۃً ایک اسلوب ادا ہے۔ ان کے سر پر پگڑی تھی۔ اس لئے انھوں نے پگڑی کے اسلوب میں جواب دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعتہً وہ پگڑی کو اپنا کفن سمجھ کر پہنتے تھے۔

صحابی کی توبہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھوتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں، پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے (الاعراف ۲۰۲ - ۲۰۱)

اللہ کا ڈر کس طرح آدمی کو برائی کے وقت چونکا دیتا ہے، اس کی ایک مثال حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر کا واقعہ ہے۔ بنو قریظہ ایک یہودی قبیلہ تھا جو مدینہ کے قریب آباد تھا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر معاہدہ کے خلاف بنو قریظہ نے غداری کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف فوج بھیجی۔ تقریباً ایک مہینہ تک ان کا محاصرہ جاری رہا۔ اس کے بعد بنو قریظہ کی درخواست پر حضرت سعد بن معاذ کو ان کے معاملہ کا حَکَم بنایا گیا۔ کہ وہ جو فیصلہ کریں فریقین اس کو منظور کرلیں۔

اس دوران میں بنو قریظہ نے حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر انصاری کو بلایا۔ زمانہ جاہلیت میں ابولبابہ اور بنو قریظہ کے درمیان اچھے تعلقات تھے اور ابھی تک ان سے ان کے مالی معاملات باقی تھے۔ بنو قریظہ کو امید تھی کہ وہ ان کو صحیح مشورہ دیں گے۔ حضرت ابولبابہ جب بنو قریظہ کے یہاں پہنچے تو بنو قریظہ کے مرد اور عورت اور بچے سب ان کے گرد جمع ہوگئے۔ ان میں بہت سے رونے لگے۔

بنو قریظہ نے حضرت ابولبابہ سے پوچھا کہ تمھاری کیا رائے ہے۔ کیا ہم رسول اللہ کے حُکم کو منظور کرلیں اور اس کے فیصلہ پر راضی ہوجائیں۔ یہ بہت جذباتی موقع تھا۔ حضرت ابولبابہ کو معلوم تھا کہ بنو قریظہ کے لئے قتل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ کیونکہ تورات میں غدر کی سزا یہی ہے۔ تاہم ان کی زبان پر یہ الفاظ نہ آسکے۔ انھوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اپنی حلق پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بتایا کہ حُکم کو ماننا اپنے آپ کو ذبح کرانا ہے (اشار بیدہ الی حلقہ انہ الذبح، سیرۃ ابن کثیر)

بنو قریظہ سے تعلق کی بنا پر حضرت ابولبابہ سے یہ عمل ہوگیا۔ مگر اس کے فوراً بعد ان کا جو حال ہوا وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

ال ابو لبابة فوالله مازالت قدمای من مکانهما حتی عرفتُ انی قد خُنتُ اللہ ورسوله (سیرۃ ابن کثیر)

خدا کی قسم میرے دونوں پاؤں ابھی اپنی جگہ سے ہٹے بھی نہ تھے کہ میں نے جان لیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی ہے۔

حضرت ابولبابہ احساس جرم لئے ہوئے بنو قریظہ کے یہاں سے لوٹے۔ چنانچہ وہ اپنے گھر نہیں گئے بلکہ مسجد نبوی پہنچے۔ وہاں انھوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا۔ انھوں نے عہد کیا کہ میں نہ کچھ کھاؤں گا اور نہ کچھ پیوں گا۔ یہاں تک کہ میری موت آجائے یا اللہ میری توبہ قبول کرے۔ اسی حال میں ایک ہفتہ پڑے رہے۔ مسلسل فاقہ کی وجہ سے غشی طاری ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا: ابولبابہ اگر سیدھے میرے پاس آجاتے تو میں ان کی بخشش کے لئے دعا کرتا۔ مگر جب وہ ایسا کر گزرے ہیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو نہ کھولوں گا، جب تک کہ اللہ کی طرف سے حکم نہ آجائے۔ بالآخر اللہ کی طرف سے توبہ نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے کھول کر انھیں آزاد کیا۔

غلطی سچے مومن سے بھی ہوتی ہے اور منافق سے بھی۔ نہ صرف چھوٹی غلطیاں بلکہ بڑی غلطیاں بھی دونوں سے ہوسکتی ہیں۔ تاہم دونوں کی غلطیوں میں ایک فرق ہے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ بشری تقاضے کی بنا پر اس سے غلطی تو ہو جاتی ہے۔ مگر جلد ہی بعد وہ چونک اٹھتا ہے۔ اس کا احتساب خویش کا جذبہ اس کو اپنی غلطی پر متنبہ کر دیتا ہے، اس وقت نہایت شدت کے ساتھ اس کے اوپر برعکس جذبہ طاری ہوتا ہے۔ غلطی کرتے وقت اگر بظاہر وہ اطاعت خداوندی سے باہر نکل گیا تھا تو اب دگنا شدت کے ساتھ وہ اطاعت خداوندی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ وہ روتا ہے، وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، وہ بے تابانہ چاہنے لگتا ہے کہ کسی طرح وہ اپنی پچھلی غلطی کی تلافی کرے اور آئندہ ایسی غلطی سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے۔

اس کے برعکس منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ غفلت کے ساتھ غلطی کرتا ہے اور غلطی کرنے کے بعد بھی بدستور غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ اپنی غلطی کے احساس سے اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ اس پر شرمندگی اور تلافی کا کوئی طوفان نہیں گزرتا۔ وہ اپنی غلطی کے صرف دنیوی پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے نہ کہ ان پہلوؤں پر جو آخرت میں اس کے سامنے ظاہر ہوں گے۔

مومن کی غلطی اس کو خدا سے اور قریب کر دیتی ہے اور منافق کی غلطی صرف اس کو خدا سے دور کرنے کا سبب بنتی ہے۔

عالی ظرفی

مظفر حلیم (متوفی ۹۳۳ھ) گجرات کا حاکم تھا اور محمود خلجی مانڈو (احمد آباد) کا۔ دونوں ہم زمانہ تھے۔ پاس پاس ہونے کی وجہ سے دونوں میں باہم لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ محمود خلجی اکثر گجرات پر حملہ کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس "خوبصورت اور سرسبز" ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔ تاہم اسے اپنے ارادہ میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس درمیان میں ایک واقعہ پیش آیا جو بظاہر مظفر حلیم کے لئے بہت خوش کن تھا۔ وہ یہ کہ اس کے حریف محمود خلجی کے وزیر منڈلی رائے نے موقع پاکر بغاوت کردی۔ اس کی بغاوت کامیاب رہی، اس نے سلطان کو تخت سے بے دخل کردیا اور خود ملک پر قابض ہوگیا۔ تاہم سلطان محمود خلجی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگیا۔

اب اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا کرے۔ اس کی نظر میں صرف ایک ہی شخص تھا جو اس نازک وقت میں اس کی مدد کرسکتا تھا اور یہ وہی سلطان مظفر حلیم تھا جس کے اوپر وہ اپنے اقتدار کے زمانہ میں بار بار حملے کرچکا تھا۔ سلطان محمود خلجی کو معلوم تھا کہ سلطان مظفر حلیم اگرچہ اس کا حریف ہے مگر وہ ایک بہادر اور شریف انسان ہے۔ اور شریف اور بہادر انسان کی یہ صفت ہے کہ وہ مدد مانگنے والے کی مدد کرتا ہے، خواہ وہ اس کا حریف اور دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

سلطان محمود خلجی نے کئی دن کے حیص بیص کے بعد بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سلطان مظفر حلیم کے پاس جائے گا اور اس سے مدد طلب کرے گا۔ وہ جرأت کرکے اس کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے باغی وزیر کے خلاف اس کی مدد کرے۔

سلطان مظفر حلیم کو موقع تھا کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل کرے۔ وہ طعن و تشنیع کرکے اس کے بارے میں اپنے سینہ کو ٹھنڈا کرے۔ مگر اس نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ فوراً اپنے حریف سلطان کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ سلطان مظفر حلیم نے حکم دیا کہ اس کی فوج مانڈو کی طرف کوچ کرنے کے لئے تیار ہوجائے۔ اس نے محمود خلجی کو لیا اور خود اپنی فوج کے ساتھ مانڈو کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وزیر منڈلی رائے کی فوج سے زبردست مقابلہ ہوا۔ بالآخر منڈلی رائے کی فوج نے ہتھیار ڈال دئے اور گجرات دوبارہ فتح ہوگیا۔

اب فوجیوں کی فاتحانہ نفسیات نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ سلطان مظفر حلیم کے فوجی سرداروں نے کہا کہ یہ ملک اب آپ کا ہے۔ کیونکہ اس کو آپ کی فوجوں نے لڑکر فتح کیا ہے۔ آپ اس کو محمود خلجی کے حوالے نہ کریں بلکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیں۔ اس معاملہ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

سلطان مظفر حلیم کے لئے یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ تاہم اس نے جرأت سے کام لیا اور اپنے فوجی سرداروں کے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کو یہ بات اپنی بہادری اور غیرت کے خلاف معلوم ہوئی کہ جس ملک کو اس نے سلطان محمود خلجی کے نام پر فتح کیا ہے، اس کو سلطان کے حوالے نہ کرے اور خود اس پر قابض ہو جائے۔ سلطان کی جو شرافت اس کی محرک بنی تھی کہ وہ اپنے دشمن کی مشکل وقت میں مدد کرے، وہی شرافت دوبارہ اس میں مانع ہوگئی کہ وہ دشمن کی کمزوری کا غلط فائدہ اٹھائے اور اس کی چیز کو خود اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس کے ایک طرف شرافت تھی اور دوسری طرف ملک۔ اس نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ ملک کو پانے کی خاطر اپنی شرافت کو کھو دے۔

تاہم سلطان مظفر حلیم کو اندیشہ تھا کہ اس کی فوج اگر مفتوحہ علاقہ میں ٹھہری رہی تو فتح کے جوش میں وہ کوئی نازک مسئلہ نہ کھڑا کر دے اور موجودہ فضا باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک حکم جاری کیا۔ اس حکم میں کہا گیا تھا کہ اس کی فوجوں کا کام اب یہاں ختم ہو چکا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی فوج کا کوئی شخص مزید آگے بڑھ کر مفتوحہ شہر کے اندر نہ داخل ہو۔ تمام کی تمام فوج بلا تاخیر اپنے وطن کی طرف واپس چلی جائے۔

اس حکم پر فوراً عمل ہوا۔ سلطان مظفر حلیم کی فوج اپنے فتح کئے ہوئے ملک کو سلطان محمود خلجی کے حوالے کر کے گجرات واپس چلی گئی۔ سلطان مظفر حلیم نے ایک مفتوحہ ملک کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ اپنی شرافت اور اپنی بہادری کو محفوظ رکھ سکے (ظفر الوا، از آصفی)

کوئی انسان کیا ہے، ہمیشہ غیر معمولی حالات میں معلوم ہوتا ہے اور ان غیر معمولی حالات میں سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی فاتح اور غالب کی حیثیت میں ہو۔ اپنے کو فتح و غلبہ کے مقام پر پاکر بھی جو شخص شرافت اور انصاف پر قائم رہے وہی وہ انسان ہے جو امتحان میں پورا اترا۔

ملت کا سرمایہ

ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (پیدائش ۱۹۴۵) عربی اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی طور پر جانتے ہیں اور ایک زبان سے دوسری زبان کا برجستہ ترجمہ کرسکتے ہیں۔

۳۰ جون ۱۹۸۲ کی ایک ملاقات میں میں نے انھیں قلم کاغذ دیا اور کہا کہ میں ایک انگریزی عبارت بولتا ہوں، اس کو آپ اس کاغذ پر لکھیں اور پھر اس کا ترجمہ عربی زبان میں کریں۔ یہ انگریزی عبارت الرسالہ جولائی ۱۹۸۲ (صفحہ ۱۴) کی تھی جو کہ حسب ذیل ہے :

You've removed most of the roadblocks to success when you've learnt the difference between motion and directon

میں رک رک کر انگریزی عبارت بول رہا تھا اور وہ قلم ہاتھ میں لئے ہوئے کاغذ پر لکھ رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے بولنا ختم کیا، انھوں نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میرے ذہن میں تھا کہ انھوں نے انگریزی عبارت لکھی ہے اور اب مطابقت دیکھنے کے لئے کاغذ مجھے دے رہے ہیں تاکہ اس کے بعد اس کا عربی ترجمہ کریں۔ مگر میں نے تعجب کے ساتھ دیکھا کہ کاغذ پر صرف عربی ترجمہ لکھا ہوا ہے۔ میں جب انگریزی عبارت بول رہا تھا اسی وقت وہ ساتھ ساتھ اس کا عربی ترجمہ لکھتے جا رہے تھے۔ ان کا عربی ترجمہ یہ تھا:

لقد عزلتم معظم عوائق الشارع نحو النجاح عند ما عرفتم الفرق بين الحركة والاتجاه

ملت کے اندر اس طرح کے کتنے نوجوان ہیں جو نادر صلاحیتوں کے مالک ہیں وہ ملت کا اثاثہ ہیں۔ مگر یہ اثاثہ ملت کے کام نہیں آتا، اس قسم کے تمام لوگوں کو اغیار مہنگی قیمت دے کر خرید لیتے ہیں اور ان کو دوسرے دوسرے کاموں میں لگا دیتے ہیں، اسلام کے فرزند اسلام کے کام نہیں آتے۔

اسلام کے محاذ پر ہر طرف کمتر صلاحیت کے لوگ لگے ہوئے ہیں اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ دوسرے محاذوں پر اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اسی مسئلہ کے حل پر ملت کے نئے مستقبل کا راز چھپا ہوا ہے۔

منفی جوش

وکٹر ہیوگو (۱۸۸۵-۱۸۰۲) فرانس کا مشہور ناول نگار ہے۔ اس کے زمانہ میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ وکٹر ہیوگو ایک بار الجزائر گیا۔ وہ کسی ہوٹل میں تھا کہ وہاں کچھ الجزائری مسلمان آگئے۔ ان مسلمانوں کو فرانسیسی ،، کی صورت سے پہلے ہی سے نفرت تھی۔ وہاں اتفاق سے ایک الجزائری مسلمان اور وکٹر ہیوگو کے درمیان کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ فوراً دونوں کے درمیان اشتعال پیدا ہوگیا، یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت آگئی۔ الجزائری مسلمان طاقت ور تھا۔ اس نے وکٹر ہیوگو کو خوب مارا۔

اس موقع پر وہاں اور بھی کئی الجزائری مسلمان موجود تھے۔ مگر انھوں نے وکٹر ہیوگو کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک " فرانسیسی ،، کے مارے جانے پر وہ خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے رہے۔ آخر میں وکٹر ہیوگو نے کہا ـــــ اب تو میں اپنے ملک واپس جارہا ہوں۔ مگر جلد ہی ایک ایسا کام کروں گا جو نہ صرف تم سے بلکہ تمھاری نسلوں تک سے اس کا انتقام لیتا رہے۔

اس واقعہ کے چھ مہینے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وکٹر ہیوگو کی لکھی ہوئی سیرت کی کتاب شائع ہوئی جس کے ایک ایک فقرے میں پیغمبر اسلام کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ اس کے بعد پاکستان کے سابق سفیر برائے فرانس مسٹر قدرت اللہ شہاب نے اس کی تردید میں ایک کتاب لکھی اور اس کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

مسلمان اس کے لئے بہت جلد تیار ہو جاتے ہیں کہ وہ " معاندین اسلام ،، کو ذلیل کریں اور اُن سے کفر و اسلام کے نام پر لڑائی لڑیں۔ اسی طرح ان میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو ان کی مخالفانہ تحریروں کا تیز و تند زبان میں جواب دیں۔ مگر ایسے لوگ ان کے درمیان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے جو ان " معاندین اسلام ،، کو اسلام کا مدعو سمجھیں اور مثبت انداز میں دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو اسلام کی طرف بلائیں۔

اس قسم کی "خدمت اسلام ،، سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ البتہ یہ بہت بڑا نقصان ہوتا ہے کہ وہ معتدل فضا ختم ہو جاتی ہے جس میں دوسری قومیں اسلام پر غور و فکر کریں۔ دوسری قومیں جب ہمارے لئے نفرت کا موضوع بن جائیں تو ان کے لئے ہمارا دین محبت کا موضوع کیوں بنے گا۔

منفی تحریکیں

پروفیسر سی ایم جوڈ نے لکھا ہے: وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے اور جو عوام کے بڑے بڑے گروہوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں ہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ جو لوگ کسی گروہ کے اوپر قیادت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اس کے لئے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کریں جس سے وہ گروہ نفرت کرے یا وہ کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کریں جس سے وہ گروہ ڈرے۔

Guide to Modern Wickedness, P. 153

نفرت اور خوف کے جذبات کو ابھار کر تحریکیں چلانا قرآن کے الفاظ میں عداوت (البقرہ ۳۶) کی بنیاد پر تحریک چلانا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں اندھے جھنڈے اور جاہلی نعرہ کے تحت لڑنا کہا گیا ہے:

من قتل تحت رأية عمية يغضب للعصبية ويقاتل للعصبية فليس من امتي (مسلم)

جو شخص کسی اندھے جھنڈے کے تحت مارا جائے، وہ عصبیت کے لئے غصہ کرے اور وہ عصبیت کے لئے لڑے تو وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

کسی فرد یا گروہ کو برائی کی علامت قرار دے کر اس کے پیچھے پڑنا خود ایک بہت بڑی برائی ہے۔ پھر برائی کے بیج سے بھلائی کا پھل کیسے نکلے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تحریکیں، خواہ وہ حق وصداقت کے نام پر اٹھائی گئی ہوں، ہمیشہ منفی تحریکیں ہوتی ہیں۔ اور منفی عمل سے کبھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ خدا کی دنیا، زمین سے آسمان تک، مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہے۔ شہد کے چھتہ سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک ہر جگہ مثبت اصولوں کی کارفرمائی ہے۔ ایسی دنیا میں وہی تحریک نتیجہ خیز ہوگی جو مثبت بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو، منفی بنیادوں پر کیا جانے والا شور وغل اور اکھیڑ پچھاڑ ایک قسم کا شیطانی عمل ہے، اور شیطانی عمل سے ملکوتی نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔

منفی نعرے لے کر اٹھنا شخصی قیادت قائم کرنے کے لئے انتہائی مفید ہے۔ مگر اس قسم کی تحریک اصلاح کے مقصد کے لئے اتنی ہی بے فائدہ ہے۔ ہر تحریک اپنی دعوت اور سرگرمیوں کے مطابق اپنے متاثرین کا ذہن بناتی ہے۔ جو تحریک منفی بنیادوں پر اٹھے وہ یقیناً اپنے عمل کے دوران لوگوں کا ذہن بھی منفی انداز کا بنائے گی۔ پھر ایسے منفی ذہن کے لوگوں کا انجام خدا کی مثبت دنیا میں اس کے سوا کیا ہے کہ وہ یہاں بالکل بے جگہ ہو جائیں اور کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

نشانہ کا فرق

شیطان کا طریقہ عداوتِ آدم ہے اور پیغمبر کا طریقہ عداوتِ فساد۔ شیطانی عمل کا محرک ضد اور حسد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ "شخص" کو اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبرانہ عمل کا محرک برائی کو دور کرنا ہے۔ اس لئے پیغمبر کا سارا زور برائی کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ برائی کرنے والے کے خلاف۔

رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم نے مکہ میں تحریک شروع کی تو عمر بن الخطاب آپ کے زبردست مخالف بن گئے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ عمر بن الخطاب کو شخصی طور پر ختم کرنے کی مہم شروع کردیں۔ اس کے بجائے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ خدایا عمر ابن الخطاب کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے۔ اسی طرح مدینہ میں ایک نام نہاد مسلمان عبداللہ ابن ابی آپ کے خلاف مسلسل سازشیں کرنے لگا۔ مگر آپ نے ایسا نہ کیا اس کے قتل کا منصوبہ بناتے۔ آپ نے مدینہ کا حاکم ہونے کے باوجود اس کو زندہ رہنے دیا یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مرا۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا مقصد شعوری یا غیر شعوری طور پر جاہ و مرتبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے کے مقابلے میں اپنے کو بڑا بنانا۔ اس قسم کی تحریک ہمیشہ کچھ متعین افراد یا گروہوں کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ ایک شخص یا گروہ کو بڑائی کے مقام تک پہنچنے کے لئے ہمیشہ دوسرا شخص یا گروہ رکاوٹ ہوتا ہے۔ اس لئے حصول جاہ کی تحریکیں ہمیشہ ان لوگوں کے خلاف اٹھتی ہیں جو عملاً جاہ کے مقامات پر قابض ہوں۔

اس کے برعکس معاملہ ان تحریکوں کا ہوتا ہے جو خوف خدا اور فکر آخرت کی بنیاد پر اٹھیں۔ ایسی تحریکوں کی توجہ ہمیشہ اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ برائی کرنے والوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کریں کہ وہ اپنی برائی کو چھوڑ دیں اور دنیا و آخرت میں خدا کے غضب سے بچ جائیں۔ ایسی تحریک کو لے کر اٹھنے والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ برائی کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کرسکتے۔ مگر برائی کرنے والے کو ہر وقت گلے لگانے پر تیار رہتے ہیں۔ برائی کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دینے کے باوجود برائی کرنے والے کے لئے ان کے دل میں خیر خواہی ہوتی ہے اور اس کے حق میں ان کی زبان سے ہمیشہ دعائیں نکلتی رہتی ہیں۔

آپ کو اٹھنا ہے تو برائی کے خلاف اٹھئے نہ کہ برائی کرنے والے کے خلاف۔ کیونکہ برائی کے خلاف اٹھنا پیغمبر کی سنت ہے اور برائی کرنے والے کے خلاف اٹھنا شیطان کی سنت۔

موت کا سبق

ایک مجرم کو بتایا گیا کہ عدالت اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے اور کل صبح اس کو پھانسی دے دی جائے گی۔ پھانسی اگرچہ کل کے دن ہونے والی تھی مگر آج ہی اس کا یہ حال ہوا گویا اس کو پھانسی دی جا چکی ہو۔ زندگی اس کے لئے بے قیمت ہو گئی۔ اس کا ہنسنا اور بولنا ختم ہو گیا۔ اس کے ہاتھ جو دوسروں کے خلاف اٹھتے تھے، اب اس قابل نہ رہے کہ کسی کے خلاف اٹھیں۔ اس کے پاؤں جو ہر طرف دوڑنے کے لئے آزاد تھے، اب ان میں یہ طاقت بھی نہ رہی کہ وہ کہیں بھاگنے کی کوشش کریں۔

موت بتاتی ہے کہ یہی معاملہ ہر ایک کا ہے۔ ہر آدمی جو آج زندہ نظر آتا ہے، کل کے دن اسے "پھانسی" کے تختہ پر لٹکنا ہے۔ مگر ہر آدمی اس سے بے خبر ہے۔ ہر ایک اپنے آج میں گم ہے، کسی کو اپنے کل کا احساس نہیں۔ یہاں ہر آدمی "مجرم" ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اپنے مجرم ہونے کو جانتے ہوں۔

آدمی زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ اپنے مال اور اپنے ساتھیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ اس سے پوچھے بغیر اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کی دیکھنے والی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی ہر چیز سے جدا ہو کر قبر کی تنہائی میں چلا جاتا ہے۔

موت کا یہ واقعہ آدمی کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی اختیار سے بے اختیاری کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اجالے سے اندھیرے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ سے بے کچھ کی طرف جا رہا ہے۔ موت سے پہلے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں وہ اپنے ارادہ کا آپ مالک ہے۔ موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ کسی اور کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہو گا۔

آدمی اگر اس حقیقت کو یاد رکھے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ کسی پر قابو پا کر اسے ستانا اس کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ کیونکہ جو شخص خود کل دوسرے کے قابو میں جانے والا ہے وہ کسی کو ستا کر کیا پائے گا۔ اپنے کو بڑا سمجھنے پر اسے شرم آئے گی۔ کیونکہ جو بڑائی بالآخر چھن جانے والی ہو اس کی کیا حقیقت۔

آنے والا دن

موجودہ دنیا میں جب کوئی آدمی خدا کو مانتا ہے تو وہ دلیل کی بنیاد پر خدا کو مانتا ہے۔ آخرت میں جو لوگ خدا کو مانیں گے وہ خدا کے زور و قوت کی بنیاد پر خدا کو مانیں گے۔ گویا موجودہ دنیا میں دلیل خدا کی نمائندہ ہے۔ اس کے برعکس آخرت میں یہ ہوگا کہ خدا خود اپنی ذات کمال کے ساتھ اپنے آپ کو منوانے کے لئے انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں خدا کو ماننے والا کون ہے اور اس کو نہ ماننے والا کون۔ خدا کو ماننے والا وہ ہے جو معقولیت کے وزن کو مانے۔ جو حق کے آگے اس وقت جھک جائے جب کہ اس کے ساتھ لفظی دلیل کے سوا کوئی اور زور شامل نہ ہو۔ اس کے برعکس جس کا یہ حال ہو کہ کوئی بات محض اپنی سچائی کی بنا پر اس کو متاثر نہ کر سکے، وہ کسی سچائی کو صرف اس وقت مانے جب کہ وہ کسی وجہ سے اس کو ماننے کے لئے مجبور ہو گیا ہو۔ جس سچائی کے ساتھ ایسا کوئی دباؤ موجود نہ ہو وہ اس کو ماننے کے لئے بھی تیار نہ ہوتا ہو، ایسا آدمی خدا کو ماننے والا نہیں ہے۔ اس کا معبود ظاہری طاقت ہے نہ کہ غیبی خدا۔

خدا اپنے ماننے کا ثبوت غیب کی سطح پر دے رہا ہے اور لوگ اس کو ماننے کا ثبوت شہود کی سطح پر دینا چاہتے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے مگر آدمی صرف طاقت کے آگے جھکنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی محض خدا کے خوف کی بنا پر انصاف کے طریقہ کو اپنا لے۔ مگر انسان صرف اس وقت انصاف کرنے پر راضی ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے لئے مجبور ہو گیا ہو۔ جہاں مجبوری نہ ہو وہاں وہ فوراً سرکشی کرنے لگتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو موقع ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو چھپا لے۔ مگر قیامت ہر آدمی کو برہنہ کر دے گی۔ اس وقت بہت سے خدا پرست غیر خدا پرستوں کی صف میں نظر آئیں گے، بہت سے حق کو ماننے والے حق کو نہ ماننے کے مجرم قرار دئے جائیں گے۔ بہت سے لوگ جو جنت کا الاٹمنٹ لئے ہوئے ہیں وہ اپنے کو جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا پائیں گے۔

انسان کتنا زیادہ بے ڈر بنا ہوا ہے، حالانکہ کتنا زیادہ ڈر کا لمحہ اس کے لئے آنے والا ہے۔

ایک تاثر

انسان زمین کے اوپر ایک تضاد ہے۔ وہ حقیقتوں کی دنیا میں حقیقتوں کو نظرانداز کرکے رہنا چاہتا ہے۔ انسان کو ایک نہایت حسین اور مکمل دنیا دی گئی ہے۔ مگر وہ اس طرح یہاں رہتا ہے جیسے وہ اپنی دنیا کی تردید کررہا ہو۔

انسان کھلے ہوئے آسمان کے نیچے بند ذہن کے ساتھ جینا چاہتا ہے۔ لطیف ہواؤں کے درمیان اس کو صرف کثیف اخلاق کے ساتھ رہنا پسند ہے۔ اونچے پہاڑوں کے پڑوس میں وہ چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ سرسبز و شاداب درختوں کے ماحول میں وہ ٹھنٹھ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ دریاؤں اور چشموں کی روانی کے درمیان وہ جمود و تعطل کی تصویر بنا ہوا ہے۔

اس صورت حال کی سب سے زیادہ عبرت ناک مثال وہ لوگ ہیں جن کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۸۲ کو میں جموں اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ دو مسلمان میرے پاس آئے جو غالباً کشمیری تھے۔ ایک نے کہا "مولانا صاحب، مجھے ایک مسئلہ بتائیے۔ لبنان میں فلسطینی بھائیوں کا خون ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے خون کے صدقہ کے طور پر ایک بکرا ذبح کروں" دوسرے نے کہا "میں فلسطین جانا چاہتا ہوں، مجھے بتائیے کہ فلسطین جانے کا راستہ کیا ہے"۔ دونوں مجھ سے مشورہ چاہتے تھے، مگر میں ان کو کوئی مشورہ نہ دے سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے اور اب میرے پاس ان سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی شاید سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خیالی پرواز میں سب سے آگے ہیں اور حقیقی عمل میں سب سے پیچھے۔ ان کو سیاست میں صرف نعرہ پسند ہے، ادب میں شاعری اور دین میں رومانیت۔ مسلمانوں نے نہ اپنی مقدس کتاب سے کچھ سیکھا اور نہ دنیا کے تجربات سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصاغر و اکابر کی تمام فوج خوش فکری کے خول میں بند ہے۔ اپنے فکری خول سے باہر کی حقیقتوں کی اسے خبر ہی نہیں۔

آخر ایسے لوگوں کو کیا مشورہ دیا جائے جو فلسطین جیسے سنگین مسئلہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے لئے ایک بکرا ذبح کردیں۔ یا اپنی انتہائی بے خبری اور بے مائگی کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ کسی طرح فلسطین پہنچ جائیں تو وہاں لڑکر وہ اس کا سارا مسئلہ حل کردیں گے۔

ایک آیت

قرآن کی سورہ نمبر ۲۵ کے آخر میں خدا کی رحمتوں کا ذکر ہے۔ خدا نے زمین کو انتہائی محکم قانون کے تحت گھمار کھا ہے جس سے رات دن اور موسم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز انتظام کے تحت بارش برساتا رہتا ہے۔ وہ زمین پر انسان کے لئے طرح طرح کا رزق پیدا کرتا ہے۔ وہ سمندر کے کھاری پانی کو میٹھا بنا کر ہماری ضرور یات پوری کرتا ہے۔ ایک عجیب و غریب حیاتیاتی نظام کے تحت وہ ہم کو اولاد عطا کرتا ہے۔ اس نے زمین و آسمان کی وسیع کائنات کو حیرت انگیز طور پر ہمارے موافق بنا رکھا ہے۔ اس قسم کی نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

الرحمٰن فسئل به خبیرا (الفرقان ۵۹)

وہ بڑی رحمت والا ہے، اس کی شان (رحمت) کسی جاننے والے سے پوچھو۔

قرآن کی یہ آیتیں توحید اور آخرت کے اثبات میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس کائنات میں اتنے کامل طور پر رحمت و قدرت کا نظام قائم ہو اس کے بارے میں یہ گمان کرنا بالکل بے بنیاد ہے کہ اس کا خدا ایک سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ یا اس کا خاتمہ عدل پر نہ ہوگا، اور وہ یوں ہی بے انجام طور پر ختم ہو جائے گی۔

اس ذیل میں فرمایا کہ کائنات میں خدا کی رحمت و قدرت کے نظام کا حال کسی جاننے والے سے پوچھو۔ یعنی جو شخص کائنات میں غور و مشاہدہ کر رہا ہو، جس نے کائنات کے نظام میں جھانک کر دیکھا ہو اس سے اس کی تفصیلات پوچھو تو وہ تمھیں بتائے گا کہ یہ کائنات کیسی کائنات ہے۔ اور اس میں انسان کے لئے کیسے کیسے قیمتی انتظامات کئے گئے ہیں۔

اس کا مصداق موجودہ زمانہ میں سائنس داں بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ سائنس داں جنھوں نے زمین و آسمان کے نظام کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کی حکمت و معنویت کو اس قدر حیران کن انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ان کو سن کر اور پڑھ کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوں اور اس کے ایمان میں اضافہ ہو جائے (ملاحظہ ہو، مذہب اور جدید چیلنج صفحہ ۸۲ - ۱۸۰)

واضح ہو کہ اس آیت میں سوال کا تعلق اللہ کی "رحمانیت" کو پوچھنے سے ہے نہ کہ دین حق کی بابت

ر چھنے سے۔ اللہ کی رحمانیت کے واقعات آپ کسی بھی عالم کائنات سے پوچھ سکتے ہیں۔ مگر اللہ کا دین تو صرف پیغمبر ہی کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اور اب قیامت تک کے لئے اللہ کے مستند پیغمبر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

”جاننے والے سے پوچھو“ ایک عام لفظ ہے۔ جب بھی کسی کلام میں یہ لفظ آئے تو دیکھنا ہوگا کہ کس چیز کے بارے میں پوچھنا مراد ہے۔ جس چیز کی بابت پوچھنا مطلوب ہے اسی چیز کے جاننے والے سے پوچھنا مراد ہوگا نہ کہ کسی دوسری چیز کے جاننے والے سے۔

اس قسم کا سوالیہ اسلوب قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورہ انبیاء میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین یہ کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں (ھل ھٰذا الا بشر مثلکم) پھر وہ خدا کے پیغمبر کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ نبی عربی سے پہلے جس کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا انسانوں ہی میں سے بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ پس سابق اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے (فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون)

اس آیت میں اہل ذکر سے مراد یہود ہیں۔ قریش سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم کو یہ شبہ ہے کہ رسول انسان کیسے ہو سکتا ہے تو یہود سے پوچھ لو۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ ان کے یہاں کثرت سے پیغمبر آتے رہے ہیں۔ وہ تم کو بتائیں گے کہ ان کے یہاں جتنے پیغمبر آئے سب انسان ہی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی فرشتہ یا اور کوئی غیر انسانی مخلوق نہ تھا۔

فارم IV رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں
جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں
یکم مارچ ۱۹۸۳ء

دین کے نام پر بے دینی

قرآن کی تین سورتوں (الاعراف، طٰہٰ، الشعراء) میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا نے پیغمبر بنایا۔ اس کے بعد وہ خدا کے حکم کے مطابق شاہ مصر فرعون کے دربار میں گئے۔ انھوں نے فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکل کر میرے ساتھ صحرائے سینا میں جانے دے (ارسل معنا بنی اسرائیل) اس کے جواب میں فرعون نے اپنے درباریوں کے سامنے جو تقریر کی اس میں اس نے کہا کہ موسیٰ چاہتے ہیں کہ تم کو تمھارے ملک مصر سے نکال دیں (یرید ان یخرجکم من ارضکم)

حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو ساتھ لے کر خود ملک مصر سے نکل جانے کی بات کی تھی۔ مگر فرعون نے لازم کے صیغہ کو متعدی کا صیغہ بنادیا۔ اس نے کہا کہ موسیٰ ہم لوگوں کو مصر سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ فرعون نے اپنی قوم در اپنے درباریوں کو موسیٰ کے خلاف بھڑکانے کے لئے آنجناب کی طرف وہ بات منسوب کردی جو آپ نے خود نہیں فرمائی تھی۔

فرعون کا کلمہ واضح طور پر شرارت کا کلمہ تھا۔ یہ ویسا ہی تھا جیسے موجودہ زمانہ کے ظالم حکمراں یہ کرتے ہیں کہ اگر وہ کسی شخص سے ناراض ہوں تو وہ اپنی خفیہ پولیس کے ذریعہ اس انکشاف کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ حکمراں کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کی سازش کر رہا تھا۔ اس طرح وہ اپنے اس عمل کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں کہ اس شخص کو بغاوت کا مجرم قرار دے کر ہلاک کر دیں۔

فرعون شرک اور کفر کا علم بردار تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اسلام کے ایسے علم بردار پیدا ہوئے ہیں جو قرآن سے فرعون کے الفاظ (یرید ان یخرجکم من ارضکم) لے لیتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی دعوت عام معنوں میں صرف ایک دینی دعوت نہ تھی بلکہ وہ سیاسی انقلاب برپا کرنے کا منصوبہ تھا۔ حضرت موسیٰ اس لئے اٹھے تھے کہ فرعون کو اقتدار کے تخت سے بے دخل کر کے اس پر قبضہ کریں اور ملک میں حکومت الٰہیہ کا نظام قائم کریں۔ وہ کلمۂ موسیٰ کے بجائے کلمۂ فرعون سے پیغمبر کا مشن برآمد کر رہے ہیں۔

فرعون کا کلمہ صرف اس قابل ہے کہ اس کو شرارت کے خانہ میں جگہ ملے۔ مگر جو لوگ فرعون کے کلمہ سے پیغمبر کا مشن برآمد کر رہے ہیں ان کے قول کو آخر کس خانہ میں رکھا جائے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي
وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ
أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ ﴿٧١﴾ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُم مِّنْ
أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٧٢﴾ فَكَذَّبُوهُ
فَنَجَّيْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا
بِآيَاتِنَا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ ﴿٧٣﴾

اور ان کو نوح کا حال سناؤ۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، اگر میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیتوں سے نصیحت کرنا تم پر گراں ہو گیا ہے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ تم اپنا متفقہ فیصلہ کر لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو، تم کو اپنے فیصلہ میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ پھر تم لوگ میرے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی ہے۔ میری مزدوری تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ پھر انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے نوح کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان کو جانشین بنایا۔ اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ دیکھو کہ کیا انجام ہوا ان کا جن کو ڈرایا گیا تھا ۷۱ — ۷۳

حضرت نوح قدیم ترین زمانہ کے رسول ہیں۔ وہ جب تک خاموش تھے، قوم ان کی عزت کرتی رہی۔ مگر جب آپ حق کے داعی بن کر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو بتانے لگے کہ ایسا کرو اور ویسا نہ کرو تو وہ قوم کی نظر میں ایک ناپسندیدہ شخص بن گئے۔ یہاں تک کہ قوم نے اعلان کر دیا کہ تم اپنی تبلیغ ونصیحت سے باز آؤ ورنہ ہم تم کو اپنی زمین میں نہیں رہنے دیں گے۔

حضرت نوح نے کہا کہ تم لوگ میرے معاملہ کو ایک انسان کا معاملہ سمجھتے ہو، اس لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ مگر یہ معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ مجھ سے لڑنے کے لئے تم کو خدا سے لڑنا پڑے گا۔ تم کو اگر یقین نہ ہو تو تم اس طرح تجربہ کر سکتے ہو کہ اپنے ساتھیوں اور شریکوں کو ملا کر میرے خلاف کوئی متفقہ منصوبہ بناؤ اور اپنی تمام طاقت کے ساتھ اس کی تعمیل کر گزرو۔ تم دیکھو گے کہ میرے مقابلہ میں تمھارا ہر منصوبہ ناکام ہے۔ موجودہ دنیا میں داعی حق کی صداقت کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ کوئی بھی اس کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

جو شخص خدا کی طرف سے حق کی دعوت لے کر اٹھے وہ ہمیشہ نشانی (دلیل) کے زور پر اٹھتا ہے۔ دلیل چونکہ ایک ذہنی چیز ہے اس لئے ظاہر پسند انسان اس کی عظمت کو سمجھ نہیں پاتا۔ وہ ذہنی طور پر لاجواب ہونے کے باوجود اس کے

[کر]نے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

حق کے داعی کو جن آداب دعوت کا لازمی طور پر لحاظ کرنا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو سے کسی بھی [قس]م کا معاشی اور مادی مطالبہ نہ کرے۔ خواہ اس یک طرفہ دست برداری کی وجہ سے اس کو کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ [ای]سا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان آخر وقت تک داعی اور مدعو کا تعلق باقی رہے، وہ کسی بھی حال میں [با]ہمی حریف اور مادی رقیب کا تعلق نہ بننے پائے۔

حضرت نوح نے جب اتمام حجت کی حد تک حق کا پیغام پہنچا دیا، پھر بھی ان کی قوم سرکشی پر قائم رہی تو سرکشوں کو سیلاب میں غرق کر کے زمین ان سے خالی کرائی گئی اور مومنین نوح کو موقع دیا گیا کہ وہ زمین کے وارث بن کر اس پر آباد ہوں۔ [اس]ی کو قرآن کی اصطلاح میں "خلافت" کہا جاتا ہے۔ سیلاب سے پہلے قوم نوح زمین کی خلیفہ بنی ہوئی تھی۔ سیلاب کے [بع]د مومنین نوح زمین کے خلیفہ قرار پائے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

[پھ]ر ہم نے نوح کے بعد کتنے رسول بھیجے۔ وہ ان کے پاس کھلی کھلی دلیلیں لے کر آئے، مگر وہ اس پر ایمان لانے والے [ن]ہ بنے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے نکل جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں ۷۴

اس آیت میں "حد سے گزر جانے والا" ان لوگوں کو کہا گیا ہے جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک بار اگر وہ حق [ک]ا انکار کر دیں تو اس کے بعد وہ اس کو اپنی ساکھ کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور پھر اس کو مسلسل نظر انداز کرتے رہتے ہیں [تا]کہ لوگوں کی نظر میں ان کا علم دین اور ان کا برسر حق ہونا مشتبہ نہ ہونے پائے۔

جو لوگ اس قسم کا رویہ اختیار کریں ان کو دنیا میں یہ سزا ملتی ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ [یع]نی خدا کے قانون کے تحت ان کی نفسیات دھیرے دھیرے ایسی بن جاتی ہیں کہ بالآخر حق کے معاملہ میں ان کا شدت [اح]ساس باقی نہیں رہتا۔ ابتداءً ان کے اندر جو تھوڑی سی حساسیت زندہ تھی وہ بھی بالآخر مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ [و]ہ اس قابل نہیں رہتے کہ حق اور ناحق کے معاملہ میں تڑپیں اور ناحق کو چھوڑ کر حق کو قبول کر لیں۔ حضرت نوح اور ان کے [بع]د آنے والے بیشتر رسولوں کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

اللہ کی طرف سے جب بھی کوئی داعیٔ حق آتا ہے تو وہ اس حال میں آتا ہے کہ اس کے گرد کسی قسم کی ظاہری عظمت [ن]ہیں ہوتی۔ اس کے پاس جو واحد چیز ہوتی ہے وہ صرف دلیل ہے۔ جو لوگ دلیل کی زبان میں حق کو مانیں وہی داعیٔ [ح]ق کو مانتے ہیں۔ جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ دلیل کی زبان انھیں متاثر نہ کر سکے وہ داعیٔ حق کو پہچاننے سے بھی محروم رہتے [ہی]ں اور اس کا ساتھ دینے سے بھی۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا
وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُبِينٌ ﴿٧٦﴾
قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ ۖ أَسِحْرٌ هَٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ﴿٧٧﴾
قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ
وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ ﴿٧٨﴾

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا، مگر انھوں نے گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے سچی بات پہنچی تو انھوں نے کہا، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ کیا تم حق کو جادو کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے پاس آچکا ہے۔ کیا یہ جادو ہے، حالاں کہ جادو والے کبھی فلاح نہیں پاتے۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم کو اس راستے سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور اس ملک میں تم دونوں کی بڑائی قائم ہو جائے، اور ہم کبھی تم دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں ۷۸ — ۷۵

فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے اپنی مجرمانہ ذہنیت کی بنا پر موسیٰ اور ہارون کی بات نہیں مانی۔ وہ چیزوں کو دلیل کے معیار سے دیکھنے کے بجائے جاہ واقتدار کے معیار سے دیکھتے تھے۔ اس خود ساختہ معیار کے نام پر انھوں نے اپنے کو اونچا اور موسیٰ وہارون کو نیچا سمجھ لیا۔ ان کی یہ نفسیات ان کے لئے اس حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی جو ان کے نزدیک ایک چھوٹا آدمی ان کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

حضرت موسیٰ کی استدلال کی زبان جب فرعون کی سمجھ میں نہیں آئی تو آپ نے عصا اور ید بیضا کے معجزات دکھائے۔ ان معجزات کا توڑ فرعون کے پاس نہ تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ یہ جادو ہے۔ اس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں اپنی شکست کو ایک جھوٹی توجیہہ میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ موسیٰ کا معاملہ حق کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جادو کا معاملہ ہے، یہ صحیح ہے کہ جادو اور معجزہ میں کچھ ظاہری مشابہت ہوتی ہے۔ مگر بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ جادو محض شعبدہ اور کرشمہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں معجزہ کو مستقل کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جادو بالآخر جادو ثابت ہوتا ہے اور معجزہ بالآخر معجزہ۔

اس موقع پر فرعون نے لوگوں کو حضرت موسیٰ کی دعوت سے پھیرنے کے لئے دو اور باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ موسیٰ ہم کو ہمارے آبائی دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ فرعون کو چاہئے تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کے پیغام کو حق اور ناحق کی

صطلاح میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ مگر اس نے اس کو آبائی اور غیر آبائی معیار سے جانچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ق اور ناحق کے معیار سے دیکھنے میں اپنے آپ کو غلط ماننا پڑتا۔ جب کہ آبائی اور غیر آبائی کی تقسیم میں اپنی روش پر بدستور د جود رہنے کا جواز مل رہا تھا۔

فرعون نے دوسری بات یہ کہی کہ "موسیٰ اور ہارون اس ملک میں اپنی کبریائی قائم کرنا چاہتے ہیں" یہ بھی دام کو بھڑکانے کے لئے محض ایک سیاسی شوشہ تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ نے تو اول مرحلہ میں فرعون کے سامنے یہ بات کھ دی تھی کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ فرعون کو خدا کا پیغام پہنچائیں اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے کل کر صحرائے سینا میں چلے جائیں۔ ایسی حالت میں یہ الزام سراسر خلاف واقعہ تھا کہ وہ مصر کی حکومت پر قبضہ رنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿۸۲﴾

ر فرعون نے کہا کہ تمام ماہر جادوگروں کو میرے پاس لے آؤ۔ جب جادوگر آئے تو موسیٰ نے ان سے کہا کہ جو کچھ تمہیں ڈالنا ہے ڈالو۔ پھر جب جادوگروں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے۔ بے شک اللہ س کو باطل کر دے گا، اللہ یقیناً مفسدوں کے کام کو سدھرنے نہیں دیتا۔ اور اللہ اپنے حکم سے حق کو حق کر کھاتا ہے خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو ۸۲ — ۷۹

فرعون کا ماہر جادوگروں کو بلانا اس لئے نہ تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ جادوگروں کے ذریعہ وہ حضرت موسیٰ و زیر کرے گا۔ یہ کسی عقلی فیصلہ سے زیادہ فرعون کی اس بڑھی ہوئی خواہش کا نتیجہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کو نہ مانے۔ دا کے پیغمبر کو جادوگروں کے ذریعہ غلط ثابت کرنے کا منصوبہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کا ناکام ہونا پہلے سے علوم تھا۔ مگر آدمی جب کسی حقیقت کو نہ ماننا چاہے تو اس کی یہ خواہش اس کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ احمقانہ ربیروں سے اس کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کا بند باندھتا ہے الاں کہ وہ خود جان رہا ہوتا ہے کہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جادوگروں نے میدان میں رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے وئے سانپ کی صورت میں دکھائی دیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بہت بڑا سانپ بن کر

میدان میں دوڑنے لگا۔ حضرت موسیٰ کا یہ "سانپ" محض سانپ نہ تھا، وہ دراصل خدا کی ایک طاقت تھی جو اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کردے۔ چنانچہ اس کے سامنے آتے ہی جادوگروں کی رسی، رسی رہ گئی اور ان کی لکڑی لکڑی۔

یہ خود اپنے منتخب کئے ہوئے میدان میں فرعون کی شکست تھی۔ مگر اب بھی فرعون نے شکست نہ مانی۔ اب اس نے حضرت موسیٰ کی تردید کے لئے کچھ اور الفاظ تلاش کرلئے جس طرح اس کو پہلے مرحلہ میں آپ کی تردید کے لئے کچھ الفاظ مل گئے تھے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

پھر موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے کہ کہیں وہ ان کو کسی فتنہ میں نہ ڈال دے، بے شک فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو حد سے گزر جاتے ہیں۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم واقعی فرماں بردار ہو۔ انھوں نے کہا، ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا۔ اور اپنی رحمت سے ہم کو کافر لوگوں سے نجات دے　　۸۶ — ۸۳

نئے فکر کو قبول کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے معاشرہ میں نئے نئے مسائل سے دوچار ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ عمر کے لوگ اکثر کسی نئے فکر کو قبول کرنے میں محتاط ہوتے ہیں۔ مختلف وجوہ سے زیادہ عمر کے لوگوں پر مصلحت کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ وہ نئے فکر کی صحت کو ماننے کے باوجود آگے بڑھ کر اس کا ساتھ نہیں دے پاتے۔

مگر نوجوان طبقہ عام طور پر اس قسم کی مصلحتوں سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ کسی نئی اور انقلابی دعوت کو قبول کرنے میں وہی لوگ زیادہ آگے بڑھے جو ابھی زیادہ عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ یہی صورت حال حضرت موسیٰ کے ساتھ پیش آئی۔

حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے والے نوجوانوں کو ایک طرف فرعون کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف خود اپنی قوم کے بڑوں کی طرف سے ان کو حوصلہ افزائی نہیں ملی۔ یہ بڑے اگرچہ حضرت موسیٰ کی نبوت کو مانتے تھے۔ مگر اپنی مصلحت اندیشی کی بنا پر وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے بیٹیاں پرجوش طور پر حضرت موسیٰ کا ساتھ دیں اور اس کے نتیجہ میں وہ فرعون کے ظلم کا شکار بنیں۔

مگر اس قسم کی صورت حال کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ آدمی مخالفین حق کے ڈر سے خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کو چاہئے کہ وہ انسانی مخالفتوں کے مقابلہ میں خدائی نصرتوں پر نظر رکھے، وہ خدا کے بھروسہ پر اس حق کا ساتھ دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو جس کا ساتھ دینے کے لئے ذاتی طور وہ اپنے آپ کو عاجز پا رہا تھا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں کچھ گھر مقرر کر لو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔ اور اہل ایمان کو خوش خبری دے دو ۸۷

قبلہ کے معنی عربی زبان میں مرجع یا مرکز توجہ کے ہیں۔ یہاں گھروں کو قبلہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی بستیوں میں کچھ گھروں یا ان گھروں کے بعض مناسب حصوں کو اس مقصد کے لئے مخصوص کر دیا جائے کہ وہ حضرت موسیٰ کی دینی جدوجہد کے لئے بطور مرکز کے کام دیں۔ یہاں تنظیمی اجتماعات ہوں، باہمی مشورے ہوں۔ دعوتی عمل کی خاموش منصوبہ بندی کی جائے۔

حضرت موسیٰ کی توحید و آخرت کی باتیں مصر کے بادشاہ فرعون کو سخت ناگوار تھیں۔ اس نے ان کے اوپر نہایت سخت قسم کی پابندیاں عائد کر دیں۔ یہاں تک کہ کھلے طور پر دینی سرگرمیاں جاری رکھنا ان کے لئے سخت دشوار ہو گیا۔ اس وقت حکم ہوا کہ فرعون سے ٹکرانے کے بجائے یہ کرو کہ اپنے کام کو قریبی دائرہ میں سمیٹ لو۔ اپنی بستیوں میں چھوٹے چھوٹے دعوتی اور تنظیمی مراکز بنا کر محدود دائرہ میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھو۔

ان حالات میں ان کو جو دوسرا حکم دیا گیا وہ نماز کی اقامت تھا۔ یعنی اللہ سے تعلق جوڑنے اور اس سے مدد مانگنے کے لئے نمازوں کا اہتمام، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ نماز دراصل خدا سے قریب ہو کر خدا سے مدد مانگنے کی ایک صورت ہے۔ نماز میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو عجز اور تواضع کے مقام پر لاتا ہے اور عجز اور تواضع ہی وہ مقام ہے جہاں بندہ اور خدا کی ملاقات ہوتی ہے۔ بندہ کے لئے اپنے رب سے ملنے کا دوسرا کوئی مقام نہیں۔

یہ جو پروگرام بتایا گیا اسی کی تکمیل میں ان کے لئے فلاح اور نجات کا راز چھپا ہوا تھا۔ یہ حکم گویا اس بات کی خوش خبری تھی کہ خدا ان کو اس حالت سے نکالنے والا ہے جس میں ان کے دشمنوں نے ان کو مبتلا کر دیا ہے۔

جانور سے بدتر

شیخ سعدی نے کہا تھا "میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اور خدا کے بعد اس شخص سے ڈرتا ہوں جو خدا سے نہیں ڈرتا۔" اسی بات کو شیکسپیئر نے ایک اور انداز سے اس طرح کہا ہے ——— "انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جس سے میں بزدل کی طرح ڈرتا ہوں۔"

اس دنیا میں ہر چیز قابل پیشین گوئی کردار رکھتی ہے۔ آگ کے بارے میں آپ پیشگی طور پر یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اگر آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تبھی وہ آپ کو جلائے گی۔ اگر آپ اپنے ہاتھ کو اس سے دور رکھیں تو وہ ایسا نہیں کرے گی کہ وہ کود کر آپ کے ہاتھ پر آگرے۔ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے حتیٰ کہ موذی جانوروں کے بارے میں بھی ہم کو پیشگی طور پر معلوم ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ ان کا حملہ ہمیشہ دفاعی ہوتا ہے نہ کہ جارحانہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایک لگے بندھے قاعدہ کے تحت کام کر رہی ہے اور اس قاعدہ کی رعایت کرکے آپ اس کے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ مگر انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے عمل کا کوئی اصول اور قاعدہ نہیں۔ وہ مکمل طور پر آزاد ہے اور جس وقت جو چاہے کرسکتا ہے۔

اس دنیا میں انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو یک طرفہ طور پر دوسرے کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو کسی واقعی سبب کے بغیر دوسرے کے اوپر حملہ کرتا ہے۔ انسان کے حرص اور انتقام کی کوئی حد نہیں۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوں اور محض ذاتی محنت کی بنیاد پر ترقی کریں تب بھی آپ محفوظ نہیں۔ کیونکہ دوسروں کے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ آپ کو گرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ انسان لامحدود طور پر اپنی خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے اور بے حساب حد تک دوسرے کو برباد کرکے اس کی بربادی کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔

کوئی بدترین موذی جانور بھی اس کو نہیں جانتا کہ وہ کسی کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بنائے۔ وہ کسی کو نیچا دکھا کر اپنے غرور کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرے۔ کسی کو خواہ مخواہ مصیبتوں میں پھنسا کر اس کی پریشانی کا تماشا دیکھے۔ یہ صرف انسان ہے جو ایسا کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اپنے آپ کو اسفل سافلین کی پستی میں گرا لیتا ہے۔

یہ سرکشی ہے

انصاف مانگا نہیں جاتا بلکہ لیا جاتا ہے —— موجودہ دنیا کے بارے میں کسی کا یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ یہاں وہی شخص اپنا حق پاتا ہے جس کے پاس بازوؤں کی طاقت ہو۔ جس کے پاس صرف لفظی دلائل ہوں اس کے لئے اس دنیا میں کچھ نہیں۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اس وقت انصاف دیتا ہے جب کہ اس کو ڈر ہو کہ انصاف نہ دینے سے اس کا اپنا معاملہ بگڑ جائے گا۔ اور اگر اس کا کچھ بگڑنے والا نہ ہو تو وہ انصاف دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔

کسی سے آپ کا کوئی معاملہ پڑے اور آپ اتفاق سے کمزور پوزیشن میں ہوں اور دوسرا فریق طاقت ور پوزیشن میں، تو حیرت انگیز طور پر آپ دیکھیں گے کہ آپ کا فریق آپ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے عاجز ہو رہا ہے۔ وہی آدمی جو دوسرے معاملات میں نہایت ذہین اور ہوشیار دکھائی دیتا تھا، آپ کے معاملہ میں ایسا بن جائے گا جیسے وہ اس کے پہلوؤں کو سمجھتا ہی نہیں۔ وہ آپ کے دلائل کو سنے گا مگر ان کو کوئی وزن نہ دے گا۔ آپ کے بامعنی الفاظ اس کی نظر میں بالکل بے معنی ہو جائیں گے۔

آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ معقولیت کی ان کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ جہاں کوئی ڈر ہو یا کوئی فائدہ کا پہلو ہو تو ان کی ساری عقل فوراً جاگ اٹھتی ہے۔ وہ پوری ہوشیاری کے ساتھ وہاں متحرک ہو جاتے ہیں۔ مگر جہاں صرف دلیل اور معقولیت کا زور ہو، اس کے سوا کوئی اور چیز انھیں مجبور کرنے والی موجود نہ ہو وہاں وہ ایسا بے حس بن جاتے ہیں جیسے کہ نہ ان کے سر میں کوئی بات سمجھنے کی صلاحیت ہے اور نہ ان کے سینہ میں کسی چیز پر تڑپنے والا دل۔

سامنے کا نفع نقصان لوگوں کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے۔ آدمی بھول گیا ہے کہ معقولیت کو وزن نہ دینا خدا کو وزن نہ دینا ہے۔ ایسے لوگ قیامت میں اس بات کے مجرم قرار پائیں گے کہ انھوں نے خدا کو بے حقیقت سمجھا، انھوں نے مالک کائنات کو بے وزن جانا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ جانے کہ کون اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بغیر دیکھے (الاحزاب) اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں خدا کی سچائی دلیل کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ آخرت میں خدا کی سچائی اپنے بے نقاب روپ میں ظاہر ہوگی۔ جو لوگ ایک سچی دلیل کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا اس وقت کیا حال ہوگا جب وہ جانیں گے کہ جس دلیل کو انھوں نے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا وہ دراصل خدا تھا جو اپنے غیبی روپ میں ان کے سامنے آیا تھا مگر اس کو انھوں نے نہیں مانا۔

سبب اپنے اندر

نئی دہلی میں پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں یہ قصہ سنا گیا کہ صدر جمہوریہ ہند مسٹر گیانی ذیل سنگھ اپنے آپریشن کے لئے امریکہ گئے۔ وہاں وہ ٹکساس کے اسپتال میں تھے جس میں ان کے پیش رو سنجیوا ریڈی بھی زیر علاج رہ چکے تھے۔ جب وہ آپریشن تھیٹر میں لے جائے گئے تو چیف سرجن نے موصوف سے پوچھا: کیا آپ تیار ہیں (Are you ready) گیانی ذیل سنگھ نے اس کے جواب میں کہا:

No, I am not Reddy. I am Zail Singh

میں ریڈی نہیں ہوں۔ میں ذیل سنگھ ہوں (ہندستان ٹائمس۔ ۴ دسمبر ۱۹۸۲)

عین ممکن ہے کہ یہ کوئی واقعہ نہ ہو بلکہ محض ایک لطیفہ ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسا لطیفہ بنانے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ گیانی ذیل سنگھ کے بارے میں یہ مشہور رہے کہ وہ انگریزی زبان کم جانتے ہیں۔ ٹکساس کے آپریشن ٹیبل پر اگر رادھا کرشنن یا جواہر لال نہرو ہوتے تو کسی لطیفہ گو کو ایسا لطیفہ گھڑنے کی جرأت نہ ہوتی۔

یا ہر کی دنیا آپ کو اتنا ہی جانتی ہے جتنا آپ نے اس کو بتایا ہے اور آپ کی جو تصویر اس کے ذہن میں ہے اسی کے مطابق وہ آپ کے ساتھ سلوک کرتی ہے۔ اگر دوسروں سے آپ کو برے سلوک کا تجربہ ہو تو دوسروں کو برا سمجھنے کے بجائے خود اپنے اندر اس کے اسباب تلاش کیجئے۔ کیونکہ اپنی کمی کو دور کرکے آپ زیادہ بہتر طور پر دوسروں کے برے سلوک سے بچ سکتے ہیں۔

یونان کے ایک آرٹسٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک آدمی کی تصویر بنائی جس کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ تھا۔ اس نے تصویر کو بازار میں رکھ دیا۔ اس کے دوست نے اس کے بعد اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ تم نے انگور کی تصویر اتنی کامیاب بنائی ہے کہ چڑیاں اس کو واقعی سمجھ کر اس پر چونچ مارتی ہیں۔ آرٹسٹ نے کہا: آدمی کی تصویر بنانے میں مجھ سے غلطی ہوگئی۔ ورنہ چڑیاں اس قسم کی جرأت ہی نہ کرتیں۔

اب آرٹسٹ نے دوسری تصویر بنائی۔ اس تصویر میں بھی ایک آدمی انگور کا خوشہ لئے ہوئے تھا۔ انگور کا خوشہ دوبارہ اس قدر مطابق فطرت تھا کہ چڑیاں اس کو دیکھ کر اس کے پاس آتیں۔ مگر اب انھیں چونچ مارنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ جو آدمی انگور کا خوشہ لئے ہوئے تھا اس کی آنکھیں اس قدر غضب ناک تھیں کہ ان کو دیکھتے ہی چڑیاں واپس لوٹ جاتیں۔

کچھ چھوڑنا پڑتا ہے

دہلی میں میں اجمیری گیٹ کی سڑک سے گزر رہا تھا۔ ایک خوانچہ فروش عورت کی آواز میرے کان میں آئی: "ایک ہزار کی ساڑی پہنوں گی تو بچے نہیں پال سکتی ہوں"۔ اس کے ساتھ بیٹھنے والے خوانچہ فروش نے اس کی معمولی ساڑی پر اعتراض کیا تھا۔ اس کے جواب میں عورت نے کہا کہ خریدنے کے لئے میں بھی اچھی ساڑی خرید سکتی ہوں۔ مگر اس کی قیمت مجھے یہ دینی پڑے گی کہ اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم میں خرچ کرنے کے لئے اس کے بعد میرے پاس کچھ نہ رہے گا۔

یہ زندگی کی سادہ سی حقیقت ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ زیادہ اہم چیزوں میں اپنا بھرپور حصہ ادا کرنے کے لئے اس کو کم اہم چیزوں میں "صبر" کا اصول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کچھ چیزوں میں اسے "کم" پر راضی ہونا پڑتا ہے تاکہ بعض دوسری چیزوں میں وہ "زیادہ" کا مالک بن سکے۔

اس اصول کا تعلق ہر ایک سے ہے، خواہ وہ غریب ہو یا امیر۔ غریب کو اس اصول پر چلنے کے لئے اگر اپنی ضروریات میں کمی کرنی پڑتی ہے تو امیر سے اس کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنی عیش اور تفریح کی چیزوں میں کمی کر دے۔ اہم کی خاطر غیر اہم کی قربانی ہر ایک کو دینی ہے۔ اس میں ایک شخص یا دوسرے شخص کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔

مگر اس اصول کو لوگ صرف اپنے گھر اور اپنے بچوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ خدا کے دین کے بارے میں وہ اس اہم اصول کو بالکل بھولے ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں ہر آدمی کا وہی حال ہو رہا ہے جو بائبل میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ــــــ خدا کا گھر ویران ہے، کیونکہ تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے (حجی، باب اول)

لوگ اپنے گھر کے امور کو کم اہم اور زیادہ اہم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو کم اہم ہے اس کو چھوڑ کر جو زیادہ اہم ہے اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر دین و ملت کے معاملہ میں ان کے یہاں اہم اور غیر اہم کی کوئی تقسیم نہیں۔ یہاں وہ بس اپنے ذوق پر چلنا چاہتے ہیں، خواہ اس کا مطلب یہی کیوں نہ ہو کہ آدمی اہم کو چھوڑ کر غیر اہم دائرہ میں دوڑنا شروع کر دے۔

اگر آدمی سنجیدہ ہو

حدیث میں آیا ہے کہ اپنے چہرہ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ اور جس شخص کے پاس وہ بھی نہ ہو تو وہ ایک اچھے بول کے ذریعہ اپنے کو جہنم سے بچائے۔ کیوں کہ اچھے بول کا بدلہ بھی دس گنا سے سات سو گنا تک ملتا ہے (من استطاع ان یقی وجھہ من النار ولو بشق من تمرۃ فلیفعل ومن لم یجد فبکلمۃ طیبۃ فان بھا تجزی الحسنۃ عشر امثالھا الیٰ سبعمائۃ ضعف)

دوسری طرف حدیث میں یہ بھی ہے کہ جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (من سکت نجا) اس سے معلوم ہوا کہ کبھی نیکی یہ ہوتی ہے کہ آدمی بولے اور کبھی سب سے بڑی نیکی یہ ہوتی ہے کہ آدمی چپ رہے۔ کبھی چلنا مطلوب ہوتا ہے اور کبھی بیٹھ رہنا۔ کبھی خدا کو پسند ہوتا ہے کہ اس کا بندہ آنکھ کھول کر دیکھے اور کبھی خدا کی سب سے بڑی پسند یہ ہوتی ہے کہ بندہ اپنی آنکھوں کو بند کرلے۔

کب ایک عمل مطلوب ہے اور کب دوسرا عمل، اس کی کوئی متعین فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ لیکن اگر آدمی خدا سے ڈرتا ہو، اگر اس کو آخرت کی پکڑ کا اندیشہ لگا ہوا ہو تو وہ خود جان لے گا کہ کس موقع پر اسے کیا کرنا چاہئے۔

اگر آدمی کا ذاتی معاملہ ہو اگر اس کے اوپر زد پڑے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ کس موقع پر اسے کیا کرنا چاہئے۔ مگر جب معاملہ دوسرے کی ذات کا ہو تو وہ اس کو سمجھ نہیں پاتا۔ اگر آدمی صرف اتنا کرے کہ جو چیز وہ اپنے لئے چاہتا ہے وہی دوسرے کو بھی دے اور جس چیز سے خود بچنا چاہتا ہے اس سے دوسروں کو بھی بچالے تو یہی اس کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔

اپنی ذات کے بارے میں آدمی کا عمل بتا رہا ہے کہ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ مگر اس علم کو آدمی صرف اپنے لئے استعمال کرتا ہے اور جب معاملہ دوسرے کا ہو تو وہ اس سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

نصیحت کے آداب

نصیحت ایک حکیمانہ قول ہے۔ وہ اس لئے ہوتی ہے کہ آدمی اس کو پکڑلے۔ اور اپنی زندگی میں ہمیشہ اس کو برتتا رہے۔ اسی لئے نصیحت کا یاد رہنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی نصیحت اسی وقت نصیحت ہے جب کہ وہ سننے والے کو یاد رہ جائے۔ جو نصیحت ایسی ہو کہ وہ آدمی کو یاد نہ رہے، عملاً سننے والے کے لئے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

نصیحت کو یاد رکھنا یا اس کا یاد رہنا دو طرفہ معاملہ ہے۔ ایک طرف وہ اس پر موقوف ہے کہ سننے والا اس کو دھیان کے ساتھ سنے۔ دوسری طرف سنانے والے سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ سنانے والے کو اپنی نصیحت ایسے انداز میں کہنی چاہئے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے اور اس کا ذہن بآسانی اس کو محفوظ کر سکے۔ نصیحت کو عمدہ انداز میں کہنا گویا سننے والے کو یاد رکھنے میں مدد دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے مذکر (ناصح) تھے۔ چنانچہ یہ حکمتِ کلام آپ کی حدیثوں میں کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔ نصیحت کو ذہن نشین کرانے کے لئے آپ مختلف قسم کا اہتمام فرماتے اور مختلف اسلوب اختیار کرتے۔

آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ مختصر الفاظ میں بولتے۔ ٹھہر ٹھہر کر اپنے الفاظ ادا کرتے۔ حضرت عائشہ نے بعد کے لوگوں سے ایک بار فرمایا:

ان رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکنْ یسرُدُ الحدیثَ کسردِکم کان یحدِثُ حدیثاً لَوعدّہ العادُّ لاحصاہ (متفق علیہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری طرح تیز باتیں نہیں کرتے تھے۔ آپ اس طرح بات کرتے تھے کہ اگر گننے والا گنے تو اس کو گن لے۔

اسی مقصد سے کبھی آپ سوال و جواب کا انداز اختیار کرتے۔ کبھی رواجی اسلوب سے ہٹ کر کسی انوکھے اور چونکا دینے والے اسلوب میں اپنی بات ارشاد فرماتے۔ کبھی اپنے کلام کو ایک سے زیادہ بار فرماتے۔ کبھی سننے والے سے کہتے کہ میرے کہے ہوئے کو دہراؤ تاکہ میں دیکھوں کہ تم نے میرے الفاظ کو کس طرح پکڑا ہے۔ پھر اسی حکمت کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ نے ایک بات کسی شخص سے ایک انداز میں فرمائی اور وہی بات کسی دوسرے شخص سے دوسرے انداز میں۔

انھیں حکیمانہ طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ اپنی بات کو گنتی کی صورت میں بیان فرماتے ——— "دو باتیں آدمی کے لئے ضمانت ہیں"۔ "تین باتیں جس کے اندر ہوں"۔ "چار باتیں یاد رکھو"۔ پانچ باتیں بنیادی ہیں"۔ حدیثوں

میں دین کی تعلیم کرتے ہوئے اس قسم کے جو الفاظ آتے ہیں وہ اسی خاص حکمت کی وجہ سے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما الامور ثلاثۃ۔ امر تبین لک رشدہ فاتبعہ۔ و امر تبین لک زیغہ فاجتنبہ۔ و امر اختلف فیہ فکلہ الی عالمہ

معاملات تین طرح پر ہیں۔ وہ معاملہ جس کی صحت تم پر واضح ہو اس کی پیروی کرو۔ اور وہ معاملہ جس کی کجی تم پر واضح ہو اس سے بچو۔ اور وہ معاملہ جس میں اختلاف پڑجائے اس کو کسی جاننے والے کے سپرد کردو۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اصلاح کی بات کہنی تھی۔ اس کو آپ نے "تین" کلمات میں تقسیم کرکے فرمایا تاکہ سننے والے کو وہ فوراً یاد ہوجائے اور وہ اس کے ذہن کا جزء بن سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت نے بھی اس حکیمانہ طریقہ کی پیروی کی۔ امت کے رہنما اور واعظین مسلسل اسی انداز کلام میں لوگوں کو نصیحتیں کرتے رہے۔ وہ جب کسی سے نصیحت کا کوئی کلمہ کہتے تو ایسے اسلوب میں کہتے کہ لوگ اس کو پکڑ لیں اور اپنے دماغ میں اس کو محفوظ رکھیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر یحییٰ بن معاذ الرازی کے دو اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

طوبیٰ لمن ترک الدنیا قبل ان تترکہ و بنی قبرہ قبل ان یدخلہ وارضی ربہ قبل ان یلقاہ

مبارک ہے وہ جس نے دنیا کو چھوڑ دیا اس سے پہلے کہ دنیا اسے چھوڑے۔ جس نے اپنی قبر بنالی اس سے پہلے کہ وہ اس میں داخل ہو۔ جس نے اپنے رب کو راضی کرلیا اس سے پہلے کہ وہ اس سے ملے۔

ترک الدنیا کلہا اخذُھا کلہا۔ فمن ترکہا کلہا اخذَھا کلہا ومن اخذَھا کلہا ترکہا کلہا فاَخذُھا فی ترکِہا وترکُہا فی اخذِھا

دنیا کو پورا چھوڑنا دنیا کو پورا پکڑنا ہے۔ پس جس نے پورے کو چھوڑا اس نے پورے کو پکڑ لیا اور جس نے پورے کو لیا اس نے پورے کو چھوڑ دیا۔ پس دنیا کو لینا اس کے چھوڑنے میں ہے اور دنیا کو چھوڑنا اس کے لینے میں ہے۔

نصیحت کا کلمہ خیر خواہی کا کلمہ ہے۔ سچی نصیحت اصلاح کی تڑپ کے تحت نکلتی ہے۔ ایسا آدمی فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ بات کو ایسے انداز سے کہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے۔ وہ سننے والے کے ذہن میں مستقل طور پر محفوظ ہوجائے۔ وہ اس کو اصول زندگی کے طور پر ہمیشہ کے لئے یاد رکھے۔ یہ جذبہ کہنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مخاطب کی پوری رعایت کرے۔ وہ اپنے الفاظ اور اپنے کلام کو زیادہ سے زیادہ پُرحکمت بنائے۔ مخاطب کے ساتھ یہی خیر خواہی اور رعایت ہے جو نبی اور اس کے سچے متبعین کے یہاں مندرجہ بالا قسم کے ناصحانہ کلام میں ڈھل جاتی ہے۔

ایمان آدمی کو اللہ والا بناتا ہے

امام احمد نے براء بن عازب کی حدیث میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ پر ایمان کی سب سے مضبوط گرہ اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے دشمنی ہے (اوثق عری الایمان باللہ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ)

خدا کے حکم کے آگے جھک جانا

طائف کے قبیلہ ثقیف کا ایک خاندان بنو عمرو بن عمیر تھا۔ اور قبیلہ بنو مخزوم کا ایک خاندان بنو مغیرہ۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان زمانہ جاہلیت میں سودی لین دین کا معاملہ جاری تھا۔ فتح مکہ کے بعد دونوں خاندان اسلام لائے تو اس وقت بنو عمرو بن عمیر کا سود بنو مغیرہ کے ذمہ واجب الادا تھا۔ چنانچہ بنو عمرو بن عمیر نے بنو مغیرہ سے اپنے سودی بقایا کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد بنو مغیرہ نے آپس میں مشورہ کیا اور طے شدہ فیصلہ کے مطابق کہا کہ ہم اسلام لانے کے بعد اپنی اسلامی کمائی سے سود نہیں ادا کریں گے۔ اس پر جھگڑا بڑھا۔ اس وقت مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عتاب بن اسید حاکم تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ آپ نے اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیت لکھ کر بھیج دی: اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور بقایا سود کو چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔ اگر تم ایسا نہ کرو تو تم سے اللہ اور اس کے رسول کی جنگ ہے (البقرہ ۲۷۸ ـ ۷۹) اس آیت کو سنتے ہی بنو عمرو بن عمیر کا ذہن بدل گیا۔ انھوں نے کہا: ہم اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بقایا سود کو چھوڑتے ہیں (نتوب الی اللہ ونذر ما بقی من الربا، تفسیر ابن کثیر، المجلد الاول، صفحہ ۳۲۹)

جو رحم کرے گا اس پر رحم کیا جائے گا

احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر رحم والا رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا (الراحمون یرحمھم الرحمان۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء)

جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: کیا ہم آپ کی پہرہ داری نہ کریں۔ آپ نے فرمایا، آدمی کی تقدیر اس کی پہرہ داری کرتی ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

وانہ لا یجد طعم الایمان حتی یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیخطئہ وما اخطأہ لم یکن لیصیبہ (ابوداؤد) ایمان کی لذت آدمی اس وقت تک نہیں پاتا جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ جو کچھ

اس پر گزرا ہے وہ اس سے چوکنے والا نہ تھا اور جو کچھ اس پر نہیں گزرا وہ اس پر گزرنے والا نہ تھا۔

وہ صبر و استقامت میں ہاتھی سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے۔

خلافت عباسی کے زمانہ میں خلق قرآن کا فتنہ اٹھا۔ اس وقت معتزلہ کے عقیدہ سے اختلاف کے نتیجہ میں امام احمد بن حنبل کو سخت سزائیں دی گئیں مگر وہ اپنے مسلک پر قائم رہے۔ حافظ ابن حجر ضرب کی نوعیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہاتھی کو بھی اگر اس طرح مارا جاتا تو وہ بھاگ جاتا (لو ضرب الفیل لھرب)

دعوت کا کام سب سے زیادہ قیمتی کام ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تمھارے ذریعہ سے ایک آدمی کو ہدایت دے دے تو یہ تمھارے لئے ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے (لان یھدی اللہ بک رجلاً واحداً خیر لک مما طلعت علیہ الشمس۔ وفی روایۃ: خیر لک من حُمُر النعم)

داعی لوگوں کا خیر خواہ ہوتا ہے خواہ وہ سرکشی کریں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۰ دن سے زیادہ مدت تک طائف کا محاصرہ کیا۔ جب مسلمانوں کے لئے وہ مشکل ہوگیا تو آپ نے واپسی کا حکم دیا۔ ایک شخص نے آپ سے کہا: اے خدا کے رسول، ثقیف کے لئے بد دعا کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا: اے اللہ، ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو مسلمان کر کے واپس لا (اللھم اھد ثقیفا وائت بھم مسلمین) اسی طرح آپ سے کہا گیا کہ قبیلہ دوس سرکش اور منکر ہوگیا ہے، اس کے خلاف بد دعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا: اے اللہ قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو مومن بنا کر لا (اللھم اھد دوسا وائت بھم مومنین)

وہ نیکی نیکی نہیں جس سے فخر اور بڑائی کا جذبہ پیدا ہو

ابن عطاء اللہ السکندری نے اپنی کتاب الحِکَم میں کہا ہے: ایسا گناہ جس سے پستی اور عجز پیدا ہو وہ اس نیکی سے بہتر ہے جس سے فخر اور گھمنڈ پیدا ہو (رُبَّ معصیۃ اورثتْ ذلاً وانکساراً خیر من طاعۃ اورثت عزاً واستکباراً)

اللہ کی یاد تمام اعمال کا خلاصہ ہے

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ کون سا عمل سب سے بہتر ہے اور تمھارے آقا کے نزدیک سب سے پاکیزہ ہے اور تمھارے درجات کو بڑھانے والا ہے اور تمھارے لئے سونے چاندی کے انفاق سے بہتر ہے اور تمھارے لئے اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن سے مڈبھیڑ کرو اور تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمھاری گردنیں ماریں۔ صحابہ نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا (ترمذی)

ایک سفر

وسط افریقہ میں ایک ملک ہے جس کا نام روانڈا ہے۔ اس کے دارالسلطنت کا نام کیگالی (Kigali) ہے۔ یہاں پہاڑوں کے خوبصورت ماحول میں کھلی فضا کے اندر ایک اسلامی مرکز قائم ہے۔ ۱۹۸۱ میں مجھے یہاں لکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ میرے اور میرے ساتھی کے لیے دو ہوائی ٹکٹ بھی آچکے تھے۔ مگر آخر وقت میں بعض وجوہ سے سفر ملتوی کر دینا پڑا۔ اس موقع کے لئے جو لکچر ترتیب دئے گئے تھے ان کا اردو ایڈیشن "احیاء اسلام" کے نام سے کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

اگست ۱۹۸۲ میں عالمی مؤتمر میں شرکت کے لئے طرابلس گیا تو وہاں سے دوبارہ کیگالی کے سفر کا انتظام ہو گیا۔ طرابلس کی الهيئة المشتركة نے یہ انتظام کیا کہ میں طرابلس سے واپسی میں کیگالی اور ابوظبی اور کویت وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے دہلی واپس جاؤں۔ اس پروگرام کے تحت میں ۳۱ اگست ۱۹۸۲ کو کیگالی پہنچا اور ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ تک وہاں مقیم رہا۔

لیبیا اور متحدہ عرب امارات کے باہمی تعاون سے ۱۹۷۵ میں ایک اسلامی ادارہ قائم ہوا جس کا صدر دفتر طرابلس میں ہے اور جس کا نام ہے:

الهيئة المشتركة لتاسيس المراكز الثقافية الاسلامية

اس ادارہ کے موجودہ ذمہ دار دکتور طاہر محمد الشویھدی ہیں۔ اس ادارہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے ملکوں میں اسلامی مراکز قائم کئے جائیں جن میں مسجد، مدرسہ، ہال، اسپتال، لائبریری اور دعوتی ادارے ہوں۔ یہ مراکز ایک طرف مقامی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے ہیں اور دوسری طرف مقامی غیر مسلم آبادی میں اسلام کی تبلیغ کا کام انجام دیتے ہیں۔ ہیئت کی طرف سے اس قسم کے مراکز گابون، ٹوجو، مالی، بورونڈی، یوگنڈا، زامبیا، انڈونیشیا وغیرہ میں قائم کئے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مرکز وہ ہے جو روانڈا کے دارالسلطنت کیگالی میں قائم ہے۔ اس مرکز کے تحت تقریباً ایک درجن شعبے کام کر رہے ہیں۔

طرابلس سے ہم ۳۰ اگست کو فرانسیسی ہوائی کمپنی کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں جہاز ایک گھنٹہ کے لئے مالٹا میں اترا۔ اس طرح موقع ملا کہ ہم جہاز سے باہر آکر مالٹا کو دیکھیں جو آج کل سیاحوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مالٹا کی زمین پر قدم رکھتے ہوئے عجیب احساس ہوا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آزادی ہند کی مسلح تحریک کے نتیجہ میں ہندستان کے مسلم قائدین کو جلاوطن کیا گیا۔ میں نے سوچا: ہمارے لیڈر موجودہ صدی کے آغاز میں ایک ناکام سیاسی تحریک کی خاطر اس جزیرہ میں آئے اور ناکام سیاسی تحریک کی خاطر اس سے واپس چلے گئے۔ اس کے

برعکس اگر وہ اللہ کے دین کے داعی بن کر "مالی" آتے تو شاید آج اس علاقہ کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ ایسی حالت میں ان کا آنا بھی کامیابی کا آنا ہوتا اور جانا بھی کامیابی کا جانا۔

پیرس سے ہم کو جہاز بدلنا تھا۔ اس کی وجہ سے چند گھنٹے پیرس میں گزرے۔ دہلی کی پُرہجوم آبادی کے مقابلہ میں پیرس ایک سونا شہر معلوم ہوتا ہے۔ تاہم وہ یورپ کا قدیم ترین ترقی یافتہ شہر ہے۔ ہم کو افریقہ کے ایک ملک سے افریقہ کے دوسرے ملک میں جانا تھا۔ مگر اس کے لئے ہم کو یورپ کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس وقت ہمارا پیرس اترنا اس بات کی علامت تھا کہ آج کسی مسلمان کو "لیبیا" سے "روانڈا" جانا ہو تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ اپنے لئے کوئی "پیرس" تلاش کرے۔ کیگالی سے ہم نے دہلی ٹیلیفون کیا تو اس کا رابطہ بھی پیرس سے قائم ہوا۔

یہ ہماری آج کی صورت حال ہے۔ مگر کسی زمانہ میں پیرس اس بات کی علامت تھا کہ اسلام کے علم برداروں کی پیش قدمی جو مکہ سے شروع ہوئی وہ خشکی اور تری کو پار کرتی ہوئی یورپ کے مرکزی شہر پیرس تک پہنچ چکی ہے۔ آج بھی پیرس کی بعض قدیم عمارتوں میں عربی کتبات موجود ہیں جو گزرے ہوئے عہد کی یاد دلاتے ہیں۔

۲۱ اگست کو ہم کیگالی (روانڈا) پہنچے۔ روانڈا وسط افریقہ میں خط استوا پر واقع ہے۔ اس کے ایک طرف یوگنڈا، دوسری طرف تنزانیہ اور تیسری طرف فرانس ہے۔ اس کا رقبہ ۲۶ ہزار مربع کیلومیٹر اور آبادی دو ملین (۲۰ لاکھ) ہے۔ اس کا دارالسلطنت کیگالی ہے۔ پورا ملک سرسبز پہاڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مٹی نہایت زرخیز ہے۔ مختلف فصلیں آبپاشی کے بغیر پیدا ہوتی ہیں۔

میرا قیام اصلاً کیگالی میں رہا۔ تاہم مجھے ایک طرف یوگنڈا تک جانے کا موقع ملا جہاں سرحد کے دونوں طرف کثرت سے چائے کے ہرے بھرے فارم پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہم بحیرہ مہازی (Muhazi) تک گئے جو تقریباً سو میل لمبا ہے اور روانڈا اور زائر کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ شہر کے علاوہ یہاں کی دیہاتی زندگی کو بھی تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔

عیدی امین (سابق صدر یوگنڈا) کی تصویر ہمارے یہاں بہت خراب ہے۔ مگر یوگنڈا کے لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ ذاتی طور پر بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ اسلام دوست تھا اور اس نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ اس کے زمانہ میں یوگنڈا میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ اس کی وجہ سے کلیسا اس کو بے حد ناپسند کرتا تھا۔ غیر ملکیوں کو یوگنڈا سے نکالنے میں عیدی امین نے جو سخت انداز اختیار کیا اس کی وجہ سے اس کے مخالفین کو موقع مل گیا کہ اس کو دنیا کے سامنے وحشی انسان کے روپ میں پیش کریں، حتیٰ کہ اس کو ملک سے نکال باہر کریں ——— اس سے اندازہ ہوتا ہے

صحافت کے میدان میں مسلمانوں کی پس ماندگی موجودہ زمانہ میں کتنے وسیع نتائج تک پہنچ رہی ہے۔ روانڈا اور یوگنڈا کی سرحد پر میں نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے نوٹوں کی گڈیاں ہاتھ میں لئے ہوئے گھوم رہے ہیں وہ آنے جانے والوں کے لئے نوٹوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ ان بچوں کے لئے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کوئی ان کے نوٹ چھین کر بھاگ جائے گا۔

روانڈا ابھی صنعتی انقلاب سے دور ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ بہت سادہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی فطرت پر قائم ہیں۔ چنانچہ اسلام ان کے درمیان تیزی سے پھیل رہا ہے۔

روانڈا میں کلیسا کافی طاقت ور ہے اور وہ اسلامی تبلیغ کا مخالف ہے۔ مگر یہاں کا موجودہ صدر جنرل ہابیا ریمانا (Habia Remana) نہایت ہوشیار اور منصف مزاج ہے۔ اس نے کھلے طور پر اعلان کیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر مذہب کو آزادی ہے کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل دیے بغیر اپنا مذہبی کام کرے۔ کیگالی کے موجودہ اسلامی مرکز کے لئے حکومت نے کافی وسیع زمین مفت دی ہے۔ اور اس پر چھ ملین ڈالر کے خرچ سے ایک بڑا اسلامی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ مرکز تعمیر ہونے کے بعد صدر روانڈا نے اس کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں کہا کہ روانڈا میں ہم اس طرح کے اور بھی اسلامی مراکز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے مراکز ہماری شان میں اضافہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ملک کے اندر آزادی فکر کا نشان ہیں۔

کیگالی کے اسلامی مرکز کا خاموش تبلیغی کام تقریباً پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دو درجن داعی پیدل یا کاروں یا بائیسکلوں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتے ہیں اور ان کو خدا کے دین کی دعوت دیتے ہیں۔ میں نے اپنے زمانہ قیام (۳۱ اگست تا ۵ ستمبر ۱۹۸۲) میں دیکھا کہ تقریباً روزانہ مختلف اطراف سے لوگ یہ خبریں لے کر آ رہے ہیں کہ فلاں مقام پر اتنے آدمی اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ تعداد اکائیوں میں نہیں بلکہ اکثر دہائیوں میں ہوتی ہے۔ حتی کہ کبھی سیکڑوں میں۔ آئے دن نومسلموں کی جماعتیں مرکز میں آتی ہیں تاکہ یہاں کچھ دن رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ اسی کے ساتھ ہر ایک باصرار اپنا ختنہ کراتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان نومسلموں میں تقریباً ۹۹ فی صد نوجوان ہیں۔

کام کی بڑھتی ہوئی رفتار کے لحاظ سے مرکز کے وسائل بہت کم ہیں۔ تاہم نہ صرف مرکز میں بلکہ مختلف مقامات پر نومسلموں کی دینی تعلیم کے لئے مدارس قائم ہیں جن میں مرکز کے مقرر کردہ معلمین ان کو اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ مقامی زبان (کینیا روانڈا) میں چھوٹی چھوٹی کتابیں سادہ دینی تعلیمات کے بارے میں شائع کی گئی ہیں۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۲ کو کیگالی کے اسلامی مرکز میں میرا لیکچر تھا۔ شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اور کئی ملکوں کے سفراء وسیع لیکچر ہال (قاعة المحاضرات) میں موجود تھے۔ اجتماع میں تقریباً نصف تعداد مسلمانوں کی تھی اور تقریباً نصف تعداد غیر مسلموں کی۔

یہاں مرکز کا اسٹاف کافی وسیع ہے۔ مگر ان میں کوئی اردو جاننے والا نہیں۔ روانڈا کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ چنانچہ شرکار کی اکثریت فرانسیسی زبان جاننے والوں پر مشتمل تھی۔ میں نے اپنا لکچر اس طرح تیار کیا کہ اولاً میں نے اپنی ہندستانی عربی میں لکچر کو املا کرایا۔ اس کے بعد مرکز کے ڈائرکٹر جناب محمد سلیمان القائد، جو میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے ہیں، انھوں نے میری عربی کو عربوں کی زبان میں لکھا۔ اس کے بعد اس عربی لکچر سے جناب سالم جابی (غینیا) نے اس کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔

لکچر کی صورت یہ ہوئی کہ اولاً میں نے عربی زبان میں ابتدائی کلمات کہے جس کا فوری طور پر سالم جابی نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد جناب ادریس لبنجی (روانڈا) نے میرا لکچر فرانسیسی میں پڑھ کر سنایا۔ لکچر کے بعد سائیکلو اسٹائل پر تیار کی ہوئی اس کی عربی اور فرانسیسی کاپیاں لوگوں کے درمیان تقسیم کی گئیں۔ جلد ہی انشاراللہ کیگالی کے اسلامی مرکز کی طرف سے دونوں زبانوں میں اس لکچر کو کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ طرابلس کا مقالہ (القرآن فی مواجہۃ التحدیات العصریہ) اور کیگالی کا لکچر (دور الاسلام فی التاریخ العالمی) دونوں اصلاً عربی زبان میں لکھے گئے۔ اس لئے فی الحال ان کا اردو نسخہ الرسالہ میں اشاعت کے لئے ہمارے پاس موجود نہیں۔

اسلامی مرکز (کیگالی) کا دعوتی کام اب تک زیادہ تر عوام میں ہو رہا ہے۔ مرکز کے ڈائرکٹر نے کہا: آپ کا یہ لکچر انشاراللہ مرکز کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اولاً ہم اس لکچر کو فرانسیسی اور عربی اور مقامی زبان (کینیا روانڈا) میں شائع کریں گے اور اس کے بعد آپ کی دوسری چھوٹی کتابیں بھی فرانسیسی میں اور عربی میں شائع کریں گے اس طرح انشاراللہ یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ (مثقفین) میں بھی ہمارا دعوتی کام شروع ہو جائے گا۔

اس سفر میں ایک اخوانی قائد سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک عرب ملک سے تعلق رکھتے تھے اور میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے میرے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کیا کہ اسلامی تحریک کا نشانہ دعوت ہے نہ کہ سیاست۔ ان کے نزدیک الاخوان المسلمون نے سیاسی طریق کار اختیار کر کے غلطی کی ہے۔ تاہم ان کا اصرار تھا کہ ان کو اخوان المسلمون میں بدستور شامل رہنا چاہئے تاکہ وہ اندر سے اس کی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔

میں نے کہا کہ اخوانیوں کا سیاسی طریق کار کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ ان کے فکر میں اول روز سے شامل تھا، ان کی اٹھان ہی سیاست پر ہوئی تھی۔ اور کسی تحریک کی اٹھان جس فکر پر ہوتی ہے وہ آخر تک اسی پر قائم رہتی ہے، آپ درمیان سے اسے بدل نہیں سکتے۔ تاہم انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا۔ بالآخر میں نے انھیں ایک تحریر لکھ کر دی اور کہا کہ اس کو پڑھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیجئے اور دو سال بعد اس کو دوبارہ کھول کر پڑھئے گا اور پھر دو سالہ تجربات کا جائزہ لے کر مجھے بتائیے گا کہ آپ کا خیال درست تھا یا میرا خیال۔ یہ تحریر میری ہندستانی عربی میں حسب ذیل تھی:

کل حرکۃ انسانیۃ، مہما کانت اسلامیۃ او غیر اسلامیۃ فہی تجری فی مجراہا التی قدّر لہا منذ البدء۔ لا یمکن لاحد ان یغیّر مجراہا من الوسط۔ حتی و لو حاول مؤسس تلک الحرکۃ هذا فلا ریب انہ سیفشل۔ اذا کان رجل مع حرکۃ ثم ظہر لہ ان فیہا غلطا، فلا سبیل لہ الآن یعتزل تلک الحرکۃ و یبدأ من جدید۔ و اذا ہو قام علی تصحیحہا و جعل یجتہد ان یتجہ بتلک الحرکۃ غیر اتجاہہا فلیس لہ فی النہایۃ الا الفشل۔ انما ینبغی علیہ ان لا یضیع عمرہ الثمین الذی بقی عندہ۔ و یستعمل نفسہ فی العمل الصحیح و الجہد المثمر۔ ہذا ما عندی و العلم عند اللہ العلی الخبیر۔

وحید الدین خان ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲

اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ کا بیشتر حصہ سفر میں گزرا۔ اس دوران میں مجھے دنیا کے تین براعظموں میں جانے کا موقع ملا۔ ایشیا، افریقہ، یورپ۔ ایشیا میں سعودی عرب، دبئی اور کویت۔ افریقہ میں لیبیا، روانڈا، یوگنڈا، کینیا اور ایتھوپیا۔ یورپ میں انگلینڈ، فرانس، مالٹا، یونان اور اٹلی۔ طرابلس کی موتمر میں ساری دنیا کے لوگ جمع تھے۔ آسٹریلیا اور امریکہ سمیت تقریباً ہر ملک کی نمائندگی وہاں موجود تھی۔ ان لوگوں سے کثرت سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طرح گویا ان مہینوں میں بالواسطہ یا براہ راست طور پر میں نے ساری دنیا کو دیکھ لیا۔ ان سفروں میں طرح طرح کے مختلف تجربات اور مشاہدات سامنے آئے۔ یہ تجربات اور مشاہدات انشاء اللہ الرسالہ میں آتے رہیں گے۔

تاریخ کا انوکھا کارنامہ

ایک بزرگ یہ دیکھ کر تڑپ اٹھے کہ ملک جل رہا ہے۔ ملت برباد ہو رہی ہے۔ ملک کو بدعنوانیوں نے تباہ کر رکھا ہے اور ملت کو امتیازی سلوک نے۔ وہ ملک اور ملت دونوں کو بچانے کے لئے "سر سے کفن باندھ کر" نکل پڑے۔

انھوں نے طوفانی دورے کئے، پُرجوش تقریریں کیں ــــ یہ ہمارا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ جب تک ہم ملک اور ملت دونوں کو بچا نہ لیں، ہم چین سے نہ بیٹھیں گے، ہم ہر قسم کی قربانیاں دیں گے۔ ہم ۲۱ فروری ۸۳ء سے ستیہ گرہ کریں گے۔ ہماری تحریک اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ملک اور ملت دونوں کے مسائل حل نہ ہو جائیں۔

لوگوں نے اپنی جانیں قربانی کے لئے پیش کیں۔ چندے دینے والوں نے چندے دیے۔ ہر طرف تھیلیوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ لوگ اُمنڈ اُمنڈ کر چاروں طرف سے آنے لگے، تاکہ ملک و ملت کو بچا کر یا تو غازی بنیں، یا اسی مقدس مشن میں جان دے کر شہید ہو جائیں۔

مگر عین اس وقت ایک معجزہ ظاہر ہوا۔ ستیہ گرہ کی تحریک شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ ملک اور ملت دونوں کے تمام مسائل اچانک حل ہو گئے۔ ۲۲ فروری ۱۹۸۳ء کی صبح کو مذکورہ بزرگ کا اُردو اخبار (زیادہ صحیح لفظوں میں جماعتی بلیٹن) چھپ کر آیا تو اس کا صفحہ اول موٹی موٹی سُرخیوں سے بھرا ہوا تھا:

"ملک و ملت بچاؤ تحریک کی عظیم کامیابی

حکومت نے ہمارے تمام مطالبات منظور کر لئے

ستیہ گرہ کی تحریک کا شاندار التوا"

عجیب بات ہے کہ ملک و ملت کے بارے میں اتنا بڑا واقعہ ہو گیا مگر خود ملک و ملت کو اس کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ ۲۲ فروری کی صبح کو مذکورہ بزرگ کے اپنے لیتھو پر چھپنے والے دو ورقہ اُردو اخبار میں جو خبر انتہائی نمایاں سُرخیوں میں چھپی ہوئی تھی وہ اس دن کے بڑے بڑے ملکی اخبارات میں کسی گوشہ کے اندر بھی جگہ نہ پا سکی۔ شاید لوگوں کا حسد بزرگ کے کمالات کا اعتراف کرنے میں رُکاوٹ بن گیا ہو۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ خود بزرگ کا اپنا اخبار بھی بزرگ کی تاریخ ساز کامیابی کو صحیح طور پر شائع کرنے میں ناکام رہا۔ اپنے صفحہ اول کی رپورٹ میں ایک طرف اس نے لکھا کہ "ہمارے نمائندہ خصوصی کی اطلاع کے مطابق حکومت نے ملک و ملت بچاؤ تحریک کی تمام شرطوں کو تسلیم کر لیا۔" دوسری طرف اسی اخبار کے اسی صفحہ میں یہ بھی درج تھا کہ "وزیر اعظم اور تحریکِ ملک و ملت کے لیڈروں کے درمیان سوا دو گھنٹے تک بات چیت ہوتی رہی لیکن کچھ طے نہ ہو سکا۔"

بزرگ "ملک و ملت" تحریک چلانے میں مصروف ہیں، مگر بُرا نے شہر کے دیواری پوسٹروں نے یہ اطلاع دی ہے کہ کچھ لوگ ایک اور تحریک چلانے کا ارادہ کر رہے ہیں جس کا عنوان ہوگا "ملک و ملت کو بزرگ سے بچاؤ۔"

اتحاد کب قائم ہوتا ہے

سر ایچ۔ اے۔ آر گب (۱۸۹۵ — ۱۹۷۱) مشہور مستشرق ہیں۔ وہ انگریزی کے علاوہ عبرانی، عربی آرامی وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے اسلام اور اسلامی تاریخ کو پڑھنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ پختہ عیسائی ہونے کے باوجود انھیں سلطان صلاح الدین ایوبی سے خاص دل چسپی تھی۔ انھوں نے سلطان کے پانچ معاصر مصنفین کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا ——— ابن ابی طے، ابن الاثیر، قاضی بہاء الدین ابن شداد، عماد الدین، القاضی الفاضل۔

پروفیسر گب نے سلطان صلاح الدین ایوبی سے متعلق مراجع کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں صدیوں کے بعد یہ منظر دکھائی دیا کہ ایک مسلم حکمراں مسلسل تین سال تک جنگ کے میدان میں اپنی فوجوں کے ساتھ رہ کر ایک مستعد دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ سلطان صلاح الدین اگرچہ کوئی بہت بڑے جنگی ماہر یا کوئی خاص تجربہ کار حکمراں نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کی غیر معمولی کامیابی کا راز ان کی یہ صلاحیت تھی کہ وہ صلیبی حملہ آوروں کے خلاف اپنی قوم کے مختلف عناصر اور ان کی باہم متصادم سیاسی قوتوں کو ایک محاذ پر یک جا اور متحد کر سکتے تھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی بے غرضی، ان کی فیاضی، ان کی سادگی، ان کی تواضع، ان کی ایمانداری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ موافق اور مخالف دونوں ہی ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ ان کی یہی خصوصیات تھیں جنھوں نے ان کو اس قابل بنایا کہ وہ مسلمانوں کی مختلف قوتوں کو ساتھ لے کر دشمن کا متحدہ مقابلہ کریں اور کامیاب ہوں (خلاصہ)

Studies on the Civilization of Islam

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے اور اتحاد کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ قوم کے ذمہ داروں کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ دوسروں کا اعتراف کرتے ہوں۔ ان کے سینہ میں اتنی کشادگی ہو کہ وہ دوسروں کو ان کا واقعی مقام دے سکیں۔ وہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے سے زیادہ اجتماعی مقاصد کو نمایاں کرنے میں دل چسپی رکھتے ہوں۔

اپنے آپ کو دوسروں کے قریب لے جانے کا نام اتحاد ہے۔ مگر اکثر لوگ دوسروں کو اپنے قریب لانے کا نام اتحاد سمجھ لیتے ہیں۔

جذباتی نہ بنو

۱۹۸۲ کے آخر میں دہلی میں ایشیائی کھیلوں کے مقابلے ہوئے جن کو عام طور پر ایشیاڈ (ASIAD) کہا جاتا ہے۔ ان کھیلوں میں مجموعی طور پر انڈیا نے تیرہ سونے کے میڈل حاصل کئے اور پاکستان نے صرف تین۔ مگر خود انڈیا اور پاکستان کے درمیان یکم دسمبر ۱۹۸۲ کو جو مقابلہ ہوا اس میں پاکستان کے مقابلہ میں ہندستانی ٹیم بری طرح ہار گئی۔ یہ دونوں کے درمیان ہاکی فائنل کا مقابلہ تھا اور انڈیا ایک اور سات کے تناسب سے پاکستانی ٹیم سے ہار گیا۔

ایشیاڈ کے تمام کھیلوں کے مقابلہ میں یکم دسمبر کا یہ کھیل سب سے زیادہ ہندستانیوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس دن غیر معمولی زور و شور رہا۔ چنانچہ جب نتیجہ سامنے آیا تو ہمارے لکھنے اور بولنے والوں نے خوب خوب تبصرے کئے۔ ان تبصروں میں ایک تبصرہ خاص طور پر بہت سبق آموز تھا۔

ایوننگ نیوز (۲ دسمبر ۱۹۸۲) نے کل کے دن کیا غلطی ہوئی (What went wrong yesterday) کے عنوان سے ایک رپورٹ چھاپی تھی۔ اس میں رپورٹر نے بہت سے ہندستانیوں کے تبصرے درج کئے تھے۔ ایک سینئر جرنلسٹ کے حوالے سے یہ جملہ نقل کیا گیا تھا:

Whenever Indians play against Pak they are all nerves and this affects their game.

جب بھی ہندستان والے پاکستانیوں سے کھیلتے ہیں تو وہ بالکل جذباتی ہو جاتے ہیں اور یہ چیز ان کے کھیل کو متاثر کرتی ہے۔

کامیابی ہمیشہ اس کا نام ہوتی ہے کہ آدمی اپنی عقل کو بخوبی طور پر کام میں لائے۔ مگر جب آدمی کسی معاملہ میں جذباتی ہو جائے تو اس کے جذبات اس کی عقل پر چھا جاتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کر سکے۔ اور مقابلہ کی اس دنیا میں عقل کو صحیح طور پر استعمال نہ کرنے ہی کا دوسرا نام ناکامی ہے۔

اگر آج کسی سے آپ کو تکلیف پہنچے تو سوچ سمجھ کر کل اس کا جواب دیجئے۔ کسی کی ایک کارروائی سے آپ کے اندر غصہ پیدا ہو تو پہلے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیجئے اور اس کے بعد اس کے مقابلہ کے لئے اٹھئے۔ کوئی شخص آپ کو حقیر معلوم ہو تو اپنے ذہن میں اس کو برابر کی سطح پر لائیے اور پھر اس کے خلاف کارروائی کیجئے ــــــ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

پیغمبرِ انقلاب ؐ

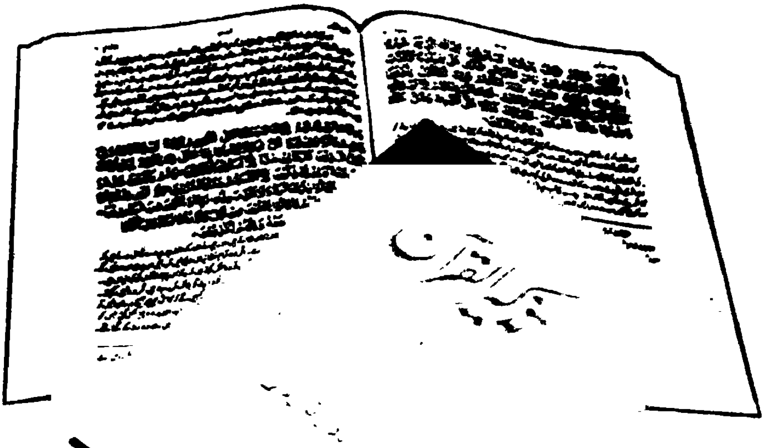
سیرتِ پاک کا عِلمی اور تاریخی مُطالعہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کے وقت دعا فرمائی کہ خدایا تو اسماعیل کے خاندان میں ایک نبی پیدا کر۔ دعا قبول ہوئی اور آمنہ کے بطن سے اسماعیلی پیغمبر پیدا ہو گئے۔ مگر حضرت ابراہیم کی دعا اور اسماعیلی پیغمبر کی بعثت کے درمیان تقریباً ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ نبیوں کے خاتم تھے۔ آپ کو خدا کے دین کی تبلیغ کے ساتھ خدا کے دین کو غالب بھی کرنا تھا تاکہ خدا کے انعامات کا کامل ظہور ممکن ہو سکے اور آپ کی لائی ہوئی آسمانی کتاب (قرآن) کی مستقل حفاظت کا انتظام ہو۔ یہ کام موجودہ عالم امتحان میں اسباب ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا تھا اور یہی موافق اسباب فراہم کرنے میں ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ اب پچھلے ہزار سال کے دوران دوبارہ ایسے موافق اسباب پیدا کیے گئے ہیں جو موجودہ زمانہ میں دینِ محمدی کے غلبہ کا ذریعہ بن سکیں ——— یہ ہے بنیادی فکر جس کی تفصیل زیرِ نظر کتاب میں کی گئی ہے۔

قیمت ۲۰ روپے

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ — قاسم جان اسٹریٹ — دہلی ۱۱۰۰۰۶



تذکیر القرآن

جلد اوّل

سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ ۔ قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

بدخواہی ایک ایسا زہر ہے ـــــــ
جس کا نصف حصہ آدمی کو خود پینا پڑتا ہے

اپریل ۱۹۸۳ ☐ قیمت فی پرچہ ـ تین روپے ☐ شمارہ ۷۷

خدا اور انسان

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

فہرست

سالِ اشاعت ۱۹۸۳ قیمت تین روپیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان نے ہمیشہ خدا کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے میں بھی۔ اس نے خدا کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور اپنے آپ کو خدا جیسا۔ یہی ہر دور کے انسان کی غلطی رہی ہے۔ ساری انسانی تاریخ اسی غلطی اور اس کے نتائج کی داستان ہے۔

خدا کو اپنے جیسا سمجھنا یہ ہے کہ خدا کو انسانی سطح پر اتار لایا جائے۔ الحاد اور شرک کی تمام قسمیں اسی غلطی کی پیداوار ہیں۔ الحاد بھی خدا کو انسان پر قیاس کرنے کا دوسرا نام ہے اور شرک بھی۔

انسان ہمیشہ باپ اور ماں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، وہ کسی جننے والے کے ذریعہ جنا جاتا ہے۔ اس بنا پر گمان کر لیا گیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو جننے والا بھی کوئی ہونا چاہئے۔ کسی کو خدا سے پہلے ہونا چاہئے جو خدا کو وجود بخشے۔ اب چونکہ انسان کو خدا ئے لم یزل کا پیدا کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اس لئے اس نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ انسان اپنی تخلیق کی صورت میں اپنے خالق کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے ایک غلط مفروضہ کی وجہ سے اس کو ماننے پر تیار نہ ہوا۔

جن لوگوں نے خدا کو مانا انھوں نے یہی غلطی دوسرے انداز سے کی۔ انھوں نے دیکھا کہ انسان جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو بہت سے لوگوں کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے خدا کے بھی شریک اور مددگار فرض کر لئے۔ انسان کے یہاں بڑے لوگوں کی سفارشیں چلتی ہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ مخصوص اور قریبی لوگ ہیں جو خدا کے دربار میں اثر رکھتے ہیں اور خدا ان کی سفارشیں قبول کرتا ہے۔ انسان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ وہ اکثر حق کے تقاضوں کو چھوڑ کر جذباتی میلان کے تحت فیصلے کرتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ خدا محض گروہی تعلق کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے ایسا معاملہ کرتا ہے جو معاملہ وہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس قسم کا ہر عقیدہ خدا کی خدائی کی نفی ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اکثر اپنے ذہن میں ایسے متضاد خیالات کو جمع کر لیتا ہے جن کا بیک وقت درست ہونا ممکن نہیں۔

اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھنا یہ ہے کہ آدمی یہ گمان کرے کہ وہ اپنی تقدیر کا مالک آپ ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ وہ اپنی زندگی کا اصول آپ وضع کرے اور اپنے حلال و حرام کو خود اپنی عقل سے متعین کرے۔ اس قسم کی ہر کوشش گویا اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھانا ہے، جو چیز صرف خدا کا حق ہے اس کا حق دار اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ مگر ایسا ہر گمان اس کائنات میں سراسر باطل ہے۔ کیونکہ انسان صرف ایک عاجز مخلوق ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خالق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

وحید الدین ۱۴ مارچ ۱۹۸۲

خدا اور انسان

کائنات خدا کا آئینہ ہے۔ یہاں خدا اپنی مخلوقات کے روپ میں نمایاں ہے۔ آدمی کی حساسیت اگر زندہ ہو تو اپنے گرد و پیش وہ خدا کو پائے گا۔ اپنے چاروں طرف وہ خدا کا مشاہدہ کرے گا۔ خدا کی کائنات اس کے لئے خدا کا زندہ ثبوت بن جائے گی۔

دنیا میں زندگی کی سرگرمیاں اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایک زندہ ہستی ہے نہ کہ کوئی ایسی ہستی جو زندگی اور حیات سے محروم ہو۔ جب سورج نکلتا ہے اور چھپی ہوئی چیزیں اس کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نے اپنی آنکھیں کھولی ہوں، جیسے خدا ایک دیکھنے والی ہستی ہو اور اپنی آنکھوں سے سارے عالم کو دیکھ رہا ہو۔ دریاؤں میں جب پانی کا سیلاب رواں ہوتا ہے تو وہ پُرشور اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک ایسا خالق ہے جو چلتا ہے اور اقدام کرکے آگے بڑھتا ہے۔ جنگل کا شیر جب اپنا پنجہ نکال کر کسی جانور کو اپنی پکڑ میں لیتا ہے تو گویا وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا خدا ایک ایسا خدا ہے جو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خلا کی بے پایاں وسعتیں اس حقیقت کا ابدی اظہار ہیں کہ اس کائنات کا خالق ایک لامحدود ہستی ہے، وہ اپنی ذات میں بھی اتھاہ ہے اور اپنی صفات میں بھی۔

خدا کا یہ کائناتی مشاہدہ ایک طرف آدمی کے اندر خدا کا یقین پیدا کرتا ہے دوسری طرف اس کو بہت بڑے سوال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس دنیا کا اگر خدا ہے تو وہ اپنی دنیا میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔ دنیا میں بے پناہ برائیاں ہیں۔ یہاں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ ایک شخص موقع پا کر دوسرے شخص کو ذبح کر دیتا ہے۔ یہ سب خدا کی دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ مظلوموں کی جانب کھڑا نہیں ہوتا۔

اس سوال کو صرف اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ مخلوقات کے بارہ میں خالق کی اسکیم کو سمجھ لیا جائے۔ موجودہ دنیا خدا کا مستقل بندوبست نہیں، وہ صرف امتحانی بندوبست ہے۔ یہ گویا ایک کھیت ہے جس میں مختلف پودوں کو اگنے کا موقع دے کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا درخت ہے اور کون جھاڑ جھنکاڑ۔ اس کے بعد اچھے درختوں کو ہر قسم کے بہترین مواقع دے کر تمام برے درختوں کو اکھاڑ دیا جائے گا اور پھر خدا کی دنیا خدا کے معیاری انتظام کے تحت حسن اور لذت کی ابدی بہشت بن جائے گی۔

یہ گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ نہیں

تمام سفروں میں ٹرین کا سفر سب سے زیادہ تجربات سے بھرا ہوتا ہے۔ انسانی قافلوں کو لئے ہوئے تیز رفتار ایکسپریس دوڑی چلی جارہی ہے۔ گاڑی کے دونوں طرف قدرت کے مناظر مسلسل ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس طرح ٹرین گویا زندگی کے بڑے سفر کی ایک علامت بن گئی ہے جو نشانیوں سے بھری ہوئی ایک دنیا میں انسان طے کر رہا ہے۔ مگر جس طرح ٹرین کے مسافر اطراف کے مناظر سے بے خبر ہو کر اپنی ذاتی دلچسپیوں میں گم رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بکھری ہوئی نشانیوں پر غور کرے۔

سورج اپنے روشن چہرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور انسان کے اوپر اس طرح چمکتا ہے جیسے وہ کوئی پیغام سنانا چاہتا ہو۔ مگر وہ کچھ کہنے سے پہلے غروب ہو جاتا ہے۔ درخت اپنی ہری بھری شاخیں نکالتے ہیں، دریا اپنی موجوں کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر انسان ان کے پاس سے گزر جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ان کا کوئی بول اس کے کان میں پڑا ہو۔ آسمان کی بلندیاں، زمین کی رعنائیاں سب ایک عظیم "اجتماع" کے شرکا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک خاموش کھڑا ہوا ہے۔ وہ انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

یہ عظیم کائنات کیا گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدا کا ایک پیغام ہے اور اس کو وہ ابدی زبان میں نشر کر رہا ہے۔ مگر انسان دوسری آوازوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اس کو کائنات کا خاموش کلام سنائی نہیں دیتا۔ ایک سفر میں ہم ایک درمیانی اسٹیشن پر نماز پڑھنے کے لئے اترے۔ اسٹیشن کے آدمیوں سے پوچھا کہ "پچھم کس طرف ہے"۔ مگر کسی کے پاس اس سادہ سے سوال کا جواب نہ تھا۔ میں نے سوچا "سورج ایک روشن ترین حقیقت [illegible] یثیت سے روزانہ ان کے اوپر نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ مگر لوگ اپنے آپ میں اتنا گم ہیں کہ ان کو مشرق و مغرب کا پتہ [illegible] ۔ پھر وہ لطیف پیغام جو سورج اور اس کے کائناتی ساتھی اپنی خاموش زبان میں نشر کر رہے ہیں ان سے کیسے کوئی با[illegible] سکتا ہے۔

ہماری ٹ[illegible] یلے اسٹیشن پر رکی۔ میں باہر آکر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ ہرے بھرے درخت، ان کے پیچھے سرخی ملی ہوئی روشنی اور اس کے اوپر پھیلے ہوئے بادل، عجیب آفاقی حسن کا منظر پیدا کر رہے تھے۔ "ان میں یہ حسن ان کی بلندی نے پیدا کیا ہے"، میں نے سوچا۔ "مگر انسان اس بلندی تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس سطح پر نہیں جیتا جس سطح پر درخت جی رہے ہیں، وہ وہاں بسیرا نہیں لیتا جہاں روشن[illegible] ر بادل بسیرا لئے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ سطحی مفادات میں جیتا ہے۔ وہ جھوٹی دوستی اور جھوٹی دشمنی میں سانس ل[illegible] ہے۔ کائنات کا ہم سفر بننے کے بجائے اپنے آپ کو وہ اپنی ذات کے خول میں بند کر لیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں جنتی فضائیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہاں وہ اپنے آپ کو دوزخ کے ماحول میں ڈال دیتا ہے۔ انسانی دنیا کے بگاڑ کی ساری وجہ یہی ہے۔ اگر وہ بلند سطح پر جینے لگے تو اس کی زندگی میں بھی وہی حسن آجائے جو قدرت کے حسین مناظر میں دکھائی دیتا ہے۔ (۱۶ مارچ ۱۹۷۹)

خدا کی دنیا

جب آپ اپنے کمرہ میں ہوں تو آپ اس کی چھت کو ناپ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کی لمبائی کتنی ہے اور چوڑائی کتنی۔ مگر جب آپ کھلے میدان میں آسمان کے نیچے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی چھت کی لمبائی اور چوڑائی کو ناپنے کے لئے آپ کے تمام پیمانے ناکافی ہیں۔ یہی حال خدا کی پوری کائنات کا ہے۔ ایک بیج جس طرح بڑھ کر درخت کی ایک دنیا بناتا ہے اس کو کون بیان کر سکتا ہے۔ سورج کی روشنی، ہواؤں کا نظام، چڑیوں کے نغمے، پانی کے بہتے ہوئے چشمے اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سچائی اس سے زیادہ لطیف ہے کہ اس کو انسانی لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں زبان گنگ ہو جاتی ہے وہاں سے حقائق شروع ہوتے ہیں۔ جہاں الفاظ ساتھ نہیں دیتے وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ خدا چپ کی زبان میں بول رہا ہے اور ہم اس کو شور کی زبان میں سننا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ ہم خدا کی آوازوں کو سن سکیں۔ اس دنیا کی سب سے قیمتی باتیں وہ ہیں جو چپ کے بول میں نشر ہو رہی ہیں مگر جو لوگ صرف شور وغل کی بولیاں سننا جانتے ہوں وہ ان قیمتی باتوں سے اسی طرح ناآشنا رہتے ہیں جس طرح ایک بہرا شخص کسی عمدہ موسیقی سے۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ اس کے حسن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی جب اس دنیا کو دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ خدا کی اس ابدی دنیا کا باشندہ بن جائے ——— وہ ہواؤں میں شامل ہو جائے وہ درختوں کی سرسبزیوں میں جا بسے۔ وہ آسمان کی بلندیوں میں کھو جائے۔ مگر انسان کی محدودیتیں اس کی اس خواہش کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ اپنی محبوب دنیا کو دیکھتا ہے مگر اس میں شامل نہیں ہو پاتا۔ شاید جنت اسی کا نام ہے کہ آدمی کو اس کی محدودیتوں سے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ خدا کی حسین دنیا میں ابدی طور پر داخل ہو جائے۔

انسان نے جو تمدنی دنیا بنائی ہے وہ خدا کی دنیا سے کس قدر مختلف ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی سواریاں شور اور دھواں پیدا کرتی ہیں مگر خدا کی دنیا میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور نہ کہیں شور ہوتا ہے اور نہ دھواں۔ انسان انسانوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، مگر خدا کی دنیا میں ہوا اس طرح گزرتی ہے کہ وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ انسان اپنی غلاظت کو کاربن اور پسینہ اور بول و براز کی صورت میں خارج کرتا ہے مگر خدا نے اپنی دنیا میں جو درخت اگائے ہیں وہ اس کے برعکس اپنی کثافت کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں اور پھول اپنی کثافت کو خوشبو کی صورت میں۔ انسان کے بنائے ہوئے تمام شہروں میں کوڑے کو ٹھکانے لگانا ایک ناقابل حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مگر خدا کی بنائی ہوئی وسیع تر دنیا میں ہر روز بڑے پیمانہ پر "کوڑا" نکلتا ہے مگر کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ اس کو Recycle کرکے دوبارہ کائنات کے مفید اجزاء میں تبدیل کر دیا جاتا ہے ——— جو شخص حقیقت کی جھلک دیکھ لے وہ اس کے بیان سے اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر چپ طاری ہو جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظوں کا سیلاب بہانے لگے۔

معبود کی طلب

روس کے خلائی مسافر اندرن نکولائیف اگست ۱۹۶۲ میں جب ایک خلائی پرواز سے واپس ہوئے تو ۲۱ اگست کو ماسکو کی ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا:

جب میں زمین پر اترا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں زمین کو چوم لوں

انسان جیسی ایک مخلوق کے لئے زمین پر جو بے حساب موافق سامان جمع ہیں وہ معلوم کائنات میں کہیں بھی نہیں۔ روسی خلاباز جب زمین سے دور خلا میں گیا تو اس نے پایا کہ وسیع خلا میں انسان کے لئے صرف حیرانی اور سرگشتگی ہے۔ وہاں انسان کے سکون اور حاجت برآری کا کوئی سامان نہیں۔ اس تجربہ کے بعد جب وہ زمین پر اترا تو اس کو زمین کی قیمت کا احساس ہوا، ٹھیک ویسے ہی جیسے شدید پیاس کے بعد آدمی کو پانی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین اپنے تمام موافق امکانات کے ساتھ اس کو اتنی محبوب معلوم ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے اور اپنے جذبات محبت کو اس کے لئے نثار کر دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں الٰہ بنانا کہا گیا ہے۔ آدمی خالق کو نہیں دیکھتا، اس لئے وہ مخلوق کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچ جائے، جو اس حقیقت کو جان لے کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کسی برتر ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق کو پالے اور خالق کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اپنے تمام بہترین جذبات کو خدا کے لئے نثار کر دے۔

روسی خلاباز پر جو کیفیت زمین کو پاکر گزری وہی کیفیت مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر خدا کو پاکر گزرنا چاہئے۔ مومن وہ ہے جو سورج کو دیکھے تو اس کی روشنی میں خدا کے نور کو پالے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی لامحدودیت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی مہک کو پائے اور پانی کی روانی میں خدا کی بخشش کو دیکھے۔ مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن کی نگاہ مخلوقات میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور مومن مخلوقات سے گزر کر خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ غیر مومن مخلوقات کے حسن کو خود مخلوقات کا حسن سمجھ کر انھیں میں محو ہو جاتا ہے۔ مومن مخلوقات کے حسن میں خالق کا حسن دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو خالق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ غیر مومن کا سجدہ چیزوں کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا سجدہ چیزوں کے خالق کے لئے۔

انسان کی تلاش

انسان کے اندر ایک عجیب خصوصیت ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں ۔ وہ ہے لامتناہی تلاش کا جذبہ ۔ ہر آدمی اپنے پیدائشی جذبہ کے تحت ایک ایسی نامعلوم چیز کی تلاش میں رہتا ہے جس کو اس نے پایا نہیں. کوئی بھی کامیابی اس کو اس طلب کے بارے میں مطمئن نہیں کرتی، کوئی بھی ناکامی اس کے اندر سے اس جذبہ کو فنا نہیں کر پاتی ۔فلاسفہ اس کو آئیڈیل کی طلب کہتے ہیں ۔

یہ آئیڈیل کی طلب ہی تمام انسانی سرگرمیوں کی حقیقی اور آخری قوت محرکہ ہے ۔ اگر یہ طلب نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں اچانک ٹھپ ہو کر رہ جائیں ۔انسانی ذہن کی یہی وہ زبردست طلب ہے جس کو فرائڈ نے غلط طور پر جنسی خواہش سے تعبیر کیا۔ ایڈلر نے اس کو غلط طور پر حصول طاقت کی خواہش قرار دیا۔میک ڈوگل نے غلط طور پر کہا کہ یہ انسان کی تمام حیوانی جبلتوں کے مخلوطہ کا ایک پُراسرار نتیجہ ہے ۔مارکس نے اس کو غلط طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ انسانی زندگی کی معاشی خواہش ہے اور یہی اس کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتی ہے ۔ مگر ان توجیہات کو غلط قرار دینے کے لئے یہی واقعہ کافی ہے کہ یہ چیزیں جن لوگوں کو پوری طرح ملیں وہ بھی مطمئن نہ ہو سکے ۔ ان کی اندرونی ہستی بھی اسی طرح بے چین رہی جس طرح ان چیزوں سے محروم رہنے والے بے چین نظر آتے ہیں ۔

انسان ہزاروں برس سے اپنے اس آئیڈیل کو دنیا کی چیزوں میں تلاش کر رہا ہے ، مگر کوئی بھی شخص اس اطمینان سے دوچار نہیں ہوا کہ اس نے اپنی تلاش کا مکمل جواب پالیا ہے ۔اس معاملہ میں بادشاہ یا امیر بھی اتنا ہی غیر مطمئن رہتا ہے جتنا کوئی بے زور اور مفلس آدمی ۔ یہ لمبا تجربہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "نظر آنے والی" دنیا میں آدمی کی تلاش کا جواب موجود نہیں ۔ اس کا جواب اس "نظر نہ آنے والی" دنیا میں ہے جس کو آدمی محسوس تو کرتا ہے مگر دیکھ نہیں پاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طلب خدا کی طلب ہے ۔ آدمی جس آئیڈیل کو پانے کے لئے بے قرار رہتا ہے وہ خود اس کا خالق ہے ۔ ہر آدمی جس چیز کی تلاش میں ہے وہ دراصل وہ خدا ہے جو اس کی روح میں سمایا ہوا ہے ۔ ہر آدمی اپنی فطرت کے تحت مسلسل خدا کی جستجو میں رہتا ہے وہ اپنے اس اندرونی جذبہ کے تحت دنیا کی مختلف چیزوں کی طرف دوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید یہ چیز اس کی تلاش کا جواب ہو۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے اور قریب سے اس کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز وہ نہیں جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا۔

سب کچھ عجیب ہے

۱۹۵۷ میں روس نے پہلا اسپٹنک خلا میں بھیجا تھا۔ امریکہ نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ کو پہلی خلائی بس (کولمبیا) دو آدمیوں کے ساتھ بھیجی۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ تقریباً سو بار خلائی سفر کے لئے استعمال ہو سکتی ہے ۔

کولمبیا کا وزن ۷۵ ٹن ہے۔ اس کے بنانے میں تقریباً دس ارب ڈالر خرچ ہوئے ہیں اور وہ نو سال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ کولمبیا اپنے دو مسافروں کو لے کر خلا میں روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار ۲۶ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ ۵۴ گھنٹہ خلا میں رہی۔ اس نے زمین کے گرد ۳۶ چکر لگا کر ۱۰ لاکھ میل طے کئے اور پھر ۱۴ اپریل کو واپس آگئی۔ واپسی کے وقت مخصوص راڈ اور راکٹوں کے ذریعہ اس کی رفتار کو گھٹا کر ۳۴۵ کیلومیٹر فی گھنٹہ کیا گیا۔ جب وہ ہوائی کرہ میں داخل ہوئی تو ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر سرخ اینٹ کی مانند ہو گئی۔ اس وقت اس کا بیرونی درجہ حرارت ۱۵۰۰ درجہ سنٹی گریڈ تھا۔ مگر کولمبیا کے بیرونی سمتوں میں ہر طرف گرمی روکنے والے ٹائل ۳۱ ہزار کی تعداد میں لگائے گئے تھے اس کی وجہ سے اس کے اندر کے دونوں مسافر محفوظ رہے۔

کولمبیا کو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے صحرا میں ایک ہوائی میدان میں اتارا گیا۔ وہ صرف ۱۰ سکنڈ کے فرق سے اپنے ٹھیک وقت پر اتر گئی۔ تقریباً دو لاکھ آدمی اس کے اترنے کا منظر دیکھنے کے لئے وہاں جمع تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے کروڑوں آدمیوں نے اس واقعہ کو ٹیلی وژن پر دیکھا۔ کیلی فورنیا کے صحرا میں ۲۰ ٹرک اور کئی ہوائی جہاز اور دوسرے سامان موجود تھے تاکہ اترنے کے بعد وہ کولمبیا کی ہر ضرورت کو پورا کر سکیں ۔ کولمبیا راکٹ کی طرح عمودی شکل میں اوپر گئی۔ وہ ایک تابع سیارہ کی طرح زمین کے گرد گھومی اور پھر گلائڈر (ہوائی جہاز) کی طرح زمین پر اتر آئی ۔

کولمبیا کے دو مسافروں میں سے ایک مسٹر ینگ (John Young) تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہے۔ ۵۴ گھنٹہ بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ اس حیران کن خلائی سفر سے واپس کیلی فورنیا پہنچے تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ——— کیسا عجیب ہے اس طرح سے کیلی فورنیا آنا :

What a way to come to California

مسٹر ینگ خلائی سفر طے کر کے کولمبیا کے ذریعہ کیلی فورنیا میں اترے تو یہ بات ان کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز عجیب ہے۔ کوئی سفر خواہ پیدل ہو یا سواری کے ذریعہ ہو، اس میں اتنے بے شمار کائناتی اسباب شامل ہوتے ہیں کہ آدمی ان کے بارے میں سوچے تو معمولی سفر بھی اس کو ایسا حیران کن معلوم ہو کہ وہ پکار اٹھے : میرا اپنے پیروں سے چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا بھی اتنا ہی عجیب ہے جتنا کولمبیا کے ذریعہ خلائی سفر طے کر کے کیلی فورنیا کے صحرا میں اترنا۔ عام آدمی صرف کسی انوکھے واقعہ کے عجوبہ کو دیکھ پاتا ہے، عقلمند وہ ہے جو معمولی واقعات میں بھی اسی عجوبہ کو دیکھ لے۔

دریافت کی لذت

سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا اور اس سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے۔ پھر بھی سورج کی روشنی اور حرارت بے پناہ مقدار میں ہم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سورج کائنات کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ ہے جو قریب ہونے کی وجہ سے ہم کو بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں اور اس سے بہت زیادہ روشن بھی۔ روشنی اور حرارت کی یہ عظیم دنیائیں جن کو ستارہ کہا جاتا ہے بے شمار تعداد میں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کھرب ہا کھرب سال سے دہکنے کے باوجود ان کا حرارتی بھنڈار ختم نہیں ہوتا۔

ستاروں میں یہ بے پناہ قوت (Energy) کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہنس بیٹے (Hans Bethe) نے فلکیاتی طبیعیات کے میدان میں لمبی تحقیق کے بعد بتایا کہ اس کا راز کاربن سائیکل (Carbon Cycle) ہے۔ اسی تحقیق پر ۱۹۶۷ میں موصوف کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر بیٹے (پیدائش ۱۹۰۶) نے جس دن کاربن سائیکل کی یہ سائنسی دریافت کی، وہ ان کے لئے جوش و مسرت کا ایک ناقابلِ بیان لمحہ تھا۔ ان کی بیوی روز بیٹے (Rose Bethe) کہتی ہیں کہ رات کا وقت تھا۔ ہم نیو میکسیکو کے صحرا میں تھے۔ صحرائی ماحول میں آسمان کے ستارے عجیب شان کے ساتھ چمک رہے تھے۔ روز بیٹے نے اوپر نگاہ کی اور حیران ہو کر کہا "آکاش کے ستارے کتنا زیادہ چمک رہے ہیں" ڈاکٹر بیٹے نے جواب دیا: کیا تم کو خبر ہے کہ اس وقت تم اس واحد انسان کے عین قریب کھڑی ہو جو یہ جانتا ہے کہ یہ ستارے آخر چمکتے کیوں ہیں۔

Do you realize, just now you are standing next to
the only human who knows why they shine at all.

ہنس بیٹے کی دریافت اصل حقیقت کا بے حد جزئی پہلو تھا۔ اس نے ستاروں میں کاربن سائیکل کا عمل دریافت کیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود کاربن سائیکل کا عمل ستاروں میں کیوں ہے۔ اس عظیم تر راز کو مومن خدا کی صورت میں دریافت کرتا ہے۔ ایمان باللہ ایک دریافت (Discovery) ہے جو تمام دریافتوں سے زیادہ بڑی ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ سائنس داں کو معمولی دریافت ہوتی ہے تو وہ وفور جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ مگر ایمان والے سب سے بڑی چیز ـــــ خدا کو دریافت کرتے ہیں اور ان کے اندر کوئی جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا۔ شاید خدا پر ایمان کے دعوے داروں نے ابھی تک خدا کو دریافت نہیں کیا۔

خدا کی موجودگی کا تجربہ

اپالو ۱۵ میں امریکہ کے جو تین خلاباز چاند پر گئے تھے، ان میں سے ایک کرنل جیمز اروِن ((James Irwin)) تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگست ۱۹۷۲ کا وہ لمحہ میرے لئے بڑا عجیب تھا جب میں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ میں نے وہاں خدا کی موجودگی (God's Presence) کو محسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری روح پر اس وقت وجدانی کیفیت طاری تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا بہت قریب ہو۔ خدا کی عظمت مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آرہی تھی۔ چاند کا سفر میرے لئے صرف ایک سائنسی سفر نہیں تھا بلکہ اس سے مجھے روحانی زندگی نصیب ہوئی (ٹریبون ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲)

کرنل جیمز اروِن کا یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اتنا حیرتناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی صناعیوں میں ڈوب جائے۔ تخلیق کے کمال میں ہر آن خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش جو دنیا ہے اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور درخت اور چڑیا غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں ہے سب کا سب حد درجہ عجیب ہے، ہر چیز اپنے خالق کا آئینہ ہے۔ مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔ مگر ایک شخص جب اچانک چاند کے اوپر اترا اور پہلی بار وہاں کے تخلیقی منظر کو دیکھا تو وہ اس کے خالق کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے تخلیق کے کارنامہ میں اس کے خالق کو موجود پایا۔ ہماری موجودہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں یہاں بھی "خدا کی موجودگی" کا تجربہ اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح چاند پر پہنچ کر کرنل اروِن کو ہوا۔ مگر لوگ موجودہ دنیا کو اس استعجابی نگاہ سے نہیں دیکھ پاتے جس طرح چاند کا ایک نیا مسافر چاند کو دیکھتا ہے۔ اگر ہم اپنی دنیا کو اس نظر سے دیکھنے لگیں تو ہر وقت ہم کو اپنے پاس "خدا کی موجودگی" کا تجربہ ہو۔ ہم اس طرح رہنے لگیں جیسے کہ ہم خدا کے پڑوس میں رہ رہے ہیں اور ہر وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

اگر ہم ایک اعلیٰ درجہ کی مشین کو پہلی بار دیکھیں تو فی الفور ہم اس کے ماہر انجینئر کی موجودگی کو وہاں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم دنیا کو اور اس کی چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اسی وقت ہم وہاں خدا کی موجودگی کو پالیں گے۔ خالق ہم کو اس طرح نظر آئے گا کہ ہم خالق اور تخلیق کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرسکیں۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرے۔ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو سورج کی سنہری کرنوں میں اس کو خدا کا نور چمکتا ہوا دکھائی دے گا ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا روپ جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمس ربانی کا تجربہ ہوگا۔ اپنی ہتھیلی اور اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ آدمی کو حاصل ہو جائے۔

کائنات کا دسترخوان

قرآن میں ہے کہ اللہ آسمان وزمین کا نور ہے (نور) اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا تمام کی تمام خدائی صفات کا مظہر ہے۔ حساس قلب کو یہاں کی ہر چیز میں خدا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ رزق خداوندی کا دسترخوان ہے۔

خدا پر ایمان اگر کسی آدمی کو وہ حساسیت دیدے جو خدا پر سچے ایمان سے پیدا ہوتی ہے تو کائنات بن فی الواقع اس کو ہر طرف خدا کا نور دکھائی دے گا۔ ہوا کے لطیف جھونکے جب اس کے جسم کو چھوئیں گے تو اس کو ایسا محسوس ہو گا کہ لمس خداوندی کا کوئی حصہ اسے مل رہا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں اس کو رحمت حق کا جوش ابلتا ہوا نظر آئے گا۔ چڑیوں کے چہچہے جب اس کے کان میں رس گھولیں گے تو اس کے دل کے تاروں پر زمزمۂ خداوندی کے نغمے جاگ اٹھیں گے۔ پھولوں کی مہک جب اس کے مشام جان کو معطر کرے گی تو وہ اس کے لئے خدائی خوشبو میں نہانے کے ہم معنی بن جائے گی۔

ساری کائنات مومن کے لئے رزق روحانی کا دسترخوان ہے، ویسے ہی جیسے جنت اس کے لئے رزق مادی کا دسترخوان ہوگی۔ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عبرت حاصل کرے، ان کے ذریعہ وہ ان ربانی کیفیات کو پالے جو ان کے اندر ان لوگوں کے لئے رکھ دی گئی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اُگتے ہیں۔ موسم خزاں کے پت جھڑ کے بعد اس کا درخت بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب آتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر نہایت خوش رنگ پھول اس کی شاخوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ سوکھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ لطیف اور رنگین پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک محروم اور بے قیمت وجود کے لئے خدا نے خصوصی طور پر اپنی خوب صورت چھتری بھیج دی ہے۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا اس کو دیکھ کر کہے ——— "خدایا! میں بھی ایک ڈھاک ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلادے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سرسبز و شاداب کردے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کردے۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب ہم کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں، اس کے اوپر ایک قسم کا لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی آدمی صرف اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے خواہ اس نے پھول کے تعارف کے لئے انسانی زبان کے تمام الفاظ جمع کر دئے ہوں۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقیقتوں سے باخبر نہیں ہو سکتا، خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

ہدایت ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر اس کی سچی طلب رکھتا ہو۔ جو اپنے اندر سچائی کی کھٹک لئے ہوئے ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو۔ جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو۔ جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب بن جائے وہی سچائی کو پاتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس فطری صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص غیر حقیقی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے حقیقی دنیا کے اتنا قریب آ جاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

پیغمبر اس تلاش حق کی راہ میں آدمی کا مددگار ہے۔ پیغمبر کے ذریعہ حقیقت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے ——— قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

شکر کی اہمیت

چارلس رشٹر (Charless Richter) ایک امریکی سائنس داں ہیں۔ وہ زلزلہ کے ماہرین میں سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مخصوص پیمانہ دریافت کیا ہے جو آج دنیا بھر میں زلزلہ کی پیدا کردہ طاقت کو ناپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو رسٹر پیمانہ (Richter Scale) کہتے ہیں۔

چارلس رشٹر نے کیلی فورنیا کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں نصف صدی تک زلزلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ان سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ زلزلہ کے خطرہ سے بچنے کے لئے آدمی کو کہاں بھاگنا چاہئے۔ کیلی فورنیا میں اس کا جواب بالکل سادہ ہے، وہ یہ کہ کہیں نہیں۔ امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں زلزلہ کا سب سے کم خطرہ فلوریڈا اور ساحلی ٹکساس میں ہے۔ مگر پھر میں سوال کروں گا کہ طوفان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقہ کے اپنے کچھ خطرات ہیں۔ اس لئے واحد بدل یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے مقام پر چلا جائے اور کسی دوسرے خطرہ کو گوارا کرے (ہندستان ٹائمس ، ۱ اکتوبر ۸۰)

آدمی کا یہ مزاج ہے کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس پر وہ مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ کوئی بظاہر خوش نصیب آدمی جس کو لوگ قابل رشک سمجھتے ہیں وہ بھی اندر سے اتنا ہی غیر مطمئن ہوتا ہے جتنا وہ لوگ جو اس کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی نعمت ملی ہوئی ہے۔ مگر جس کے اندر شکر کی نفسیات نہیں ہوتی وہ غیر حاصل شدہ نعمت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت ہر وقت اسے حاصل ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لئے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ عین اسی چیز سے محروم رہ جاتا ہے جس کو اسے سب سے زیادہ اپنے سینہ کے اندر پرورش کرنا چاہئے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لئے نہیں۔ ایک جغرافیہ کا آدمی وہاں کے مسائل سے گھبرا کر دوسرے جغرافیہ میں چلا جائے تو اس کو دوسرے جغرافیہ میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ یہاں بھی مسائل ہیں۔ اسی طرح اگر کم آمدنی والے کے مسائل ہیں تو زیادہ آمدنی والے کے بھی مسائل ہیں۔ اگر بے زور آدمی کے مسائل ہیں تو ان کے بھی مسائل ہیں جن کو زور و قوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں کسی آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا حاصل کرنا ہو نہ کہ مسائل سے پاک زندگی کا مالک بننا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ظاہر فریبی

ایر مارشل عبداللطیف ہوائی جہاز چلانے کا چالیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ۲۵ اگست ۱۹۸۱ کو انھوں نے روسی ساخت کا آواز سے تیز چلنے والا لڑاکا جہاز مگ ۲۵ آزمائشی طور پر اڑایا۔ آدھ گھنٹہ تک پرواز کرنے کے بعد انھوں نے جہاز کو نیچے اتارا۔ ایر مارشل جب ہوائی جہاز سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

The flight made even the Himalayas look small

ہماری پرواز کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی چھوٹا دکھائی دیتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۱)

آواز سے تیز رفتار جہاز ہمالیہ کے اوپر اڑانیں بھر رہا ہو تو اس وقت جہاز کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو ہمالیہ واقعی حقیر دکھائی دیتا ہے، اور اپنی عظمت کا ایک عجیب احساس پیدا کرتا ہے مگر یہ غلط فہمی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ جہاز ہمالیہ کی کسی چوٹی سے ٹکرا جائے۔ چٹان کے معمولی ٹکراؤ سے بھی فی الفور جہاز میں آگ لگ جاتی ہے اور اچانک جہاز اور اس کا مسافر دونوں اس طرح راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

موجودہ دنیا میں کسی کو کوئی بڑائی ملتی ہے تو وہ بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کی ہر بڑائی ایسی ہی ہے جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز کے اوپر سے کسی آدمی کا پہاڑ کو دیکھنا۔ ایسے مسافر کو بظاہر اپنی سواری عظیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک خیالی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالات کا معمولی فرق بھی اس کو یہ بتانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

دنیا میں کسی چیز کو پانے کے لئے جن بے شمار اسباب کی موافقت ضروری ہے ان کی فراہمی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام موافق اسباب کو یکجا کر کے کسی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ تاہم اس سارے معاملہ پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کرلے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے پائے مگر اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا سمجھے۔ وہ بظاہر بڑا بنا ہوا ہو مگر اپنے کو چھوٹا یقین کرے۔ وہ بظاہر بلندی پر اڑ رہا ہو مگر اپنے کو پستی میں اترا ہوا محسوس کرے۔

آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری فریب سے گزر کر اصل حقیقت کو پالے، یہاں کی ہر بڑائی کو چھوٹی بڑائی سمجھے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس فریب کا پردہ پھاڑنے میں کامیاب ہوتے ہوں۔

رہنما کی ضرورت

ہم کو بھوک لگتی ہے۔ ہم اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کھانا موجود تھا جو ہماری بھوک کو مٹائے۔ ہم کو پیاس لگتی ہے۔ ہم اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے عمل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں پانی موجود تھا جو ہماری پیاس کو بجھائے۔ ایسا ہی معاملہ سچائی کا ہے۔ آدمی ہمیشہ سے سچائی کی تلاش میں ہے۔ یہ تلاش ہی اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ یہاں کوئی سچائی ہے جسے آدمی کو جاننا چاہئے۔ سچائی کھانے اور پینے سے زیادہ بڑی ہے۔ پھر جب ہماری چھوٹی طلب کا جواب اس دنیا میں موجود ہے تو ہماری بڑی طلب کا جواب یہاں کیوں نہ موجود ہوگا۔

سچائی کا سوال اپنی حقیقت کو جاننے کا سوال ہے۔ آدمی اچانک ایک روز پیدا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اس نے خود کو پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دنیا میں پاتا ہے جو اس سے الگ خود اپنے آپ قائم ہے۔ وہ پچاس سال یا سو سال اس دنیا میں رہ کر مر جاتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جاتا ہے۔ زندگی اور موت کی اسی حقیقت کو جاننے کا سوال سچائی کا سوال ہے۔

مگر ایک شخص جس طرح کھانا اور پانی کو جان لیتا ہے اسی طرح وہ سچائی کو نہیں جان سکتا۔ سچائی یقینی طور پر لامحدود اور ابدی ہے۔ سچائی اگر لامحدود اور ابدی نہ ہو تو وہ سچائی نہیں۔ مگر آدمی کی عقل اور اس کی عمر دونوں محدود ہیں۔ محدود عقل لامحدود سچائی تک نہیں پہنچ سکتی، محدود عمر کا آدمی ابدی سچائی کو دریافت نہیں کر سکتا۔

آدمی کی یہی نارسائی یہ ثابت کرتی ہے کہ سچائی کو جاننے کے لئے اسے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ "پیغمبری" کیا ہے۔ پیغمبری کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچائی جہاں تک آدمی اپنے آپ نہیں پہنچ سکتا تھا وہ خود آدمی تک پہنچ جائے۔ جس سچائی کو ہم اپنی کوششوں سے نہیں جان سکے، وہ خود ظاہر ہو کر اپنے بارے میں ہمیں بتادے۔

حقیقت سے لوگوں کو پیشگی طور پر باخبر کرنے کے لئے اس کو خدا نے پیغمبر کے ذریعہ کھولا۔ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کو براہ راست ہر آدمی پر کھول دیا جائے گا۔ پیغمبر نے بتایا کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ جس خدا کی اطاعت ساری کائنات جبر کے تحت کر رہی ہے اسی خدا کی اطاعت انسان ارادہ کے تحت کرنے لگے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو خدا کے آگے بے اختیار بنائے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کے باوجود جو لوگ خدا کے محکوم بن جائیں ان کے لئے جنت ہے اور جو لوگ آزادی پاکر سرکش بن جائیں ان کے لئے جہنم۔

اندھیرا ختم ہوگا

خدا کی دنیا میں انسان بظاہر ایک تضاد ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سورج ہر روز ٹھیک اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے وہاں انسان کا حال یہ ہے کہ آج ایک بات کہتا ہے اور کل وہ اس سے پھر جاتا ہے۔ جس دنیا میں سخت پتھروں کے اندر سے بھی پانی نکل پڑتا ہے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ بدترین بے دردی کا ثبوت دیتا ہے۔ جس دنیا میں اس کا چاند تمام مخلوقات کے اوپر بلا امتیاز چمکتا ہے وہاں انسان ایک کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے اور دوسرے کے ساتھ کچھ۔ جس دنیا کا ضمیر اپنے آپ کو پھولوں کی لطافت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے وہاں انسان کانٹوں سے بھی زیادہ برے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس دنیا میں ہواؤں کے جھونکے ہر طرف بے غرض خادم کی طرح پھر رہے ہیں وہاں انسان اس طرح رہتا ہے جیسے ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا اس کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔ جس دنیا میں ایک درخت دوسرے درخت کو دکھ نہیں دیتا وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو ستاتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو برباد کرکے خوشی کے قہقہے لگاتا ہے۔

یہ سب کچھ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا یہاں مداخلت نہیں کرتا، وہ اس تضاد کو ختم نہیں کرتا۔ مخلوقات کے آفاقی آئینہ میں خدا کتنا حسین معلوم ہوتا ہے مگر انسانی زندگی کے المناک گوشہ میں اس کا چہرہ کتنا مختلف ہے۔ خدا کے سامنے درندگی کے واقعات آتے ہیں مگر اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ خدا انسانوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کے سب سے زیادہ حساس باسیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے خلاف اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں ابھرتی۔ کیا خدا پتھر کی مورتی ہے، کیا وہ ایک انتہائی کامیاب اسٹیچو ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے مگر اس کے بارہ میں اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔

اس سوال نے ہر زمانہ کے سوچنے والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ مگر یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقات کے بارے میں ہم خالق کی حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ خالق کی اسکیم میں دنیا دارالامتحان ہے مگر ہم اس کو دارالجزا کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ کل کے دن پیش آنے والا ہے اس کو ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی کے دن ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔

جس طرح ہر روز رات کے اندھیرے کے بعد سورج کی روشنی پھیلتی ہے اسی طرح لازماً یہ بھی ہونے والا ہے کہ زندگی کا اندھیرا ختم ہو۔ ظالم اور مظلوم ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں۔ سرکش انسانوں کی گردنیں توڑی جائیں اور سچے انسانوں کو ان کی سچائی کا انعام دیا جائے۔ یہ سب کچھ اپنی کامل ترین صورت میں ہوگا، مگر وہ موت کے بعد ہوگا نہ کہ موت سے پہلے۔

دنیا اور آخرت

انسان کی سب سے بڑی طلب کیا ہے۔ یہ کہ اس کو خوشیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی حاصل ہو۔ یہی ہر زمانہ میں آدمی کا سب سے بڑا خواب رہا ہے۔ ہر آدمی اسی تمنا کو لے کر جیتا ہے۔ مگر ہر آدمی اس تمنا کی تکمیل کے بغیر مر جاتا ہے۔ سارے فلسفے اور نظریات، تمام انسانی کوششیں اسی ایک چیز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ مگر آج تک انسان نہ فکری طور پر اس کو دریافت کر سکا اور نہ عملی طور پر اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔

اس ناکامی کی وجہ صرف ایک ہے۔ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں پانا چاہتے ہیں۔ مگر ہزاروں برس کے تجربہ نے صرف ایک چیز ثابت کی ہے۔ یہ کہ موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔ موجودہ دنیا کی محدودیت، موجودہ دنیا میں انسانی آزادی کا غلط استعمال انتہائی فیصلہ کن طور پر اس میں مانع ہے کہ موجودہ دنیا انسانی خوابوں کی تعبیر بن سکے۔

ہم زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر صنعتی مسائل پیدا ہو کر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم بے پناہ قربانیاں کر کے ایک سیاسی نظام کو وجود میں لاتے ہیں مگر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والوں کا بگاڑ اس کو عملاً بے نتیجہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد، گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہو کر ہم کو الجھا لیتا ہے اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

یہ مسلسل تجربات ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے خوابوں کی دنیا موجودہ زمینی حالات میں نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے دوسری دنیا اور دوسرے حالات درکار ہیں۔ آدمی کی تمنائیں بجائے خود ایک حقیقی انسانی طلب ہیں۔ مگر اس طلب کی تکمیل کی جگہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی موجودہ دنیا۔

یہی واحد چیز ہے جو ہماری دنیا کی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انجام پانے کی دنیا۔ اس کے بعد آدمی اپنی وہ منزل پا لیتا ہے جس کی طرف وہ مطمئن ہو کر بڑھ سکے۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی بالآخر مایوسی اور انتشار ذہنی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو وہاں وہی نظریہ صحیح ہو سکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتا رہا ہو۔

انسان کا المیہ

یہ جولائی کی ایک حسین صبح تھی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا مگر آسمان کی وسعتوں میں اس کی پھیلتی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جلد ہی نکلنے والا ہے۔ افق پر بادل کے ٹکڑوں کے پیچھے سے پھوٹنے والی سورج کی ابتدائی شعاعیں عجیب رنگ برنگ منظر پیش کر رہی تھیں۔ درختوں کی سرسبزی، چڑیوں کے چہچہے اور صبح کی ہوا کے لطیف جھونکے ماحول کی رعنائی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: خدا کی دنیا انتہائی حد تک بامعنی ہے، مگر وہ اس وقت انتہائی حد تک بے معنی ہو جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو شامل نہ کیا جائے۔

دنیا بے حد لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ دنیا بے پناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بے نور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں، حتیٰ کہ اس خوش قسمت انسان کے لئے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔

انسان ایک کامل وجود ہے۔ مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اسی کے ساتھ وہ طرح طرح کی محدودیت کا شکار ہے اور بہت سے ناموافق حالات اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ انسان کی زندگی کامل زندگی ہونے کے باوجود اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایک ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو۔

خدا نے یہ کامل اور ابدی دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لئے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا۔ مگر اس کے لئے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

تضاد ختم ہوگا

میں آبادی سے دور ایک پہاڑ کے سامنے کھڑا تھا۔ سرسبز درخت میرے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ چڑیوں کی بولیاں کانوں میں آ رہی تھیں۔ مختلف قسم کے جانور چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوپر عجیب تاثر ہوا۔ کیسا عظیم اور کیسا کامل ہوگا وہ خدا جس نے اتنی بڑی دنیا بنائی اور پھر اس کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے بتائے ہوئے نقشہ کی انتہائی پابند رہتے ہوئے حرکت کرے۔

کتنی حسین اور کتنی معصوم ہے یہ دنیا۔ یہاں چڑیاں وہی آوازیں نکالتی ہیں جو ان کے خالق نے انھیں سکھایا ہے۔ یہاں بلی اور بکری بالکل اسی طرح اپنا اپنا رزق کھاتے ہیں جو پیدائشی طور پر ان کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہاں درخت عین اسی منصوبہ کے مطابق اُگتے اور بڑھتے ہیں جو ازل سے ان کے مالک نے ان کے لئے متعین کر دیا ہے۔ یہاں دریا ٹھیک اسی قانون کے مطابق رواں ہوتا ہے جو اس کے لئے ابدی طور پر مقدر ہے۔ خدا کی کائنات انتہائی کامل مجموعہ ہے اور یہاں کی ہر چیز ادنیٰ انحراف کے بغیر عین اسی طرح عمل کرتی ہے جس کا حکم اس کے خدا نے اسے دے رکھا ہے۔

مگر انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے منھ سے ایسی آوازیں نکالتا ہے جس کی اجازت اس کے خدا نے اسے نہیں دی۔ وہ ایسی چیزوں کو اپنا رزق بناتا ہے جس سے اس کے مالک نے اس کو روک رکھا ہے۔ وہ اپنے سفر حیات کے لئے ایسے راستے اختیار کرتا ہے جہاں کاتب ازل نے ہمیشگی طور پر اس کے لئے لکھ دیا ہے کہ "یہاں سے گزرنا منع ہے" انسان خدا کی کائنات کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ مگر وہ عظیم کائنات کے مجموعی نظام سے بغاوت کرتا ہے، وہ خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرتا ہے۔

یہ خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کو دخل دینا ہے۔ یہ ایک ہم آہنگ مجموعہ میں بے آہنگی کا جوڑ لگانا ہے۔ یہ ایک حسین تصویر میں بدصورتی کا دھبہ ڈالنا ہے۔ یہ ایک کامل دنیا میں ناقص چیز کا اضافہ کرنا ہے۔ یہ فرشتوں کی سرگرمیوں کے ماحول میں شیطان کو سرگرم ہونے کا موقع دینا ہے۔

خدا کی قدرت اور اس کے حسن ذوق کا ثبوت جو عظیم تر کائنات میں ہر لمحہ نظر آتا ہے وہ اس گمان کی تردید کرتا ہے کہ یہ صورت حال اسی طرح باقی رہے۔ خدا کی قدرت یقیناً اس ظلم کی اجازت نہیں دے سکتی۔ خدا کا حسن ذوق ہرگز اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ضرور ہے کہ وہ دن آئے جب کائنات کا یہ تضاد ختم ہو، خدا کی مرضی انسانی دنیا میں بھی اسی طرح پوری ہونے لگے جس طرح وہ بقیہ دنیا میں پوری ہو رہی ہے۔

آپریشن

فونکس (امریکہ) کے اسپتال میں ایک شخص نے داخلہ لیا۔ اس کے پیٹ میں نہایت سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو آپریشن کا کیس قرار دیا۔ چنانچہ اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ اس کے پیٹ میں ایک ہیرا اٹکا ہوا ہے۔ یہی ہیرا اس کے ناقابل برداشت درد کا سبب تھا۔ ہیرا اس کے پیٹ سے نکال کر الگ کیا گیا۔ اس ہیرے کے ساتھ اب بھی قیمت کا پرچہ لگا ہوا تھا۔ اس پرچہ پر لکھا ہوا تھا ———— ۶۵۰۰ ڈالر۔

فوراً پولیس طلب کی گئی۔ پوچھ گچھ کے دوران مریض نے بتایا کہ اس کو انعام میں یہ ہیرا ملا تھا اور غلطی سے وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ تاہم بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ شخص ایک بار ہیرے کی ایک دکان میں داخل ہوا اور وہاں ایک ہیرا چرالیا۔ مگر جب وہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو دکان دار کو شبہ ہوا۔ اس نے آدمی کا پیچھا کیا۔ جب آدمی نے دیکھا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے تو اس نے ہیرے کو جلدی سے منھ میں ڈالا اور نگل لیا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی مگر وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد فوراً اس کو گرفتار کرلیا گیا (ہندستان ٹائمس ۵ نومبر ۱۹۸۱ء)

ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہ ہوسکا۔ وہ مجبور ہوگیا کہ چھپائے ہوئے ہیرے کو نکال کر باہر لائے اور خود اپنے جرم کا زندہ ثبوت بن جائے۔ یہی معاملہ شدید تر صورت میں لوگوں کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں آدمی ایک شخص کا حق دباتا ہے، وہ کسی کو وہ کلمۂ اعتراف دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو ازروئے واقعہ اسے دینا چاہئے۔ یہ سب کرکے بھی آدمی موجودہ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ زور اور ہوشیاری کے ذریعہ وہ اپنے جرم کو چھپا لیتا ہے۔ مگر یہ صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی موت سے دوچار نہیں ہوتا۔ موت ہر آدمی کے لئے گویا قدرت کا آپریشن ہے جو اس کے اندر کو باہر کر دیتا ہے اور اس کے چھپے کو کھلا بنا دیتا ہے۔ جس طرح ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ظلم اور بے انصافی کو بھی خدا کی یہ کائنات کبھی قبول نہیں کرتی۔

آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدائی آپریشن اس کی حقیقت کو کھول دے اور اس کے لئے اپنے جرائم کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

دو قسم کی روحیں

قرآن کی سورہ نمبر ۹۱ میں ارشاد ہوا ہے: قد افلح من زکّٰها وقد خاب من دسّٰها (وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور وہ شخص برباد ہو گیا جس نے اپنے آپ کو گندا کیا) موجودہ زندگی آخرت سے پہلے کا ایک امتحانی موقع ہے۔ جو شخص یہاں سے نیک اور ستھری روح لے کر آخرت کی دنیا میں پہنچے گا وہ وہاں جنت کی پرمسرت فضاؤں میں بسایا جائے گا اور جو شخص یہاں سے برائیوں میں لپٹی ہوئی روح لے کر آخرت کی دنیا میں جائے گا اس کو وہاں جہنم کے پُر عذاب ماحول میں دھکیل دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا گویا خدا کی نرسری ہے۔ نرسری میں مختلف قسم کے پودے اگائے جاتے ہیں۔ زمین میں روئیدگی کی قوت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کے پودے اگ آتے ہیں۔ مالی ان سب کی جانچ کرتا ہے۔ جو پودے غیر مطلوب پودے ہیں ان کو وہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ اور جو پودے اس کے مطلوب پودے ہیں ان کو اہتمام سے نکال کر لے جایا جاتا ہے تاکہ کسی باغ میں ان کو پھلنے پھولنے کے لئے نصب کر دیا جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے بیک وقت دونوں مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو اپنی روح کو پاک کرے اور چاہے تو گندا کرتا رہے۔ کوئی وہ شخص ہے جو اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔ اس کے سامنے جب کوئی حق آتا ہے تو وہ بے جھجک اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ خیر خواہی اور انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں وہ خدا کی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ اپنے نفس کی مرضی پر۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔ اس کو اس کا خدا جنت کی پُر بہار دنیا میں بسائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو خود اپنی بڑائی میں گم رہتا ہے۔ اس کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ معاملات میں وہ سرکشی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ خدا کی مرضی پر۔ یہی وہ آدمی ہے جس نے اپنی روح کو گندا کیا۔ کائنات کا مالک اس کو اپنے پڑوس کے لئے قبول نہیں کرے گا۔ وہ اس کو جہنم میں دھکیل دے گا تاکہ وہ ابدی طور پر اپنے جرم کی سزا بھگتتا رہے۔

یہ تضاد کیوں

آسمان کے نیچے ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہاں داداگیری کی صلاحیت کا استعمال ہے مگر سنجیدگی کی صلاحیت کا کوئی استعمال نہیں۔ یہاں شاطر آدمی اپنی پوری قیمت پالیتا ہے مگر شریف آدمی کو یہاں کوئی قیمت نہیں ملتی۔ ہر ایک کو خوش کرنے والی زبان بولنے والے کو یہاں خوب مقبولیت حاصل ہوتی ہے، مگر جو شخص غیر مصلحت پرستانہ انداز میں بولے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اس کو یہاں کوئی عزت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جو اپنی ذات میں بالکل بے عیب ہے۔ جہاں درخت کمال کا ایک انتہائی خوش منظر نمونہ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں چڑیاں اس کے سوا کوئی اور بولی نہیں جانتیں کہ وہ حسن اور سلامتی کے نغمے گائیں۔ جہاں سورج اور چاند صرف روشنی بکھیرتے ہیں، ان کو تاریکی بکھیرنا اور اندھیرا پھیلانا نہیں آتا جہاں ستارے صرف اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں، کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑنے کے لئے نہیں دوڑتا۔

انسان اور بقیہ کائنات میں یہ تضاد دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں دو خدا ہیں، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت کا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں یہ الل ٹپ نظام کیوں کر جاری رہتا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ مثالی دنیا اس کے بعد آنے والی ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات اسی کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ امتحان کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ انسان کو عمل کی پوری آزادی ہو۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور کچھ لوگ ٹیڑھے راستہ پر چلتے ہیں، مگر قیامت کے بعد جب مثالی دنیا قائم ہوگی تو وہاں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہوگا کہ وہ مثالی انداز میں سوچنے اور مثالی کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقیہ تمام لوگ چھانٹ کر اسی طرح دور پھینک دئے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

تولے جانے سے پہلے تول لو

موجودہ دنیا میں چیزوں کے دو روپ ہیں۔ ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ یہاں ہر آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے باطنی وجود میں برائی لئے ہوئے ہو مگر زبان سے خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو اچھی صورت میں ظاہر کرے۔ قیامت اس لئے آئے گی کہ ظاہر و باطن کے اس فرق کو مٹا دے۔ قیامت کا زلزلہ تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گا تاکہ ہر انسان کے اوپر سے اس کا خول اتر جائے اور وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجائے۔

وہ دن بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم ترین شخصیت سمجھے جاتے ہیں اس دن وہ کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب موجود ہوتا ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو جائیں گے جیسے کہ ان کے منھ میں الفاظ ہی نہیں۔

آج ایک شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی شان وشوکت دکھانے کے لئے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد اسلام کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن وانصاف کے اجلاس میں اس کو صدارت کرنے کے لئے بلایا جائے۔ ایک شخص کی خلوتیں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر اجتماعی مقامات پر وہ اللہ کے نام کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو اس کے باوجود اخبارات کے صفحہ پر اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جارہا ہو۔

ہر آدمی کی حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں خدا لوگوں کی حقیقت چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دکھا دیا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دھوکے بازی

برطانیہ کا ایک آرٹسٹ ہے جس کا نام اسٹیفن پریسیٹ لی (Stephen Priestley) ہے۔ چیسٹر (انگلینڈ) میں ایک نیلام میں اس کی چار تصویریں رکھی گئیں۔ اس کی تصویروں کی قیمت صرف ایک پونڈ لگی۔ چنانچہ اسٹیفن پریسیٹ لی (پیدائش ۱۹۵۴) کو ایک پونڈ کا چک دے دیا گیا۔

برطانوی آرٹسٹ ایک پونڈ کا چک پاکر بہت خفا ہوا۔ اس کے نزدیک ــــ اس کی ان چار تصویروں کی قیمت اس سے بہت زیادہ تھی جتنی قیمت خریدار کی طرف سے اس کو ملی۔ اس نے اپنے چک پر ایک پونڈ کی رقم کو ۱۰۰۱ پونڈ بنا دیا۔ وقتی طور پر اس نے بنک سے ۱۰۰۱ پونڈ کی رقم حاصل کرلی۔ مگر بہت جلد بنک والوں کو معلوم ہوگیا کہ اس نے بنک کے سامنے جو چک پیش کیا اس کی رقم جعلی تھی۔ اسٹیفن پریسیٹ لی کو پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب وہ جیل میں دھوکے بازی کے جرم میں سزا بھگت رہا ہے (ہندستان ٹائمس ۲ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس واقعہ کا تعلق دنیا کے معاملہ سے ہے۔ مگر اسی میں آخرت کے معاملہ کی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے پاس صرف ایک پونڈ کا "عمل" ہے مگر وہ اس کو ایک ہزار ایک پونڈ دکھا کر کیش کرانا چاہتے ہیں ـــــــ کوئی دین کا ایک جزئی کام کر رہا ہے اور اسی کو وہ کلی کام بتاتا ہے، کوئی ذاتی شہرت کے لئے سرگرم ہے اور اس کو خدمت دین کا عنوان دئے ہوئے ہے۔ کوئی قومی عصبیت کے تحت متحرک ہے اور اس کو اسلامی تحریک قرار دینا چاہتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کر رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ کوئی دولت وعزت کی خاطر کسی کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کو اسلامی اخوت کے پُرفخر لفظ سے یاد کرتا ہے۔ کوئی بحثوں اور مناظروں میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ احیار اسلام کا مجاہد ہے۔ کوئی معمولی اصلاح کا کام کر رہا ہے اور اس کو دعوت وتبلیغ کا شاندار نام دئے ہوئے ہے۔

ان میں سے ہر شخص موجودہ دنیا میں بھرپور طور پر اپنی قیمت وصول کر رہا ہے۔ وہ اپنے معمولی عمل کو بہت بڑا عمل ثابت کرکے خوش ہے۔ مگر موت ان ساری خوش فہمیوں کو باطل کر دے گی۔ موت کے بعد آنے والی عدالت میں ایسے تمام لوگ دھوکے بازی کے مجرم قرار پائیں گے، خواہ آج کی دنیا میں وہ اپنے ایک پونڈ کے چک سے ایک ہزار ایک پونڈ کی رقم کیش کرانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

موت کو یاد کرو

کچھوا پانچ سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ درخت ایک ہزار سال تک زمین پر کھڑا رہتا ہے۔ پہاڑ اور دریا کروروں سال تک اپنی شان کو باقی رکھتے ہیں۔ مگر انسان کی عمر پچاس سال یا سو سال سے زیادہ نہیں۔ انسان جو بظاہر تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف اور افضل ہے وہ سب سے کم زندگی پاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ مختصر زندگی بھی ناکامیوں کی ایک مسلسل داستان کے سوا اور کچھ نہیں۔ آدمی کی زندگی غم اور دکھ سے اتنا زیادہ بھری ہوئی ہے کہ خوشی کے لمحات غفلت کی چند جھلکیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، امیدوں کی مسلسل پامالی کا نام زندگی ہے اور بالآخر اس قسم کے دردناک ایام گزارتے ہوئے ایک دن موت کے آگے شکست کھا جانا۔

ایک غریب کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس کے پاس بڑا امکان نہیں۔ اس کے پاس ضروریات زندگی کے لئے کافی پیسہ نہیں۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں کا حال بھی بہت زیادہ مختلف نہیں جن کو ایک غریب آدمی رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دولت مند آدمی کے لئے پیسہ ہونا اس سے زیادہ بڑے مسائل پیدا کرتا ہے جو غریب کو پیسہ نہ ہونے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ایک مشہور آدمی جس کے گرد انسانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہو اندر سے اس قدر بے چین ہوتا ہے کہ رات کو گولی کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ غرض اس دنیا میں ہر آدمی دکھی ہے، کوئی ایک صورت میں اور کوئی دوسری صورت میں۔

بالفرض کوئی شخص ناموافق حالات سے بچ جائے اور اس خوش قسمتی کو حاصل کرلے جس کو سکھ اور چین کہتے ہیں تب بھی کتنے دن تک۔ اگر کوئی شخص اتفاقی اسباب کے تحت خوشیوں کا خزانہ اپنے گرد جمع کرلے تو وہ بھی بس صبح سے شام تک کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد اچانک موت کا بے رحم فرشتہ آئے گا اور اس کو اس طرح پکڑ لے گا کہ نہ اس کی دولت اس کو بچا سکے گی اور نہ اس کی فوج۔ ہوائی جہاز کے مسافر پر بھی موت اسی طرح قابو پالیتی ہے جس طرح ایک پیدل چلنے والے آدمی پر۔ وہ عالی شان محلوں میں بھی اسی طرح فاتحانہ داخل ہوجاتی ہے جس طرح ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں۔ موت آدمی کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔

موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ وہ کامیابی کو زندگی کے اُس پار تلاش کرے۔ کامیاب وہ ہے جو موت سے یہ سبق لے لے۔ جو شخص یہ سبق لینے سے محروم رہے اس کی خوشیوں کے چراغ بہت جلد بجھ جائیں گے۔ وہ اپنے کو ایک ایسے بھیانک اندھیرے میں پائے گا جہاں وہ ابدالآباد تک ٹھوکریں کھاتا رہے اور کبھی اس سے نکل نہ سکے۔

کچھ کام نہ آئے گا

ایک صاحب سے بات ہورہی تھی۔ ۲۰ سال پہلے وہ معمولی میکنک تھے۔ اب وہ تقریباً دو درجن مشینوں کے مالک ہیں۔ ان کے کئی کارخانے چل رہے ہیں۔ میں نے ایک ملاقات میں کہا: آپ نے ماشاء اللہ اپنے کاروبار میں کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے خوشی اور اعتماد کے لہجہ میں جواب دیا: اتنی کمائی کرلی ہے کہ بچے کچھ نہ کریں تب بھی وہ سو سال تک آرام سے کھاتے رہیں گے۔

یہ ایک انتہائی مثال ہے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا یہی حال ہو رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں یہی یقین لئے ہوئے ہے کہ اس نے اپنے معاملات کو درست کرلیا ہے۔ اسے اب کسی خطرہ کی ضرورت نہیں۔ کم از کم "سو سال" تک تو بالکل نہیں۔

کوئی اپنے بڑوں کو خوش کرکے مطمئن ہے۔ کسی کو یہ فخر ہے کہ اس نے اپنے قانونی کاغذات کو پکا کرلیا ہے۔ کسی کو اپنے قابل اعتماد ذریعۂ معاش اور اپنے بنک بیلینس پر ناز ہے۔ کوئی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنی داداگیری پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تو جس کے پاس ہے وہ اس سے خوشامد اور مصالحت کا تعلق قائم کرکے سمجھتا ہے کہ اس نے بھی ایک چھتری حاصل کرلی ہے، اب اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔

مگر بھونچال جب آتا ہے تو اس قسم کے تمام بھروسوں کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ بھونچال کے لئے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں۔ طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔ بھونچال یہ یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں آدمی کس قدر بے بس ہے۔

یہ بھونچال خدا کی ایک پیشگی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ ہر ایک کے لئے بالآخر کیا ہونے والا ہے۔ بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔ جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کردیتی ہے۔ جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل عاجز ہے۔ اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ بے بسی کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اور اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کرسکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے اربوں اور کھربوں گنا زیادہ سخت ہوگا۔ اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔ عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔ اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنایا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری دوسری چھتریوں کی پناہ لئے ہوئے تھے۔

شناختی کارڈ کے بغیر

دیہات کا ایک لڑکا شہر آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ ایک اسکول کی عمارت کے سامنے سے گزرا۔ یہ اسکول کے جشن کا دن تھا۔ سیکڑوں لڑکے ایک کھڑکی کے سامنے لائن لگائے ہوئے تھے۔ دیہاتی لڑکے نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کھڑکی پر مٹھائی تقسیم ہورہی ہے۔ اور ہر ایک اس کو لے کر باہر آرہا ہے۔ دیہاتی لڑکا بھی لائن میں شامل ہوکر کھڑا ہوگیا۔ وہ لائن کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب میری باری آئے گی تو مٹھائی کا پیکٹ اسی طرح میرے ہاتھ میں بھی ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا ہے۔

لائن ایک کے بعد ایک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دیہاتی لڑکا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے خوش خوش اپنا ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھایا۔ اتنے میں کھڑکی کے پیچھے سے آواز آئی "تمھارا شناختی کارڈ"۔ لڑکے کے پاس کوئی کارڈ نہ تھا۔ وہ کارڈ پیش نہ کرسکا۔ چنانچہ وہ کھڑکی سے ہٹا دیا گیا۔ اب لڑکے کو معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی ان لوگوں کو تقسیم ہورہی تھی جو سال بھر اسکول کے طالب علم تھے نہ کہ کسی ایسے شخص کے لئے جو اچانک کہیں سے آکر کھڑکی پر کھڑا ہوگیا ہو۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ آخرت کا دن خدائی فیصلہ کا دن ہے۔ اس دن سارے لوگ خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے۔ وہاں لوگوں کو انعامات تقسیم ہورہے ہوں گے۔ مگر پانے والے صرف وہ ہوں گے جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو، جو اپنا "شناختی کارڈ" لے کر وہاں حاضر ہوئے ہوں۔

وہ وقت آنے والا ہے جب کسی آنکھ کے لئے سب سے زیادہ پُرکیف منظر یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو دیکھے۔ کسی ہاتھ کے لئے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو چھوئے۔ کسی سر کے لئے سب سے زیادہ عزت اور فخر کی بات یہ ہوگی کہ وہ اس کو رب العالمین کے آگے جھکا دے۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان لوگوں کے لئے ہوگا جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے اپنے کو خدا کی نظر عنایت کا مستحق ثابت کیا ہو۔ بقیہ لوگوں کے لئے ان کی غفلت ان کے اور ان کے خدا کے درمیان حائل ہوجائے گی۔ وہ خدا کی دنیا میں پہنچ کر بھی خدا کو نہ دیکھیں گے۔ وہ پانے والے دن بھی اپنے لئے کچھ پانے سے محروم رہیں گے۔

جنت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان کو جس جنت میں داخل کیا جائے گا اس کی معرفت انھیں اسی دنیا میں کرائی جا چکی ہوگی (ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم، محمد) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا رزق اس رزق کے مشابہ ہوگا جس کی توفیق انھیں دنیا کی زندگی میں ملی تھی (داتوابہ متشابھا، بقرہ) حدیث میں کہا گیا ہے کہ جنت دوزخ دراصل انسان ہی کے اعمال ہیں جو آدمی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کا آغاز اِسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔ جنتی انسان اپنی جنت کو اسی دنیا میں پالیتا ہے۔ گویا کہ جنت کا ایک مثنیٰ اسی دنیا میں ہے اور آخرت کی جنت میں وہی شخص جائے گا جس نے دنیا میں جنت کے اس مثنیٰ کو پالیا ہو۔ جنت کا یہ دنیوی مثنیٰ گویا نقد انعام ہے جو اصل انعام سے پہلے اس کی ایک ابتدائی علامت کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔

یہ جنتی کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا میں ان کیفیات کا تجربہ کیا ہو جو آخرت میں اس کو جنت کا مستحق بنانے والی ہیں جس کے رونگٹے کھڑے ہو کر اس کو خدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔ جس کے قلب پر ٹکڑے کر دینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔ جس نے بغض و انتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفو خداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقا اپنے خادم کے اعتراف قصور پر اس سے درگزر فرماتا ہے۔ جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پر قابو پانے کے باوجود وہ اس کو اس لئے چھوڑ دے کہ اس کا خدا بھی اس دن اسے چھوڑ دے جب کہ وہ اس سے زیادہ عجز کی حالت میں ہوگا۔ جو ایک امر حق کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے لوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کا ایک پھول ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔ مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیا میں گزر جاتے ہیں جو دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حالات میں شیطانی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور ملکوتی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جنت کا۔

پلاسٹک کے پھل اور پھول

آجکل پلاسٹک کے پھول اور پھل بنتے ہیں۔ دیکھنے میں بالکل پھول اور پھل کی طرح معلوم ہونگے لیکن سونگھئے تو اس میں پھول کی خوشبو نہیں اور منھ میں ڈالئے تو اس میں پھل کا مزہ نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں دین داری کی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے۔ بظاہر اس میں دھوم کی حد تک دین دکھائی دے گا۔ لیکن قریب سے تجربہ کیجئے تو وہی چیز موجود نہ ہوگی جو دین کا اصل خلاصہ ہے: اللہ کا ڈر اور انسان کا درد ——— پلاسٹک کے دور میں شاید دین داری بھی پلاسٹک کی دین داری بن کر رہ گئی ہے۔

لوگ دین دار ہیں مگر کوئی شخص اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کوئی شخص اللہ کی خاطر اپنی اکڑ ختم کرنا نہیں جانتا۔ ذاتی فائدہ کی خاطر بے شمار لوگ اپنے اختلاف اور شکایت کو بھول کر دوسروں سے جڑے ہوئے ہیں مگر خدا کی زمین پر کوئی نہیں جو خدا کے لئے اپنے اختلاف وشکایات کو بھول کر دوسرے سے جُڑ جائے۔

دین اصلاً اس کا نام ہے کہ آدمی اس حقیقت کو پاجائے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو بنایا ہے۔ وہ موت کے بعد تمام انسانوں کو جمع کرکے ان سے حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی جنت میں داخل کرے گا یا ابدی جہنم میں۔ یہ حقیقت اتنی سنگین ہے کہ اگر وہ فی الواقع کسی کے دل ودماغ میں اتر جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں انتہائی حساس ہوجاتا ہے جو آدمی کو جہنم کی آگ میں پہنچانے والی ہیں اور ان تمام چیزوں کا انتہائی مشتاق ہوجاتا ہے جو آدمی کو جنت کے باغوں کا مستحق بنانے والی ہیں۔ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی انفرادی ہستی کو خدا کی عظیم تر ہستی میں کھو دیتا ہے۔

خدا اور آخرت کے بارے میں اس کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کو بندوں کے بارے میں بھی انتہائی محتاط اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ایک انسان سے بدخواہی کرتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا رہا ہے۔ بندوں کے ساتھ سرکشی کا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ جہنم کے فرشتوں کی فوج لئے ہوئے ہے۔ اپنے صاحب معاملہ افراد سے بے انصافی کرنا اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو جہنم کے گہرے غار میں دھکیل دیا ہے۔ اب کوئی انسان اس کی نظر میں محض ایک انسان نہیں ہوتا بلکہ ہر انسان ایک ایسا وجود ہوتا ہے جس کے ساتھ خدا اپنے تمام فرشتوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہو۔

اپنا احتساب

کھیت میں جب فصل بوئی جاتی ہے تو فصل کے ساتھ طرح طرح کے گھاس پھوس بھی اگتے ہیں۔ گیہوں کے ہر پودے کے ساتھ ایک خود رو گھاس بھی نکلتی ہے اور سرسوں کے ہر درخت کے ساتھ ایک نکما پودا بھی بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ نکلنے والے گھاس پھوس فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں، وہ کھیت کے پانی اور کھاد میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ اصلی فصل کو بھرپور طور پر بڑھنے نہیں دیتے۔

کسان اگر ان خود رو پودوں کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دے تو وہ ساری فصل کو خراب کر دیں۔ کھیت میں دانہ ڈال کر کسان نے جو امیدیں قائم کی ہیں وہ کبھی پوری نہ ہوں۔ اس لئے کسان یہ کرتا ہے کہ وہ کھیت میں نلائی (Weeding) کا عمل کرتا ہے۔ وہ ایک ایک خود رو پودے کو نکالتا ہے تاکہ کھیت کو ان سے صاف کر دے اور فصل کو بڑھنے کا پورا موقع ملے۔ ہر کسان جانتا ہے کہ کھیت میں دانہ ڈالنا ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فصل کے ساتھ اگنے والی دوسری گھاسوں کو چن چن کر نکال دیا جائے، ورنہ کھیت سے مطلوبہ فصل حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ نلائی کا عمل جو کھیت میں کیا جاتا ہے یہی انسانی زندگی میں بھی مطلوب ہے اور اس کا شرعی نام محاسبہ ہے۔ انسان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کو جب کوئی خوبی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ ایک "نکمی گھاس" بھی اس کے اندر سے اگنا شروع ہوتی ہے۔ اس نکمی گھاس کو جاننا اور اس کو اپنے اندر سے نکال پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کا انجام وہی ہوگا جو بغیر نلائی کئے ہوئے کھیت کا۔

کسی کو اسباب و وسائل ہاتھ آجائیں تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اقتدار مل جائے تو گھمنڈ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دولت کے ساتھ بخل، علم کے ساتھ فخر، مقبولیت کے ساتھ ریا اور سماجی عزت کے ساتھ نمائش کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں گویا خود رو گھاس ہیں جو کسی آدمی کی خوبیوں کو کھا جانے والی ہیں۔ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس اعتبار سے اپنا نگراں بن جائے اور جب بھی اپنے اندر کوئی "نکمی گھاس" اگتے ہوئے دیکھے تو اس کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ جو شخص اپنے اوپر محاسبہ کا عمل نہ کرے گا وہ یقینی طور پر اس دنیا میں برباد ہو جائے گا۔ وہ ایسا کھیت ہوگا جس کی فصل تباہ ہو گئی، وہ ایسا باغ ہوگا جس کی ساری بہار خزاں میں تبدیل ہو گئی۔

دونوں ایک سطح پر

۳۱ مارچ ۱۹۸۱ کو تمام دنیا کے اخبارات کی پہلی سرخی یہ تھی "صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ"۔ ایک نوجوان نے خودکار گن سے صدر رونالڈ ریگن پر حملہ کیا اور دو سکنڈ میں چھ فائر کئے۔ ایک گولی صدر کے سینہ کو چھید کر ان کے پھیپھڑے میں لگی۔ اسپتال تک پہنچتے پہنچتے ان کے جسم کا آدھا خون بہہ چکا تھا۔ مگر فوری طبی مدد کارگر ثابت ہوئی اور رونالڈ ریگن کی جان بچ گئی۔

رونالڈ ریگن اس سے پہلے ایک فلم ایکٹر تھے۔ فلم کی دنیا میں وہ کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۸۰ کے الکشن میں امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے۔ گولی لگنے کے بعد صدر ریگن نے واشنگٹن کے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

If I'd got this much attention in Hollywood, I would never have left

اگر میں ہالی وڈ (فلمی دنیا) میں اتنی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوتا تو میں فلمی دنیا کو کبھی نہ چھوڑتا (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۱) دوسری طرف نوجوان حملہ آور جان ہنکلے (John Hinckley) کی روداد کے ذیل میں آیا ہے کہ اس کو نوجوان فلم ایکٹرس جاڈی فاسٹر (Jodie Foster) سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ اس کو خطوط لکھتا رہا مگر مس فاسٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اس نے حملہ سے ایک دن پہلے مذکورہ ایکٹرس کو خط لکھا جس میں یہ فقرہ تھا Now you'll know who I am (H.T. 2-4-1981)

اب تم جان لوگی کہ میں کون ہوں۔ اس خط کے اگلے دن اس نے صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس کے بعد ایک گمنام نوجوان اچانک ساری دنیا کے اخباروں کی شاہ سرخی بنا ہوا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کی خبروں میں اس نے پہلا مقام حاصل کر لیا۔ صرف ایک بندوق کی لبلبی دبا کر اس نے وہ شہرت حاصل کر لی جو بے شمار لوگوں کو ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی نہیں ملتی۔

ایک آدمی بظاہر مجرم ہو اور دوسرا بظاہر بے قصور مگر دونوں شہرت کے طالب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے جینے کی سطح ایک ہے۔ دنیا کا قانون لوگوں سے ان کے ظاہر کے اعتبار سے معاملہ کرتا ہے، آخرت وہ مقام ہے جہاں لوگوں سے ان کے باطن کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا۔ ایک شخص نام و نمود کے لئے دین کا علم بردار بنے، دوسرا شخص نام و نمود کے لئے لیڈری کرے تو دین دار کا انجام بھی وہی ہوگا جو خود پسند لیڈروں کا خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔

صرف "کرنا" کافی نہیں

بالٹی کے پیندے میں سوراخ ہو اور اوپر سے آپ اس میں پانی ڈالیں تو سارا پانی بہہ کر نکلتا رہے گا اور بالٹی کے اپنے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔ ایسا ہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ آدمی کا وہی عمل حقیقۃً عمل ہے جو خود اس کو کچھ دے رہا ہو۔ اگر آدمی بظاہر سرگرمیاں دکھا رہا ہو اور اس کا اپنا وجود کچھ پانے سے محروم ہو تو اس کی سرگرمیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہی عمل ہے جس کے دوران آدمی کے ذہن میں شعور کی چنگاری پڑے۔ اس کے دل میں سوز و تڑپ کا کوئی لاوا ابلے۔ اس کی روح کے اندر کوئی کیفیاتی ہل چل پیدا ہو۔ اس کے اندرون میں کوئی ایسا حادثہ گزرے جو برتر حقیقتوں کی کوئی کھڑکی اس کے لئے کھول دے۔ یہی یافت کسی عمل کی کامیابی کا اصل معیار ہے۔ وہی عمل عمل ہے جو آدمی کو اس قسم کے تحفے دے رہا ہو۔ جس عمل سے آدمی کو یہ چیزیں نہ ملیں وہ ایسا ہی ہے جیسے سوراخ دار بالٹی میں پانی گرانا۔

دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آپ کیا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی "مصروفیات" بہت بڑھی ہوئی ہوں، اگر بتانے کے لئے آپ کے پاس بہت سے کارنامے ہوں مگر آپ کی اندرونی ہستی خالی ہو، آپ خود کچھ نہ ہو رہے ہوں تو آپ کی مصروفیات محض بے فائدہ سرگرمیاں (Idle Business) ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں — ہوائیں ہوں مگر ان سے آکسیجن نہ ملے۔ پانی ہو مگر اس سے سیرابی حاصل نہ ہو۔ غذا ہو مگر اس سے آدمی کو قوت نہ ملے۔ سورج ہو مگر وہ روشنی نہ دے رہا ہو تو ایسا ہونا ہونا نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کی بدترین شکل ہے۔ اسی طرح جو عمل آدمی کی اپنی غذا نہ بن رہا ہو وہ عمل نہیں صرف بے عملی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بے معنی کوئی چیز۔

پتھر کے اوپر آپ پانی ڈالیں تو وہ بظاہر پانی سے بھیگ جائے گا۔ اس کے چاروں طرف پانی پانی نظر آئے گا۔ مگر پتھر پانی کے مزہ اور تراوٹ کو نہیں جانتا، اس نے پانی کی اس دوسری حیثیت کا تجربہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ایک زندہ آدمی جب پیاس کے وقت پانی پیتا ہے تو اس کی رگیں تر ہو جاتی ہیں، وہ پانی کی حقیقت کا ایک "اندرونی تجربہ" کرتا ہے۔ اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کرنا کیا ہے اور ہونا کیا۔ کرنا یہ ہے کہ آدمی کچھ مقررہ اعمال کو بس رسمی طور پر دہرا لے۔ آدمی کی زبان کچھ الفاظ بولے مگر وہ الفاظ اس کے دل کی دھڑکن نہ بن رہے ہوں۔ آدمی اپنے ہاتھ پاؤں سے کچھ عمل کرے مگر اس کا عمل اس کی روح کو نہ چھوئے۔ اس کی حرکات و سکنات اس کے دل و دماغ میں ارتعاش نہ پیدا کریں۔ اس کے برعکس ہونا یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے لئے روحانی تجربہ بن رہا ہو۔ اس کی اندرونی ہستی کو بار بار کیفی غذائیں مل رہی ہوں۔ اس کا جسمانی عمل اس کے غیر جسمانی وجود میں ہل چل پیدا کر رہا ہو۔ وہی کرنا کرنا ہے جس کے درمیان آدمی خود بھی کچھ ہو رہا ہو۔ جو کرنا ہونا نہ بنے، حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ گویا ایک ایسا پتھر ہے جو بظاہر پانی سے بھیگ رہا ہے مگر پانی کا مزہ نہیں پاتا ہے۔

مقبول بندے

جسم میں اگر ایسا خون داخل کیا جائے جو آدمی کے بلڈ گروپ کا نہ ہو تو جسم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً ضد جسم (Antibodies) پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ خون باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلے یا کٹے ہوئے حصہ جسم پر قلم بندی ہوتی ہے جس کی محفوظ صورت یہ ہے کہ خود اپنے جسم کی کھال لے کر مقام ماؤف پر لگا دی جائے جس کو آٹو گریفٹنگ کہتے ہیں۔ اب اگر کسی مقام پر کھال کی قلم بندی (Skin Grafting) کرنی ہے اور وہاں کسی غیر متعلق جسم کی کھال لے کر لگا دی گئی تو وہ چند دن ٹھیک رہے گی۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر جسم اس کی اجنبیت کو پہچان لے گا۔ خون کا دوران اس مقام پر رک جائے گا اور بالآخر کھال کا مذکورہ ٹکڑا الگ ہو کر گر جائے گا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) نے اپنی پیتھالوجی کی کتاب (۱۷۷) میں لکھا ہے کہ خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی:

Self will not accept not-self

یہ چھوٹے سلف (انسان) کی خودداری کی ایک مثال ہے۔ اسی پر بڑے سلف (خدا) کی غیرت اور خودداری کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام غیرت مندوں سے زیادہ غیرت مند اور تمام یکتا پسندوں سے زیادہ یکتا پسند ہے۔ خدا کسی حال میں بھی کسی قسم کی دوئی کو گوارہ نہیں کرتا۔ وہ ہر دوسرے قصور کو معاف کر دے گا مگر شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

وہ کون خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کے مقبول بندے ٹھہریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سلف کے خول کو توڑ کر خدا کے سلف میں گم ہونے پر راضی ہو گئے۔ جو اپنی یا کسی دوسرے کی یکتائی کو بھلا کر خدا کی یکتائی کے آگے جھک گئے۔ جنھوں نے ہر قسم کے شرک کو چھوڑ کر توحید خالص کو اختیار کر لیا۔ انسان کے لئے اگرچہ یہ مشکل ترین کام ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کا اقرار کرے۔ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے کو مانتا ہوا نظر آئے تو وہ یا تو خوف کی بنیاد پر ہوگا یا مصلحت کی بنیاد پر۔ تاہم یہی وہ عطیہ جو کوئی انسان کبھی کسی کو نہیں دیتا اسی کا مطالبہ انسان کے خالق نے انسان سے کیا ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ مسلم وہی ہے جو اپنی خودی کا اثاثہ اپنے خالق کو دینے پر راضی ہو جائے۔ جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی سپردگی میں دے دے۔ جو ہر اعتبار سے خدا کا تابع فرمان بن جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انسان کے لئے ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ مگر اسی کو خدا نے اپنی جنت کی قیمت بنا دیا ہے۔ جنت کی انوکھی نعمت اسی خوش نصیب کے حصہ میں آئے گی جو اس انوکھے عطیہ کی صورت میں اس کی قیمت پیش کر دے۔

صبر کا بدلہ

قرآن میں صبر کی بے حد تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے اوپر زیادتی کرے اور تم صبر نہ کرسکو تو اس کے ساتھ تم اتنا ہی کرسکتے ہو جتنا اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ مگر یہ صرف رخصت کی بات ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ تم معاف کردو اور انتقام کے بجائے اصلاح کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا اجر اللہ کے ذمہ ہو جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ ہوگا (فمن عفا واصلح فاجـره علی اللہ، الشوریٰ ۴۰)

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ایک آدمی دوسرے کو ایک قول دیتا ہے مگر بعد کو وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ کبھی کوئی شخص اپنے کو مضبوط پوزیشن میں پاکر کمزور فریق کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ کبھی کوئی شکایت پیش آنے کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کو مٹانے اور برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے ساتھی کو اس کا ایک جائز حق دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ناحق اپنے بھائی کی بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مظلوم ہے اس کے دل میں ظالم کے خلاف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی زیادتیوں کو بھولنے اور اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مواقع پر دل کے زخم کو بھلا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ایسا کرے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال دے، وہ اللہ کی خاطر اس کو برداشت کرے تو اس کا یہ عمل کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پاسکا اس کو وہ خدا سے پاکر رہے گا۔

ایک شخص جب کسی کو ایک قول دیتا ہے تو گویا وہ اس کو ایک بینک چیک دے رہا ہے جو عمل کے وقت کیش کیا جاسکے۔ مگر جب عمل کے وقت وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو گویا اس نے کاغذی چیک تو لکھ دیا مگر جب کھاتہ سے اس کی رقم لینے کا وقت آیا تو اس نے ادائگی سے انکار کر دیا۔ ایسا تجربہ کسی انسان کے لئے تلخ ترین تجربہ ہے۔ لیکن اگر وہ صبر کرے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے گا۔ جو چیک انسانی بینک میں کیش نہ ہوسکا وہ خدائی بینک میں کیش ہوگا، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

ضمیر کے خلاف

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵-۱۸۸۹) نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ فلسطین پر یہودیوں کا بطور تاریخی وطن اپنا حق جتانا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین قبائل کناڈا کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ یہودیوں نے نازیوں کے ظلم پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں مگر خود یہودی فلسطینی عربوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ بالکل اسی قسم کا ہے جو نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔

ٹائن بی نے اپنا یہ بیان کناڈا میں دیا تھا۔ اس وقت کناڈا میں حکومت اسرائیل کے سفیر مسٹر ہرزگ تھے۔ مسٹر ہرزگ نے برطانی مورخ کو دعوت دی کہ اس مسئلہ پر وہ اس سے مباحثہ کریں۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد مانٹریل کی میک گل یونیورسٹی میں ایک تقریب ہوئی جس میں دونوں جمع ہوئے۔ مسٹر ہرزگ نے کہا: جرمن نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو مار ڈالا تھا۔ اس کے مقابلہ میں فلسطین میں جو عرب بے گھر ہوئے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی ہے۔ ان دونوں کو ایک جیسا کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے جواب دیا کہ میں نے جب نازیوں اور اسرائیلیوں کے مظالم کو ایک جیسا کہا تھا تو اس سے مراد تعداد نہیں بلکہ جرم کی نوعیت تھی۔ کسی شخص کے لئے سو فی صد سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں۔ قاتل کہلانے کے لئے ایک شخص کو قتل کر دینا کافی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ میرے الفاظ پر کیوں اس قدر بوکھلا اٹھے ہیں۔ میں نے وہی بات کہی ہے جو تم میں سے ہر ایک کا ضمیر کہہ رہا ہے۔

جب بھی آدمی کسی سچائی کی تردید کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اپنی تردید کر رہا ہوتا ہے۔ سچائی ہمیشہ آدمی کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے مگر آدمی ضد، تعصب اور اپنی جھوٹی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر اس کو نہیں مانتا، وہ اپنے انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ بولتا ہے جن کے بارے میں خود اس کا دل گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔

آدمی کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا ساتھ نہ دے سکے۔ ضد اور تعصب اور مصلحت سے مغلوب ہو کر وہ ایسے رخ پر چلنے لگے جس کے متعلق اس کا اندرونی ضمیر آواز دے رہا ہو کہ وہ صحیح رخ نہیں ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کرنا ہے یا اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں قتل کرنا ہے۔ یہ اپنے مجرم ہونے پر خود گواہ بننا ہے۔

کیسی عجیب ہے یہ محرومی۔ مگر جب آدمی کی بے حسی بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی محرومی کی ان کارروائیوں کو اپنی فتح سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہوتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو زندگی دے رہا ہوں۔

خدا کی یاد

اخبار ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر نے ایک فیلڈ اسٹڈی (۵ امئی ۱۹۸۲) کے ذریعہ ہندستانی لوگوں کا مزاج معلوم کیا۔ وہ اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندستانیوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خدا ان کے یہاں سب سے اوپر ہوتا ہے۔ جب ہر چیز ٹھیک ہو تو پیسہ سب سے اوپر آجاتا ہے اور خدا کو دوسرے درجہ میں پہنچا دیتا ہے:

When a catastrophe strikes, God is tops. When all is tranquil, money manages to push God down to the second place.

یہ بات نہ صرف ہندستانیوں کے لئے صحیح ہے بلکہ وہ عام انسانوں کے لئے بھی بڑی حد تک درست ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ تکلیف اور بے بسی کے لمحات میں وہ سب سے زیادہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ اس وقت اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور کوئی پریشانی سامنے نہ ہو تو وہ اپنے مادی مفادات کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔

مگر اس قسم کی خدا پرستی خدا پرستی نہیں۔ وہ صرف آدمی کے اس جرم کو بتاتی ہے کہ وہ اپنے رب کو بھولا ہوا تھا۔ وہ وقت جب کہ اسے خدا کو یاد کرنا چاہئے تھا اس وقت اس نے خدا کو یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خدا نے اس کی حقیقت اس پر کھول دی۔ اس کی آنکھ سے غفلت کا پردہ ہٹ گیا۔ جب ایسا ہوا تو وہ گھبرا کر خدا کو پکارنے لگا۔

انسان ایک آزاد اور با اختیار مخلوق ہے۔ اس سے آزادانہ خدا پرستی مطلوب ہے نہ کہ مجبورانہ۔ انسان کا یاد کرنا وہ یاد کرنا ہے جب کہ اس نے راحت کے لمحات میں خدا کو یاد کیا ہو۔ راحت کے وقت خدا کو بھلائے رکھنا اور جب مصیبت آئے تو خدا کی طرف دوڑنا ایک ایسا عمل ہے جس کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

پھر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دولت کو سب سے بڑا درجہ دئے ہوئے ہیں وہ جھوٹے معبود کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ جو چیز مصیبت کے وقت آدمی کا سہارا نہ بنے، جس کو آدمی خود نازک لمحات میں بھول جائے وہ کسی کا معبود کس طرح ہو سکتی ہے۔

جب پردہ اٹھے گا

امریکی صدر رونالڈ ریگن ۳۰ مارچ ۱۹۸۱ کو پراعتماد چہرہ کے ساتھ اپنے صدارتی محل (وھائٹ ہاؤس) سے نکلے۔ کاروں کا قافلہ ان کو لے کر واشنگٹن کے ہلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے ہوٹل کے شان دار ہال میں ایک تقریر کی۔ تحسین وآفریں کی فضا میں ان کی تقریر ختم ہوئی۔ وہ آدمیوں کے ہجوم میں ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ باہر آئے۔ وہ اپنی گولی پروف لیموشین (کار) سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک باہر کھڑے ہوئے مجمع کی طرف سے گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک نوجوان جان ہنکلے نے دو سکنڈ کے اندر چھ فائر کئے۔ ایک گولی مسٹر ریگن کے سینہ پر لگی۔ وہ خون میں لت پت ہو گئے اور فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ اچانک گولی لگنے کے بعد صدر امریکہ کا جو حال ہوا وہ اے پی کا رپورٹر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

Mr Reagan appeared stunned. The smile faded from his lips

مسٹر ریگن جیسے سن ہو گئے۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی (ٹائمس آف انڈیا ۳۱ مارچ ۱۹۸۱) یہ واقعہ اس صورت حال کی ایک تصویر ہے جو موت کے "حملہ" کے وقت اچانک آدمی پر طاری ہو گی۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آگیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں۔ ہر آدمی پُراعتماد چہرہ لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی "لیموشین" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اچانک پردہ اٹھتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر اگلی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ ہر آدمی کی زندگی کا ایک انتہائی بھیانک لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا ——— میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا۔ میں اپنے کو مال وجائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے پاس طاقت ہے۔ مگر میں تو خدا کی اس دنیا میں مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ بے زور تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو میرا کوئی ایک بھی نہیں۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

ہر طرف فریب

آج کی دنیا فریب کی دنیا ہے۔ آج کے انسان کو ایسے نعرے مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی شخصی لوٹ کی سیاست کو قومی خدمت کی سیاست ظاہر کر سکے۔ ہر آدمی ایسے الفاظ کا ماہر بنا ہوا ہے جو اس کے ظلم و فساد کو عین حق و انصاف کا روپ دے سکیں۔ ہر آدمی کو ایسے قانونی نکتے ہاتھ آ گئے ہیں جو اس کے جرم کو بے گناہی کا سرٹیفکٹ عطا کر دیں۔

یہ دنیا پرستوں کا حال ہے۔ مگر خدا پرستوں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہاں بھی لوگوں نے ایسے فضائل و مسائل کا خزانہ جمع کر رکھا ہے جو ان کی بے دینی کو دینی کمال کے خانہ میں ڈال دیں۔ جو ان کی بے عملی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دے دیں۔

لوگوں نے ایسا خدا دریافت کر رکھا ہے جس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو ایسا رسول ہاتھ آگیا ہے جو صرف اس لئے آیا تھا کہ ان کی ساری بداعمالیوں کے باوجود خدا کے یہاں ان کا یقینی سفارشی بن جائے۔ لوگوں کو ایسی آخرت مل گئی ہے جہاں جنت صرف اپنے لئے ہے اور جہنم صرف دوسروں کے لئے۔ لوگوں کو ایسی نمازیں حاصل ہو گئی ہیں جن کے ساتھ کبر اور حسد جمع ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو ایسے روزے معلوم ہو گئے ہیں جو جھوٹ اور ظلم سے فاسد نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ایسا دین ہاتھ آگیا ہے جو صرف بحث و مباحثہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لئے۔ لوگوں کو اسلامی دعوت کے ایسے نسخے معلوم ہو گئے ہیں جو ان کی شخصی قیادت اور قومی سیاست کو اسلام کا لباس اوڑھا دیں۔

مگر جھوٹا سونا اسی وقت تک سونا ہے جب تک وہ کسوٹی پر کسا نہ گیا ہو۔ اسی طرح فریب کا یہ کاروبار بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا ظاہر ہو کر اپنے انصاف کی ترازو کھڑا نہ کر دے۔ آج امتحان کی آزادی ہے۔ آج آدمی کو موقع ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ بولنا چاہے گا مگر اس کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولے۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاس پاؤں نہ ہوں گے کہ ان کے ذریعہ وہ بھاگ کر کہیں جا سکے۔

یہ سچائی کا دن ہوگا۔ اس دن ہر آدمی کے اوپر سے فریب کا وہ لباس اتر چکا ہوگا جس کو آج وہ پہنے ہوئے ہے۔ ہر آدمی اپنی اس اصل صورت میں نمایاں ہو جائے گا جو فی الواقع اس کی ہے مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج وہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی کی یہ اصل صورت خدا کے سامنے آج بھی عریاں ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

جانور سے بدتر

شیخ سعدی نے کہا تھا "میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اور خدا کے بعد اس شخص سے ڈرتا ہوں جو خدا سے نہیں ڈرتا"۔ اسی بات کو شیکسپیئر نے ایک اور انداز سے اس طرح کہا ہے ——— "انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جس سے میں بزدل کی طرح ڈرتا ہوں"۔

اس دنیا میں ہر چیز قابل پیشین گوئی کردار رکھتی ہے۔ آگ کے بارے میں آپ پیشگی طور پر یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تبھی وہ آپ کو جلائے گی۔ اگر آپ اپنے ہاتھ کو اس سے دور رکھیں تو وہ ایسا نہیں کرے گی کہ وہ کود کر آپ کے ہاتھ پر آگرے۔ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے حتیٰ کہ موذی جانوروں کے بارے میں بھی ہم کو پیشگی طور پر معلوم ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ ان کا حملہ ہمیشہ دفاعی ہوتا ہے نہ کہ جارحانہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایک لگے بندھے قاعدہ کے تحت کام کر رہی ہے اور اس قاعدہ کی رعایت کر کے آپ اس کے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ مگر انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے عمل کا کوئی اصول اور قاعدہ نہیں۔ وہ مکمل طور پر آزاد ہے اور جس وقت جو چاہے کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو یک طرفہ طور پر دوسرے کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو کسی واقعی سبب کے بغیر دوسرے کے اوپر حملہ کرتا ہے۔ انسان کے حرص اور انتقام کی کوئی حد نہیں۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوں اور محض ذاتی محنت کی بنیاد پر ترقی کریں تب بھی آپ محفوظ نہیں۔ کیونکہ دوسروں کے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ آپ کو گرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ انسان لامحدود طور پر اپنی خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے اور بے حساب حد تک دوسرے کو برباد کر کے اس کی بربادی کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔

کوئی بدترین موذی جانور بھی اس کو نہیں جانتا کہ وہ کسی کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بنائے۔ وہ کسی کو نیچا دکھا کر اپنے غرور کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرے۔ کسی کو خواہ مخواہ مصیبتوں میں پھنسا کر اس کی پریشانی کا تماشا دیکھے۔ یہ صرف انسان ہے جو ایسا کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اپنے آپ کو اسفل سافلین کی پستی میں گرا لیتا ہے۔

امتحان کا مقام

کالج میں امتحان ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوا۔ مگر اس نے امتحان کی کاپی پر کچھ نہیں لکھا۔ وہ بس بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور تین گھنٹہ گزار کر باہر چلا آیا۔ اس کے بعد وہ لائبریری پہنچا اور وہاں کتابوں کے درمیان بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ امتحان ہال میں اس نے اپنی کاپی سادہ چھوڑ دی تھی مگر لائبریری میں اس نے اپنی کاپی بھر ڈالی۔

آپ کہیں گے کہ یہ فرضی کہانی ہے۔ کوئی طالب علم اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ امتحان ہال میں پرچہ حل نہ کرے اور لائبریری میں بیٹھ کر کاپی بھرنے لگے۔ اور اگر یہ واقعہ سچا ہو تو یقیناً وہ کوئی ایسا طالب علم ہو گا جس کا دماغ صحیح نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کی حرکت کوئی پاگل طالب علم ہی کر سکتا ہے۔ مگر دنیا کے امتحان کے معاملہ میں جو بات لوگوں کو اتنی عجیب معلوم ہوتی ہے، آخرت کے معاملہ میں ہر شخص اسی طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ کالج کے ذمہ دار طلبہ کا امتحان جہاں لینا چاہتے ہیں وہ امتحان ہال ہے نہ کہ لائبریری۔ اسی طرح خدا کے بھی امتحان لینے کے مقامات ہیں۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا نے امتحان کے جو مقامات مقرر کئے ہیں وہاں لوگ امتحان میں پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ دوسرے دوسرے مقامات پر خدا پرستی اور دین داری کا کمال دکھا رہے ہیں۔

خدا آدمی کے ایمان کا ثبوت دل کی انابت میں دیکھنا چاہتا ہے اور لوگ اپنے ایمان کا ثبوت کلمۂ ایمان کے مخارج میں دے رہے ہیں۔ خدا آدمی کی عبادت کو خشوع کے معیار پر جانچ رہا ہے اور لوگ مسائل کی پابندی میں اپنی عبادت گزاری کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ خدا لوگوں کے دین کو کردار اور معاملات کی سطح پر جانچ رہا ہے اور لوگ اشراق اور چاشت کے فضائل میں اپنی دین داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی اپنے آپ پر خدا کی حکومت قائم کرنے والا بنے اور لوگ کسی خارجی شخص کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کر کے حکومت خداوندی کے قیام کا کریڈٹ لینے میں مصروف ہیں۔ خدا کسی آدمی کو جہاں مظلوموں کی حمایت کرنے والا دیکھنا چاہتا ہے وہ مظلوم فرد ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ظلم و فساد کے اجتماعی واقعات پر تقریریں اور بیانات پیش کر کے اپنے کو مظلوموں کا حامی ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی طالب علم کی وہ کاپی بالکل بے کار ہے جو امتحان ہال کے بجائے لائبریری میں بیٹھ کر بھری گئی ہو۔ کاش لوگ جانتے کہ ٹھیک اسی طرح وہ عمل بے حیثیت ہے جو خدا کے مطلوبہ مقام کے علاوہ کہیں اور پیش کیا گیا ہو۔

عمل کے بغیر

آج کاغذ کی اتنی افراط ہے کہ جہاں بھی دیکھیں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ملے گا۔ مگر کاغذ کے ان ٹکڑوں کی کوئی قیمت نہیں۔ نوٹ بھی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ مگر اس کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت اتنی یقینی ہے کہ کوئی بھی آدمی اس پر شبہ نہیں کرتا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام کاغذی ٹکڑے کی کسی نے ضمانت نہیں لی ہے جبکہ نوٹ کے پیچھے سرکاری بینک کی ضمانت ہے۔ ہر نوٹ پر سرکاری بینک کی یہ ضمانت ثبت ہوتی ہے کہ وہ اس کے پیش کرنے والے کو وہ رقم پوری پوری ادا کر دے گا جو اس پر چھپی ہوئی ہے۔ یہی ضمانت ہے جس نے نوٹ کے کاغذ کو لوگوں کے لئے قیمتی بنا دیا ہے۔

یہی معاملہ الفاظ کا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج جتنے الفاظ بولے جارہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں اتنے الفاظ نہیں بولے گئے۔ مگر ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ ان کے پیچھے اٹل ارادہ کی ضمانت شامل نہیں ہے۔ آپ سے ایک شخص وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کا فلاں کام کر دے گا۔ مگر جب آپ مقررہ وقت پر اس کی حمایت مانگتے ہیں تو وہ بہانہ کر دیتا ہے۔ آپ مذکورہ شخص کے پاس جو چیز لے کر گئے وہ اس کے بولے ہوئے الفاظ تھے۔ جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو گویا اس نے اپنے الفاظ کی قیمت ادا نہیں کی۔ اس نے الفاظ کا کاغذ تو دے دیا مگر جو عمل اس کاغذ کی قیمت تھا اس کو دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس کے بولے ہوئے الفاظ ردی کاغذ کے ٹکڑے تھے نہ کہ بینک کا جاری کیا ہوا نوٹ۔

آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الفاظ کی سطح پر ہر آدمی بڑے بڑے الفاظ بول رہا ہے مگر اپنے الفاظ کی عملی قیمت دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ اسی طرح ردی کے پرزے بن کر رہ گئے ہیں جیسے پرزے گلی کوچوں میں ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور ہر آدمی ان کو بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایک شخص مظلوموں کی حمایت میں بیانات اور تجویزوں کے انبار لگا رہا ہے مگر جب اس کے قریب کا ایک شخص اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میری مظلومیت پر میری مدد کرو تو وہ اس کو برف کی طرح بالکل سرد پاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی جو لفظ بول رہا تھا اس کے پیچھے اس کا حقیقی ارادہ شامل نہ تھا۔ وہ محض زبانی الفاظ تھے نہ کہ کوئی حقیقی فیصلہ۔ ایک شخص لوگوں کے سامنے شرافت اور تواضع کی تصویر بنا رہتا ہے مگر جب اس کی انا پر چوٹ لگتی ہے تو اچانک وہ حسد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی شرافت محض ظاہری تھی، وہ اس کی روح میں اتری ہوئی نہ تھی۔

الفاظ کم ہو جاتے ہیں

مسٹر لزلی براؤن شمالی انگلستان کے ایک ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی کے جسمانی نظام میں بعض حیاتیاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا مادۂ حیات رحم مادر میں یکجا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ عین وقت پر سائنس نے ان کی مدد کی۔ لندن کے ڈاکٹر پیٹرک اسٹپٹو جو برسہا برس سے اس میدان میں تجربہ کر رہے تھے انھوں نے اپنی لیبورٹری میں لزلی براؤن کا مادۂ تولید (اسپرم) نکالا اور مسز براؤن کے جسم سے ایک بیضہ لیا۔ دونوں کو انھوں نے ایک خصوصی قسم کے ٹسٹ ٹیوب میں رکھا۔ قدرتی قانون کے تحت وہ دونوں مل کر زرخیز ہو گئے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر نے اس کو مصنوعی طور پر رحم مادر میں پہنچا دیا۔ اب رحم مادر میں اس "بچہ" کی پرورش ہونے لگی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اگست ۱۹۷۸ میں تاریخ کا پہلا "ٹسٹ ٹیوب بے بی" وجود میں آگیا۔ اس پورے عمل کی تصویر لی جاتی رہی، اور پیدائش کے بعد اس کو مکمل طور پر ٹیلی وژن پر دکھایا گیا۔

ٹیوب بے بی (لوئی براؤن) کے باپ سے اس پورے واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے کہا "بیوٹی فل" یعنی بے حد حسین۔ اس ایک لفظ کے سوا وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

غم کی گھٹنا خوشی سے زیادہ بڑی گھٹنا ہوتی ہے۔ انڈین نیوی کے ایک افسر کی اہلیہ مسز اوما چوپڑہ کو ۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بچے گیتا (۱۷) اور سنجے (۱۵) کو نئی دہلی میں وحشیانہ طور پر کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ سات گھنٹے تک وہ ایک لفظ نہ بول سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاثر جتنا شدید ہو الفاظ اتنا ہی کم ہو جاتے ہیں۔ بے حد خوشی ہو تب بھی آدمی زیادہ بول نہیں پاتا اور بے حد غم ہو تب بھی زیادہ بولنا آدمی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ دین و ملت کے "غم" میں ہر روز الفاظ کے دریا بہاتے رہتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ دین و ملت کے غم میں وہ سب سے پیچھے ہیں۔ جو شخص درد و غم میں مبتلا ہو اس کو تو چپ لگ جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظی اکھاڑوں میں لسانی پہلوانی کے کرتب دکھانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو نہ اس کے منعم کے روپ میں پایا ہے اور نہ منتقم کے روپ میں۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی روپ میں بھی خدا کو پالیتے تو یہ صورت باقی نہ رہتی کہ ہر آدمی ایسے الفاظ کا بھنڈار بنا ہوا ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔

دنیا کی خاطر عمل کرنے والے

لوگ خوش اخلاق ہیں۔ وہ ہدیے دیتے ہیں اور دعوتیں کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے کام آنے کے لئے دوڑتے ہیں۔ وہ دوسرے کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بناتے ہیں۔ وہ غمی کے موقع پر اظہار درد کے لئے پہنچتے ہیں اور خوشی کے موقع پر مبارک باد دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ وہ اختلاف کے باوجود اختلاف کو بھول جاتے ہیں اور شکایت کے باوجود شکایت کو پی جاتے ہیں۔

لوگ خوش ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔

مگر لوگوں کی یہ خوش معاملگی کس کے ساتھ ہے۔ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن سے ان کا کوئی فائدہ وابستہ ہے۔ جن سے انھیں امید ہے کہ وہ وقت پر ان کے کام آسکتے ہیں۔ جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ جن کے زور قوت کا رعب ان کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ جن سے کٹ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے کٹ جائیں گے، جن سے جڑ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے جڑے رہیں گے۔

لوگوں کی یہ خوش اخلاقی تمام تر مفاد پرستانہ خوش اخلاقی ہے۔ اس کا راز اس وقت معلوم ہو جاتا ہے جب کہ معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے کے لئے مذکورہ محرکات میں سے کوئی محرک موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر اچانک وہی آدمی بالکل بد اخلاق بن جاتا ہے جو اس سے پہلے نہایت خوش اخلاق دکھائی دے رہا تھا۔

اب اس کو یہ شوق نہیں ہوتا کہ وہ سلام میں پہل کرے۔ اب وہ اپنی دعوتوں میں اس کو بلانا بھول جاتا ہے۔ اب وہ اس کی مشکلوں میں کام آنے کے لئے نہیں دوڑتا۔ اب وہ معمولی شکایت پر بگڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب اس کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کے جذبات کی رعایت کرے۔ دنیوی فائدہ کے لئے اخلاق دکھانے والا آدمی اس وقت بے اخلاق ہو جاتا ہے جب کہ اس میں کوئی دنیوی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔

لوگوں کو جاننا چاہئے کہ اس قسم کی خوش اخلاقی اور انسانیت کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ وہ کسی آدمی کو جہنم کی آگ سے بچانے والی نہیں خواہ وہ کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں آدمی کے اندر پائی جا رہی ہو۔ خدا کے ہاں جو کچھ بدلہ ہے صرف اس عمل کا ہے جو خالص خدا کی رضا اور آخرت کی نجات کے لئے کیا گیا ہو۔ اور جو عمل دنیا میں اپنا معاملہ درست رکھنے کے لئے کیا جائے اس کا خدا کے یہاں کوئی بدلہ نہیں۔ ایسے عمل کا پشتارہ لے کر خدا کے یہاں پہنچنے والوں سے خدا کہہ دے گا —— تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی دنیا کے لئے کیا۔ تم دنیا میں اس کا بدلہ پا چکے۔ اب آخرت میں تمھارے لئے اس کے بدلے میں کچھ نہیں۔

ثواب

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے وہ عام طور پر ایسا کرتے ہیں کہ اپنے ملازموں اور ماتحت کارکنوں کو تو صرف واجبی تنخواہ یا اجرت دیتے ہیں۔ دوسری طرف کانفرنس یا ریلیف فنڈ یا مشہور اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ ملازم یا کارکن کو جو رقم دی جاتی ہے وہ تو ان کے کام کی اجرت ہوتی ہے۔ اس پر ہم کو ثواب نہیں ملے گا۔ انھوں نے ہماری خدمت کی اور ہم نے ان کو معاوضہ دے دیا۔ اس پر ثواب کیسا۔ یہ تو دونوں طرف سے معاملہ برابر ہوگیا۔ اس کے برعکس اداروں اور ملی کاموں میں جو رقم دی جاتی ہے ان کے متعلق یقینی ہے کہ ان پر ثواب ملے گا۔

مگر اس کی تہ میں اصل بات کچھ اور ہے اور یہ جواب محض اصل بات پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔
اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش موجود ہے کہ وہ جو کچھ دے اس کا معاوضہ اس کو اسی دنیا میں ملے۔ غریب آدمی یہ معاوضہ پیسہ کی صورت میں چاہتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کافی پیسہ آجاتا ہے ان کو جس معاوضہ کی تمنا ہوتی ہے وہ سماجی حیثیت (سوشل اسٹیٹس) ہے۔ یہی وہ چھپی ہوئی خواہش ہے جو اس قسم کے لوگوں کے انفاق کا رخ بڑی بڑی قابل ذکر مدوں کی طرف کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غریب ملازم یا کارکن یہ معاوضہ دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس نہ اخبار ہوتا ہے نہ اسٹیج۔ اس کے پاس نہ اونچی بلڈنگوں والے ادارے ہیں اور نہ استقبال کرنے والا حلقہ۔ مگر ایک شخص جب کسی مشہور ادارہ یا کسی "عظیم الشان" ملی مہم میں رقم دیتا ہے تو اس کو امید رہتی ہے کہ اس کو شاندار معاوضہ ملے گا ـــــ جلسوں کی صدارت، عوامی مواقع پر نمایاں نشست، اداروں میں پر زور استقبال، سماجی حیثیت میں اضافہ، اخباروں میں نام چھپنا اور بڑے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ ملنا، وغیرہ

ثواب کا تعلق نیت سے ہے نہ کہ قابل تذکرہ مدوں سے۔ ثواب حقیقۃً اس عمل میں ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ ثواب یہ ہے کہ اللہ کی خاطر ایسی مدوں میں دیا جائے جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ ان مواقع پر خرچ کیا جائے جہاں ہر قسم کے دوسرے محرکات حذف ہو جاتے ہیں۔ جس انفاق کا فائدہ اسی دنیا میں وصول کر لیا گیا ہو اس کا فائدہ کسی کو آخرت میں ملے گا تو کیوں ملے گا۔

لوگ دکھائی دینے والے مقامات پر انفاق کر رہے ہیں حالاں کہ خدا ان کے انفاق کو قبول کرنے کے لئے اس مقام پر کھڑا ہوا ہے جو ظاہر پرست انسانوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

خداکو پانے والے

خدا کی زمین پر شاید ایسے لوگ موجود نہیں جنھوں نے خدا کو ان عظمتوں کے ساتھ پایا ہو جس کے اثرات اس ہیجان خیز کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جس کو خدا کی یاد کہا گیا ہے۔ جھوٹی عبادت کی دھوم ہر طرف نظر آتی ہے۔ مگر سچی عبادت اتنی نایاب ہے کہ امکان ہی کے درجہ میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کہیں موجود ہوگی۔

آج ساری دنیا میں دین اور اسلام کا غلغلہ بلند ہے۔ مگر وہ انسان شاید خدا کی زمین پر کہیں پایا نہیں جاتا جس نے خدا کو اس طرح دیکھا ہو کہ اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ جو قرآن کو پڑھے تو اس کی روح پکار اٹھے کہ خدایا یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تونے میری ہدایت کا ایسا انتظام کیا، ورنہ میں جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ رسول کی سنت کو دیکھے تو اس کا وجود اس دریافت سے سرشار ہو جائے کہ یہ خدا کا کیسا غیر معمولی انتظام تھا کہ اس نے پیغمبر کی زندگی میں ہدایت کا بے داغ نمونہ قائم کیا اور پھر تاریخ میں اس کو روشنی کے ابدی مینار کی طرح محفوظ کر دیا۔ جب وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھے تو اس کو یہ احساس ہونے لگے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیا ہے، جب وہ کوئی غذا اپنی حلق کے نیچے اتارے تو اس کی پوری ہستی میں اس احسان مندی کی لہر دوڑ جائے کہ کیسا عجیب ہے وہ خدا جس نے میرے جسم کی پرورش کے لئے ایسی مکمل غذا کا اہتمام کیا۔ جب وہ پانی پیئے تو اس کی آنکھوں سے ایک اور جھرنا بہہ پڑے اور وہ بے اختیار ہو کر کہے کہ خدایا اگر تو مجھے سیراب نہ کرے تو میں سیراب ہونے والا نہیں، اگر تو مجھے پانی نہ دے تو کہیں سے مجھ کو پانی ملنے والا نہیں۔

آہ، لوگ اپنے کو خدا سے کتنا قریب سمجھتے ہیں مگر وہ خدا سے کتنا زیادہ دور ہیں۔ وہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر ان کے منھ میں خدائی مٹھاس کی شکر نہیں گھلتی۔ وہ خدا کو پانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے چمنستان کی کوئی خوشبو ان کے مشام کو معطر نہیں کرتی۔ وہ خدا کے نام پر دھوم مچاتے ہیں مگر خدا کے نورانی سمندر میں نہانے کا کوئی نشان ان کے جسم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی جنتیں ان کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں مگر جنت کے باغ کا کوئی جھونکا ان کے وجود کو نہیں چھوتا۔

کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس کی یاد دل ودماغ کی دنیا میں کوئی اہتزاز (Thrill) پیدا نہ کرے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ جنت جس میں داخلہ کا ٹکٹ آدمی اپنی جیبوں میں لئے پھرتا ہو مگر جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک اس کے رفتار و گفتار سے نمایاں نہ ہو۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ آخرت والے جن کے لئے آخرت کی ابدی وراثت لکھی جا چکی ہو مگر ان کی ساری دلچسپیاں بدستور اسی عارضی دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں۔

نمائشی حق پرستی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جاتی ہے۔ اس مٹی کے اوپر سبزہ اگ آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کھیت ہو۔ لیکن اگر زور کی بارش ہو جائے تو مٹی سمیت سارا سبزہ بہہ جاتا ہے اور اس کے بعد صرف پتھر کی صاف چٹان باقی رہ جاتی ہے جو ہر قسم کی ہریالی اور نباتات سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

یہی معاملہ اکثر انسانوں کا ہے۔ وہ دیکھنے میں بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور طریق میں بہت "شاداب" نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کا ایک جھٹکا ان کی ساری شادابی اور ہریالی کو ختم کر دیتا ہے اس کے بعد ان کی شخصیت ایک سوکھے پتھر کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک شخص جو بات چیت میں شرافت اور معقولیت کی تصویر بنا ہوا تھا وہ عملی تجربہ کے وقت اچانک ایک نامعقول انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو انصاف اور انسانیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا وہ عمل کے موقع پر بے انصافی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو مسجد کے رکوع اور سجدہ میں تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ مسجد کے باہر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں گھمنڈ اور خود پسندی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو عالی ظرفی اور حقوق رسی کی تلقین کر رہا تھا جب اس کا اپنا وقت آتا ہے تو وہ بغض، حسد اور ظلم کے راستہ پر چلنے لگتا ہے

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کی آزمائش ہو رہی ہے۔ یہ آزمائش معمول کے حالات میں نہیں ہوتی بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی عین اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

لوگ باتوں میں حق پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ حق پرستی وہ ہے جس کا ثبوت عمل سے دیا جائے۔ لوگ دوستی کے وقت خوش اخلاق بنے رہتے ہیں حالانکہ خوش اخلاق وہ ہے جو بگاڑ کے وقت خوش اخلاق ثابت ہو۔ لوگ خدا کے سامنے تواضع کی رسم ادا کر کے مطمئن ہیں حالانکہ کسی کا متواضع ہونا یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع پر قائم رہے۔

چٹان کی مٹی پر کی جانے والی کھیتی نمائشی کھیتی ہے۔ ایسی کھیتی کسی کسان کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ سیلاب کا ایک ہی ریلا اس کو جھوٹی کھیتی ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح نمائشی حق پرستی بھی جھوٹی حق پرستی ہے جس کو قیامت کا سیلاب اس طرح باطل ثابت کر دے گا کہ وہاں اس کے لئے کچھ نہ ہوگا جو اس کا سہارا بنے۔

یہ انسان!

حضرت مسیح کے وعظوں میں سے ایک وعظ میں داعی اور مدعو کی تمثیل ہے۔ یہاں ہم اس تمثیل کا عربی اور اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:

وبمن اشبّہ ھٰذا الجیل۔ یُشْبِہ اولاداً جالسین فی الاسواق ینادون الی اصحابھم ویقولون: زمّرنا لکم فما رقصتم وندبنا لکم فما بکیتم (متی ۱۱: ۱۶)

پس اس زمانہ کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہ دوں وہ ان لڑکوں کی مانند ہیں جو بازاروں میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہتے ہیں۔ ہم نے تمھارے لئے بانسری بجائی اور تم نہ ناچے۔ ہم نے ماتم کیا اور تم نہیں روئے

خلا کا داعی خدا کے سمندر میں نہاتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ ان نغمات میں ایک طرف خدا کے حسن و کمال کی تجلیاں ہوتی ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو سن کر آدمی رقص کر اٹھے۔ دوسری طرف ان نغمات میں خدا کی پکڑ کی تنبیہات ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کو تڑپا کر اسے رلادیں۔ داعی خدا کے جمال و جلال کا مظہر ہوتا ہے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ان چیزوں سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ داعی کے کلام کی صورت میں خدا بالکل اس کے قریب آجاتا ہے۔ مگر اس وقت بھی وہ خدا کو نہیں پاتا۔ اس میں نہ حمد خداوندی کی کیفیات جاگتیں اور نہ خوف خدا سے اس کی آنکھیں تر ہوتیں۔ وہ نازک ترین پیغامات کو بھی پتھر کی طرح سنتا ہے نہ کہ اس انسان کی طرح جس کو خدا نے وہ عقل دی ہے جو باتوں کی گہرائی کو پالے اور وہ دل دیا ہے جو درد سے تڑپ اٹھے۔

خدا کی طرف سے ایک پکارنے والے کا وجود میں آنا کسی مشین پر بجنے والے ریکارڈ کا وجود میں آنا نہیں ہے۔ یہ روح انسانی میں ایک ایسے انقلاب کا برپا ہونا ہے جس کی شدت آتش فشاں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔ مگر اس دنیا کا شاید یہ سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے کہ ایسے ربانی کلمات بھی انسان کو متاثر نہیں کرتے۔ داعی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے "نذیر عریاں" بن جاتا ہے، اس کے باوجود وہ اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ انسان کے سامنے جنت کی کھڑکیاں کھولی جاتی ہیں پھر بھی وہ وجد میں نہیں آتا۔ اس کو بھڑکتے ہوئے جہنم کا نقشہ دکھایا جاتا ہے پھر بھی اس پر گریہ طاری نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے خدا خود آکر کھڑا ہو جاتا ہے پھر بھی وہ سجدہ میں نہیں گرتا۔ انسان سے زیادہ نازک مخلوق خدا نے کوئی نہیں بنائی مگر انسان سے زیادہ بے حسی کا ثبوت بھی کوئی نہیں دیتا۔

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱ - تذکیر القرآن جلد اول ہدیہ ۵۰/-

۲ - الاسلام ۱۵/-

۳ - مذہب اور جدید چیلنج ۲۰/-

۴ - ظہور اسلام ۲۰/-

۵ - احیاء اسلام ۱۲/-

۶ - پیغمبر انقلاب ۲۰/-

۷ - دین کیا ہے ۲/-

۸ - قرآن کا مطلوب انسان ۵/-

۹ - تجدید دین ۳/-

۱۰ - اسلام دین فطرت ۳/-

۱۱ - تعمیر ملت ۳/-

۱۲ - تاریخ کا سبق ۳/-

۱۳ - مذہب اور سائنس ۵/-

۱۴ - عقلیات اسلام ۳/-

۱۵ - فسادات کا مسئلہ ۲/-

۱۶ - انسان اپنے آپ کو پہچان ۱/-

۱۷ - تعارف اسلام ۲/۵۰

۱۸ - اسلام پندرھویں صدی میں ۲/-

۱۹ - راہیں بند نہیں ۳/-

۲۰ - ایمانی طاقت ۳/-

۲۱ - اتحاد ملت ۳/-

۲۲ - سبق آموز واقعات ۳/-

۲۳ - زلزلۂ قیامت ۴/-

۲۴ - حقیقت کی تلاش ۳/-

۲۵ - پیغمبر اسلام ۲/-

۲۶ - منزل کی طرف ۶/-

۲۷ - حقیقت حج (زیر طبع)

۲۸ - Mohammad The Ideal Character 3/-

تعارفی سٹ

۲۹ - سچا راستہ ۱/-

۳۰ - دینی تعلیم ۲/-

۳۱ - حیات طیبہ ۲/۵۰

۳۲ - باغ جنت ۲/-

۳۳ - نار جہنم ۲/-

مکتبہ الرسالہ □ جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ ۱۱۰۰۰۶

27/6/83

الرسالہ

سرپرست

مولانا وحید الدین خاں

ہر آدمی اپنا درخت الگ الگ اگانا چاہتا ہے
یہی وجہ ہے کہ ملت کا باغ وجود میں نہیں آتا۔

مئی ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۸

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

مئی ۱۹۸۳

شمارہ ۷۸

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰٦ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ٦

زرتعاون سالانہ ۳٦ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

سننے والا سن رہا ہے

امریکہ کے خفیہ محکمہ (.N.S.A) کے ایک سابق افسر نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے (The Puzzle Palace) ۔ اس کتاب میں اس کے مصنف نے بڑے دلچسپ انکشافات کئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ سے بھیجے جانے والے ٹیلی فون ٹیلکس اور تار کے پیغامات کی تعداد ہر روز ایک ملین سے زیادہ ہوتی ہے۔ جدید نظام کے مطابق یہ پیغامات پہلے ورجینیا کے زمینی اسٹیشن (Earth Station) پر موصول ہوتے ہیں۔ وہاں سے وہ مصنوعی سیارہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں جو ۲۲۳۰۰ میل اوپر زمین کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ یہ سارا عمل فی الفور ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ میں انجام پاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مشینی پیغام جو امریکہ سے باہر جاتا ہے یا امریکہ کے اندر آتا ہے وہ اصل مخاطب تک پہنچنے سے پہلے امریکی حکومت تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کا خفیہ محکمہ جن لوگوں کے پیغامات کو جاننا چاہتا ہے، ان کا نمبر وہ زمینی اسٹیشن کے دفتر میں دیدیتا ہے۔ یہاں مذکورہ افراد کی گفتگوئیں اور پیغامات خودکار آلات کے ذریعہ ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں۔ گویا آپ اگر واشنگٹن سے دہلی کے لئے ٹیلی فون کریں تو آپ کے منہ سے جو الفاظ نکلیں گے، قبل اس کے کہ آپ کا مخاطب ان کو سنے، امریکہ کی حکومت ان کو سن چکی ہوگی۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ دسمبر ۱۹۸۲) کے امریکی نامہ نگار نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے اس کا عنوان قائم کیا ہے۔ ہوشیار، ممکن ہے کہ امریکہ آپ کی بات سن رہا ہو۔

Careful, Uncle Sam may be listening.

اس قسم کے واقعات خدا کی نشانی ہیں۔ وہ اس لئے ہو رہے ہیں تاکہ آدمی اپنی زبان کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرے۔ آدمی دوسرے آدمی سے ایک غلط بات کہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں صرف ایک آدمی سے کہہ رہا ہوں مگر آدمی کو جاننا چاہئے کہ اس کی بات اس کے مخاطب سے پہلے خدا تک پہنچ رہی ہے۔ مذکورہ واقعہ زبان حال سے کہہ رہا ہے ــــ اے انسان، ہوشیار رہ، کیونکہ تیری ہر بات کو خدا سن رہا ہے۔

خدا کی نشانیاں

ستمبر ۱۹۸۲ کی سات تاریخ تھی۔ میں افریقہ کے ایک پہاڑی علاقہ میں ایک درخت کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ درخت میرے لئے نیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اس قسم کا درخت نہیں دیکھا تھا۔

درخت اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی نشانی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ہر چیز میری نظر میں عجیب تھی، اس کا نازک پھول، اس کا ترشا ہوا پھل، ریاضیاتی کاریگری کے ساتھ بنی ہوئی اس کی پتیاں تمام چیزیں پکار رہی تھیں کہ وہ اپنے آپ نہیں اگ آئی ہیں، بلکہ کسی بنانے والے نے ان کو بنایا ہے۔ اس دنیا کا ہر درخت خدا کی صنعت گری کا نمونہ ہے۔ مگر مذکورہ درخت پہلی بار میرے سامنے آیا اس لئے وہ خصوصی طور پر میرے لئے اثر انگیز ثابت ہوا۔

افریقہ کے اس عجیب اور حسین درخت کو دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکلا —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس دنیا میں جو چیزیں بنائیں ان میں سے ہر چیز پر اس نے یہ لکھ دیا :

Made by God

(خدا کا بنایا ہوا) خدا نے چیزوں پر یہ لکھا اور اس کے بعد اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپا لیا۔ تاکہ لوگ مخلوق کو دیکھ کر خالق کو پہچانیں، تاکہ غیب کے باوجود لوگ اس دنیا میں خدا کی موجودگی کو پالیں۔

ایک شخص جو مشینوں کا ماہر ہو وہ ایک مشین کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ یہ مشین روس کی بنی ہوئی ہے یا امریکہ کی، برطانیہ کی بنی ہوئی ہے یا جاپان کی۔ یہی کائنات کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں بے شمار قدرتی مشینیں موجود ہیں اور ہر ایک مسلسل اپنا کام کر رہی ہے۔ ان "مشینوں" پر بظاہر ان کی ساخت کا ٹھپہ نہیں لگا ہوا ہے، مگر اپنی غیر معمولی بناوٹ اور ناقابل بیان حد تک ممتاز کارکردگی کی وجہ سے وہ اپنی ساخت کا آپ اعلان ہیں۔ مخلوقات خود اپنے خالق کو بتا رہی ہیں۔

کائنات کی کسی چیز کے اوپر لفظوں میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ اس کو کس نے بنایا۔ مگر معنوی طور پر ہر ایک کے اوپر لکھا ہوا موجود ہے۔ اگر دیکھنے والی نگاہ ہو تو آدمی ہر چیز کو دیکھ کر پکار اٹھے گا: بلاشبہ یہ خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ کوئی دوسرا اس کو بنا نہیں سکتا۔

آخری منزل

ایورسٹ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ہمالیہ کی یہ مشہور چوٹی سطح سمندر سے ۲۹۰۲۸ فٹ (۸۸۴۸ میٹر) بلند ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا قابلِ ذکر شخص جس نے اس بلند چوٹی پر اپنا قدم رکھنے کی سنجیدہ کوشش کی وہ ایک انگریز موریس ولسن (Maurice Wilson) تھا۔ اس نے ۱۹۳۴ میں اس کے اوپر چڑھائی کی۔ مگر جس چیز کو اس نے اپنی زندگی کا کلائمکس سمجھا تھا وہ اس کے لئے اینٹی کلائمکس (Anti-clomax) بن گیا۔

موریس ولسن پہلی جنگ عظیم میں ایک سپاہی تھا۔ اس کو دنیا کی "آخری بلندی" پر پہنچنے کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ اس نے اپنے خاندان کی کامیاب تجارت کو اس کے اوپر قربان کر دیا۔ اس نے اپنا تمام سرمایہ خرچ کر کے ذاتی طور پر ایک سکنڈ ہینڈ ہوائی جہاز خریدا۔ وہ انگلستان سے ہندوستان تک چھ ہزار میل کا سفر طے کر کے پورنیہ میں اترا۔ اس کو اپنا ہوائی جہاز آگے لے جانے کی اجازت نہیں ملی۔ چنانچہ اس نے اپنا جہاز فروخت کر دیا۔ اس کے بعد اس نے دارجیلنگ اور تبّت کے راستے سے ایورسٹ کی طرف سفر شروع کر دیا۔

آخر میں اس کے پاس ایک چھوٹا خیمہ، کچھ چاول، ایک خود کار کیمرہ اور چند دوسری چیزیں باقی رہ گئیں۔ تاہم وہ اوپر چڑھتا رہا۔ وہ کامیابی کے ساتھ ۱۹۵۰۰ فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ کو اس کی ۳۶ ویں برتھ ڈے تھی۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اس تاریخی دن کو ایورسٹ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اس نے اپنی ڈائری میں چند دن پہلے یہ الفاظ لکھے:

Only 13000 feet more to go. I have the distinct feeling that I'll reach the summit on April 21

صرف تیرہ ہزار فیٹ جانا اور باقی ہے۔ مجھے یہ واضح احساس ہو رہا ہے کہ میں ۲۱ اپریل (۱۹۳۴) کو چوٹی پر پہنچ جاؤں گا۔

ان پر فخر سطروں کو لکھنے کے بعد ہمالیہ کا سخت طوفان اور موسم کی شدت اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ وہ مجبور ہو گیا کہ پیچھے لوٹے۔ چنانچہ وہ اتر کر اپنے نچلے ٹھکانہ پر آگیا۔ مگر اس کے بعد اس کو دوبارہ اوپر چڑھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا

پیش آیا، اس کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ ایک سال بعد تن زنگ نارگے اوپر چڑھ رہا تھا کہ اس کو ایک مقام پر موریس ولسن کی لاش ملی اور اسی کے ساتھ اس کی ڈائری بھی۔ جس کا آخری اندراج وہ جملہ تھا جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔

موریس ولسن ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی پر خود کار کیمرہ کے ذریعہ اپنی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اس کو امید تھی کہ کیمرہ کی آنکھ اس کو فتح کی چوٹی پر دیکھے گی۔ جب یہ تاریخ آئی تو وہاں نہ کوئی ولسن تھا جو اپنی فتح و کامیابی کو دیکھ کر خوش ہو، اور نہ کوئی کیمرہ تھا جو اس کی فتح و کامیابی کے واقعہ کو ریکارڈ کرے۔

یہ کہانی بدلی ہوئی صورت میں ہر آدمی کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچنے کی طرف آگے بڑھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہاں ہر آدمی صرف ایک ایسی منزل کی جانب چلا جا رہا ہے جہاں موت کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں جو اس کا استقبال کرنے کیلئے موجود ہو۔

موجودہ دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جو دنیوی کامیابیوں کی صرف تمنا کرتے رہتے ہیں۔ اور بالآخر اس طرح مر جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی خوابوں کی دنیا کی طرف سفر بھی شروع نہیں کیا تھا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اپنی زندگی میں، کم یا زیادہ، ان خواہشوں کو پا لیتے ہیں۔ مگر پانے والے بھی ان چیزوں سے اتنا ہی دور رہتے ہیں جتنا کہ نہ پانے والے۔ کیونکہ ان کو پا لینے کے بعد آدمی پر کھلتا ہے کہ اس کو وہ طاقت اور مواقع حاصل نہیں جو ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ اس دنیا میں پانے والا بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا نہ پانے والا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

انسان کتنا زیادہ محروم ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ پانے والا سمجھتا ہے۔ زندگی کس قدر غیر یقینی ہے مگر آدمی اس کو کس قدر یقینی سمجھ لیتا ہے۔ آدمی صرف نامعلوم کل کے راستہ پر جا رہا ہے مگر وہ گمان کر لیتا ہے کہ وہ معلوم آج میں اپنی کامیاب دنیا تعمیر کر رہا ہے۔

کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کیسے ناکام ہیں وہ لوگ جن کا نام کامیاب انسانوں کی فہرست میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔

آہ یہ انسان

تقریباً ایک درجن انڈے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ بظاہر سب انڈے تھے۔ سب اوپر سے دیکھنے میں اچھے لگتے تھے۔ مگر جب توڑا گیا تو ایک کے بعد ایک سب خراب نکلتے چلے گئے۔ آخر میں یہ معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایک بھی اچھا نہ تھا۔ سارے انڈے اندر سے خراب انڈے تھے اگرچہ بظاہر اوپر سے اچھے نظر آتے تھے۔

ایسا ہی کچھ حال آجکل انسانوں کا ہو رہا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ہر آدمی آدمی ہے۔ وہ عمدہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ اوپر سے ہر آدمی اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے پاس اپنے کارناموں کی نہ ختم ہونے والی داستانیں ہیں۔ مگر جب تجربہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندر سے کچھ اور تھا۔ اوپر کے خوبصورت خول کے اندر ایک انتہائی بدہئیت اور بالکل مختلف قسم کا انسان چھپا ہوا تھا۔

جب کسی سے لین دین ہوتا ہے، جب کوئی واقعی معاملہ پڑتا ہے، جب شکایت اور تلخی کا کوئی موقع سامنے آتا ہے، جب کسی کے مفاد اور مصلحت پر ضرب پڑتی ہے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا اصلی انسان وہ نہ تھا جو اوپر سے دکھائی دے رہا تھا۔ خوبصورت کپڑوں کے اندر جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ گندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ خود غرضی، سطحیت، ظاہرداری، فخر، حسد، غرور، موقع پرستی، تعصب، استحصال، یہی وہ چیزیں ہیں جو لوگ اپنے خوبصورت جسموں کے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی بظاہر اچھا انڈا ہے۔ مگر توڑنے کے بعد ہر آدمی خراب انڈا ہے۔

یہی آج کی انسانی دنیا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو آج کی دنیا میں صرف دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ دکھ کی آہیں، یا ظلم کے قہقہے۔ کچھ لوگ بے انصافیوں کا شکار ہو کر آہیں بھر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے حیوانی ارادوں کی تکمیل کر کے فتح کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ کچھ لوگ بے شعوری کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور کچھ لوگ بے حسی کے گڑھے میں۔

مگر یہ صورت باقی رہنے والی نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں پائے گا۔ ایک ایسی دنیا جہاں فیصلہ کا سارا اختیار خدا کو ہوگا نہ کہ انسان کو۔

مومن کی معاشی زندگی

یاایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ○ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون ○ واذا راوا تجارۃ او لھوا انفضوا الیھا وترکوک قائما قل ما عند اللہ خیر من اللھو ومن التجارۃ واللہ خیر الرازقین ○ (جمعہ۔ رکوع آخر)

"اے ایمان لانے والو، جب جمعہ کی نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کی طرف دوڑ پڑو، اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ اور اللہ کا رزق تلاش کرو، اور اللہ کو خوب یاد کرو، تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔ اور جب وہ کوئی تجارت یا تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ کہہ دو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تماشا اور تجارت سے زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ بہترین رازق ہے۔"

یہ آیتیں پہلی بار ایک خاص موقع پر ایک خاص معاملے کے بارے میں اتری تھیں مگر ان میں ہمارے لئے دائمی نصیحت ہے۔ دراصل اس میں مسلمانوں کی معاشی زندگی کا وہ اصول بتایا گیا ہے جس کے مطابق انھیں ہمیشہ زندگی گزارنی چاہئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ (یثرب) پہنچے تو وہاں ایک بار بڑا سخت قحط پڑا۔ مقامی بازار میں غذائی چیزیں نایاب ہو گئیں۔ اس زمانے میں ایک تاجر دحیہ بن خلیفۃ الکلبی شام جا کر وہاں سے آٹا، گیہوں، زیتون کا تیل وغیرہ لاتا اور مدینہ کے بازار میں فروخت کرتا۔ اس کا معمول تھا کہ جب وہ شہر میں داخل ہوتا تو آگے آگے طبل بجوا تا، جو اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ خوراک سے لدا ہوا قافلہ آ گیا ہے۔ ایک بار جمعہ کا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے تھے کہ عین اسی کے درمیان طبل کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ خطبہ چھوڑ کر اس کی طرف دوڑ پڑے۔ کیونکہ یہ ڈر تھا کہ اگر شروع میں نہ پہنچے تو سامان فروخت ہو جائے گا۔ اور پھر خریداری کے لئے اگلی آمد کا انتظار کرنا پڑیگا۔ جب جانے والے جا چکے تو رسول اللہ نے پوچھا ——— "اب کتنے لوگ رہ گئے ہیں؟" جواب دیا گیا کہ بارہ مرد اور ایک عورت۔ آپ نے فرمایا

والذی نفسی بیدہ لو تتابعتم حتی لم یبق منکم احد لسال بکم الوادی نارا۔	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تم سب لوگ چلے جاتے۔ حتی کہ کوئی

ایک بھی یہاں نہ رہ جاتا تو یہ وادی ہمارے
لئے آگ کی وادی بن جاتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

معلوم ہوا کہ یہ اقتصادی غلطی جو مسلمانوں سے ہوئی یہ اتنی بڑی غلطی تھی کہ اس کے جرم میں ان پر پتھر برس سکتا تھا، اور ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین ان کے لئے انگارہ بن سکتی تھی، مگر چند آدمیوں کی وجہ سے اللہ نے اپنا رحم فرمایا۔ اللہ نے اس موقع پر مندرجہ بالا آیتیں نازل فرمائیں اور یہ بتایا کہ مسلمانوں کو اپنی روٹی اور معاش کے مسئلہ میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ جس سے وہ خدا کے محبوب بن سکتے ہیں اور خدا کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔

اس حیثیت سے جب ہم ان آیتوں پر غور کرتے ہیں تو ہماری معاشی زندگی کے لئے پہلا اصول یہ ملتا ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آئے کہ ایک طرف ہماری خرید و فروخت ہو اور دوسری طرف ذکر الٰہی کی پکار ہو تو ہم خرید و فروخت کو چھوڑ دیں اور ذکر الٰہی کی طرف دوڑ پڑیں (فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ)۔ ہم اپنے معاشی دھندوں میں اسی وقت تک آزاد ہیں جب تک خدا کی کوئی بات ہماری سرگرمیوں سے ٹکرا نہ رہی ہو۔ جب بھی دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہو تو لازماً ہمیں خدا کو لینا چاہئے، نہ کہ معاش کے تقاضوں کو۔

ہماری معاشی زندگی کے لئے دوسرا اصول جو ان آیتوں میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم حصول رزق میں مشغول ہوں تو ایسا نہ ہو کہ بس وہی ہمارا سب کچھ بن گیا ہو، بلکہ اس کے ساتھ ہم خدا کو خوب یاد کر رہے ہوں۔ (وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا) ہمارے دل ودماغ میں خدا بسا ہوا ہو۔ اور ہماری زبان سے بار بار ایسے کلمات ٹپک رہے ہوں جو یہ بتاتے ہوں کہ ظاہری طور پر اگرچہ ہم معاشی دھندے میں مشغول ہیں مگر ہماری توجہ اور ہماری اصل سوچ ہر آن خدا کی طرف لگی ہوئی ہے۔

ہماری معاشی زندگی کا تیسرا اہم اصول وہ ہے جو آخری آیت میں بتایا گیا ہے۔ یعنی ہماری معاشی کامیابیاں یا ہماری زندگی کے لئے معاش کی اہمیت کبھی ہم کو اس دھوکے میں نہ ڈالے کہ یہی سب سے بڑی چیز ہے یا یہی ہماری زندگی کا اصل مسئلہ ہے۔ بلکہ جو کچھ خدا کے پاس ہے اسی کو ہم سب سے بڑی چیز سمجھتے ہوں (مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ) نہ معاشی ناکامی ہم کو اس احساس میں مبتلا کرے کہ ہم تو بالکل لٹ گئے، اور اب ہمارے لئے اس دنیا میں کچھ نہیں رہا، اور نہ معاشی کامیابی ہمارے اندر یہ گھمنڈ پیدا کرے کہ ہمیں جو کچھ پانا تھا وہ ہم نے پالیا۔ بلکہ ہر حال میں ہم خدا کی رحمت

اور اس کے اُخروی انعام ہی کو اصل اور سب سے بڑی چیز سمجھتے ہوں۔

یہ تین اصول ہیں جو ہماری معاشی زندگی کو مسلمان بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ اگر یہ تین باتیں ہماری زندگی میں شامل نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود تو مسلمان ہیں مگر ہماری معاشی زندگی مسلمان نہیں ہے۔

زندگی اپنی تمام سرگرمیوں کے ساتھ اس بات کا امتحان ہے کہ ہم کس چیز کو اپنا خیر بناتے ہیں۔ لہو اور تجارت کو یا ذکر اللہ اور اطاعت رسول کو۔ دنیا میں کچھ چیزیں وہ ہیں جن میں مادی نفع ہے اور اس بنا پر آدمی ان کی طرف دوڑتا ہے۔ اور کچھ چیزیں وہ ہیں جن میں وقتی تسکین اور ظاہری نمود و نمائش ہے اور اس لئے آدمی ان کی طرف کھنچتا ہے۔ ان چیزوں میں نفس انسانی کے لئے خواہ کتنی ہی کشش ہو مگر وہ حقیقی خیر نہیں ہیں۔ یہ موت سے پہلے کی مختصر زندگی کے کھیل تماشے ہیں جو موت کے بعد کی مستقل زندگی میں باقی نہیں رہیں گے۔ مومن وہ ہے جو اللہ کی یاد میں جیئے اور اطاعت رسول کو اپنا شیوہ بنائے۔ کیونکہ یہی وہ "خیر" ہے جو موت کے بعد مستقل زندگی میں آدمی کے کام آنے والا ہے۔

اس دنیا میں مومن کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرے، وہ پوری طرح آخرت کی طرف متوجہ رہے۔ یہی کسی کی کامیابی کا اصل راز ہے۔ مگر موجودہ دنیا اس طرح بنائی گئی ہے کہ یہاں آدمی کو بھوک پیاس لگتی ہے۔ یہاں اس کو مکان اور دوسرے اسباب حیات درکار ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دو مختلف تقاضوں کے درمیان توازن کیسے قائم ہو۔ دو متضاد چیزوں میں کیا نسبت تلاش کی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی چیز کو آدمی اپنا مقصد بنائے اور دوسری چیز کو ضرورت۔

زندگی کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ جوڑے۔ وہ اللہ کے مشن میں اپنے آپ کو مشغول کرے۔ وہ اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا زیادہ شامل کرے کہ ہر وقت اس کو اسی کی یاد آتی رہے۔ اسی میں آخرت کی کامیابی ہے جہاں آدمی کو مرنے کے بعد جانا ہے اور مستقل طور پر رہنا ہے۔

اس کے بعد جہاں تک زندگی کے معاشی تقاضوں کا سوال ہے ان کے لئے اجازت ہے کہ آدمی بقدر ضرورت ان میں مشغول ہو۔ مگر معاشی زندگی کو جائز زندگی بنانے کے لئے ان تین شرطوں کا لحاظ ضروری ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔

پانے سے پہلے

انگریزی کا مقولہ ہے کہ ہم دیتے ہیں تب ہی ہم پاتے ہیں،

In giving that we receive

دنیا کے بنانے والے نے دنیا کا یہ قانون مقرر کیا ہے کہ یہاں جو دیتا ہے وہی پاتا ہے۔ جس کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہو اس کے لئے پانا بھی اس دنیا میں مقدر نہیں۔

ہمارے چاروں طرف کی دنیا میں خدا نے اس اصول کو انتہائی کامل شکل میں قائم کر رکھا ہے یہاں ہر چیز کو اگرچہ اپنے وجود کو قائم کرنے کے لئے دوسروں سے کچھ لینا پڑتا ہے، مگر ہر چیز کا یہ حال ہے کہ وہ جتنا لیتی ہے اس سے زیادہ وہ دینے کی کوشش کرتی ہے۔

درخت کو لیجئے۔ درخت زمین سے پانی اور معدنیات لیتا ہے۔ وہ ہوا سے نائٹروجن لیتا ہے۔ وہ سورج سے حرارت لیتا ہے اور اس طرح پوری کائنات سے اپنی غذا لیتے ہوئے اپنے وجود کو کمال کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔ مگر اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کا پورا وجود دوسروں کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو سایہ دیتا ہے۔ وہ دوسروں کو لکڑی دیتا ہے۔ وہ دوسروں کو پھول اور پھل دیتا ہے۔ وہ ساری عمر اسی طرح اپنے آپ کو دوسروں کے لئے وقف رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہی حال کائنات کی ہر چیز کا ہے۔ ہر چیز دوسروں کو دینے اور دوسروں کو نفع پہنچانے میں مصروف ہے۔ سورج، دریا، پہاڑ، ہوا، ہر چیز دوسروں کو نفع پہنچانے میں لگی ہوئی ہیں۔ کائنات کا دین نفع بخشی ہے نہ کہ حقوق طلبی۔

اس دنیا میں صرف ایک ہی مخلوق ہے جو دینے کے بجائے لینا چاہتی ہے، اور وہ انسان ہے۔ انسان یک طرفہ طور پر دوسروں کو لوٹتا ہے، وہ دوسروں کو دئے بغیر دوسروں سے لینا چاہتا ہے۔ وہ نفع بخش بنے بغیر نفع خور بننا چاہتا ہے۔

انسان کی یہ روش خدا کی اسکیم کے خلاف ہے، وہ کائنات کے عام مزاج سے ہٹی ہوئی ہے۔ یہ تضاد ثابت کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے موجودہ دنیا میں کامیابی مقدر نہیں۔ موجودہ دنیا میں کامیابی صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو وسیع تر کائنات سے اپنے کو ہم آہنگ کریں۔ جو دینے والی دنیا میں خود بھی دینے والے بن کر رہیں، نہ کہ دینے والی دنیا میں صرف لینے والے۔

مومن کی فراست

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد اسر ابو عزة الشاعر يوم بدر فمنّ عليه واطلقه - فلما كان يوم احد اسره ثانية. فقال منّ علیّ - فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم، لا يلدغ المومن من جحر مرتين.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی لڑائی میں ابو عزہ شاعر کو قید کیا تھا۔ پھر آپ نے اس پر احسان کیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ پھر جب احد کی لڑائی ہوئی تو اس کو دوبارہ قید کیا۔ ابو عزہ نے کہا مجھ پر احسان کیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔

یعنی تم نے دوبارہ ہمارے خلاف جنگ میں آکر اپنا اعتماد کھو دیا ہے۔ اگر تم احسان کئے جانے کے قابل ہوتے تو پہلے احسان کے بعد تم دوبارہ ہمارے خلاف لڑنے نہ آتے اس تکرار کے بعد تم معافی کے قابل نہیں۔

مومن میں یہ ہوشیاری کہاں سے آتی ہے کہ اس کو کوئی دھوکا نہ دے سکے۔ اس کا جواب دوسری حدیث میں موجود ہے۔ آپ نے فرمایا: مومن کی فراست سے بچو۔ کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ (اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله)

عام انسان اپنی ذات کی سطح پر زندگی گذارتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو ذات کی سطح سے اٹھائے اور خدا کی سطح پر زندگی گذارنے لگے۔ ایسا آدمی ان نفسیاتی پردوں سے باہر آجاتا ہے، جو لوگوں کے لئے صحیح طور پر دیکھنے اور صحیح طور پر رائے قائم کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ایسے آدمی کی سوچ خدائی سوچ بن جاتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ بے آمیز ذہن کے ساتھ چیزوں پر غور کر سکے۔

عام آدمی چیزوں کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے اور مومن خدا کی نظر سے۔ اور جو شخص چیزوں کو خدا کی نظر سے دیکھنے لگے، وہ ہر معاملہ میں درست فیصلہ لے گا اور درست فیصلہ ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

انسان کا المیہ

خدا نے ایک دنیا بنائی ۔ بے حد حسین اور انتہائی لذیذ دنیا ۔ خدا نے اس دنیا میں آدمی کے لئے ب کچھ جمع کر دیا جس کو وہ چاہتا ہے ۔ اس کے بعد خدا نے اس پر کیف دنیا میں انسان کو بسایا اور لکھ ـــــ انسان اس دنیا کو صرف دیکھے گا، وہ اس کو پا نہ سکے گا ۔

دنیا کا سکھ اور اس کی لذتیں آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں ۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا کا ر اس کی لذتیں آدمی کے لئے ناقابل حصول ہیں ۔ ایک شخص جس کو دنیا ابھی حاصل نہ ہوئی ہو وہ جتنا محروم سمجھتا ہے ، اتنا ہی وہ شخص بھی اپنے کو محروم پاتا ہے جس کو دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ا ہو گئی ہو ۔

بمبئی کا ایک فلم پروڈیوسر ہے گل آنند ۔ اس کی شادی ایک خوبصورت عورت سے ہوئی جس کا بھا تھا ۔ بظاہر اس جوڑے کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے ۔ بمبئی میں ان اس کئی شاندار مکانات تھے جس میں وہ خوشیوں کی جنت میں رہنے لگے ۔

مگر کچھ دنوں کے بعد انہیں ایک کمی کا احساس ہونے لگا ۔ وہ دو ہونے کے باوجود ابھی تک ـــــ سے محروم ہیں ۔ اس احساس نے دونوں کے درمیان ایک خاموش دوری پیدا کرنی شروع کی ۔ انہوں نے ایک مقامی یتیم خانہ سے ایک چھوٹا بچہ اور ایک چھوٹی بچی حاصل کی وہ بیٹے اور بیٹی کے طور ی کی پرورش کرنے لگے ۔ تاہم یہ مصنوعی تدبیر ان کی محرومی کے احساس کو ختم نہ کر سکی ۔ بالآخر دوری یہاں بڑھی کہ دونوں الگ الگ مکانوں میں رہنے لگے ۔

شوبھا کے ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ اس کو ذہنی اختلال ہے ۔ دس سال تک وہ اس مفروضہ کے تحت اس کا علاج کرتے رہے ، مگر بے سود ۔ بالآخر ۸ فروری ۱۹۸۳ کو یہ المناک کہانی ختم ہو گئی ۔ شوبھا بمبئی میں ر روڈ کے "نیلم بار" میں سولھویں منزل پر ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھی ۔ اس نے ۸ فروری کو اندر سے ازہ بند کر لیا ۔ پہلے اپنے بچوں کو کھڑکی سے باہر پھینکا اور اس کے بعد خود بھی چھلانگ لگا دی ۔ تینوں نیچے ے ہی مر گئے ۔ انگریزی اخبار کی رپورٹنگ کے مطابق شوبھا کے شوہر (گل آنند) نے اپنے تاثرات بیان کرتے ئے کہا :

I don't know the exact medical terms for my wife's mental disorders

بیوی کے ذہنی اختلال کو بیان کرنے کے لئے متعین طبی اصطلاح مجھے معلوم نہیں (ٹائمس آف انڈیا بمبئی ۹ فروری ۱۹۸۳)

ایک کردار ادا کرنے کیلئے

۲۲ ملین ڈالر کے خرچ سے " گاندھی " کے نام پر ایک فلم بنی ہے جس میں مہاتما گاندھی کی زندگی کو دکھایا گیا ہے ۔ اس فلم کے بنانے والے ایک انگریز سر رچرڈ اٹن برو ہیں ۔ وہ بیس سال سے اس فلم کو بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی ۔ کوئی مووی کمپنی اس میں سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی ، کیونکہ اس فلم کے متعلق ان کا عام خیال یہ تھا کہ وہ بالکل غیر نفع بخش (Totally uncommercial) ہوگی ۔ مگر بن کنگسلے (Ben Kingsley) نے اتنی کامیابی کے ساتھ گاندھی کا پارٹ ادا کیا کہ یہ فلم آج کامیاب ترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے ۔

بن کنگسلے کے باپ ایک ہندستانی گجراتی ڈاکٹر تھے ۔ جنھوں نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی ۔ ان کا ابتدائی نام کرشنا بھنجی تھا ۔ بعد کو انھوں نے اپنا نام بن کنگسلے رکھ لیا ۔ بن کنگسلے کو گاندھی سے جسمانی مشابہت کی بنا پر اس فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کرنے کے لئے چنا گیا تھا ۔ اس کے بعد انہوں نے طویل مدت تک سخت محنت کی ۔

بن کنگسلے شوٹنگ سے کافی پہلے ہندستان آئے ۔ انہوں نے اپنے سر کو منڈایا تاکہ ان کا سر گاندھی کی طرح گنجا معلوم ہو ۔ وہ موٹے تھے چنانچہ انہوں نے مسلسل کم کھانا کھا کر اپنا وزن ۱۷ کیلو تک گھٹایا اور اپنے کو دبلا بنایا ۔ سورج میں دیر دیر تک رہے تاکہ ان کا رنگ سانولا دکھائی دینے لگے ۔ فلم کی کہانی کو پورا کا پورا یاد کر ڈالا ۔ انہوں نے اپنے کمرہ کی دیواروں کو مہاتما گاندھی کی تصویروں سے بھر دیا ۔ وہ مہاتما گاندھی کی پانچ گھنٹہ کی ڈکو منٹری کو دیکھتے رہے ۔ وہ گاندھی کی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھنے پر قادر نہ تھے ۔ چنانچہ انہوں نے روزانہ دو گھنٹے کی یوگا ورزش کر کے اپنے کو اس کا عادی بنایا کہ وہ پاؤں توڑ کر دیر دیر تک بیٹھیں ۔ اسی کے ساتھ انہوں نے روزانہ دو گھنٹے چرخا چلایا تاکہ وہ شوٹنگ کے وقت بالکل مہاتما گاندھی کی طرح چرخا چلا سکیں ۔ (نیوز ویک ۱۳ دسمبر ۱۹۸۲)

بن کنگسلے کو ایک فلم میں خاص کردار ادا کرنا تھا ۔ اس کے لئے انہوں نے اتنی تیاریاں کیں ۔ طویل مدت تک سخت محنت کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ یہ کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوں ۔ پھر جو لوگ اپنے کو خیر امت کہتے ہیں ان کو تو تاریخ انسانی میں اہم ترین کردار ادا کرنا ہے ۔ کیا وہ کسی تیاری کے بغیر یہ مشکل رول ادا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ۔

زیادہ نازک

ایک مسلم نوجوان نے جدید تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اس کو باہر کے ایک ملک میں کام ملا اور وہ اس کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس کے ماں باپ اس کو رخصت کرنے کے لئے ہوائی اڈہ پر آئے۔ نوجوان کے مشرقی باپ نے آخری وقت میں نصیحت کرتے ہوئے کہا: دیکھو بیٹے، جب ہوائی جہاز کے اندر بیٹھنا تو اپنے چاروں طرف آیۃ الکرسی کا گھیرا بنا لینا۔ اور درود شریف پڑھتے رہنا۔

یہ سن کر ایک شخص نے کہا: آپ بیٹے کو اس قسم کی نصیحت کیوں کر رہے ہیں۔ بزرگ بولے: اس لئے کہ یہ ہوائی سواری ہے۔ راستہ میں ذرا سی بھی کوئی بات پیش آئے تو کیا سے کیا ہو جائے۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص اس سے زیادہ خطرناک ہوائی سواری پر بیٹھا ہوا ہے"۔ آدمی نے دوبارہ کہا " یہ زمین جس پر ہم آپ ہیں یہ ہوائی جہاز سے بھی زیادہ نازک سواری ہے۔ ہماری زمین کسی ٹھوس چیز پر رکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ اتھاہ خلا میں معلق ہے۔ وہ ہوائی جہاز سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دہرا حرکت کر رہی ہے۔ ایک طرف وہ اپنے محور پر ۲۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے مدار پر ۱۵ سکنڈ فی میل کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ ہوائی جہاز تو درمیانی مقامات پر اترتے ہیں۔ مگر زمین کا تیز رفتار سفر بغیر رکے ہوئے مسلسل جاری ہے۔"

اس قسم کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد مذکورہ شخص نے کہا۔" اگر آپ کو اپنے اس زمینی سفر کا واقعی احساس ہو تو آپ ہر وقت آیۃ الکرسی اور درود شریف پڑھتے رہیں۔ آپ کے اوپر لرزہ طاری ہو جائے، ہوائی سفر سے کہیں زیادہ آپ کو اپنے زمینی سفر کا فکر لاحق رہنے لگے"۔

لوگ انسانی واقعات سے متاثر ہوتے ہیں، وہ خدائی واقعات سے متاثر ہونا نہیں جانتے۔ کوئی شخص کرتب کے زور سے اپنے آپ کو اس طرح دکھائے کہ اس کا پاؤں چھت پر ہو اور اس کا سر نیچے کی طرف لٹکا ہوا ہو تو بیشمار لوگ اس عجیب واقعہ کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔ مگر لوگوں کو یاد نہیں کہ وہ خود اسی قسم کے عجیب تر واقعہ کی مثال ہیں۔ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص کا یہ حال ہے کہ وہ زمین کی سطح پر لٹکا ہوا ہے۔ زمین گول ہے۔ زمین پر فی الواقع یہ صورت پائی جاتی ہے کہ آدمی اس کے اوپر مذکورہ کرتب باز آدمی کی طرح لٹکے ہوئے ہیں۔ ہندستان والوں کے لئے امریکہ کے لوگ اس طرح ہیں کہ زمین کی سطح پر ان کا پاؤں ہے اور ان کا سر زمین کے نیچے لٹک رہا ہے اسی طرح امریکہ والوں کے لئے ہندستان کے لوگ سر نیچے اور پاؤں اوپر کئے ہوئے زمین پر چل پھر رہے ہیں۔

چھلانگ نہیں

A young man once came to a venerable master and asked
"How long will it take to reach enlightenment?"
The master said, "Ten years"
The young man blurred, "So long"
The master said, "No, I was mistaken. It will take you 20 years"
The young man asked. "Why do you keep adding to it"
The master answered, "Come to think of it, in your case it will probably be 30 years"

اوپر کا اقتباس فلپ کپلیو (Philip Kapleau) کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: ایک نوجوان شخص ایک بار ایک بزرگ استاد کے پاس آیا اور کہا: صاحب علم بننے میں کتنا وقت لگے گا۔

"دس سال"۔ استاد نے جواب دیا۔

"اتنی لمبی مدت"۔ نوجوان بولا۔

استاد نے کہا۔ "نہیں، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تمہارے لئے اس میں ۲۰ سال کی مدت درکار ہوگی۔

نوجوان شخص نے پوچھا "آپ مدت میں اضافہ کیوں کرتے جا رہے ہیں"۔

استاد نے جواب دیا: "بات کو سمجھو، تمہارے معاملہ میں غالباً اس کو ۳۰ سال لگ جائیں گے"۔

(آرڈی جنوری ۱۹۸۳) جو مقصد عام رفتار سے ۱۰ سال میں حاصل ہوتا ہو اس کو آپ دس دن میں حاصل کرنا چاہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ چھلانگوں کے ذریعہ اپنا سفر طے کرنا چاہتے ہیں۔ اور چھلانگوں کے ذریعہ سفر ہمیشہ اصل سفر کو طویل تر بنا دیتا ہے۔

چھلانگ لگانے والے کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی چٹان سے ٹکرا جاتا ہے یا کسی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو پیچھے لوٹ کر کسی اسپتال میں داخل ہونا پڑتا ہے جہاں وہ مدت تک علاج کے لئے پڑا رہے۔ اگر وہ عام رفتار سے چلتا تو وقت پر اپنی منزل تک پہنچ جاتا۔ مگر چھلانگ نے اس کو پیچھے ڈال کر اس کے سفر کو اور لمبا کر دیا۔

کسی کام میں دیر لگانا جتنا غلط ہے اتنا ہی غلط یہ بھی ہے کہ آپ اس کو جلد پورا کرنا چاہیں۔ ہر کام کی تکمیل کا ایک وقت ہے اور صحیح تکمیل وہی ہے جو اپنے وقت پر انجام پائے۔ دیر کرنا اگر سستی ہے تو جلدی کرنا بے صبری، اور خدا کی اس محکم دنیا میں دونوں بالآخر جہاں پہنچتے ہیں وہ بے انجامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دو انسان

ایک بزرگ کا واقعہ ہے۔ کسی مسئلہ پر ان کی گفتگو ایک شخص سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران بزرگ کی زبان سے کچھ سخت الفاظ نکل گئے۔ اس کے بعد دونوں الگ ہو گئے۔ یہ شام کا وقت تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد جب بزرگ اپنے بستر پر گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے اندر بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ ان کا دل انھیں ملامت کرنے لگا کہ تم نے خدا کے ایک بندے کے ساتھ سخت کلامی کی۔ تم نے اپنے مقابلہ میں اس کو حقیر سمجھا۔ تمہارے اندر ابھی تک گھمنڈ کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ خدا کے یہاں اگر وہی آدمی بلند مرتبہ ہو اور تم خدا کے یہاں بے قیمت ٹھہرو تو تم کیا کرو گے۔ تم کو یہ حق تو تھا کہ اپنے بھائی کی رائے سے اختلاف کرو۔ مگر تم کو یہ حق نہ تھا کہ برے الفاظ بول کر اس کو ذلیل کرو۔

اس قسم کے خیالات نے بزرگ کو اتنا بے چین کیا کہ ان کی نیند اڑ گئی، وہ رات بھر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ ایک بار وہ بستر سے اٹھے اور وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کیا، مگر انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے خدا ان کی نماز کو ان کے چہرہ پر مار رہا ہے۔ ان کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے فجر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد فوراً مذکورہ آدمی کے گھر پہنچے۔ اس سے ملاقات کر کے اس سے معافی مانگی۔ اس وقت حال یہ تھا کہ ایک طرف ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دوسری طرف زبان سے یہ نکل رہا تھا۔ "خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو"۔

یہ اللہ سے ڈرنے والے شخص کا حال تھا۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس کی اگر شام کے وقت کسی سے تکرار ہو جائے تو صبح کو وہ اس کے خلاف مزید سخت کارروائیاں کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ پچھلے دن اگر خود کسی کو برا بھلا کہا تھا تو اگلے دن اپنے ساتھیوں کو بھی اکساتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ اس کو ذلیل کریں۔ اگر ایک بار کسی سے شکایتی باتیں ہو گئیں تو ہمیشہ کے لئے اس کے خلاف کینہ اپنے دل میں رکھ لیتا ہے اور وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس کو ذلیل اور برباد کرنے کے لئے وہ کر سکتا ہے۔

جس آدمی کے دل میں اللہ کا ڈر ہو اس کے لئے اللہ کا ڈر اس کا نگہبان بن جاتا ہے۔ وہ شام کی غلطی کی تلافی صبح کو کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اللہ کے ڈر سے خالی ہو اس کا رہنما صرف اس کا نفس ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی رہنمائی میں ایک کے بعد ایک سرکشی کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

جینے کا راز

ایک مسلمان لیڈر نے وزیراعظم اندرا گاندھی کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں انہوں نے یہ شکایت کی کہ مسلم اقلیت کے ساتھ ہندوستان میں ظلم اور امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر اس صورتِ حال کو ختم نہ کیا گیا تو ان کی پارٹی ستیہ گرہ شروع کر دے گی۔ اس کے جواب میں مسز اندرا گاندھی نے مکتوب نگار کو جو خط لکھا اس کا ایک جملہ یہ تھا۔

No minority could survive if their neighbours of the majority were irritated

کوئی اقلیت زندہ نہیں رہ سکتی اگر اس کی پڑوسی اکثریت مشتعل ہو۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۱ فروری ۱۹۸۳)

اگر بالکل غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے تو وزیراعظم اندرا گاندھی کا یہ جملہ صورتِ حال کی نہایت صحیح ترجمانی ہے۔ نیز اسی کے اندر مذکورہ مسئلہ کا حقیقی حل بھی چھپا ہوا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف اسباب سے ایک دوسرے کے خلاف ناراضگی کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں — کوئی آگے بڑھ گیا ہے تو دوسروں میں اس کے خلاف حسد کا جذبہ، کسی کو زیادہ مل گیا ہے تو اس کے مقابلہ میں اپنی محرومی کا احساس، کسی سے شکایت کی کوئی بات ہو جائے تو اس کے خلاف غصہ اور انتقام، وغیرہ۔ اس قسم کے جذبات انتہائی عام ہیں اور وہ ہر سماج میں بلکہ ہر گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ مگر عام حالات میں وہ دلوں کے اندر چھپے رہتے ہیں۔ لوگوں کی روزمرہ کی مصروفیات بھی اس کے ابھرنے میں رکاوٹ بنی رہتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجائے تو یہ جذبات ظاہر ہو جاتے ہیں۔

سماجی امن درحقیقت اس کا نام ہے کہ ان منفی جذبات کو دبا رہنے دیا جائے۔ اس کے برعکس سماجی بدامنی یہ ہے کہ کوئی نادانی کر کے ان چھپے ہوئے جذبات کو مشتعل کر دیا جائے۔

یہ زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ موجودہ مقابلہ کی دنیا میں کوئی معاشرہ حتی کہ کوئی خاندان اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں زندگی کا راز صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ صبر اور حکمت کا طریقہ اختیار کر کے دبے ہوئے جذبات کو دبا رہنے دیا جائے۔ ان کو ہر قیمت پر ابھرنے کا موقع نہ دے کر روکا جائے۔

زندگی کا یہی راز ہے جس کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے — اس دنیا میں ہر آدمی کے پاس ایک وسیع قبرستان ہونا چاہئے جس میں وہ لوگوں کے قصوروں کو دفن کر سکے۔

دینے والے بنو

باٹا شو کمپنی باٹا خاندان کے نام پر ہے۔ یہ خاندان ابتداءً چیکوسلواکیا میں رہتا تھا۔ ۱۶۲۰ء میں انہوں نے جوتا بنانے کا کام شروع کیا۔ ٹامس باٹا سینئر (موجودہ باٹا کے والد) نے ۱۹۲۵ء میں پہلی بار جوتے کا کارخانہ بنایا۔

ٹامس باٹا سینئر اپنے ذاتی ہوائی جہاز میں اڑ رہے تھے کہ ان کا جہاز گہرے کہر میں پھنس کر گر گیا۔ اسی وقت وہ جل کر مر گئے۔ اس کے بعد سے ٹامس باٹا جونیئر باٹا لمیٹڈ کے پریسیڈنٹ ہیں۔ ان کی عمر اس وقت ۶۸ سال ہے۔

باٹا کمپنی کا کاروبار اس وقت ۱۱۴ ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ پچھلے سال اس کمپنی نے ۳۱۵ ملین جوڑے جوتے ساری دنیا میں فروخت کئے۔ اس کمپنی کا سب سے بڑا کاروبار کناڈا میں ہے۔ اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر ہندوستان میں ہے۔ باٹا کمپنی اس وقت دنیا کا سب سے بڑا جوتا ساز ادارہ ہے۔ اس کے براہ راست ملازمین کی تعداد مجموعی طور پر تقریباً ۹۰ ہزار ہے۔ بالواسطہ کارکنوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

مسٹر ٹامس باٹا جونیئر ۱۹۸۳ء میں چالیسویں بار ہندوستان آئے۔ اخباری نمائندے نے ایک ملاقات میں ان سے سوال کیا: آپ کی کامیابی کا واحد سب سے بڑا عامل کیا ہے جس نے آپ کو موجودہ کامیابی تک پہنچایا۔ مسٹر باٹا نے جواب دیا کہ ہم ہر قسم کے جوتے بناتے ہیں سستے بھی اور انتہائی قیمتی بھی۔ مگر ہم ہر خریدار کی ضرورت مکمل طور پر پوری کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنے خریداروں کا اتنا زیادہ لحاظ کرتے ہیں جتنا کوئی بھی نہیں کرتا۔

We realy look after our customers as nobody else

باٹا کی جوتا کمپنی کی عظیم کامیابی یہ سبق دے رہی ہے کہ ——— اگر تم اپنے لئے لینا چاہتے ہو تو دوسروں کو دینے کی کوشش کرو۔ کیوں کہ دوسروں کو دے کر ہی اس دنیا میں تم اپنے لئے پا سکتے ہو۔

تعمیر کی طاقت

چینی مفکر کنفیوشش کا قول ہے۔ "ایک چھوٹا چراغ روشن کرنا اس سے بہتر ہے کہ تم تاریکی کو برا کہو" کیونکہ تاریکی کو برا کہہ کر ہم تاریکی کو دور نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم اگر تاریکی میں ایک چراغ جلادیں تو تاریکی اپنے آپ جاتی رہے گی۔

رات نے اگر آپ کے چاروں طرف اندھیرا پھیلا دیا ہو تو اس کے خلاف لفظوں کا طوفان اٹھا کر آپ اس سے نجات نہیں پا سکتے۔ البتہ اگر آپ ایک شمع حاصل کر کے اس کو جلادیں تو آپ دیکھیں گے کہ رات کے باوجود آپ کا ماحول روشن ہو گیا ہے۔

برائی کو ختم کرنا ہے تو بھلائی کا آغاز کر دیجئے۔ آپ کو لوگوں کی طرف سے بدسلوکی کا تجربہ ہو تو آپ ان سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آیئے۔ لوگ ظالم بنے ہوئے ہوں تو آپ انصاف کرنا شروع کر دیجئے لوگ آپ کے ساتھ امتیاز برت رہے ہوں تو آپ اس پر صبر کر کے اپنی کمیوں کی تلافی میں لگ جائیے۔ لوگ آپ کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنائے ہوئے ہوں تو آپ ان کو نظر انداز کر کے اپنے اصل کام میں مصروف ہو جائیے۔ یہی کسی مسئلہ کو حل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا جتنے طریقے ہیں وہ مسئلہ کو الجھانے والے ہیں نہ کہ مسئلہ کو حل کرنے والے۔

ایک مسلم نوجوان ایک مسجد میں امام مقرر ہوئے۔ اس مسجد کے بارہ میں مشہور تھا کہ یہاں کوئی امام ٹھہرتا نہیں۔ وہاں جتنے امام آئے سب تھوڑے تھوڑے دن کے بعد بیزار ہو کر چلے گئے۔ مسجد کے لوگ اماموں کو بہت کم تنخواہ دیتے تھے۔ ان کو عزت کی نظر سے تو دیکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔

نوجوان کے اندر تعمیری مزاج تھا۔ اس نے سوچا، میرے پیش رو جو چیز مطالبہ کے ذریعہ حاصل نہ کر سکے، میں اس کو انشاء اللہ عمل کے ذریعہ حاصل کروں گا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ وہ نہ صرف اپنے مقررہ فرائض کو بحسن و خوبی ادا کرے گا۔ بلکہ فرائض سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ مسجد کی صفائی کا پہلے سے زیادہ اہتمام کرتا۔ مسجد سے ملی ہوئی زمین پہلے خالی پڑی رہتی تھی اب اس نے اس کی صفائی کر کے وہاں سبزی اور پھول لگا دیئے اور آبپاشی اور محنت کر کے اس کو سبزہ زار بنا دیا۔ محلہ کے لڑکے جو صبح و شام کھیل کود میں رہتے تھے ان کو مسجد میں بلا کر پڑھانا شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ وہ لوگوں کی تلخ باتوں کا جواب بھی میٹھے انداز میں دیتا۔ وہ لوگوں کی بدسلوکی کے باوجود ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا۔

اس قسم کے کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مسجد والوں کے دل جیت لئے ۔ لوگ اس سے اتنا خوش ہوئے کہ اپنے آپ اس کی تنخواہ بڑھا دی۔ اس کو کثرت سے تحفے تحائف ملنے لگے ۔ ہر آدمی اس کو عزت کی نظر سے دیکھنے لگا ۔ لوگوں کی خواہش ہوئی کہ اس کے لئے ایسا انتظام کریں کہ وہ یہاں مستقل رہنے لگے ۔ یہاں سے چھوڑ کر کہیں اور نہ جائے ۔ چنانچہ اس کے لئے مسجد سے متصل ایک رہائشی کوارٹر بنایا گیا تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو وہاں لائے اور دل جمعی کے ساتھ وہاں رہے ۔

زندگی کا یہی راز ہے جس کو شیکسپیر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ۔ "تمہیں کیا چاہئے ، جو کچھ بھی تمہیں چاہئے اس کو مسکراہٹ کی طاقت سے حاصل کرو نہ کہ تلوار کی طاقت سے"۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے محض وقتی جذبات کے تحت کام کرتے ہیں ۔ اگر وہ سوچ سمجھ کر کام کریں تو انہیں معلوم ہو کہ وہ جو کچھ "تلوار" کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کو وہ "مسکراہٹ" کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔

آدمی کو بیک وقت دو چیزوں کی ضرورت ہے ۔ پیسہ اور اخلاق ۔ پیسہ آپ کو آپ کی ضرورتیں دیتا ہے اور اخلاق آپ کو لوگوں کے درمیان اچھی طرح رہنے کے قابل بناتا ہے ۔ آدمی کو اگر اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیسہ چاہئے تو اسی کے ساتھ اس کو لوگوں سے اچھا نباہ کرنے کے لئے اچھا اخلاق بھی چاہئے ۔ مگر اکثر آدمی پہلی چیز حاصل کرنے کے لئے محنت کرتے ہیں اور دوسری چیز حاصل کرنا بھول جاتے ہیں ۔ چین کی ایک کہاوت میں ان دونوں چیزوں کی اہمیت کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ـــــ "اگر تمہارے پاس دو پیسے ہوں تو ایک سے روٹی خریدو اور دوسرے سے پھول۔ روٹی تمہیں زندگی دے گی اور پھول تم کو جینے کا فن سکھائے گا"۔

زندگی کا معرکہ

"سب کچھ لٹ جانے پر بھی مستقبل باقی رہتا ہے" بودی کا یہ قول زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بیان کر رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے امکانات لٹ گئے ہوں تو وہ یقینی طور پر ماضی کے امکانات ہوں گے نہ کہ مستقبل کے امکانات ۔ آدمی خواہ کتنا ہی زیادہ برباد ہو جائے ۔ بہر حال اس کی بربادی اس کے ماضی کی بربادی ہوتی ہے ۔ اس کا مستقبل پھر بھی پوری طرح اس کے لئے موجود ہوتا ہے ۔ وہ مستقبل کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر کے دوبارہ اپنے لئے ایک نئی کامیاب زندگی پا سکتا ہے ۔

کسی حادثہ سے دوچار ہونے کے بعد اگر آدمی یہ کہہ سکے کہ میں نے "ماضی کو کھویا ہے مگر میں نے مستقبل کو نہیں کھویا" تو گویا کہ اس نے جو چیز کھوئی تھی اس سے بھی زیادہ بڑی چیز اس نے دوبارہ پالی ۔

کیوں کہ اس کا یہ احساس اس کو ایک نیا آغاز عطا کرتا ہے، اور اس دنیا میں حقیقی آغاز ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

رابرٹ کولیئر نے نہایت صحیح کہا ہے کہ "انسان کی سب سے اچھی دوست اس کی دس انگلیاں ہیں" دس انگلیوں سے اس کی مراد آدمی کے دو ہاتھ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی کے دو ہاتھ جن میں اس کی دس انگلیاں ہیں، یہ اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا تمام سونا بھی ان کی قیمت نہیں۔ آدمی جب اپنا باہر کا اثاثہ کھو چکا ہو، اس وقت بھی اس کی دس انگلیاں اس کے پاس پوری طرح موجود ہوتی ہیں۔ انہیں انگلیوں اور انہیں دونوں ہاتھوں سے اس نے حاصل کیا تھا جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا۔ اب دوبارہ وہ ان کو استعمال کرکے پھر وہی چیز پا سکتا ہے جس کو اس نے پہلے حاصل کیا تھا، اور پھر اس نے ان کو کھو دیا۔

مسٹر جے سی ملک ایک فوجی پائلٹ تھے۔ انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں فائٹر پائلٹ (ہندستان ٹائمس ۵ مئی ۱۹۸۲) کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فوجی پائلٹ جب ایک جنگی جہاز لے کر اڑتا ہے تو یہ اس کے لئے گویا موت کی طرف سفر کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس کا آواز سے تیز رفتار جہاز اتنی بلندی پر اڑتا ہے جہاں عملاً مہیب خلا کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنا سارا سفر مشین کے اعتماد پر کرتا ہے۔ وہ یا تو اپنا کام کرکے دوبارہ اپنے سابقہ مقام پر واپس آجاتا ہے یا دشمن کا نشانہ بن کر ختم ہو جاتا ہے۔

فوجی پائلٹ کے اس جوکھم کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر ملک نے ایک بڑا سبق آموز جملہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پائلٹ کے اندر اس وقت جو آدمی ہے وہ ڈر کو جانتا ہے، اس کے اندر جو کارکن ہوا باز ہے اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر رکھا ہے کہ وہ اس پر قابو پا سکے:

The man in him knows fear. But the professional pilot in him has taught and trained himself to master it

یہ بات جو مضمون نگار نے فوجی پائلٹ کے بارے میں کہی ہے وہی زندگی کے عام معرکہ کے لئے بھی صحیح ہے۔ زندگی ایک سخت معرکہ ہے جس کا سامنا ہر آدمی کو کرنا پڑتا ہے۔ انسان کی کمزوریاں اس کو ڈراتی ہیں اس کے بظاہر ناموافق حالات اس کو بے ہمت کرتے ہیں۔ لیکن آدمی کو اگر زندگی کا معرکہ جیتنا ہے تو اس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ مشکلات سے گھبرانے کے بجائے وہ مشکلات پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

"حافظہ پیچھے دیکھتا ہے اور امید آگے" رام چندر ٹنڈن کا یہ قول اسی حقیقت کو ایک اور انداز سے بیان کرتا ہے۔ ڈر یا نا امیدی دراصل حافظہ کا ایک معاملہ ہے۔ ہمارے ذہن میں جو پچھلی یادیں چھپی ہوئی ہیں ان میں سے کسی یاد کو ہم اپنے ساتھ جوڑ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صورت جو فلاں کے ساتھ پیش آئی تھی وہ ہمارے ساتھ بھی نہ پیش آجائے۔ اگر ہم پچھلی یادوں کو نظر انداز کر کے آگے کے امکانات پر اپنے ذہن کو جما دیں تو معلوم ہوگا کہ جہاں ہم صرف خطرہ دیکھ رہے تھے وہیں ہمارے لئے ایک نیا شاندار، امکان چھپا ہوا تھا۔ کسی نے صحیح کہا ہے" ہر خاتمہ ایک نئے امکان کا آغاز ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں۔

ایک مقولہ ہے کہ ہوائیں اکثر اوقات اس رخ کے خلاف چلتی ہیں جو کہ کشتیاں چاہتی ہیں (الریاح فی معظم الاحیان تجری علیٰ خلاف ماتریدہ السفن)

زندگی ایک ناہموار سفر ہے۔ زندگی میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے باہر کے حالات بالکل ویسے ہی ہوں جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حالات آپ کے ساتھ موافقت نہیں کرتے۔ آپ کو اپنی زندگی کا سفر حالات سے لڑ کر طے کرنا ہوتا ہے۔

زندگی کی مثال دندانہ دار پہیہ (Cog Wheel) کی ہے۔ ایک دندانہ انسان کا ہے اور دوسرا دندانہ قدرت کا۔ جب تک قدرت کا پہیہ نہ چلے، انسان کا پہیہ نہیں چل سکتا۔

انسان جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ان کو محض اپنی ذاتی کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا۔ ذاتی کوشش کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ باہر کے اسباب اس کے ساتھ موافقت کریں۔ گویا کہ موجودہ دنیا میں کسی کامیابی کو پانے کے لئے بیک وقت دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک، آدمی کی اپنی ذاتی محنت۔ دوسرے، باہر کے حالات کی موافقت۔

آدمی کو یقیناً اپنے آپ پر قابو حاصل ہے۔ مگر خارجی اسباب پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں کامیابی کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ یہ کہ ہم اپنی زندگی کا منصوبہ بناتے ہوئے خارجی اسباب کا بھی ضرور لحاظ رکھیں۔ خشکی پر چلنے کی قوت رکھتے ہوئے سمندر میں چھلانگ نہ لگائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالات سے ہم آہنگی کر کے اپنا راستہ نکالنے کا نام کامیابی ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ حالات سے لڑ کر اپنا راستہ نکالنے میں کامیابی کا راز بتاتے ہیں۔

(نوٹ) یہ تقریر ۱۰-۱۱ دسمبر ۱۹۸۲ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

یکساں برتاؤ

ویل للمطففین۔ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون۔ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔ الا یظن اولٰئک انھم مبعوثون۔ لیوم عظیم۔ یوم یقوم الناس لرب العٰلمین۔ (المطففین)

خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ وہ لوگ کہ جب دوسروں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں۔ اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن وہ اٹھائے جانے والے ہیں، اس دن جب کہ تمام لوگ خداوندعالم کے سامنے کھڑے ہوں گے

دوسروں کو ان کے حق سے کم کرکے دینا برا ہے۔ مگر دوسروں سے لیتے وقت پورا پورا لینا اور اپنے پاس سے دوسروں کو دینا ہو تو کمی کرکے دینا اور بھی زیادہ برا ہے۔ جو آدمی ایسا کرے وہ خدا کی نظر میں سخت گنہ گار ہے۔ ایسا آدمی گویا خود ہی اپنے جرم کو ثابت کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کا عمل بتارہا ہے کہ وہ انصاف اور ناانصافی کے فرق کو جانتا ہے۔ ظلم کا ظلم ہونا اس پر بخوبی واضح ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی ذات کے لئے کم ملنے کے بارہ میں اتنا حساس کیوں ہوتا۔ جو دکان دار خریدتے ہوئے پورا تول کرلے اور بیچتے ہوئے کم تول کر دے، اس کے بدترین مجرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ظاہر الفاظ کے مطابق اس آیت میں لین دین کو صحیح رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں انسان کی ایک نفسیاتی برائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور وہ ہے اپنے لئے کچھ پسند کرنا اور دوسروں کے لئے کچھ۔

وہ سارے لوگ اس آیت کے ذیل میں آتے ہیں جن کا حال یہ ہو کہ وہ دوسروں کی عزت نہ کریں اور خود یہ چاہیں کہ ان کی عزت کی جائے۔ جو خود کسی کو سلام نہ کریں مگر یہ چاہیں کہ لوگ انہیں سلام کریں۔ جو دوسروں کے ساتھ کبھی انصاف نہ کریں مگر اپنے لئے یہ چاہیں کہ لوگ ان کے ساتھ مکمل انصاف کریں۔ خود وعدہ خلافی کریں تو انہیں کوئی احساس نہ ہو مگر جب دوسرا ان کے ساتھ وعدہ خلافی کرے تو بپھر اٹھیں۔ وہ دوسروں سے خدمت لینے کو اپنا حق سمجھیں مگر دوسرے کی خدمت کرنا انھیں بالکل یاد نہ رہے۔ مزدور سے کام لیتے ہوئے یہ چاہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرے مگر اجرت دیتے وقت یہ چاہیں کہ کم سے کم اجرت دینی پڑے۔ وہ دوسروں کو بے فکری کے ساتھ ستائیں مگر جب انھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو چیخ اٹھیں۔

انسانی زندگی کے لئے خدا کا پسندیدہ اصول یہ ہے کہ آدمی کا جو برتاؤ لینے میں ہو۔ وہی اس کا برتاؤ دینے میں ہو۔ جو آدمی اس کے خلاف عمل کرے وہ خدا کے نقشے کے خلاف چل رہا ہے اور خدا کے نقشے کے خلاف چلنے والے کے لئے خدا کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

تحریکیں ناکام کیوں

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے جو تحریکیں اٹھائیں۔ وہ سب کی سب اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اس کا سبب مذکورہ آیت کی روشنی میں معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ان تحریکوں کے لیڈر دوسروں سے اپنے خلاف جس ظلم کی شکایت کر رہے تھے وہ خود دوسرو ں کے خلاف وہی ظلم کر رہے تھے۔ قرآن کے مطابق ایسے لوگوں کے لئے اس دنیا میں خدا کا غضب ہے نہ کہ خدا کی نصرت۔

الرسالہ مارچ ۱۹۸۳ صفحہ ۴۴ پر ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اگرچہ کسی کا نام نہیں لیا گیا تھا۔ تاہم مسلمانوں کے کچھ لیڈر جو اپنے اعلان کے مطابق ، قوم کے خلاف ظالموں کے ظلم کو ختم کرنے کی مہم چلا رہے ہیں ، انہوں نے محسوس کیا کہ اس کی زد ان کے اوپر پڑ رہی ہے۔ ان کے آدمی ہمارے دفتر میں آئے۔ وہ بے حد مشتعل تھے۔ انہوں نے ہم کو برا بھلا کہا اور دھمکیاں دیں ہم تمہارے اوپر مقدمات چلائیں گے، ہم تم کو نکال باہر کریں گے۔ ہم تمہارا خاتمہ کر دیں گے ، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ میرے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ تو بعد کی بات ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس طرز عمل سے آپ خود اپنے کو کس خانہ میں ڈال رہے ہیں۔ آپ ثابت کر رہے ہیں کہ آپ کا معیار اپنے لئے کچھ ہے اور دوسروں کے لئے کچھ۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کو ہمارے ایک مضمون سے شکایت پیدا ہو گئی حالانکہ اس میں کا نام شامل نہ تھا۔ ایسے صرف ایک مضمون کی بنا پر آپ ہم سے اتنا بگڑے ہوئے ہیں کہ ہم کو مٹا ڈالنا چاہتے ہیں پھر جن لوگوں کو آپ ظالم کہتے ہیں ان کے پاس تو آپ کے خلاف اس سے بہت زیادہ بڑی بڑی شکایتیں موجود ہیں۔ یہ لوگ جو ظلم کر رہے ہیں وہ بھی یوں ہی بلا سبب نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ مختلف قسم کی شکایتوں اور ناراضگیوں کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ پھر آپ کے لئے معمولی شکایت کی بنا پر کسی کو برباد کرنے کا منصوبہ اگر جائز ہے تو وہی دوسرے لوگوں کے لئے ناجائز کیوں ہو۔ یہ تضاد موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈروں میں ہے اور یہی تضاد ان کی تمام تحریکوں کو بے نتیجہ بنائے ہوئے ہے۔

مارکس کا تضاد

انیسویں صدی میں سائنس کی ترقی نے انسانی ذہن پر زبردست اثر ڈالا۔ سائنس دانوں نے معلوم کیا کہ طبیعی دنیا کے کچھ اٹل قوانین ہیں اور ان کو معلوم کرکے نہایت کامیابی کے ساتھ ان کو تمدنی ترقی کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سائنس اپنے شاندار نتائج کی بنا پر انسانی ذہن پر غالب آ گئی۔ چنانچہ ہر میدان میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو اس کوشش میں مصروف تھے کہ چھپے ہوئے اٹل قوانین کا پتہ لگائیں اور ہر چیز کو عین سائنس ثابت کریں۔

کارل مارکس کی سائنٹفک سوشلزم بھی اسی ذہن کی پیداوار تھی۔ اس زمانے میں فرانس اور جرمنی اور برطانیہ میں ایسے مفکرین ظہور میں آچکے تھے جو اپنے زمانہ کے معاشرتی مسائل پر سائنسی اصول کو چسپاں کر رہے تھے۔ ان کو یہ شوق تھا کہ وہ ایسے سوشل قوانین کا پتہ چلائیں جو طبیعی قوانین کی طرح اٹل ہوں اور افراد کی مرضی اور خواہش کے محتاج نہ ہوں۔ اس طرح انھیں یہ یقین بھی حاصل ہوا تھا تاکہ مزدور طبقہ کے حقوق کو آئندہ رد نہ کیا جاسکے گا۔ اس میں سرمایہ دار طبقہ کے مقابلہ میں مزدور طبقہ کی جیت یقینی نظر آتی تھی۔

کارل مارکس نے اس فکر کو زیادہ منظم طور پر اور زیادہ قوت کے ساتھ پیش کیا۔ مگر بے جان مادی دنیا کو باشعور انسانوں پر چسپاں کرنا سراسر ایک احمقانہ حرکت تھی یہی وجہ ہے کہ مارکس کے اولین ساتھیوں کو اپنے زمانہ ہی میں یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ وہ مارکس کے خیالات کو معتدل بنانے کے لئے اس کی تعبیر نو کریں۔ مثلاً انگلس کو یہ کہنا پڑا کہ " ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مارکس کن حالات میں لڑ رہے تھے اور یہ کہ ان کی جنگ ایسے لوگوں سے تھی جو معاشی اسباب کو کوئی مقام دینے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے۔

مارکس کے نزدیک مادہ اور انسان میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر (Matter) ہے اور انسان (Thinking Matter)

آج سوشلسٹ نظام میں بھی طبقات بدستور باقی ہیں۔ البتہ ان کے نام بدل گئے ہیں۔ "مالک" کی جگہ اب "پارٹی" نے لے لی ہے، گویا تھنکنگ میٹر صرف میٹر کے مقام پر نہ رہ سکا۔ بلکہ دوبارہ وہ تھنکنگ میٹر بن گیا۔

شعوری ایمان

قاضی مجتبیٰ حسن زنجانی (پیدائش ۱۹۱۵) حکومتِ ہند میں جوائنٹ چیف کنٹرولر امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ تھے۔ ۱۴ فروری ۱۹۸۳ کی ملاقات میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ بتایا۔

۱۹۳۵ میں جب کہ الہ آباد میں وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے اصغر گونڈوی بھی وہاں مقیم تھے۔ اصغر صاحب اس وقت ہندوستانی اکیڈمی کے "تماہی رسالہ" کے مدیر تھے۔ جناب زنجانی صاحب اور ان کے کچھ نوجوان ساتھی ایک روز اصغر گونڈوی سے ملنے کیلئے گئے۔ وہاں مجلس میں ایک اور صاحب موجود تھے جو ان طلبہ کے آزادانہ خیالات سے واقف تھے۔ انہوں نے اصغر گونڈوی سے کہا۔

"حضرت یہ لڑکے انگریزی پڑھ کر دہریے ہو گئے ہیں۔"

اصغر گونڈوی یہ سن کر فوراً سنجیدہ ہوگئے۔ "ان کو دہریہ نہ کہو" انہوں نے کہا۔ "یہ ابھی لَا اِلٰہ کی منزل میں ہیں۔ اس کے بعد جب وہ اِلَّا اللہ کی منزل میں پہنچیں گے تو وہ تم سے اچھے مسلمان ہونگے۔"

اصغر گونڈوی کے اس جملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ایک واقعہ کے تاریک پہلو کو لینے کے بجائے اس کے روشن پہلو کو لیا۔ خدا اور مذہب کے بارہ میں ایک آدمی کے تشکیکی خیالات کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر خدا و مذہب کا منکر ہو۔ مگر اس کے ساتھ یہاں دوسرا امکان بھی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی تلاش کے مرحلہ میں ہو۔ اصغر گونڈوی نے نوجوانوں کی "دہریت" کو انکار کے معنی میں لینے کے بجائے اس کو تلاش کے معنی میں لیا۔

اس کے اندر ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ "تلاش" کے مرحلہ سے گزر کر جو شخص "یافت" کے مرحلہ تک پہنچتا ہے اس کا ایمان بے حد پختہ ہوتا ہے۔ جو آدمی شعوری طور پر "نہیں" کا انکار کرے اور شعوری طور پر "ہے" کو اختیار کرے اس کے ایمان میں جوش اور یقین اور زندگی ہوتی ہے۔ اس کا ایمان ان لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے جنہوں نے نہیں کا تجربہ نہیں کیا۔ جن کو نسلی اور روایتی طور پر ایک عقیدہ مل گیا اور وہ اس سے مانوس ہو کر اس سے وابستہ ہوگئے۔

روایتی ایمان ایک آبائی تقلید ہوتا ہے۔ اور شعوری ایمان ایک ذاتی دریافت۔ اوّل الذکر ایمان آدمی کی زندگی کا بس ایک ضمیمہ ہوتا ہے۔ جبکہ ثانی الذکر ایمان اس کے وجود میں خون اور حرارت بن کر داخل ہو جاتا ہے۔ ایک اگر بے روح ایمان ہے تو دوسرا حقیقی معنوں میں زندہ ایمان۔

مسلمان وہ ہے

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده

رسول اللہ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں

آدمی جب حقیقی طور پر خدا کو پاتا ہے تو اس کی قدرت اور جلال کے آگے اس کی ہستی بالکل دب جاتی ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے وجود کو خدا کے آگے ڈال دے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے حوالے کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دراصل ایسے ہی انسان کے طرز عمل کو بیان کرتا ہے۔ جو شخص اس طرح مسلم بنتا ہے وہ ایسا انسان ہوتا ہے جو خدا کو ہر آن اپنے آپ پر طاری کئے ہوتے ہو۔ اس کا پورا رویہ اس احساس کے تحت متعین ہوتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اگر وہ خدا کی مرضی کے خلاف چلے تو وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔

یہ احساس مسلمان کی زبان سے یہ صلاحیت ختم کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے خلاف استعمال ہو۔ یہ احساس مسلمان کے ہاتھ سے یہ طاقت چھین لیتا ہے کہ وہ کسی کے خلاف دست درازی کرے۔ اس کی زبان کھلتی ہے تو صحیح بات کہنے کے لئے کھلتی ہے۔ اس کا ہاتھ اٹھتا ہے تو انصاف کو قائم کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو حق کی جانب کھڑا کرتا ہے نہ کہ ناحق کی جانب۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں آدمی کو آزمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ آزمائش ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ آدمی دو چیزوں کے درمیان ہو۔ سورج چاند حالتِ امتحان میں نہیں ہیں — کیونکہ وہ ایک ہی متعین انداز میں سفر کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان حالتِ امتحان میں ہے۔ کیونکہ وہ اختیار رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک رخ پر حرکت کرے اور چاہے تو دوسرے رخ پر۔

اس حقیقت کی روشنی میں دیکھئے تو مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان وہ ہے جس کو موقع ہو کہ وہ اپنے بھائی کے خلاف اپنی زبان کھولے مگر اس کے باوجود وہ خدا کی خاطر اپنی زبان کو بند کر لے مسلمان وہ ہے جس کو یہ موقع ہو کہ وہ اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھائے مگر خدا کا خوف اس کے اوپر اتنا غالب ہو کہ اس کا ہاتھ اس کے بھائی پر اٹھنے سے رک جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی ہر آن انصاف اور بے انصافی کے درمیان ہے۔ مسلمان وہ ہے جس نے بے انصافی کو چھوڑ کر انصاف کا راستہ اختیار کیا، اگرچہ بے انصافی کا راستہ بھی اس کے لئے پوری طرح کھلا ہوا تھا۔

مشورہ

عن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم المستشار موتمن

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔

عن ابی هریرہ قال ما رأیت احدا اکثر مشورہ لاصحابہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی، فضائل الجہاد)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اتنا زیادہ مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے۔

قال جعفر الصادق رضی اللہ عنہ بسفیان الثوری شاور فی امرک الذین یخشون اللہ تعالیٰ۔ (تعلیم المتعلم للشیخ الزرنوجی)

امام جعفر صادق نے سفیان ثوری سے کہا: اپنے معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

قال علی کرم اللہ وجہہ ما هلك امرؤ عن مشورة۔ (تعلیم المتعلم)

حضرت علی کا قول ہے کہ مشورہ سے کوئی انسان کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔

عن ابن عباس من اراد امراً فشاور فیہ امرءً مسلما وفقہ اللہ تعالیٰ لارشد امورہ ما تشاور قوم قط الا هدوا لارشد امرهم (مدارک التنزیل)

عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ جو شخص کوئی کام کرنا چاہے پھر کسی مرد مسلم سے مشورہ کرے تو اللہ تعالیٰ کام کے بہتر پہلو کی طرف اس کی رہنمائی کر دیتا ہے جو لوگ بھی مشورہ کی پابندی کرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے معاملہ کے زیادہ درست پہلو کو پا لیتے ہیں۔

من اشار علی اخیہ بشیئ یعلم الرشد فی غیرہ فقد خان۔ (تفسیر ابن جریر)

جس نے اپنے بھائی کو جان بوجھ کر غلط مشورہ دیا اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔

آدمیوں میں کوئی زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے اور کوئی کم سمجھ والا۔ کسی کے سامنے ایک پہلو ہوتا ہے۔ اور کسی کے سامنے دوسرا پہلو۔ کوئی متاثر رائے قائم کرتا ہے اور کوئی غیر متاثر رائے۔ ایسی حالت میں آدمی کے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ دوسروں سے مشورہ کر لیا جائے تاکہ مختلف رایوں کے سامنے آنے کے بعد صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ مشورہ گویا کہ دوسروں کی صلاحیتوں کے ذریعہ اپنی کمیوں کی تلافی ہے۔

یہ بھی سنت ہے

عن انس قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا بنی ان قدرت ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبک غش لاحد فافعل ثم قال یا بنی وذلک من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے لڑکے، اگر تو اس پر قادر ہو کہ تو صبح اور شام اس طرح کرے کہ تیرے دل میں کسی کے خلاف کینہ نہ ہو تو ایسا کر۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اے لڑکے، یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

رسول کی سنت کا تعلق صرف کپڑا، بال اور مسواک جیسی چیزوں سے نہیں ہے بلکہ ایک آدمی کی زندگی کے پورے رویے سے ہے۔

لوگوں کے درمیان آپ کیسے رہیں، اس کے بارے میں سنت رسول یہ ہے کہ آپ کا دل لوگوں کے بارے میں برے جذبات سے پاک ہو۔ جب بھی ایک آدمی دوسرے آدمیوں کے درمیان رہتا ہے تو طرح طرح کے باہمی معاملات پیش آتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کے خلاف رنجش اور شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا ہونا فطری ہے۔ مگر خدا کے رسول کی سنت یہ ہے کہ ایسے جذبات کو اپنے دل میں ٹھہرنے نہ دیا جائے بلکہ انھیں باہر نکال دیا جائے۔

شکایتوں کو نظر انداز کرنا۔ رنجشوں کو بھول جانا، غلطیوں کو معاف کر دینا، تکلیف کو اپنے اوپر سہہ لینا بجائے اس کے کہ اس کو دوسرے کے اوپر ڈالا جائے، یہ پیغمبر کا طریقہ ہے اور جنت انھیں لوگوں کے لئے ہے جو پیغمبر کے طریقہ کو اختیار کریں۔

جو لوگ پیغمبر کے طریقہ کو چھوڑ کر اپنے نفس کی ترغیبات پر چلیں، جو لوگ اپنے سینے کو منفی جذبات سے پاک کرنے کے بجائے اس کو منفی جذبات کا آشیانہ بنائیں۔ وہ آخرت میں پیغمبروں اور خدا کے نیک بندوں کی آبادی سے دور ہوں گے۔ کیونکہ انھوں نے پیغمبروں اور نیک بندوں کی روش کو اپنے لئے پسند نہیں کیا۔

جھوٹی دینداری

مکہ کے مشرکین معروف معنوں میں لامذہب نہ تھے۔ وہ زور شور کی حد تک مذہبی بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کو دین ابراہیمی کا وارث اور حامل سمجھتے تھے۔ ان کی کمی یہ تھی کہ دین کی حقیقی روح ان کے اندر سے غائب ہوگئی تھی۔ چنانچہ قرآن میں ان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: مسجد حرام کے حقیقی ولی وہ لوگ ہیں جو تقویٰ والے ہیں۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور ان کی نماز بیت اللہ کے پاس کیا ہوتی ہے، بس سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا (الانفال ۳۵-۳۴)

یہی بات بائبل میں یہود کو خطاب کرتے ہوئے ان لفظوں میں کہی گئی ہے: تو اپنے سرود کا شور میرے حضور سے دور کر، کیونکہ میں تیرے رباب کی آواز نہ سنوں گا۔ لیکن عدالت کو پانی کی مانند اور صداقت کو بڑی نہر کی مانند جاری رکھ۔ (عاموس ۵: ۲۴-۲۳)

قوموں میں جب بگاڑ آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے درمیان دین کا نام ونشان مٹ جائے ایسا نہ پہلے ہوا اور نہ آئندہ کسی کے یہاں ہوگا۔ جو بات ہوتی ہے وہ یہ کہ دین کی حقیقت غائب ہو جاتی ہے، البتہ اس کی ظاہری شکلوں کی دھوم خوب بڑھ جاتی ہے۔

جب ایسا ہوتا ہے تو "رباب" پر خدائی حمد کا شور بہت بڑھ جاتا ہے۔ مگر دل کے تاروں پر خدا کا نغمہ چھڑنا بند ہو جاتا ہے۔ عوامی مجلسوں میں دینی باتوں کی دھوم خوب ہونے لگتی ہے مگر تنہائیوں میں خدا کے خوف سے تڑپنے والے ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کو مجرم ثابت کرنے کے لئے زبانیں تیزی سے چلنے لگتی ہیں۔ مگر اپنی خطاؤں کا اقرار کرنے کی تڑپ لوگوں میں باقی نہیں رہتی۔ دوسروں کی بے انصافی کا اعلان کرنے والے بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر اپنی بے انصافی کی اصلاح کرنے والے کہیں نظر نہیں آتے۔ یوم ملت اور یوم اسلام منانے والوں کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے مگر یوم خویش منانے والے معدوم ہو جاتے ہیں۔ قوم کو بچانے کے لئے ہر شخص بے تاب نظر آتا ہے مگر فرد کو بچانے کے لئے کوئی نہیں اٹھتا۔

جو اپنی ذات میں عدل وانصاف کا آبشار بن جائے۔ جس کے قول وعمل سے سچائی کی نہریں جاری ہو جائیں۔ وہی حقیقت میں خدا پرست ہے۔ مگر یہی وہ خدا پرست ہے جس کا آج کی دنیا میں کہیں وجود نہیں۔

ایک مومن

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال نکلے گا تو مومنین میں سے ایک شخص اس کی طرف جائے گا۔ اس کی ملاقات پہلے دجال کے پہریداروں سے ہوگی۔ وہ اس سے کہیں گے۔ تمہارا کہاں کا قصد ہے۔ وہ کہے گا میں اس شخص کی طرف جارہا ہوں جو نکلا ہے۔ وہ لوگ اس سے کہیں گے، کیا تم ہمارے رب پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ کہے گا۔ ہمارا رب کوئی چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ لوگ کہیں گے اس کو مار ڈالو۔ پھر ان میں کا ایک دوسرے کو کہے گا، کیا تمہارے رب نے تم کو منع نہیں کیا ہے کہ تم اس کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل نہ کرو۔ اس کے بعد وہ لوگ اس کے ساتھ دجال تک جائیں گے۔ مومن جب اس کو دیکھے گا تو کہے گا، اے لوگو یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ دجال حکم دے گا تو اس مومن کو پیٹ کے بل لٹا دیا جائے گا۔ پھر دجال کہے گا کہ اس کو پکڑو اور اس کو لہولہان کردو۔ پس اس کی پیٹھ اور پیٹ پر خوب مارا جائے گا، پھر دجال کہے گا۔ کیا تم مجھ پر ایمان نہیں رکھتے۔ مومن کہے گا۔ تو ہی جھوٹا مسیح ہے۔ پھر دجال حکم دے گا تو آرا لایا جائے گا اور اس کا پاؤں چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جائے گا۔ پھر دجال دونوں ٹکڑوں کے درمیان چلے گا اور اس سے کہے گا، اٹھ تو وہ سیدھا اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ پھر دجال اس سے کہے گا۔ کیا تم مجھ پر ایمان لاتے ہو۔ مومن کہے گا، تمہارے بارے میں میرا یقین اب اور زیادہ بڑھ گیا ہے، پھر مومن کہے گا۔ اے لوگو، میرے بعد وہ کسی کے ساتھ ایسا نہ کر سکے گا۔ پھر دجال اس کو پکڑے گا تاکہ اس کو ذبح کردے۔ مگر اللہ اس کی گردن اور اس کی ہنسلی کی ہڈی کے درمیان کے حصہ کو تانبہ کا بنا دے گا تو اس پر اس کا بس نہ چل سکے گا۔ پھر دجال اس کے دونوں ہاتھوں، دونوں پیروں کو پکڑے گا اور اس کو پھینک دے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ دجال نے اس کو آگ میں پھینک دیا۔ حالانکہ درحقیقت وہ جنت میں پھینکا گیا ہوگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رب العالمین کے نزدیک لوگوں کے لئے سب سے بڑی گواہی ہوگی۔ (مسلم، بخاری)

حدیث میں اس طرح کے جو واقعات ہیں، ضروری نہیں کہ وہ اسی طرح واقعاتی صورت میں پیش آئیں جس طرح وہ حدیث کے الفاظ میں نظر آتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ پیش آنے والے واقعہ کی تمثیل ہو۔ اصل واقعہ تمثیل کے روپ میں پیش آنے والا ہو، اور اس کو حدیث رسول میں واقعاتی روپ میں بیان کر دیا گیا ہو۔

منافق کے ساتھ برتاؤ

امام شافعی نے اپنی کتاب الام میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اخبرنا مالک عن ابن شہاب عن عطاء بن یزید اللیثی عن عبید اللہ بن عدی بن الخیار ان رجلاً سارّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم ندر ما سارّہ حتی جھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذا ھو یشاورہ فی قتل رجل من المنافقین۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیس یشہد ان لا الٰہ الا اللہ۔ قال بلی ولا شہادۃ لہ فقال الیس یصلی قال بلی ولا صلاۃ لہ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولٰئک الذین نھانی اللہ تعالیٰ عنھم۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چپکے چپکے بات کی۔ ہم نے نہیں جانا کہ وہ چپکے چپکے کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بآواز بلند بولے تو ہم نے جانا کہ وہ منافقین میں سے ایک شخص کو قتل کرنے کا مشورہ کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں کہا، کیا وہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت نہیں دیتا ہے۔ آدمی نے کہا ہاں، مگر اس کی شہادت شہادت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کیا وہ نماز نہیں پڑھتا ہے۔ آدمی نے کہا ہاں، مگر اس کی نماز نماز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف سے اللہ نے مجھ کو منع کر دیا ہے۔

بخاری و مسلم نے عبادۃ بن الصامت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بلایا پھر بیعت لی۔ آپ نے ہم سے سمع و طاعت پر بیعت لی خواہ پسند ہو یا ناپسند، مشکل ہو یا آسان۔ اور یہ کہ ہم اپنے اوپر ترجیح دئے جانے کو گوارا کریں اور اہلیت والے سے معاملہ میں نزاع نہ کریں الا یہ کہ تم کھلا ہوا کفر دیکھو جس کے لئے تمہارے پاس خدا کی طرف سے دلیل ہو (بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا ومکرھنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان)

روایات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں اشخاص اگرچہ ظاہری طور پر مسلمان بنے ہوئے ہیں مگر حقیقۃً وہ منافق ہیں۔ اس کے باوجود

آپ نے ان سے مسلمانوں جیسا معاملہ فرمایا اور ان کے ظاہر احوال پر انھیں باقی رکھا۔

مسلم، احمد، ابن ماجہ اور ابوداؤد نے اسامہ بن زید سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک سریہ میں بھیجا۔ ہم صبح کو جہینہ کے علاقہ میں پہنچے۔ وہاں میں نے ایک آدمی کو پکڑا۔ اس نے فوراً لا الٰہ پڑھا۔ پھر بھی میں نے اس کو نیزہ مار دیا۔ اس کے بعد میرے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا، کیا اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا پھر بھی تم نے اس کو قتل کر دیا (قال لا الٰہ الا اللہ وقتلتہ) میں نے کہا اے رسول اللہ اس نے ہتھیار کے ڈر سے کہا تھا۔ آپ نے فرمایا: پھر کیوں نہ تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تاکہ تم کو معلوم ہو کہ اس نے واقعۃً کہا ہے یا نہیں کہا ہے (افلا شققت علی قلبہ حتی تعلم اقالہا ام لا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جملہ کو برابر دہراتے رہے، یہاں تک کہ میں نے تمنا کی کہ کاش میں آج مسلمان ہوا ہوتا۔

حضرت عمر بن الخطاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے عبد اللہ بن ابی (رئیس المنافقین) کے قتل کی اجازت دیجئے۔ مگر آپ نے ان کو اجازت نہیں دی۔ اسی طرح ابن ابی کے لڑکے عبد اللہ نے ابن ابی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی جب کہ غزوہ مریسیع میں اس کا نفاق ظاہر ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ نے انکار فرمایا اور کہا، بلکہ ہم اس سے نرمی کا معاملہ کریں گے اور اس سے اچھا تعلق رکھیں گے (بل نترفق بہ ونحسن صحبتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو منافق قرار دیکر اس کو قتل کرنا سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ مخلص اور منافق کا تعلق اللہ سے ہے۔ وہی دونوں کو الگ کرکے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم لوگوں سے ظاہری حالات کے مطابق معاملہ کریں۔

مدینہ کے منافقین یہود سے ملے ہوئے تھے وہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ وہ بظاہر مسلمان مگر اندر سے نامسلمان تھے۔ اس کے باوجود ان کو قتل نہیں کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اقتدار حاصل تھا مگر آپ ان کی حقیقت جانتے ہوئے ان کو برداشت کرتے رہے، یہاں تک کہ منافقین اپنی طبعی موت مر کر اللہ کے یہاں حساب دینے کے لئے پہنچ گئے۔

ایک موت

۲۳ فروری ۱۹۸۳ کی صبح الرسالہ کے لئے بڑی دردناک خبر لے کر آئی۔ اس دن الرسالہ کے کاتب حافظ امجد علی شاہجہانپوری کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ حافظ امجد علی صاحب نے الرسالہ کی کتابت کا کام اتنی دلچسپی اور لگن کے ساتھ کیا کہ "الرسالہ" اور "امجد علی صاحب" دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی بن گئے۔ وہ دہلی کے اعلیٰ درجہ کے کاتب تھے۔ الرسالہ کے صفحات نے ان کی خوش نویسی کے جو نمونے محفوظ کئے ہیں وہ ابھی نا معلوم مدت تک باقی رہیں گے۔ مگر لکھنے والے کا فن لکھنے والے کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ الرسالہ کی ہر اشاعت سب سے پہلے امجد علی صاحب کی نظر سے گذرتی تھی تو یہ بات بالکل صحیح ہوگی۔ کیونکہ وہ الرسالہ کو صرف "لکھتے" نہیں تھے بلکہ وہ اس کو "پڑھتے" بھی تھے۔ الرسالہ کے مضامین جب انھیں کتابت کے لئے دیئے جاتے تو پہلے وہ ان کا مطالعہ کرتے۔ اس کے بعد ان کو لکھنا شروع کرتے۔ وہ الرسالہ کے صرف کاتب نہیں تھے۔ بلکہ وہ اس کے سب سے پہلے قاری بھی تھے۔

موت کی خبر ملنے کے بعد ۲۳ فروری کی دوپہر کو جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا مردہ جسم ایک چارپائی پر لٹایا ہوا تھا۔ میں دیر تک تاثرات کے طوفان میں انھیں دیکھتا رہا۔ وہی معصوم چہرہ تھا مگر اب وہ خاموش ہو چکا تھا۔ بظاہر وہی آنکھیں تھیں مگر اب وہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ ہاتھ وہی تھا مگر اب وہ قلم پکڑنے کی طاقت سے محروم تھا۔

۲۴ فروری کو نماز ظہر کے بعد جنازہ اٹھا۔ لوگ حافظ امجد علی کا جسم کاندھوں پر اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ اور میرے ذہن میں ایک پوری تصویر جاگ رہی تھی۔ جس میں انسان اپنے آغاز سے انجام کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ انسان کی کہانی کیسے عجیب طور پر اس دنیا میں شروع ہوتی ہے۔ اور کیسے عجیب طور پر ختم ہو جاتی ہے۔

۲۳ فروری سے پہلے امجد علی صاحب سے میرا ہر روز کا ساتھ تھا۔ ۲۳ فروری کو وہ اچانک دوسری دنیا میں چلے گئے۔ جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ ہماری آج کی دنیا اور ہماری کل کی دنیا میں کتنا کم فاصلہ ہے۔

دائرۂ عمل کا فرق

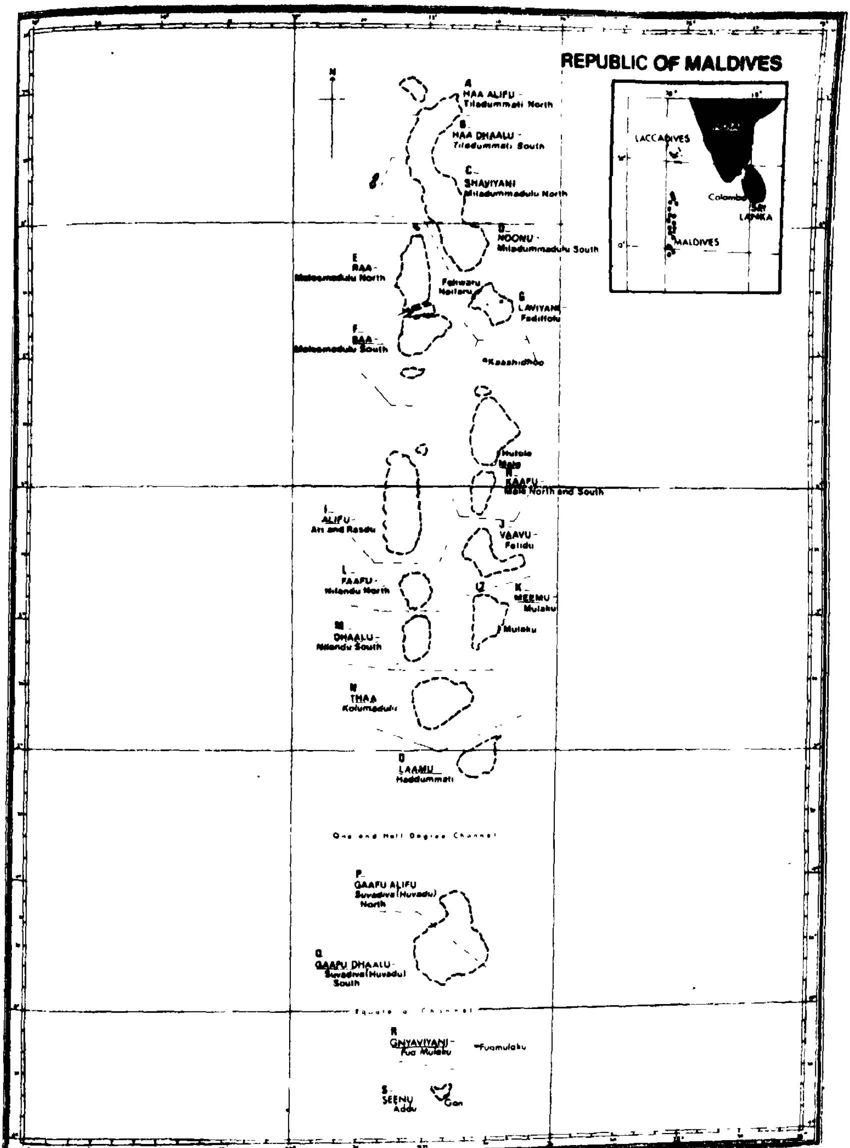
امریکہ کی ایک ایکٹرس جین سیبرگ (Jean Seberg) نے اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ امریکہ کے علاوہ یورپ میں بھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس نے قدیم انداز میں ایک "گھر" بسانے کے بجائے لاکھوں گھروں کے لئے سامان تفریح بننے کو ترجیح دیا۔ مگر اس کی موت کے بعد جب اس کی ڈائری پڑھی گئی تو اپنی ڈائری کی آخری سطروں میں اس نے لکھا تھا۔

I wish I had stayed home

کاش میں اپنے گھر میں رہی ہوتی (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۱)
کیسا عجیب تھا یہ کامیاب سفر جو بالآخر ناکامی پر ختم ہوا۔

خدا نے جس طرح اس دنیا کی مادی چیزوں کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی فطرت پر قائم رہ کر کوئی چیز اپنا صحیح وظیفہ انجام دے پاتی ہے یہی حال انسان کا بھی ہے۔ خدا نے مرد کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی طرح عورت کو بھی خاص فطرت پر پیدا کیا ہے۔ دونوں اسی وقت اپنی زندگی صحیح طور پر گذار سکتے ہیں جبکہ وہ خدا کی فطرت پر قائم رہیں۔ فطرت سے ہٹتے ہی وہ زندگی کے نقشہ میں اپنا مقام کھو دیں گے۔

عورت کی صلاحیتیں واضح طور پر مرد سے مختلف ہیں یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کا دائرہ کار اور مرد کا دائرہ کار عمومی اعتبار سے یکساں نہیں۔ مرد کا دائرہ کار اگر "باہر" ہے تو عورت کا دائرہ کار "اندر"۔ مرد اپنے دائرہ کار میں زیادہ مفید بن سکتا ہے اور عورت اپنے دائرہ کار میں۔ اگر دونوں اپنے دائرہ کار کو بدلیں تو دونوں اپنی معنویت کو کھو دیں گے۔ دونوں اپنے کو بے جگہ بنالیں گے۔



مالدیپ بحرِ ہند کے وسط میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ لمبائی میں تقریباً ۶۵۰ کیلومیٹر ہے اور چوڑائی میں تقریباً ۱۳۰ کیلومیٹر۔ اس مجمع الجزائر میں دو ہزار جزیرے ہیں جن میں تقریباً دو سو جزیرے آباد ہیں۔ ہندستان سے مالدیپ کا فاصلہ تقریباً چھ سو کیلومیٹر

ایک سفر

۸ دسمبر ۱۹۸۲ کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہم وزارت خارجہ سے بول رہے ہیں" یہ حکومت ہند کی وزارت خارجہ کے ڈپٹی سکریٹری (BSM) کا ٹیلی فون تھا۔ انہوں نے بتایا کہ مالدیپ کی وزارت تعلیم کے تحت مالے (Male) میں ایک سیمنار ہو رہا ہے جس میں انہوں نے مجھے شرکت کی دعوت دی ہے۔ سیمنار کا عنوان ہے: اسلامی دعوت جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں۔

The Call for Islam in South and Southeast Asia

انہوں نے کہا کہ اگر آپ شرکت کی منظوری دے دیں تو ہم حکومت مالدیپ کو ٹیلکس کے ذریعہ پیغام بھیج دیں تاکہ وہ آپ کے سفر کے انتظامات کرسکیں۔ میں نے شرکت منظور کرلی۔ تاہم جلد ہی بعد مجھے لیبیا کا سفر پیش آگیا اور سیٹ کا رزرویشن وقت پر نہ ہوسکا۔

میں لیبیا کے سفر سے واپس آیا تو مالدیپ کے سیمنار کی تاریخ میں صرف تین دن باقی تھے۔ ۹ جنوری کو روانہ ہوجانا میرے لئے بالکل ضروری تھا۔ معلوم ہوا کہ مالدیپ میں یہ سیاحوں کی آمد کا موسم ہے، اس لئے مدراس سے مالے (دارالسلطنت مالدیپ) جانے والے جہاز کی تمام سیٹیں بک ہوچکی ہیں۔ میرا نام ویٹنگ لسٹ میں نمبر ۴۶ پر ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ اب مالدیپ کا سفر ممکن نہ ہوسکے گا۔

میں نے اپنے آدمی کو وزارت خارجہ (نئی دہلی) کے دفتر میں بھیجا۔ ۸ جنوری کی شام کو ہمارا آدمی وزارت خارجہ کے دفتر میں اس وقت پہنچا جب کہ وہاں دفتر کے کام کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ اور ڈپٹی سکریٹری اپنی کرسی سے اٹھ چکے تھے۔ انہوں نے کھڑے کھڑے کیس کو سنا اور اس کے بعد دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اپنے اسٹینو کو بلایا اور اسی وقت ایک خط تیار کرکے ہمارے آدمی کے حوالے کیا۔ اور کہا کہ اس کو لے کر انڈین ایرلائنز کے مینجر سے ملیں۔ چنانچہ وہ خط انڈین ایرلائنز کے مینجر کو دکھایا گیا۔ اس نے فوری طور پر مدراس کے دفتر کو ٹیلکس کیا اور کہا کہ "مسٹر خان" کو اعلیٰ ترین ترجیح کی بنیاد پر مالے جانے والے جہاز میں جگہ دی جائے۔

اس کے بعد ہمارا آدمی واپس آگیا۔ چند گھنٹے کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ یہ انڈین ایرلائنز (نئی دہلی) کا ٹیلی فون تھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کی سیٹ مدراس سے کنفرم ہوگئی ہے۔ اس بس میں صرف

اتنا اضافہ کروں گا کہ یہ سب جس نے کرایا اس کا نام مسٹر آر۔ ایم اگروال تھا! اس خط کا عکس یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

ہماری پرواز ۹ جنوری کو صبح ساڑھے چھ بجے تھی۔ میں ہوائی اڈہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ خراب موسم کی وجہ سے تمام پروازیں تین گھنٹہ کے لئے موخر کر دی گئی ہیں۔ یہ نیا مسئلہ تھا۔ کیونکہ دہلی سے تین گھنٹہ دیر سے روانگی کا یہ مطلب تھا کہ مدراس سے دوسرا جہاز نہ ملے۔

اسی حیص بیص میں میں پالم پر اپنے جہاز پر سوار ہو گیا۔ مجھ سے ملی ہوئی سیٹ پر مسٹر سبرامنیم تھے جو دہلی الکٹرک سپلائی انڈرٹیکنگ (DESU) میں انجینئر ہیں۔ ان کو جب میرا قصہ معلوم ہوا تو فوراً انہوں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ وہ کئی بار جہاز کے پائلٹ سے ملے اور اس سے کہا کہ مدراس کے اسٹیشن کو پیغام بھیج کر جہاز کی پوزیشن معلوم کریں۔ پائلٹ نے بھی پوری ہمدردی ظاہر کی اور دوران پرواز اگلے اسٹیشن سے وائرلس کے ذریعہ ربط قائم کیا۔ مگر ادھر سے یہ پیغام ملا کہ "ہوائی جہاز مدراس سے روانہ ہو چکا ہے۔"

میں مدراس پہنچا تو حسب قاعدہ ہوائی کمپنی نے ہوٹل (اڈیار گیٹ ہوٹل) میں میرے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ مگر اگلے جہاز سے سیٹ کے رزرویشن کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ مسٹر سبرامنیم نے دوبارہ میرا ساتھ دیا۔ وہ ہوٹل سے مجھ کو لے کر انڈین ائرلائنز کے دفتر میں گئے۔ اور وہاں ڈیوٹی آفیسر کو پوری صورت بتائی۔ ڈیوٹی آفیسر مسٹر سوامی ناتھن تھے۔ انہوں نے نہایت دلچسپی کا اظہار کیا میری روٹ کو کولمبو سے بدل کر تریوندرم کے راستہ سے کیا۔ تریوندرم کے راستہ سے جانے والے جہاز کی بھی تمام سیٹیں بھر چکی تھیں۔ مگر انہوں نے ذمہ داروں سے اصرار کر کے مجھے اس میں سیٹ دلوائی۔ اسی کے ساتھ انہوں نے مالدیپ کی وزارت تعلیم کو ٹیلکس کے ذریعہ پیغام بھجوایا کہ میں خراب موسم کی وجہ سے مدراس میں رک گیا ہوں اور ۱۰ جنوری کو فلائٹ نمبر ۵۶۳ سے مالے پہنچوں گا۔

مدراس میں مجھے جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا وہاں دوسری چیزوں کے علاوہ بائبل (اڈیشن ۱۹۸۰) کا ایک خوبصورت نسخہ بھی موجود تھا، اس نسخہ پر لکھا ہوا تھا:

This Bible is placed by the Gideon

یہ بائبل یہاں جیڈین کی طرف سے رکھی گئی ہے۔

۱۸۹۸ میں دو مسیحی مسافر وسکن سن (امریکہ) کے ایک ہوٹل میں ملے۔ دونوں ایک دوسرے

सत्यमेव जयते

विदेश मंत्रालय, नई दिल्ली-११
MINISTRY OF EXTERNAL AFFAIRS
NEW DELHI-11

No.I(1)/162/21/82

Dated 7th January, 1983

The Commercial Manager,
Indian Airlines,
New Delhi.

Sir,

Sh. Wahiduddin Khan, President of the Islamic Call and Research Centre has been invited by the Maldivian Government to participate in a seminar on the Islamic Call in South and South East Asia to be convened in Male from 10th to 12th January, 1983.

Shri Khan will be travelling on the Delhi-Madras, Madras-Colombo, Colombo-Male sector starting from Delhi on 9th January, 1983. His ticket on the Madras-Colombo sector has not been confirmed so far.

In view of the importance of the meeting which Shri Khan has to attend, we would strongly recommend that he be allotted a seat on the Madras-Colombo sector for the date mentioned above, on a top priority basis.

Yours faithfully,

Ram Aggarwal

(R.M. AGGARWAL)
UNDER SECRETARY TO THE GOVT.OF INDIA

کے لئے اجنبی تھے۔ تاہم یہ ملاقات ان کی مستقل یکجائی کا سبب بن گئی۔ انہوں نے بعض اور مسیحیوں کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ وہ ایک تنظیم قائم کریں۔ جس کا مقصد ہوٹلوں میں بائبل کی فراہمی ہو۔ یہ نام بائبل (Book of Judges 6-7) سے لیا گیا ہے۔ آج یہ تنظیم دنیا بھر میں ۱۱۰ سے زیادہ ملکوں میں قائم ہو چکی ہے۔ موجودہ بائبل کے آغاز میں جیڈین کا تعارف کرتے ہوئے یہ دلچسپ جملہ درج ہے:

The Lord has opened doors for the placement of His word among many strategic groups of the population and in places through which large and important streams of national life pass from day to day.

خدا نے یہ دروازے کھول دئے ہیں کہ اس کا کلام آبادی کے بہت سے اہم حصوں کے درمیان رکھا جا سکے۔ اور اس کا کلام ایسے مقامات پر رکھا جائے جس کے راستے سے قومی زندگی کے بہاؤ کا بڑا اور اہم حصہ روزانہ گذرتا ہے۔

اس سے اندازہ کیجئے کہ موجودہ زمانہ میں تبلیغ کے کون سے نئے نئے راستے کھل گئے ہیں۔ اور فائدہ اٹھانے والے ان سے کس طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شروع کے ایک صفحہ پر ایک مضمون ہے۔ جس کا عنوان ہے ضرورت کے وقت مدد لو' (Help in time of need) اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ آپ اپنے مشکل لمحات میں کس طرح بائبل سے اپنے لئے سہارا لے سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چند عنوانات یہ ہیں:

Comfort in time of loneliness	-	Comfort in time of sorrow
Relief in time of suffering	-	Guidance in time of decision
Protection in time of danger	-	Courage in time of fear
Peace in time of turmoil	-	Rest in time of weariness

اس میں بتایا گیا ہے کہ بائبل کا ترجمہ اب تک دنیا کی ۱۱۰۰ سے زیادہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ بائبل کی اہم ترین تعلیم وہ ہے جو (John, 3:16) میں ان الفاظ میں ہے: کیونکہ خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو، بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے۔

مدراس کے ہوٹل میں میں نے اپنے کمرہ سے کسی بات کے لئے استقبالیہ میں ٹیلی فون کیا۔ میں نے ہندستانی میں کہا تو دوسری طرف سے آواز آئی "میں نہیں سمجھا"۔ میں نے دوبارہ انگریزی میں کہا تو وہ فوراً سمجھ گیا۔ ہندستان میں اگر آپ اعلیٰ معیار کے ہوٹل میں ٹھہریں یا ہوائی جہاز میں

سفر کریں تو آپ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ آپ انگریزی میں بولیں گے ۔ اس ملک میں انگریزی زبان اب بھی اونچی حیثیت کی نشانی بنی ہوئی ہے ۔ اس صورت حال کی وجہ سے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک میں نہیں بلکہ غیر ملک میں ہیں ۔ اگرچہ اکثر انگریزی بولنے والے غلط انگریزی بولتے ہیں ۔ مگر اپنی پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں کہ ملکی زبان جانتے ہوئے انگریزی زبان میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ صورت حال صرف اس وقت ختم ہو سکتی ہے جب کہ ملکی زبان علمی اور ادبی اعتبار سے انگریزی زبان جیسا مقام حاصل کرلے ۔ محض قومی اپیلوں سے شاید اس کا ختم ہونا ممکن نہیں ۔

۱۰ جنوری کی دوپہر کو ہمارا ہوائی جہاز مالدیپ کے اوپر اڑ رہا تھا ۔ دو ہزار چھوٹے چھوٹے جزیروں کا یہ ملک ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی مالا ہے جس کے ہرے ہرے دانے ٹوٹ کر سمندر میں بکھر گئے ہوں ۔ ہوائی اڈہ خود بھی ایک چھوٹے جزیرہ پر ہے ۔ یہاں صرف ہوائی اڈہ ہے ۔ یہاں سے اسٹیمر پر ہم مالے نامی جزیرہ پر گئے ۔ جو مالدیپ کا دارالسلطنت ہے ۔ مالے ایک میل لمبا ڈیڑھ میل چوڑا جزیرہ ہے ۔ دو ہزار میں سے دو سو جزیرے آباد ہیں ۔ کل آبادی تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار ہے ۔ یہاں کی آبادی میں صدفی صد مسلمان ہیں ۔ یہاں کوئی بھی غیر مسلم شہری نہیں ۔ مالے میں میرا قیام سوسن گی (کمرہ نمبر ۱۰) میں تھا ۔

سیمنار کی کارروائی ۱۰ ۔ ۱۱ ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۸۳ کو ہوئی ۔ جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے متعلق چار مقالے پیش ہوئے ۔ یہ مقالے مالدیپ کی وزارت تعلیم کی سکریٹریٹ نے تیار کئے تھے ۔ ہر مقالہ پہلے پڑھا جاتا اور اس کے بعد شرکا اس پر اظہار خیال کرتے تھے ۔

یہ اظہار عربی یا انگریزی زبان میں کیا گیا ۔ میں نے ان مقالوں پر جو اظہار خیال کیا وہ انگریزی زبان میں تھا جو سیمنار کی فائنل رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے ۔

۱۱ جنوری کی شام کا کھانا دوسرے جزیرہ پر رکھا گیا ۔ وہاں ہم لوگ اسٹیمر پر گئے ۔ یہ جزیرہ صرف سیاحوں کے لئے ہے ۔ یہاں سیاحوں کے نقطۂ نظر سے عمارتیں اور ہوٹل تعمیر کئے گئے ہیں ۔ رات کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سمندر کے بیچ ایک سبزہ زار تختہ پر بیٹھے ہوتے ہیں ۔
سیمنار میں چار مقالے پڑھے گئے اور اس کے بعد شرکا رنے ان پر اظہار خیال کیا ۔

مقالوں کے عنوانات حسب ذیل تھے:

۱- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی اشاعت۔
۲- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں مخالف اسلام سرگرمیاں۔
۳- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں مسلم اقلیتوں کا مسئلہ۔
۴- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں آئندہ اشاعت اسلام کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

سیمنار میں مذکورہ علاقہ میں واقع تمام ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ جن ممالک کے نمائندے شریک ہوئے ان کے نام یہ ہیں:

مالدیپ، ہندستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، پاکستان، ملیشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا فلپائن، برما، سنگاپور، ماریشس۔

مالدیپ مجمع الجزائر ہے۔ اور بحر ہند کے وسط میں واقع ہے۔ تقریباً ساڑھے سات سو کیلومیٹر لمبائی اور تقریباً سوا سو کیلومیٹر کی چوڑائی میں دو ہزار جزیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ جزیرے اتنے چھوٹے ہیں کہ انکا مجموعی زمینی رقبہ صرف تین سو مربع کیلومیٹر ہوتا ہے۔ ان جزائر میں تقریباً دو سو جزیرے آباد ہیں۔ مالدیپ کی آبادی صرف ڈیڑھ لاکھ ہے۔ تمام کے تمام باشندے مسلمان ہیں۔ یہاں کے قانون کے مطابق کسی غیر مسلم کو مالدیپ کی شہریت نہیں دی جاسکتی۔

پہلے مالدیپ کے باشندے بدھسٹ تھے۔ بارہویں صدی عیسوی میں یہاں کے باشندے ایک ساتھ مسلمان ہوگئے۔ انہوں نے عرب تاجروں کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۱۵۳ء میں مراکش سے ایک عرب تاجر یہاں پہنچا جس کا نام ابو البرکات یوسف علی بربری تھا۔ اس نے تبلیغ کی۔ اس کی تبلیغ سے مالدیپ کے تمام باشندے مسلمان ہوگئے۔

مالدیپ کی قدیم تاریخ معلوم نہیں۔ یہاں کی ابتدائی تاریخ کا ذریعہ وہ عرب مورخین یا سیاح ہیں جو مالدیپ آئے۔ المسعودی ۹۴۷ء میں مالدیپ پہنچا۔ البیرونی نے ۱۰۳۰ء میں مالدیپ کی سیاحت کی۔ الادریسی بارہویں صدی کے آغاز میں مالدیپ آیا۔ ابن بطوطہ کی مالدیپ میں آمد ۱۳۴۴ء میں ہوئی۔ فرانسیسی ملاح فرانکوئی لیول (Francois Pyrard de Lavel) ۱۶۰۱ء میں مالدیپ پہنچا۔ ان لوگوں نے اپنی سیاحتی ڈائری میں مالدیپ کے کچھ احوال لکھے ہیں۔ حسن تاج الدین پہلے مالدیپی ہیں جنہوں نے ۱۷۲۶ء میں مالدیپ کے حالات قلم بند کئے۔

مالدیپ میں ۱۱۴۱ء سے لے کر ۱۵۵۸ء تک سلاطین کی حکومت تھی۔ اس کے بعد پرتگالیوں

نے مالدیپ پر حملہ کیا۔ ۱۵۵۸ء میں مالدیپ پر پرتگالیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد محمد خطیب کی رہنمائی میں آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی۔ جلد ہی پرتگالیوں کو واپس جانا پڑا۔ اور پندرہ سال بعد ۱۵۸۵ میں سلطان کا راج دوبارہ قائم ہوگیا۔

۱۸۸۷ء میں مالدیپ برطانی راج کے ماتحت آگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پرامن طور پر مالدیپ کی آزادی کی کوشش شروع ہوئی۔ حکومت برطانیہ اور حکومت مالدیپ کے درمیان تقریباً دس سال کی گفتگو کے بعد جولائی ۱۹۶۵ میں ایک معاہدہ پر دونوں حکومتوں نے دستخط کئے۔ اس کے مطابق مالدیپ کو مکمل آزادی حاصل ہوگئی۔ اسی سال سے مالدیپ اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔

مالدیپ میں صرف ہائر سکنڈری تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہاں ابھی تک کوئی کالج نہیں۔ تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے اسکولوں کے ماسٹر اکثر بیرونی لوگ ہیں۔ یہاں کی تجارت زیادہ تر مچھلی اور سیاحت ہے۔ تاہم کوریا اور جاپان کی کشتیاں یہاں کے سمندروں میں آتی رہتی ہیں۔ اور مچھلیاں پکڑ کر لے جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے مچھلی کی آمدنی پوری طرح مالدیپ کے حصہ میں نہیں آتی۔ سیاح کافی آتے ہیں وہ بلاشبہ اپنے ساتھ دولت لاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بہت سے مسائل بھی لا رہے ہیں۔ جن کا فی الحال کوئی حل مالدیپ کے پاس نہیں۔

۱۳ جنوری کا دن یہاں کے خاص خاص مقامات کے لئے مقرر تھا۔ صبح کو ہم لوگ جزیرہ مالے سے بنیڈوز (Bandos Resort) کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ سفر برطانیہ کی بنی ہوئی ایک کشتی پر ہوا۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔ Presented by Britain

دو گھنٹہ کا یہ سفر بڑا عجیب و غریب تھا۔ راستہ میں ہم دو اور جزیروں پر اترتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچے۔ اس سفر کے دوران بار بار مختلف جزیرے سامنے آتے رہے۔ دو ہزار کی تعداد میں پھیلے ہوئے جزیرے ناریل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدرت نے سمندر میں جگہ جگہ ہرے بھرے گلدستے پھیلا رکھے ہوں۔

یہ سفر بڑا عجیب تھا۔ ہمارے چاروں طرف بحر ہند کا پانی موجیں مار رہا تھا۔ اس میں ہمارا اسٹیمر موجوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف نیلا آسمان، اس کے اوپر بادل، سمندر میں جگہ جگہ ناریل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے جزیرے، ایسا محسوس ہوا جیسے ہم حسن اور معنویت کی ایک ابدی کائنات میں رواں دواں ہیں۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا:

"کیسی عجیب بات ہوگی کہ یہاں ایسی حیرت ناک دنیا ہو اور اس کا کوئی خدا نہ ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایک موجود واقعہ کو ماننا ہے نہ کہ کسی غیر موجود چیز کو ماننا۔ خدا تو اپنی صفات کے ساتھ موجود ہی ہے۔ اب بات صرف اتنی ہے کہ اس کو اس کی ذات کے ساتھ بھی مان لیا جائے۔

بینڈوز کا جزیرہ خاص طور پر سیاحوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ وہاں کوئی دوسری آبادی نہیں ہے۔ چھوٹے سے جزیرے کے چاروں طرف سمندر لہریں مار رہا ہے۔ اس خوبصورت ماحول میں ہم نے چند گھنٹے گذارے۔ وہیں کھانا کھایا۔ اور اس کے بعد شام کو ملے واپس آگئے۔

مالے پہنچے تو معلوم ہوا کہ ٹریولنگ ایجنٹ نے کہہ دیا ہے کہ ۵ اجنوری کے جہاز میں تمام سیٹیں بک ہو چکی ہیں۔ اس لئے اس دن سیٹ نہیں مل سکتی۔ یہ میرے لئے بہت تشویش ناک خبر تھی۔ کیونکہ دہلی جلد پہنچنے ہی کے لئے میں نے لنکا کا سفر ملتوی کر دیا تھا۔ یہاں کے سیمنار میں جناب محمد حنیفہ (ٹرانسپورٹ منسٹر، سری لنکا) بھی آئے تھے۔ انہوں نے دعوت دی کہ سری لنکا میں کچھ وقت قیام کریں۔ اس کے بعد وہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہوں۔ مگر میں نے وقت کی کمی کے سبب محمد حنیفہ صاحب سے معذرت کر دی تھی۔

اب میں نے جناب برج نارائن صاحب (سفیر ہند مقیم مالدیپ) کو ٹیلی فون کیا۔ اور ان کے سامنے مسئلہ رکھا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے انڈین ایرلائنز کے مینیجر (مسٹر جوشی) سے ٹیلی فون پر بات کی اور چند منٹ کے بعد مجھے ٹیلی فون پر خبر دی کہ آپ کی سیٹ کنفرم ہو چکی ہے۔ آپ اپنے پروگرام کے مطابق سفر کریں۔ جناب برج نرائن صاحب نے مزید بتایا کہ انہوں نے ٹیلکس کے ذریعہ دہلی میں میرے آفس کو اطلاع بھیج دی ہے کہ میں ۵ اجنوری کی شام کو دہلی پہنچ رہا ہوں۔

مالدیپ میں صدارتی نظام ہے۔ ۱۲ جنوری کی شام کو یہاں کے صدر جناب مامون عبدالقیوم سے ان کی رہائشی قیام گاہ میں ملاقات ہوئی۔ وہ جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ چنانچہ بے تکلف عربی بولتے ہیں مالدیپ میں چونکہ اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ اس لئے یہاں کے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جاتے ہیں۔ ان میں بہت سے جامعہ ازہر (مصر) کے تعلیم یافتہ ہیں۔ وزیروں اور افسروں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے اور عربی اچھی جانتے ہیں۔

وزیروں اور افسروں میں کئی لوگ ایسے ملے جو میری کتاب الاسلام یتحدی پڑھے ہوئے تھے ان لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ میری مزید کتابیں بھی عربی اور انگریزی میں انہیں فراہم کی جائیں۔

یہاں ملیشیا کے ایک صاحب ملے، انہوں نے بتایا کہ الاسلام یتحدی کا ترجمہ ملائی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

مالدیپ میں اردو جاننے والے بھی ہیں۔ چنانچہ کئی ایسے لوگ ملے جنہوں نے بتایا کہ وہ الرسالہ منگاتے ہیں، اور میری اردو کتابیں پڑھے ہوئے ہیں۔

ہندستانی سفارت خانہ کے سکریٹری مسٹر نائر میرے کمرہ میں آئے اور معلوم کیا کہ کیا مجھ کو کوئی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے لائق جو بھی خدمت ہو ہم اس کو کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس وقت مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مالدیپ کے نوجوان پوسٹ ماسٹر (مالک عبد الرزاق صاحب) تقریباً دو سال پہلے دہلی آئے تھے اور وہاں میرے دفتر میں مجھ سے ملے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میں خود تو اردو نہیں جانتا مگر میرے دادا اچھی اردو جانتے ہیں۔ اور وہ آپ کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں یہاں آیا تو مجھے ان سے ملنے کی خواہش تھی۔ مگر میں دونوں صاحبان کا نام بھول گیا۔ کچھ لوگوں سے ذکر کیا تو انہوں نے دریافت کرکے معلوم کیا اور مجھ سے ملاقات کا انتظام کیا۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے۔

Mr Abdul Wahab, Dhaharage, Machangoli, Male, Maldives

عبد الوہاب صاحب مطالعہ کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ اور خاص طور پر دینی کتابیں بہت پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کو اولاً میری کتاب (علم جدید کا چیلنج) ملی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے بقیہ کتابیں حاصل کیں۔

مالدیپ میں چوری، قتل، رشوت، آپس کے لڑائی جھگڑے وغیرہ بالکل نہیں ہیں۔ حتی کہ مالے کے سوا کسی اور جزیرہ پر کوئی پولس پوسٹ بھی نہیں۔ یہاں کے باشندے عام طور پر بالکل پرامن طریقہ پر رہتے ہیں۔ البتہ سیاحوں کی آمد سے کچھ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً لڑکیوں کی آزادی، مہنگائی، معیار زندگی میں تبدیلی، تنخواہوں میں اضافہ وغیرہ۔

مالدیپ کا دار السلطنت جس جزیرہ پر قائم ہے اس کا نام مالے ہے۔ یہ صرف دو کیلومیٹر مربع رقبہ میں ہے۔ وسیع سمندر کے درمیان اس قسم کے چھوٹے چھوٹے جزیروں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر یہاں جوار بھاٹا آئے تو ان جزیروں پر انسانی آبادی کا کوئی وجود نہ رہے۔ مگر قدرت کا یہ عجیب قانون ہے کہ اس قسم کے چھوٹے جزیروں پر جوار بھاٹا نہیں آتا۔ اگر آپ جزیرہ سے ایک

کشتی یا اسٹیمر پر سوار ہو کر نکلیں تو جزیرے کے کنارے موجیں ہلکی ہوں گی۔ مگر آپ جب دور سمندر کے درمیان پہنچیں گے تو پانی کی لہریں کافی تیز دکھائی دیں گی۔

مالدیپ کا ہندستانی سفارت خانہ ہر مرحلہ میں بے حد معاون رہا۔ جناب سفیر صاحب اور مسٹر نائر (اتاشی) خود میرے یہاں آئے اور کہا کہ آپ کو جو ضرورت ہو اس کے لئے ہم حاضر ہیں۔

مالدیپ کے سیمنار میں مختلف ملکوں کے لوگوں نے شرکت کی۔ ہندستان سے صرف میں نے نمائندگی کی۔ سیمنار میں تین زبانیں رائج تھیں۔ انگریزی، عربی، اور مالدیپی۔ میں نے زیادہ تر انگریزی میں اپنے خیالات ظاہر کئے۔ طریقہ یہ تھا کہ منتظمین سیمنار کی طرف سے اولاً کوئی مقالہ پیش کیا جاتا اور اس کے بعد اس پر تبادلۂ خیال ہوتا۔

۱۰ جنوری کو جناب موسیٰ فتحی قاسم (چیف جسٹس، مالدیپ ہائی کورٹ) نے مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ اصلاً عربی زبان میں تھا۔ اس کا عنوان تھا۔

الدعوة الاسلامية وكيف دخل الاسلام جنوب وجنوب شرق آسيا

مقالہ کے بعد مختلف لوگوں نے موضوع سے متعلق اپنے اپنے تاثرات ظاہر کئے۔ میں نے کہا کہ زیر بحث موضوع کے بہت سے پہلو ہیں۔ تاہم میرے نزدیک ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اسلامی علاقہ میں اسلامی دعوت کی تاریخ شکست میں فتح (Victory in Defeat) کا راز بتاتی ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس علاقہ میں اسلام کے حاملین کی طرف سے کبھی کوئی فوج کشی نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود یہ علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ کیسے ہوا۔ یہ تاجروں اور صوفیوں کی تبلیغ کے ذریعہ۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۳ کو میں دہلی واپس آگیا۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi 110 006

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے۔ یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

عقلمند وہ ہے جو دوسروں کی غلطیوں کو بھول جائے۔ اور اپنی غلطیوں کو ہمیشہ یاد رکھے

جون ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۹

31/5/83

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جون ۱۹۸۳
شمارہ ۷۹

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

جدّوجہد حیات کا سبق

رمضان کے مہینہ کو حدیث میں صبر کا مہینہ (شہر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر واستقامت بلاشبہہ زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہی تمام فتوحات اور کامیابیوں کا راز ہے۔ حقیقی روزہ صبر کی صفت پیدا کرتا ہے اور صبر ہی وہ چیز ہے جو تمام اعلیٰ کامیابیوں کا دروازہ ہے۔

رمضان کا مہینہ آدمی کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے لڑنے کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جب کہ مومن شیطانی طاقتوں کو زیر کرکے ان کے اوپر قابو پاتا ہے اور دوبارہ خدا کی بندگی کا عزم لے کر نئے سال میں داخل ہوتا ہے۔

تاریخ حیرت انگیز طور پر روزہ کی اس خصوصیت کی تصدیق کرتی ہے۔ چنانچہ روحانی مقابلہ کا یہ مہینہ اسلام کی تاریخ میں فوجی مقابلہ کا مہینہ بھی رہا ہے۔ اسلام اور غیر اسلام کے کئی بڑے بڑے معرکے اسی مبارک مہینہ میں پیش آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند یہ ہیں:

غزوۂ بدر (رمضان ۲ ھ) جس نے پیغمبرؐ اور آپ کے ساتھیوں کو قریش کے اوپر فیصلہ کن فتح دی۔

فتح مکہ (رمضان ۸ ھ) جس نے پورے عرب پر اسلام کو غالب کر دیا۔

غزوۂ تبوک (رمضان ۹ ھ) جس نے رومیوں کے اوپر اہل اسلام کی دھاک قائم کر دی۔ غزوۂ تبوک رجب میں شروع ہو کر رمضان میں ختم ہوا۔

معرکۂ اسپین (رمضان ۹۱ ھ) جب کہ طارق بن زیاد نے اسپین میں کامیاب پیش قدمی کی۔

معرکۂ عین جالوت (رمضان ۶۵۸ ھ) جس نے تاتاریوں کو شکست دے کر مسلم دنیا میں ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔

معرکۂ سوئز (رمضان ۱۳۹۳ھ) جب کہ مصری فوجوں نے اسرائیلی فوجوں کو شکست دے کر نہر سوئز پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

اس قسم کے تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ روزہ اور جدوجہد حیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ روزہ کی بھوک پیاس آدمی کو کمزور نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس کو اس قابل بناتی ہے کہ زندگی کے معرکہ میں زیادہ قوت کے ساتھ حصہ لے سکے۔

خبر غلط تھی

نیل آرم اسٹرانگ مشہور امریکی خلاباز ہیں۔ وہ تاریخ کے پہلے انسان ہیں جنہوں نے ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کو چاند پر قدم رکھا۔ وہ اس سے پہلے امریکہ کے خلائی ادارہ ناسا (NASA) سے متعلق تھے۔ اب اس سے الگ ہو کر وہ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

پچھلے دنوں ملیشیا کے اخبار اسٹار (۱۰ جنوری ۱۹۸۳) اور سری لنکا کے ڈیلی نیوز پیپر (۲۹ جنوری ۱۹۸۳) میں ایک خبر چھپی جو بہت جلد دوسرے مسلم اخبارات میں نقل ہو کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ یہاں ہم اسٹار کی خبر اور اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

The world-famous astronaut Neil Armstrong was the first man to set foot on the moon. He has since become a Muslim and the reason given was that when he first stepped on the moon he heard a sound which was very clear to him and his companions. At that time, he thought his ears were playing tricks on him as he was rather excited and over-awed by his first experience on the moon. When he was sent on a lecture tour to the various contries, one of the places he visited was Cairo, Egypt, and he heard the same sound again. So he asked the Egyptian companion nearest to him what the sound was. He was told that it was Azan, the call to prayer and the glorification of God. He was astounded for that was the same sound and the same words to the best of his memory that he heard on the moon. It was then that he decided to learn something about the religion and finally embraced Islam. As a result of that, he lost his coveted job. But, according to him, he had found God, and nothing else mattered.

دنیا کے مشہور خلاباز آرم اسٹرانگ پہلے شخص ہیں جنہوں نے چاند پر قدم رکھا۔ وہ اس کے بعد سے مسلمان ہو گئے ہیں اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جب پہلی بار انہوں نے چاند پر قدم رکھا تو انہوں نے وہاں ایک آواز سنی جو ان کے لئے اور ان کے ساتھیوں کے لئے بہت صاف تھی۔ اس وقت ان کو خیال آیا کہ ان کے کانوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اس وقت وہ چاند کو پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ اور ان پر ایک استعجاب کی کیفیت طاری تھی۔ بعد میں وہ مختلف ملکوں میں لیکچر دینے کے لئے گئے۔ اس دوران وہ قاہرہ (مصر) بھی گئے۔ وہاں انہوں نے وہی آواز دوبارہ سنی جو انہوں نے چاند پر سنی تھی۔ انہوں نے اپنے قریب کے مصری ساتھی سے پوچھا کہ یہ آواز کیا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ اذان ہے جو عبادت کی پکار ہے اور اس میں خدا کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ آرم اسٹرانگ کو بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ ان کے حافظہ کے مطابق وہی آواز اور وہی الفاظ تھے جو انہوں نے چاند پر سنے تھے۔ اس وقت انہوں نے اسلام کے متعلق جاننے کا

NEIL A. ARMSTRONG
31 N. BROADWAY
LEBANON, OHIO 45036
TELEPHONE 513-932-6833

May 5, 1983

Mr. Wahuddudin Khan
President, Islamic Centre, Delhi
Office Al-Risala Monthly
Jamiat Building
Qasim Jan Street
Delhi - 110006
India

Dear Mr. Khan:

Thank you for the courtesy of your letter.

The reports of my conversion to Islam, of hearing the voice of Adzan on the moon, and later in Cairo (I have never been in Egypt) are all untrue.

Several magazines and newspapers in Malaysia, Indonesia and elsewhere have published these reports without verification. I apologize for any inconvenience that this incompetent jouralism may have caused you.

Sincerely,

Neil A. Armstrong

NAA:vw

فیصلہ کیا اور بالآخر اسلام قبول کرلیا۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی قابل رشک ملازمت کھودی۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ میں نے خدا کو پالیا ہے۔ اور اب کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

یہ خبر دوسرے اخبارات میں نقل ہوئی تو اس میں مزید اضافے بھی کردئے گئے۔ مثلاً یہ کہ آرم اسٹرانگ نے چاند کی آواز کو ٹیپ ریکارڈ کرلیا تھا اور زمین پر آکر اذان کی آواز کو اس سے ملایا۔ وغیرہ۔

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے ایک خط مسٹر آرم اسٹرانگ کو لکھا تھا۔ انہوں نے اس خبر کی تردید کی ہے اور اس کو بے بنیاد بتایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ذاتی دستخط سے جو جواب موصول ہوا ہے اس کا عکس علٰحدہ صفحہ پر دیا جارہا ہے۔ آرم اسٹرانگ اپنے جواب میں لکھتے ہیں:

آپ کے خط کا شکریہ۔ میرے اسلام قبول کرنے کی خبریں، اذان کی آواز کو چاند پر اور اس کے بعد قاہرہ میں سننا، سب خلاف واقعہ ہیں۔ میں کبھی مصر نہیں گیا۔ ملیشیا، انڈونیشیا اور دوسرے مقامات کے کچھ رسالوں اور اخبارات نے یہ خبریں بغیر تصدیق کئے ہوئے چھاپی ہیں۔ اس نااہل صحافت نے آپ کو جو بھی زحمت دی ہو اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں ——

خلوص کے ساتھ، آرم اسٹرانگ

خبر کے مطابق اس واقعہ میں حکومت امریکہ بھی ملوث تھی۔ کیونکہ خبر میں بتایا گیا تھا کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مسٹر آرم اسٹرانگ کی سرکاری ملازمت ختم کردی گئی ہے۔ اس بنا پر خود حکومت امریکہ نے بھی اس کی تردید کا اہتمام کیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے امریکن سینٹر میں ایک خصوصی ٹیلی پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں اخبارات کے نمائندوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ٹیلی فون کے ذریعہ براہ راست آرم اسٹرانگ سے بات کریں۔ اس ٹیلی پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے امریکی خلاباز نے اپنے قبول اسلام کی تردید کی (ہندستان ٹائمس ۱۳ مئی ۱۹۸۳) مزید انہوں نے کہا کہ اسلام کی تعلیمات کبھی ان کے سامنے نہیں آئیں اور نہ انہوں نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے:

He had never been exposed to Islamic teachings nor had he read the Quran.

کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے آرم اسٹرانگ اور ان جیسے دوسرے بندگان خدا کے سلسلہ میں اپنی تبلیغی ذمہ داریوں کو تو پورا نہیں کیا۔ البتہ فرضی کہانیاں بنا کر خوش ہورہے ہیں کہ چاند سے لیکر امریکی خلاباز تک سب کو ان کے دین اعظم نے فتح کر رکھا ہے۔

ہمدردانِ مرکز کی خدمت میں

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اسلامی مرکز کی ابتدا نومبر ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ ۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا۔ اور مکتبہ الرسالہ قائم ہوا۔ ان کا خاص مقصد اسلامی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنا تھا۔ بفضلہ تعالیٰ یہ کام اردو زبان میں کامیاب طور پر جاری ہے۔ فکری طور پر اسلامی مرکز کا فکر سب سے زیادہ غالب فکر بنتا جارہا ہے۔ یہ مشن اب ملکی حدود سے گزر کر بین اقوامی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔

اب یہ طے کیا گیا ہے کہ اسلامی مرکز کے منصوبہ کے تحت مزید شعبوں کو بھی باقاعدہ طور پر قائم کیا جائے۔ مثلاً دارالتصنیف، دارالترجمہ، جدید طرز کی اسلامی درس گاہ، داعیوں کی تربیت کا کورس، مختلف زبانوں میں پریس، مکمل اسلامی لائبریری۔ تربیتی اور تبلیغی ادارہ، الرسالہ کا انگریزی اور عربی اڈیشن، مکتبہ الرسالہ کی کتابوں کی دوسری عالمی زبانوں میں اشاعت وطباعت کا انتظام، وغیرہ

اس جامع منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے کثیر وسائل کی ضرورت ہے۔ وسیع عمارت، کارکنوں کی ایک ٹیم اور دوسرے ضروری وسائل کے بغیر یہ کام نہیں کیا جاسکتا۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے ہم کو آپ کے خصوصی مالی تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

ہماری آپ سے اپیل ہے کہ آپ خود بھی اس مالی تعاون میں حصہ لیں اور اپنے حلقۂ تعارف میں دوسروں کو بھی اس اہم ترین دینی کام میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔

واضح ہو کہ اسلامی مرکز میں ہر نوعیت کے مختلف شعبے ہیں۔ اوران کے لئے عام عطیات وتعاون کے علاوہ زکوٰۃ وصدقات کی مدکی رقمیں بھی بھیجی جاسکتی ہیں۔ رقم بھیجتے ہوئے براہ کرم اس کی مد کی صراحت فرمائیں۔

اسلامی مرکز کا مقصد دور جدید میں اسلام کا احیاء اور ملت اسلامی کی تعمیر ہے۔ بلاشبہ یہ وقت کا اہم ترین کام ہے۔ ہم کو پوری امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہمارے ساتھ مالی تعاون کریں گے اور اپنے بس بھر اس میں پوری شرکت فرمائیں گے۔

وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز

دفتر الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

ہار مان لینا

امریکہ کے ایک شخص نے ۱۸۳۱ء میں تجارت کی۔ اس میں وہ ناکام ہوگیا۔ ۱۸۳۲ میں اس نے ملکی سیاست میں حصہ لیا مگر وہاں بھی اس نے شکست کھائی۔ ۱۸۳۴ میں اس نے دوبارہ تجارت کی۔ اس بار بھی وہ اپنی تجارت کو چلانے میں ناکام رہا۔

۱۸۴۱ میں اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ ۱۸۴۳ میں وہ دوبارہ سیاست میں داخل ہوا۔ اس کو امید تھی کہ اس بار اس کی پارٹی اس کو کانگریس کی ممبری کے لئے نامزد کردے گی۔ مگر آخر وقت میں اس کی امید پوری نہ ہوسکی۔ اس کا نام پارٹی کے امیدواروں کی فہرست میں نہیں آیا۔ ۱۸۵۵ میں اس کو پہلی بار موقع ملا کہ وہ سینٹ کے لئے کھڑا ہو۔ مگر وہ الکشن میں ہار گیا۔ ۱۸۵۸ میں وہ دوبارہ سینٹ کے الکشن میں کھڑا ہوا اور دوبارہ شکست کھائی۔

یہ بار بار ناکام ہونے والا شخص ابراہام لنکن (۶۵–۱۸۰۹) تھا جو ۱۸۶۰ میں امریکہ کا صدر منتخب ہوا۔ اس نے امریکہ کی تعمیر میں اتنا بڑا کام کیا کہ آج وہ نئے امریکہ کا معمار سمجھا جاتا ہے۔

ابراہام لنکن کو امریکہ کی قومی اور سیاسی تاریخ میں اتنا معزز نام کیسے ملا اور وہ اس اونچے مقام تک کس طرح پہنچا، ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ ——— وہ جانتا تھا کہ شکست کو کس طرح تسلیم کیا جاتے:

He knew how to accept defeat

حقیقت پسندی زندگی کا سب سے بڑا راز ہے اور ہار ماننا حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین قسم۔ ہار ماننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس حقیقت واقعہ کا اعتراف کرلیں کہ آپ دوسروں سے آگے نہیں ہیں بلکہ دوسروں سے پیچھے ہیں۔ بالفاظ دیگر، آپ جہاں فی الواقع ہیں وہیں نظری طور پر اپنے آپ کو کھڑا مان لیں۔ ہار ماننے کے بعد آدمی فوراً اس حیثیت میں ہوجاتا ہے کہ وہ اپنا سفر شروع کرسکے۔ کیونکہ سفر ہمیشہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں آپ فی الواقع ہیں نہ کہ وہاں سے جہاں ابھی آپ پہنچے ہی نہیں۔

زکوٰۃ کے بارے میں

قرآن میں زکوٰۃ کی آٹھ مدوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے ایک مد فی سبیل اللہ (التوبۃ) ہے۔ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ قرآن کا لفظ اگرچہ عام (اللہ کے راستے میں) ہے۔ تاہم جمہور فقہائے اس مد کو جنگ کے لئے خاص کیا ہے۔ ان کا متفقہ مسلک یہ ہے کہ زکوٰۃ کی یہ مد ان افراد کے لئے ہے جو ذاتی طور پر بطور خود کسی اسلامی جنگ میں حصہ لیں۔ اور حکومت کی طرف سے ان کی تنخواہ مقرر نہ ہو۔ (جمہور العلماء علی ان المراد بہ ھنا الغزو۔ وان سہم (سبیل اللہ) یعطی للمتطوعین من الغزاۃ الذین لیس لہم مرتب من الدولۃ، فقہ السنۃ، المجلد الاوّل صفحہ ۳۹۳)

اگر مسئلہ کی اس صورت کو تسلیم کرلیا جائے تو گویا فی سبیل اللہ کی ہدایت اب عملاً منسوخ ہوچکی ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا طرز پر جنگ میں شریک ہونا صرف قدیم زمانہ میں ممکن تھا۔ اب جدید حالات میں اس قسم کی شرکت کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانہ کی جنگ اتنی زیادہ پیچیدہ اور ٹکنکل ہوتی ہے کہ صرف باقاعدہ طور پر تربیت یافتہ لوگ ہی اس میں حقیقی حصہ لے سکتے ہیں۔ غیر تربیت یافتہ لوگوں کو جنگ میں حصہ لینے کا موقع دینا موجودہ زمانہ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی شکست کا انتظام کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر، اب صرف حکومت کے مشاہرہ یاب افراد ہی جنگ میں حصہ لے سکتے ہیں۔ دراصل فی سبیل اللہ ایک عام لفظ ہے۔ اس میں وہ تمام کام شامل ہیں جو اللہ کے راستے میں کئے جائیں۔ خاص طور پر اس سے وہ کام مراد ہے جس کو قرآن میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔ اسلام میں اصل چیز "حرب" نہیں بلکہ اصل چیز "دعوت" ہے۔ اسلامی عمل اصلاً دعوت سے شروع ہوتا ہے اور حرب صرف اس وقت پیش آتی ہے جب کہ فریق ثانی کی طرف سے اس کا آغاز کرکے داعیان اسلام کو دفاعی مقابلہ کے لئے مجبور کردیا گیا ہو:

ومن اھم ماینفق فی سبیل اللہ فی زماننا ھذا اعداد الدعاۃ الی الاسلام وارسالھم الی بلاد الکفار من قبل جمعیات منظمۃ تمدھم بالمال الکافی کما یفعلہ الکفار فی نشر دینھم۔
رشید رضا، تفسیر المنار

فی سبیل اللہ میں خرچ کی سب سے اہم مد موجودہ زمانہ میں یہ ہے: اسلام کے داعی تیار کرنا اور اسلامی تنظیموں کی طرف سے ان کو غیر مسلمین کے ملکوں میں بھیجنا جو کافی مال سے ان داعیوں کی مدد کریں۔ جس طرح دوسرے مذاہب والے اپنے دین کو پھیلانے کے لئے کرتے ہیں۔

پاگل پن

ایک لطیفہ ہے کہ کسی وکیل صاحب نے قانون کی پریکٹس میں کافی پیسہ کمایا تھا۔ جب ان کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے وصیت نامہ لکھوایا۔ اپنی وصیت میں انہوں نے کہا تھا کہ میری ساری دولت اور جائداد میرے مرنے کے بعد پاگل لوگوں میں تقسیم کردی جائے۔ کسی نے اس کار خیر کی وجہ پوچھی تو وکیل صاحب نے جواب دیا:

میرے پاس جو کچھ ہے وہ پاگلوں ہی سے تو مجھے ملا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ "قانون" کا کاروبار پاگل انسانوں کے ذریعہ دنیا میں قائم ہے۔ آدمی انتقام کے جوش میں آکر کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ کوئی شخص کسی کی جائداد ہڑپ کرلیتا ہے کوئی حسد اور بغض کا شکار ہو کر کسی کو پریشان کرنا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو بے بس پاکر اس کو عدالت کے شکنجہ میں الجھانے کے لئے اس کے اوپر جھوٹے مقدمے قائم کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ وکیلوں کی تجارت قائم ہے۔

اس قسم کے لوگ اگرچہ اپنے کو عاقل اور ہوشیار سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بدترین قسم کے پاگل ہیں۔ عام پاگل صرف اپنے لئے پاگل ہوتے ہیں۔ مگر یہ ہوشیار پاگل اپنے ساتھ ساری انسانیت کے لئے پاگل ہیں۔ ان کی آخری سزا اگرچہ خدا کے یہاں ملے گی۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں بھی بالآخر وہ عبرت ناک انجام کا شکار ہوتے ہیں۔ جس انسان کو انہوں نے اپنے پاگل پن کا شکار بنانا چاہا تھا، وہ تو خدا کی مدد سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر یہ لوگ خود اسی گڑھے میں داخل کر دیئے جاتے ہیں جہاں وہ دوسروں کو داخل کرنا چاہتے تھے۔

ہر آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنے فائدہ کے لئے کرتا ہے۔ اپنا فائدہ انسان کا سب سے بڑا معبود ہے۔ آدمی اگر معتدل حالت میں ہو تو وہ کبھی جان بوجھ کر ایسی کارروائی نہیں کریگا، جو اس کو خود اپنے نقصان کی طرف لے جانے والی ہو۔ مگر غصہ اور انتقام وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو اندھا کر دیتی ہیں۔ وہ دوسرے کی ضد میں ایسی کارروائیاں کرنے لگتا ہے جس کا نقصان بالآخر خود اسی کو اٹھانا پڑے۔ ایسی ہر کارروائی یقینی طور پر پاگل پن ہے۔ معروف پاگل اگر طبی پاگل ہوتے ہیں تو ایسے لوگ نفسیاتی پاگل۔

زبان درازی

سقراط کا قول ہے۔ اگر تم اتنے زبان دراز ہو کر تمہاری زبان درازی کے مقابلہ میں کوئی تم سے جیت نہ سکے تو تم کبھی غریبوں کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتے۔

بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ زبان درازی اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی سے کیا تعلق۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو ان میں بہت گہرا تعلق ہے۔ غریب کے ساتھ ہمدردی وہی شخص کر سکتا ہے جو حق کا اعتراف کرنا جانتا ہو، خواہ اس حق کا تعلق ایک غریب آدمی سے کیوں نہ ہو۔

ایک واقعہ سے اس کی بخوبی وضاحت ہو جائے گی۔ ایک زمیندار نے اپنا آم کا باغ کسی باغبان کے ہاتھ فروخت کیا، جب درختوں میں پھل لگے تو آندھی آ ئی۔ اس آندھی میں بہت سے پھل گر گئے۔ باغبان کو اندیشہ ہوا کہ وہ پھلوں کی فروخت سے پوری قیمت حاصل نہ کر سکے گا اور اس کو نقصان ہوگا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے آم ایک ٹوکری میں رکھے اور ان کو لے کر زمیندار کے پاس گیا۔ اور کہا کہ دیکھئے آندھی کی وجہ سے کافی پھل گر گئے ہیں اور ہم کو نقصان کا اندیشہ ہے اس لئے آپ باغ کی قیمت میں کچھ کمی کر دیں۔

زمیندار نے یہ سنا تو بگڑ کر کہا جب تم نے ہمارا باغ خریدا تھا اس وقت تم کو یہ معلوم نہ تھا کہ باغ کے گرد کوئی ایسی اونچی دیوار کھڑی ہوئی نہیں ہے جو آندھی اور باغ کے درمیان روک بن سکے۔ غریب باغبان مایوس ہو کر چلا گیا۔

زمیندار کے ایک دوست اس وقت زمیندار کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اور زمیندار اور باغبان کی پوری بات سن رہے تھے۔ جب باغبان چلا گیا تو انہوں نے زمیندار سے کہا، تم بہت سنگدل معلوم ہوتے ہو، غریب آدمی پر رحم کرنا نہیں جانتے۔ زمیندار صاحب نے یہ سن کر کہا۔ آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو رزق دیتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ رزق دینے والا خدا ہے، وہ بہر حال ہر ایک کو اس کا رزق پہنچاتا ہے۔

طاقتور کے مقابلہ میں آدمی زیادہ بول نہیں پاتا۔ مگر جب کمزور سے معاملہ ہو تو وہ خوب زبان درازی دکھاتا ہے۔ اس کی یہ زبان درازی اس کو یہ موقع نہیں دیتی کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کو سمجھے اور حق کو مان کر اس کے مطابق وہ کرے جو اسے کرنا چاہیے۔

زندگی کی سڑک

سڑکوں میں چوراہے ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے مقامات جہاں پورب سے پچھم جانے والی سڑک پر مسافروں کے لئے راستہ جو اتر سے دکھن یا دکھن سے اتر جا رہے ہوں۔

ٹریفک قانون کے تحت یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک طرف کی سڑک بند کر کے دوسری طرف کی سڑک کھول دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے علامتی طور پر ہرا سگنل اور لال سگنل استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک گاڑی چلتے چلتے چوراہہ پر پہنچتی ہے اور دیکھتی ہے کہ اس کے سامنے لال سگنل روشن ہو گیا ہے تو وہ وہیں رک جاتی ہے تاکہ دوسری سڑک سے چلنے والی سواریوں کو گزرنے کا موقع دیدے۔ جب دوسری سڑک کی سواریاں نکل جاتی ہیں تو لال سگنل کی جگہ ہرا سگنل روشن ہو جاتا ہے۔ اب آپ کی سواری کے لئے موقع ہوتا ہے کہ وہ چوراہہ کو پار کر کے آگے بڑھے اور اپنا سفر جاری رکھے۔

چوراہہ کا یہ قانون زندگی کا قانون بھی ہے۔ زندگی کی سڑک کوئی خالی سڑک نہیں جس پر آپ اپنی مرضی کے مطابق صرف اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں۔ یہاں دوسرے بھی بہت سے لوگ ہیں اور وہ بھی اپنا اپنا سفر طے کرنا چاہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہر ایک اپنے اندر یہ وسعت اور لچک پیدا کرے کہ وہ یہاں خود راستہ لینے کے ساتھ دوسروں کو بھی راستہ دے۔ جو لوگ اپنے اندر یہ حکمت پیدا نہ کریں ان کا انجام وہی ہو گا جو ایسے چوراہہ کا، جہاں کوئی سوار اپنی سواری کو نہ روکے۔ ہر ایک بس اندھا دھند اپنی سواری دوڑاتا رہے۔

یاد رکھئے، زندگی کی شاہراہ پر آپ ہی اکیلے نہیں ہیں۔ یہاں بہت سے دوسرے چلنے والے بھی ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھیں تو آپ کو دوسروں کے لئے بھی گزرنے کا موقع دینا ہو گا۔ سڑک کے کسی حصہ پر اگر آپ اپنی گاڑی کو دوڑانے کا موقع پا رہے ہیں تو سڑک کے کسی دوسرے حصہ پر آپ کو اپنی گاڑی روکنی بھی ہو گی تاکہ دوسری سواریاں ٹکرائے بغیر گزرنے کا موقع پا سکیں۔

اپنا حق لینے کے لئے دوسروں کا حق دینا پڑتا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ دوسروں کو ان کا حق دئے بغیر اپنا حق پا لیں تو موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

ایمان میں اضافہ

ایک سائنس داں نے کہا "فطرت کا مطالعہ میرا مذہب ہے۔ جس دن میں فطرت کی کوئی نئی چیز نہیں دریافت کرتا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ دن میں نے ضائع کر دیا" یہ اس انسان کا حال ہے جو مخلوقات میں جیتا ہے۔ پھر اس انسان کا حال اس سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے جو خالق میں جیتا ہو۔ جس طرح سائنس داں ہر روز مخلوقات میں کوئی نئی چیز دریافت کرتا ہے، اسی طرح مومن کو ہر روز خالق کی نسبت سے کوئی ایسی ہی چیز پانا چاہئے جو اس کے ایمان میں اضافہ کرنے والا ہو۔ مومن جس روز کوئی نئی چیز نہ پائے، وہ دن گویا اس نے ضائع کر دیا، اس دن گویا خدا سے اس کا ربط قائم نہیں ہوا۔

ایمان خدا کی دریافت کا دوسرا نام ہے۔ خدا ایک مسلسل حقیقت ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اس لئے اس کی دریافت بھی ایک مسلسل واقعہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جو ایمان اضافہ پذیر نہ ہو وہ غفلت کی ایک قسم ہے، اس کو حقیقی معنوں میں ایمان نہیں کہا جا سکتا۔

جس کا ذہن خدا کی طرف متوجہ ہو، جس کا دل خدا کی طرف لگا ہوا ہو اس کو بار بار خدا کی نئی تجلیات کا ادراک ہوتا ہے۔ وہ بار بار خدا کی نئی جھلک پاتا رہتا ہے۔ جس طرح خدا کے کمالات کہیں ختم نہیں ہوتے اسی طرح مومن کا سفر معرفت بھی کسی حد پر ختم نہیں ہوتا۔

یہ نئی معرفت کبھی ایسی ربانی کیفیات کی صورت میں امنڈتی ہے جس سے وہ اس سے پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ کبھی ایسے دعائیہ الفاظ کے روپ میں بے اختیار اس کی زبان پر آجاتی ہے جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کبھی وہ خدا کی حکمتوں میں سے کسی ایسی حکمت کا راز پا لیتا ہے جو اس سے پہلے اس پر نہیں کھلے تھے۔ کبھی وہ خدا کی تربت کا ایسا تجربہ کرتا ہے جو اس سے پہلے کبھی اس کے علم میں نہیں آئے تھے۔ کبھی اس پر ایسے نئے معانی کا القاء ہوتا ہے جس کے اظہار کے لئے اس کے تمام معلوم الفاظ عاجز نظر آنے لگتے ہیں۔

قرآن کا اہم ترین حصّہ

پروفیسر فلپ ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں قرآن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کے سب سے زیادہ پراثر حصے وہ ہیں جو آخرت کے معاملات سے بحث کرتے ہیں۔ (صفحہ ۱۳۰)

The most impressive parts of the Koran deal with eschatology

جن غیر مسلموں نے قرآن کو پڑھا ہے وہ عام طور پر اسی قسم کے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کو سب سے کم جو چیز قرآن میں ملتی ہے وہ یہی آخرت ہے۔ مسلمان ہر چیز قرآن میں پالیتے ہیں مگر اسی چیز کو نہیں پاتے جو قرآن میں سب سے زیادہ بلکہ ہر ہر صفحہ پر پھیلی ہوئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم عام طور پر خالی الذہن ہوتا ہے۔ وہ صرف یہ جاننے کے لئے پڑھتا ہے کہ قرآن میں جو کچھ لکھا ہے وہ کیا ہے۔ چنانچہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ اس کو کسی کمی بیشی کے بغیر پالیتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مسلمان زیادہ تر دو جذبے کے تحت قرآن پڑھتے ہیں۔ یا ثواب کے لئے یا فخر کے لئے۔

کچھ لوگ قرآن کو سب سے زیادہ مقدس کتاب سمجھ کر بس اس کی "تلاوت" کر لیتے ہیں تاکہ اس کا ثواب انھیں مل جائے۔ اس کے بعد کچھ لوگ وہ ہیں جو قرآن کو اپنا ایک قومی فخر سمجھتے ہیں اور فخر کی نفسیات لے کر قرآن کو پڑھتے ہیں۔ ایسے لوگ قدرتی طور پر قرآن کو زمانہ کی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں۔ زمانہ میں جن چیزوں کو اہمیت حاصل ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پرفخر کتاب ضرور اس کا مجموعہ ہوگی۔ اب جس کے ذہن میں سوشلزم سب سے بڑی چیز ہے وہ قرآن میں سوشلزم کو پڑھنے لگتا ہے۔ جس کے ذہن میں سائنس کی اہمیت ہے وہ قرآن کی عظمت کو سائنس کی صورت میں پالیتا ہے۔ اسی طرح جس کے ذہن میں سیاست اور قانون کی اہمیت ہے۔ وہ قرآن میں جو سب سے اہم بات دریافت کرتا ہے وہ سیاست اور قانون ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن آخرت کی کتاب ہے۔ قرآن اس لئے آیا ہے کہ وہ آنے والے دن سے پہلے آنے والے دن کے بارہ میں لوگوں کو خبردار کردے۔ قرآن مادی صور سے پہلے لفظی صور ہے۔ جو لوگ لفظی صور سے جاگ جائیں وہ کامیاب ہیں۔ جو لوگ مادی صور سے جاگیں گے ان کے لئے ان کا جاگنا کچھ کام نہ آئے گا۔

دعوت الی اللہ

مصطفیٰ محمد عمارۃ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے : جواہر البخاری وشرح القسطلانی۔ اس کتاب میں امام بخاری اور شیخ قسطلانی کی کتابوں سے ۸۰۰ سے زیادہ حدیثیں منتخب کر کے مختلف عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ضخیم کتاب میں ہر قسم کے عنوانات ہیں مگر "دعوت الی اللہ" یا اس کے ہم معنی کوئی عنوان موجود نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مصنف کو دعوت وتبلیغ سے متعلق احادیث پہنچیں نہیں۔ انھوں نے جن حدیثوں کو پڑھا اور سنا ان میں یقیناً دعوت وتبلیغ والی حدیثیں موجود تھیں۔ مگر ذہن کی مخصوص ساخت کی وجہ سے وہ ان کے ذہن کا جزء نہ بن سکیں۔

خود مصنف کی زیر نظر کتاب سے ثابت ہے کہ ان کو دعوت وتبلیغ کی احادیث پہنچیں تھیں۔ مگر ان کے ذہن سے ان کا دعوتی مفہوم اوجھل رہ گیا۔ چنانچہ انھوں نے ان احادیث کو دعوت وتبلیغ کے خانہ میں درج نہیں کیا بلکہ کسی اور خانہ میں ان کو نقل کر دیا۔

کتاب کے صفحہ ۴۹۶ پر یہ حدیث ملتی ہے :

عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مثلی ومثل ما بعثنی اللہ بہ کمثل رجل اتی قوماً فقال رأیت الجیش بعینیّ وانی انا النذیر العریان فالنجاءَ النجاءَ فاطاعتہ طائفۃ فادلجوا علی مہلہم فنجوا وکذبتہ طائفۃ فصبحہم الجیش فاجتاحہم۔

ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مثال اور اس چیز کی مثال جس کو لے کر خدا نے مجھے بھیجا ہے اس آدمی کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے دشمن کا لشکر دیکھا ہے اور میں تم کو کھلا ڈرانے والا ہوں پس بچو بچو۔ پھر ایک گروہ نے اس کی بات مانی اور رات کو سویرے چل پڑا اور وہ بچ گیا۔ دوسرے گروہ نے نہ مانا چنانچہ صبح کو دشمن کا لشکر اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کو ہلاک کر ڈالا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تو اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے "نذیر عریاں" بن جائیں اور ان کو قیامت کے

آنے والے ہولناک دن سے آگاہ کردیں۔ جو شخص آپ کی بات مان کر اپنی اصلاح کرلے گا وہ جنت میں جائیگا۔ اور جو شخص آپ کی بات نہیں مانے گا اور اس کے مطابق اپنے کو درست نہیں کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

یہ حدیث واضح طور پر دعوت و تبلیغ کے بارہ میں ہے مگر صاحب کتاب نے اس کو جس عنوان کے تحت درج کیا ہے وہ یہ ہے:

باب الخوف من اللہ تعالی والانتہاء عن المعاصی والجنۃ قریبۃ۔

اللہ تعالیٰ کا خوف اور گناہوں سے رکنا اور یہ کہ جنت قریب ہے۔

بعد کے زمانہ میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی حال ہے۔ ان کتابوں میں آپ طہارت سے لے کر قتال تک کے تمام ابواب پائیں گے۔ مگر دعوت الی اللہ اور تبلیغ ما انزل اللہ کا اس میں کوئی باب نہ ہوگا۔ یہ صرف عام مصنفین کا حال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے علماء اور مصنفین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعد کے دور میں مسلمانوں میں ہم ہر طرح کی سرگرمیاں دیکھتے ہیں مگر دعوت الی اللہ اور شہادت حق کی سرگرمی ہمیں ان کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ اسلام کی اشاعت کا کام کسی بھی دور میں بند نہیں ہوا۔ ہر دور میں خدا کے بندے بے شمار تعداد میں خدا کے دین میں داخل ہوتے رہے اور آج بھی داخل ہو رہے ہیں۔ مگر یہ سب زیادہ تر اسلام کی اپنی قوت سے ہو رہا ہے نہ کہ شعوری طور پر مسلمانوں کی کسی دعوتی جدوجہد سے۔

بعد کی تاریخ میں مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی یہ سب سے بڑی کمی ہے جس نے مسلمانوں کو غیر مسلمین کے مقابلہ میں خدا کی نصرت سے محروم کردیا ہے، جب تک اس کمی کو دور نہ کیا جائے مسلمانوں کو کبھی دنیا میں برتری کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔

موجودہ زمانہ میں بظاہر مسلمانوں کے درمیان "دعوت اسلامی" کا کافی چرچا نظر آرہا ہے۔ مگر ان کی کارروائیوں کو دیکھنے اور ان کی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ مختلف اسباب سے لوگ دعوت کا نام تو لے رہے ہیں۔ مگر شاید ان پر یہ واضح نہیں کہ دعوت سے حقیقۃً کیا مراد ہے۔ لوگ سیاسی ہنگامے برپا کرتے ہیں اور قومی مسائل پر پرجوش تقریریں کرتے ہیں اور اسی کو دعوت کا عنوان دے رہے ہیں۔ حالانکہ دعوت خدائی پیغام رسانی کا نام ہے نہ کہ قومی اور مادی ہنگامہ آرائی کا۔

موت کا مرحلہ

موت کا لمحہ تمام قابل قیاس اور ناقابل قیاس لمحات سے زیادہ شدید ہے۔ ہر دوسری مصیبت جس کے لئے آدمی پریشان ہوتا ہے۔ اس مصیبت کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو موت کی صورت میں اس کے سامنے آنے والی ہے۔

موت زندگی کے سخت ترین مرحلہ کی طرف سفر ہے۔ یہ کامل بے اختیاری، کامل بے سروسامانی اور کامل بے مددگاری کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ دنیا کی ہر تکلیف کی ایک حد ہوتی ہے، موت ہم کو ایک ایسی دنیا میں داخل کر دیتی ہے جس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

موجودہ دنیا میں بھی آدمی باعتبار حقیقت اسی حال میں ہے۔ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ وہ معمولی ناخوشگواری کو بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک سوئی کا چبھنا، ایک دن کی بھوک پیاس، چند دن کے لئے نیند نہ آنا بھی اس کے پورے وجود کو تڑپا دیتا ہے۔ تاہم موجودہ دنیا میں اس کو اس کی ضرورت کے مطابق تمام چیزیں حاصل ہیں اس لئے وہ اپنی بے چارگی کو بھولا رہتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے۔

اگر آدمی سے موجودہ دنیا چھین لی جائے۔ جہاں پانی اور غذا ہے، جہاں ہوا اور روشنی ہے، جہاں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے تمدن بنانے کے امکانات ہیں۔ اگر موجودہ دنیا آدمی سے چھین لی جائے تو خلا کے کسی دوسرے مقام پر وہ اپنے لئے اس قسم کی ایک اور دنیا کی تخلیق نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہے۔

دنیا میں آدمی پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ آہ واویلا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ آنے والے دن کو جانے تو وہ کہے گا کہ خدایا جو کچھ بیت رہا ہے اس سے کہیں زیادہ سخت ہے وہ جو بیتنے والا ہے۔ دنیا میں آدمی کو عزت اور آرام حاصل ہو تو وہ فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ آنے والے لمحات کو جانے تو وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا اس عزت اور آرام کی کوئی حیثیت نہیں، اگر آنے والے طویل تر مرحلہ میں وہ باقی نہ رہے۔

موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک نئے مرحلۂ حیات کا آغاز ہے۔ یہ نیا مرحلہ کسی کے لئے تمام مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت کا غار ہوگا اور کسی کے لئے تمام راحتوں سے زیادہ بڑی راحت کا دروازہ۔

جھوٹا دین

بائبل میں یہود کے بگاڑ کے بارہ میں یہ الفاظ آتے ہیں :

" یہ باغی لوگ اور جھوٹے فرزند ہیں۔ جو خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرتے ہیں۔ جو غیب بینوں سے کہتے ہیں کہ غیب بینی نہ کرو۔ اور نبیوں سے کہ ہم پر سچی نبوتیں ظاہر نہ کرو۔ ہم کو خوشگوار باتیں سناؤ۔ اور ہم سے جھوٹی نبوت کرو۔ پس اسرائیل کا قدوس یوں فرماتا ہے کہ چونکہ تم اس کلام کو حقیر جانتے ہو اور ظلم اور کج روی پر بھروسا کرتے ہو اور اسی پر قائم ہو، اس لئے یہ بدکرداری تمہارے لئے ایسی ہو گی جیسے پھٹی ہوئی دیوار جو گرا چاہتی ہے۔ وہ اسے کمہار کے برتن کی طرح توڑ ڈالے گا اسے بے دریغ چکنا چور کرے گا۔ اس کے ٹکڑوں میں ایک ٹھیکرا بھی ایسا نہ ملے گا جس میں چولھے پر سے آگ یا حوض سے پانی لیا جائے۔ (یسعیاہ باب ۳۰)

یہود کا بگاڑ یہ نہیں تھا کہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کا بگاڑ یہ تھا کہ وہ خود ساختہ دین پر تھے اور اس کو خدا کا دین بتاتے تھے۔ خدا کے جو بندے انہیں سچے دین کی طرف بلاتے ان کو وہ حقیر جانتے تھے اور ان کو نظر انداز کرتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ جھوٹی کرامتوں اور گھڑی ہوئی بشارتوں کے نام پر انھیں بلاتے ان کے گرد وہ جوق در جوق جمع ہو جاتے

یہود کو ایسا دین پسند نہیں آتا تھا جو ان کی زندگیوں میں تبدیلی کا تقاضا کرتا ہو۔ وہ ایسے دین کو پسند کرتے تھے جس میں اپنی زندگی کا ڈھانچہ توڑنا نہ ہو۔ بس کچھ اوپری اور نمائشی کام کرکے جنت کی ضمانت مل جائے۔ مگر اس قسم کا دین اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

خدا کے کلام کو حقیر جاننا اور ظلم اور کج روی پر بھروسہ کرنا جس میں یہود مبتلا تھے وہی آج پوری طرح مسلمانوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ دوسروں سے مسلمانوں کے جو مادی جھگڑے ہیں ان میں یہ چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان جھگڑوں میں خدا کے بتائے طریقہ پر چلنے کا فائدہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ظالمانہ مقابلہ اور جھوٹی سرگرمیوں میں وہ خوب اپنا وقت اور مال خرچ کرتے ہیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں خدا کی نظر میں " بدکرداری " ہیں اور ان کا نتیجہ ان کے حق میں بھی وہی نکلے گا جو یہود کے حق میں نکلا۔ یہ کہ ان کا گھر پھٹی ہوئی دیوار کی طرح گر پڑے اور وہ مٹی کے برتن کی طرح توڑ ڈالے جائیں۔

نامعلوم مستقبل

آدمی اس دنیا میں معصوم کلی کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کے والدین امنگوں اور حوصلوں کے ساتھ اس کو پالتے ہیں۔ وہ بڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں اپنی زندگی کی جدوجہد شروع کرتا ہے جہاں اس کے لئے تلخ تجربات اور ناخوشگوار یادوں کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں۔

انسان آرزوؤں کے محل بناتا ہے، صرف اس لئے کہ سنگین حقائق اس کی نفی کرکے اس کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیں۔ وہ حوصلوں کی دنیا آباد کرتا ہے۔ مگر اس کے حوصلے صرف اس کے دماغ میں رہ جاتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا میں واقعہ نہیں بنتے۔ وہ امیدیں قائم کرتا ہے۔ مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی امیدیں فرضی سپنے کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ایک نازک شیشہ ہے جو صرف اس لئے دنیا میں آتی ہے کہ حالات کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کا آغاز سنہری آرزوؤں کے ساتھ کرتا ہے۔ مگر بالآخر جو چیز اس کے حصہ میں آتی ہے وہ صرف آرزوؤں کا ایک قبرستان ہے جو اس کے سینے میں دفن ہو کر رہ جاتا ہے کیسی کیسی امیدیں، کیسی کیسی تمنائیں اور کیسے کیسے خواب ہوتے ہیں جن کی وہ اپنی روح کے سب سے نازک گوشہ میں پرورش کرتا ہے۔ مگر سب کا سب ناتمام رہتا ہے۔ وہ حسرتوں کا قبرستان بنا ہوا زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ وہ ایک نامعلوم مستقبل کی طرف دھکیل دیا جائے۔

انسان کا ماضی امیدوں اور تمناؤں کا ماضی ہے۔ اس کا حال ناکامیوں اور حسرتوں کا بہت بڑا مزار ہے۔ اور اس کا مستقبل ایک نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ لگانا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ آغاز اور کیسا عجیب ہے اس کا انجام۔

خدا نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے بارہ میں سنجیدہ ہو۔ وہ زندگی میں کھو جانے کے بجائے زندگی کے آغاز و انجام کے بارہ میں سوچے۔ جو شخص سنجیدگی کے ساتھ اس معاملہ میں سوچے گا وہ اس کامل حکمت کو پالے گا جس کی طرف یہ ناقص دنیا ہر آن اشارہ کر رہی ہے۔

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۞ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞

اور موسیٰ نے کہا، اے ہمارے رب، تونے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں رونق اور مال دیا ہے۔ اے ہمارے رب، اس لئے کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔ اے ہمارے رب، ان کے مال کو غارت کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔ فرمایا، تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ اب تم دونوں جمے رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے　　۸۹ — ۸۸

جو لوگ آخرت کی فکر کرتے ہیں وہ عام طور پر دنیوی ساز و سامان جمع کرنے میں ان لوگوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں جو آخرت سے بے فکر ہو کر دنیا حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہوں۔ دنیوی کمی آخرت کی طرف دھیان لگانے کی قیمت ہے، اور دنیوی زیادتی آخرت سے غافل ہونے کی قیمت۔

مزید یہ کہ جس کے پاس دنیا کی رونق اور سامان زیادہ جمع ہو جائیں وہ بڑائی کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کی زبان پر جاری ہونے والے حق کو پہچانیں اور اس کے آگے جھک جائیں۔ اپنے وسائل کو اگر وہ خدا کا عطیہ سمجھتے تو اس کو حق کی تائید میں استعمال کرتے، مگر وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس کو صرف اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں کہ حق کو دبائیں اور اس طرح ماحول کے اندر اپنی برتری قائم رکھیں۔

"تاکہ وہ تیری راہ سے بھٹکائیں" کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے دئے ہوئے مال و اسباب کو صرف اس لئے استعمال کیا کہ اس کے ذریعہ سے خدا کے بندوں کو خدا سے دور کریں، انہوں نے اس کو حق کی خدمت میں لگانے کے بجائے باطل کی خدمت میں لگایا۔ یہاں شدت بیان کی خاطر کلام کا اسلوب بدل گیا ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے سامنے سچے دین کی دعوت پیش کی اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور خدا کی نصرتوں کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کی حد تک واضح کر دیا، اس کے باوجود فرعون اور اس کے ساتھیوں نے آنجناب کے پیغام کو نہیں مانا۔ اس وقت حضرت موسیٰ نے دعا کی کہ خدایا

ان کے اوپر وہ سزا نازل فرما جو تیرے قانون کے تحت ایسے سرکشوں کے لئے مقدر ہے۔ ایسے موقع پر پیغمبر کی بددعا خود خدا کے فیصلہ کا اعلان ہوتا ہے جو نمائندہ خدا کی زبان سے جاری کیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی دعا قبول ہوگئی۔ تاہم جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے، حضرت موسیٰ کی دعا اور فرعون کی تباہی کے درمیان ۴۰ سال کا فاصلہ ہے۔ (تفسیر النسفی)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد بھی لمبی مدت تک یہ صورت حال باقی رہی کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھی اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے، اور دوسری طرف فرعون اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بدستور ملک میں قائم تھی۔ ایسی حالت میں آدمی اگر خدا کی اس سنت سے بے خبر ہو کہ وہ سرکشوں کو مہلت دیتا ہے تو وہ جلد بازی میں اصل کام چھوڑ دے گا اور مایوسی اور بد دلی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ٱلْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُۥ بَغْيًا وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ ٱلْغَرَقُ قَالَ ءَامَنتُ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱلَّذِيٓ ءَامَنَتْ بِهِۦ بَنُوٓا إِسْرَآءِيلَ وَأَنَا۠ مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ۝٩٠ ءَآلْـَٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ مِنَ ٱلْمُفْسِدِينَ ۝٩١ فَٱلْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ ءَايَةً ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلنَّاسِ عَنْ ءَايَٰتِنَا لَغَٰفِلُونَ ۝٩٢

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ سرکشی اور زیادتی کی غرض سے۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں مگر وہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔ اور میں اس کے فرمانبرداروں میں ہوں۔ کیا اب، اور اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ پس آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے نشانی بنے اور بیشک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل رہتے ہیں ۹۰—۹۲

مصر میں حضرت موسیٰ کا مشن دو طرفہ تھا۔ ایک، فرعون کو توحید اور آخرت کی طرف بلانا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو مصر سے باہر صحرائی ماحول میں لے جانا اور وہاں ان کی تربیت کرنا۔ جب فرعون پر دعوت حق کی تکمیل ہو چکی تو اللہ کے حکم سے وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ صحرائے سینا پہنچنے کے لئے انہیں دریا کو پار کرنا تھا۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی رہنمائی میں دریا کے کنارے پہنچے تو اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ نے پانی پر اپنا عصا مارا۔ پانی بیچ سے پھٹ کر دائیں بائیں کھڑا ہو گیا،

اور درمیان میں خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل اس راستے سے بآسانی پار ہوگئے۔

فرعون اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل پانی کے درمیان ایک خشک راستہ سے گذر رہے ہیں۔ دریا کے وسیع پاٹ نے پھٹ کر حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو راستہ دے دیا تھا۔ یہ واقعہ دراصل خدا کی ایک نشانی تھا۔ فرعون کو اس سے یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ موسیٰ حق پر ہیں اور خدا ان کے ساتھ ہے۔ مگر اس نے دریا کے پھٹنے کو خدائی واقعہ سمجھنے کے بجائے عام واقعہ سمجھا۔ اپنے اور موسیٰ کے درمیان فرعون کو صرف دریا نظر آیا، حالانکہ وہاں خود خدا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس واقعہ میں فرعون کے لئے اطاعت اور انابت کا پیغام تھا وہ اس کے لئے صرف سرکشی میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ اس نے "دریا" کو دیکھا مگر "خدا" کو نہیں دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ جس طرح موسیٰ اور ان کے ساتھیوں نے دریا کو پار کیا ہے اسی طرح وہ بھی دریا کو پار کر سکتا ہے۔

اپنے اس ذہن کے ساتھ فرعون اور اس کا لشکر دریا میں داخل ہوگئے۔ دریا کا پانی جو دو ٹکڑے ہوا تھا وہ موسیٰ اور ان ساتھیوں کے لئے ہوا تھا، وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لئے نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ فرعون اور اس کا لشکر جب بیچ دریا میں پہنچے تو خدا کے حکم سے دونوں طرف کا پانی مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت اس میں غرق ہوگیا۔ غرق ہوتے ہوتے ہوئے فرعون نے ایمان کا اقرار کیا مگر وہ بے سود تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اختیاری ایمان معتبر ہے نہ کہ وہ ایمان جب کہ آدمی ایمان لانے پر مجبور ہوگیا ہو۔

خدا سے نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہلاکت ہے، اس کا نمونہ دور رسالت میں بار بار انسان کے سامنے آتا تھا۔ تاہم اس قسم کے کچھ نمونے خدا نے مستقل طور پر محفوظ کر دیئے ہیں تاکہ وہ بعد کے زمانہ میں بھی انسان کو سبق دیتے رہیں جبکہ نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا ہو۔ انہیں میں سے ایک تاریخی نمونہ فرعون موسیٰ (رعمسیس ثانی) کا ہے جس کی ممی کی ہوئی لاش ماہرین اثریات کو قدیم مصری شہر تھیبس (Thebes) میں ملی تھی اور اب وہ قاہرہ کے میوزیم میں نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ فَمَا ٱخْتَلَفُوا۟ حَتَّىٰ جَآءَهُمُ ٱلْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِى بَيْنَهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ فِيمَا كَانُوا۟ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانا دیا اور ان کو ستھری چیزیں کھانے کے لئے دیں۔ پھر انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ علم ان کے پاس آچکا تھا۔ یقیناً تیرا رب قیامت کے دن ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ۹۳

بنی اسرائیل قدیم زمانہ میں خدا کے دین کے حامل تھے۔ ان کے ساتھ خدا نے یہ احسان کیا کہ ان کے دشمن (فرعون) سے ان کو نجات دی۔ اس کے بعد وہ ان کو سینا کی کھلی فضا میں لے گیا۔ وہاں ان کے لئے خصوصی انتظام کے تحت پانی اور رزق مہیا کیا۔ صحرائی تربیت کے ذریعہ ان کے اندر ایک نئی طاقتور نسل تیار کی۔ اس نسل نے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ایک عظیم ملک فتح کیا اور شام اور اردن اور فلسطین جیسے سرسبز علاقہ میں بنی اسرائیل کی سلطنت قائم کی۔ جو کئی سو سال تک باقی رہی۔

اس احسان کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ بنی اسرائیل خدا کے فرماں بردار اور شکر گزار رہتے اور خدا کے دین کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے۔ مگر واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے وہ راہ سے بے راہ ہو گئے۔

ان کا راہ سے بے راہ ہونا کیا تھا۔ یہ آپس کا اختلاف تھا۔ ان کے پاس خدا کا اتارا ہوا علم موجود تھا جو واحد سچائی تھا۔ مگر انہوں نے اس علم کی تشریح و تاویل میں اختلاف کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ (تفسیر النسفی) کوئی امت جب تک خدا کے اتارے ہوئے دین (العلم) پر رہتی ہے، اس میں اتفاق و اتحاد رہتا ہے۔ مگر بعد کو ان کے درمیان اس العلم کی تشریح میں اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک اختلافی رائے لیکر بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ دوسری اختلافی رائے لیکر۔ ہر ایک اپنے اپنے مسلک کو برحق ثابت کرنے کے لئے بحث مباحثہ اور تقریر اور مناظرہ کا طوفان کھڑا کرتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ اصل العلم کتابوں میں بند پڑا رہتا ہے اور سارا زور ان کی تاویلات و تشریحات میں صرف ہونے لگتا ہے۔ اس طرح بنیادی دینی تعلیمات (العلم) میں متحد الرائے ہونے کے باوجود لوگ ذیلی تعلیمات میں مشغول ہو کر مختلف الرائے ہو جاتے ہیں۔

"اللہ قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا" بظاہر متعدی ہے مگر حقیقۃً وہ لازم کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت میں جب خدا ظاہر ہوگا تو ہر آدمی اپنے اختلاف کو بھول کر اسی بات کو مان لے گا جو واحد سچائی ہے۔ اگر وہ خدا سے ڈرتے تو آج ہی سب کے سب ایک رائے پر پہنچ جاتے۔ مگر خدا سے بے خوف ہو کر وہ الگ الگ راہوں میں بٹ گئے ہیں بے خوفی سے رایوں کا تعدد پیدا ہوتا ہے اور خوف سے رایوں کا اتحاد۔

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝

پس اگر تم کو اس چیز کے بارے میں شک ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ بیشک یہ تم پر حق آیا ہے تمہارے رب کی طرف سے، پس تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے، ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگے ۹۴ — ۹۵

پیغمبر بے آمیز حق کو لیکر اٹھتا ہے، اور بے آمیز حق کی دعوت کو قبول کرنا انسان کے لئے ہمیشہ سخت دشوار کام رہا ہے۔ لوگ عام طور پر ملاوٹی حق کی بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا پرستانہ زندگی پر حق کا لیبل لگا لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں بے آمیز حق کی دعوت کو ماننا اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ داعی حق کو ماننے کے لئے اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے، اور اپنے آپ کو چھوٹا کرنا بلاشبہ انسان کے لئے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ حق کی دعوت اٹھے اور لوگ جوق در جوق اس کی طرف دوڑنا شروع کر دیں۔ حق کا استقبال اس دنیا میں ہمیشہ اعراض اور مخالفت کی صورت میں کیا گیا ہے۔

داعی جب اپنے ماحول میں حق کی یہ بے وقعتی دیکھتا ہے تو کبھی کبھی اس پر یہ شبہ گزرتا ہے کہ میں غلطی پر تو نہیں ہوں۔ اس آیت میں داعی کو اسی نفسیات سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اس شبہ کے غلط ہونے کا ایک نہایت واضح ثبوت یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں اور داعیوں کو بھی ہمیشہ اسی طرح کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ جو لوگ سابق انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو بخوبی معلوم ہے کہ اس دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک پیغمبر اٹھے اور فوراً اس کو عوامی مقبولیت حاصل ہو جائے۔ پھر یہی بات اگر بعد کے زمانہ کے داعیوں کے ساتھ پیش آئے تو اس پر حیران و پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

آدمی کی عقل اگر کسی چیز کی سچائی پر گواہی دے اور وہ صرف لوگوں کی بے توجہی یا مخالفت کی وجہ سے اس چیز کو چھوڑ دے تو یہ گویا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانا ہے۔ اللہ نشانیوں (دلائل) کے روپ میں انسان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے جس چیز کی صداقت پر دلیل قائم ہو جائے

اس کو ماننا آدمی کے اوپر خدا کا حق ہوجاتا ہے۔ پھر جو شخص خدا کا حق ادا نہ کرے اس کے حصہ میں نقصان اور ہلاکت کے سوا کیا آئے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾

بے شک جن لوگوں پر تیرے رب کی بات پوری ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے، خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو سامنے آتا نہ دیکھ لیں۔ پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا، یونس کی قوم کے سوا۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا اور ان کو ایک مدت تک بہرہ مند ہونے کا موقع دیا ۹۸ — ۹۶

انسان کے سامنے جب ایک حق بات آتی ہے تو اس کی عقل گواہی دیتی ہے کہ یہ صحیح ہے۔ مگر کسی حق کو لینے کے لئے آدمی کو کچھ دینا پڑتا ہے اور اسی دینے کے لئے آدمی تیار نہیں ہوتا۔ اس کی خاطر آدمی کو دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے مفاد کو خطرہ میں ڈالنا ہوتا ہے۔ اپنی رائے اور اپنے وقار کو کھونا پڑتا ہے۔ یہ اندیشے آدمی کے لئے قبول حق میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ جس چیز کا جواب اس کو قبولیت اور اعتراف سے دینا چاہئے تھا اس کا جواب وہ انکار اور مخالفت سے دینے لگتا ہے۔

آدمی کی نفسیات کچھ اس طرح بنی ہیں کہ وہ ایک بار جس رخ پر چل پڑے اسی رخ پر اس کا پورا ذہن چلنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار حق سے انحراف کرنے کے بعد بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوبارہ حق کی طرف لوٹے۔ کیونکہ ہر آنے والے دن وہ اپنے فکر میں پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ حق کی طرف واپس جائے۔

اس طرح کے لوگ اپنے موقف کو بتانے کے لئے ایسے الفاظ بولتے ہیں جس سے ظاہر ہو کہ ان کا کیس نظریاتی کیس ہے۔ مگر حقیقۃً وہ صرف ضد اور تعصب اور ہٹ دھرمی کا کیس ہوتا ہے جو اپنی دنیوی

مصلحتوں کی خاطر اختیار کیا جاتا ہے۔ تاہم عذاب خداوندی کے ظہور کے وقت آدمی کا یہ بھرم کھل جائیگا۔ خوف کی حالت اس کو اس چیز کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے گی جس کے آگے وہ بے خوفی کی حالت میں جھکنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔

پچھلے زمانہ میں جتنے رسول آئے سب کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ان کی مخاطب قوم آخر وقت تک ایمان نہیں لائی۔ البتہ جب وہ عذاب کی پکڑ میں آگئے تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان قبول کرتے ہیں۔ جب تک خدا انہیں دلیل کی زبان میں پکار رہا تھا۔ انہوں نے نہیں مانا اور جب خدا نے انہیں اپنی طاقتوں کی زد میں لے لیا تو کہنے لگے کہ اب ہم مانتے ہیں۔ مگر ایسا ماننا خدا کے یہاں معتبر نہیں۔ خدا کو وہ ماننا مطلوب ہے جب کہ آدمی دلیل کے زور پر جھک جائے نہ کہ وہ طاقت کے زور پر جھکے۔

حضرت یونس علیہ السلام عراق کے ایک قدیم شہر نینوی میں بھیجے گئے۔ انہوں نے وہاں تبلیغ کی مگر وہ لوگ ایمان نہ لائے۔ آخر حضرت یونس نے پیغمبروں کی سنت کے مطابق ہجرت کی۔ وہ یہ کہہ کر نینوی سے چلے گئے کہ اب تمہارے اوپر خدا کا عذاب آئے گا۔ حضرت یونس کے جانے کے بعد عذاب کی ابتدائی علامتیں ظاہر ہوئیں۔ مگر اس وقت انہوں نے وہ نہ کیا جو قوم ھود نے کیا تھا کہ انہوں نے عذاب کا بادل آتے دیکھ کر کہا کہ یہ ہمارے لئے بارش برسانے آرہا ہے۔ قوم یونس کے اندر فوراً چونک پیدا ہوگئی۔ سارے لوگ اپنے مویشیوں اور عورتوں اور بچوں کو لے کر میدان میں جمع ہوگئے اور خدا کے آگے عاجزی کرنے لگے۔ اس کے بعد عذاب ان سے اٹھا لیا گیا۔ جس طرح ظہور عذاب سے پہلے کا ایمان قابل اعتبار ہے اسی طرح وقوع عذاب کے قریب کا ایمان بھی قابل اعتبار ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اتنا کامل ہو جتنا کامل قوم یونس کا ایمان تھا۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٠﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ پھر کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن ہو جائیں۔ اور کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر ایمان لا سکے۔ اور اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے ۱۰۰ — ۹۹

"تیرا رب چاہتا تو سارے لوگ مومن بن جاتے" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لئے یہ ممکن تھ
کہ انسانی دنیا کا نظام بھی اسی طرح بنائے جس طرح بقیہ دنیا کا نظام ہے۔ جہاں ہر چیز مکمل
طور پر خدا کے حکم کی پابند بنی ہوئی ہے۔ مگر انسان کے سلسلہ میں خدا کی یہ اسکیم ہی نہیں۔ انسا
کے سلسلہ میں خدا کی اسکیم یہ ہے کہ آزادانہ ماحول میں رکھ کر انسان کو موقع دیا جائے کہ وہ خو
اپنے ذاتی فیصلہ سے خدا کا فرماں بردار بنے۔ وہ اپنے اختیار سے وہ کام کرے جو بقیہ دنیا بے اختیارا
کے ساتھ کر رہی ہے، جنت کی ابدی نعمتیں اسی اختیارانہ اطاعت کی قیمت ہیں۔

"کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا" کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو ایما
کی نعمت ملے گی تو اس طریقہ کی پیروی کرکے ملے گی جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ موجودہ د
میں ایمان کو پانے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ایمان کی دعوت کو اپنی عقل کے استعمال سے سمجھے۔ جس شخ
کی عقل کے اوپر اس کی دنیوی مصلحتیں غالب آجائیں اس کی عقل گویا گندگی کی کیچڑ میں لت پت
ہو گئی ہے۔ ایسے شخص کے لئے اس دنیا میں ایمان کی نعمت پانے کا کوئی سوال نہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ
قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے دیکھو اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو فائدہ نہیں پہن
جو ایمان نہیں لاتے۔ وہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن ان
پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو پیش آئے۔ کہو، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں
پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے۔ اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ ہم ایم
والوں کو بچا لیں گے۔ ۱۰۱ — ۱۰۳

ہمارے چاروں طرف جو کائنات ہے اس میں بے شمار نشانیاں موجود ہیں جو خدا
وجود کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس کائنات کے بارہ میں
کا منصوبہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ دنیا میں ڈراوے (آندھی اور بھونچال) جیسے واقعات بھی پیش

آتے رہتے ہیں جو انسان کو خدا اور آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ بنائیں۔ مگر یہ سب کچھ عالم امتحان میں ہوتا ہے، یعنی ایسی دنیا میں جہاں آدمی کو اختیار ہے کہ مانے یا نہ مانے۔ چنانچہ آدمی یہ کرتا ہے کہ جب نشانیاں اور ڈراوے سامنے آتے ہیں تو وہ ان کی کوئی نہ کوئی خود ساختہ توجیہہ کرکے بات کو دوسرے رخ کی طرف پھیر دیتا ہے اور نصیحت سے محروم رہ جاتا ہے۔

جب آدمی دلیل کی زبان میں بات کو نہ مانے تو گویا وہ صرف اس دن کا انتظار کر رہا ہے جب کہ امتحان کا پردہ ہٹا دیا جائے اور خدا اپنا آخری فیصلہ سنانے کے لئے سامنے آجائے۔ مگر وہ دن جب آئے گا تو وہ آج کے دن سے بالکل مختلف ہوگا۔ آج تو ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں بظاہر یکساں حالت میں نظر آتے ہیں۔ مگر جب فیصلہ کا دن آئے گا تو اس کے بعد وہی لوگ امن میں رہیں گے جو حق پرست ثابت ہوئے تھے۔ بقیہ تمام لوگ اس طرح عذاب کی لپیٹ میں آجائیں گے کہ اس کے بعد ان کے لئے کوئی راہ نہ ہوگی جس سے بھاگ کر وہ نجات حاصل کریں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ
فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ
يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ
الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

کہو، اے لوگو اگر تم میرے دین کے متعلق شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اللہ کے سوا۔ بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں۔ اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر دین کی طرف کروں۔ اور مشرکوں میں سے نہ بنوں۔ اور اللہ کے علاوہ ان کو نہ پکارو جو تم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ پھر اگر تم ایسا کروگے تو یقیناً تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ اور اگر اللہ تم کو کسی تکلیف میں پکڑ لے تو

اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے۔ اور اگر وہ تم کو کوئی بھلائی پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے ۱۰۷-۱۰۴

داعی اولاً دلیل کی زبان میں اپنی بات کہتا ہے۔ مگر جب لوگ دلیل سننے کے باوجود شک وشبہہ میں پڑے رہتے ہیں تو اس کے پاس آخری چیز یہ رہ جاتی ہے کہ عزم کی زبان میں اپنے پیغام کی صداقت کا اظہار کر دے۔

توحید کے داعی کا شرک کے پرستاروں سے یہ کہنا کہ "میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی عبادت تم لوگ کرتے ہو" محض ایک دعویٰ نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک دلیل بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ــــ میں بھی تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ میرے پاس بھی وہی عقل ہے جو تمہارے پاس ہے۔ پھر جس بات کی صداقت میری سمجھ میں آرہی ہے اس کی صداقت تمہاری سمجھ میں آخر کیوں نہیں آتی۔

سچائی اگر ایک انسان کی سطح پر قابل فہم ہو جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے بھی قابل فہم تھی۔ اس کے باوجود اگر دوسرے لوگ انکار کریں تو یقیناً اس کی وجہ خود ان کا اپنا کوئی نقص ہو گا نہ کہ دعوت حق کا نقص۔ جس چیز کو ایک آنکھ والا دیکھ رہا ہو اور دوسرا آنکھ والا شخص اسے نہ دیکھے تو وہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آنکھ والا حقیقۃً آنکھ والا نہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ جس چیز کو ایک آنکھ والا دیکھ لے اس کو دوسرا شخص آنکھ رکھتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔

موت اس بات کا اعلان ہے کہ آدمی اس دنیا میں کامل طور پر بے اختیار ہے۔ موت ان تمام چیزوں کو باطل ثابت کر دیتی ہے جن کے سہارے آدمی انکار اور سرکشی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ موت ایک طرف آدمی کو اپنے عجز اور دوسری طرف خدا کی قدرت کا تعارف کراتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کوئی نہیں جس کو نفع دینے یا نقصان پہنچانے کا اختیار حاصل ہو۔ اس طرح موت آدمی کو ہر دوسری چیز سے کاٹ کر خدا کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ مکمل طور پر انسان کو خدا پرستار بناتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر سبق لینے کا ذہن ہو تو صرف موت کا واقعہ اس کی اصلاح کے لئے کافی ہو جائے۔

ہر انسان پر ایک وقت آتا ہے جب کہ وہ بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسی طرح کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ فائدہ اور نقصان کے معاملہ میں وہی ہونے دے جو وہ چاہتا ہے۔ وہ مطلوب فائدہ کو ہر حال میں پالے اور غیر مطلوب نقصان سے ہر حال میں محفوظ رہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان ایک بے اختیار مخلوق ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں
ئی اور بھی ہے جو اس کے اوپر حکمرانی کر رہا ہے۔

ل یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ
نَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا
یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾

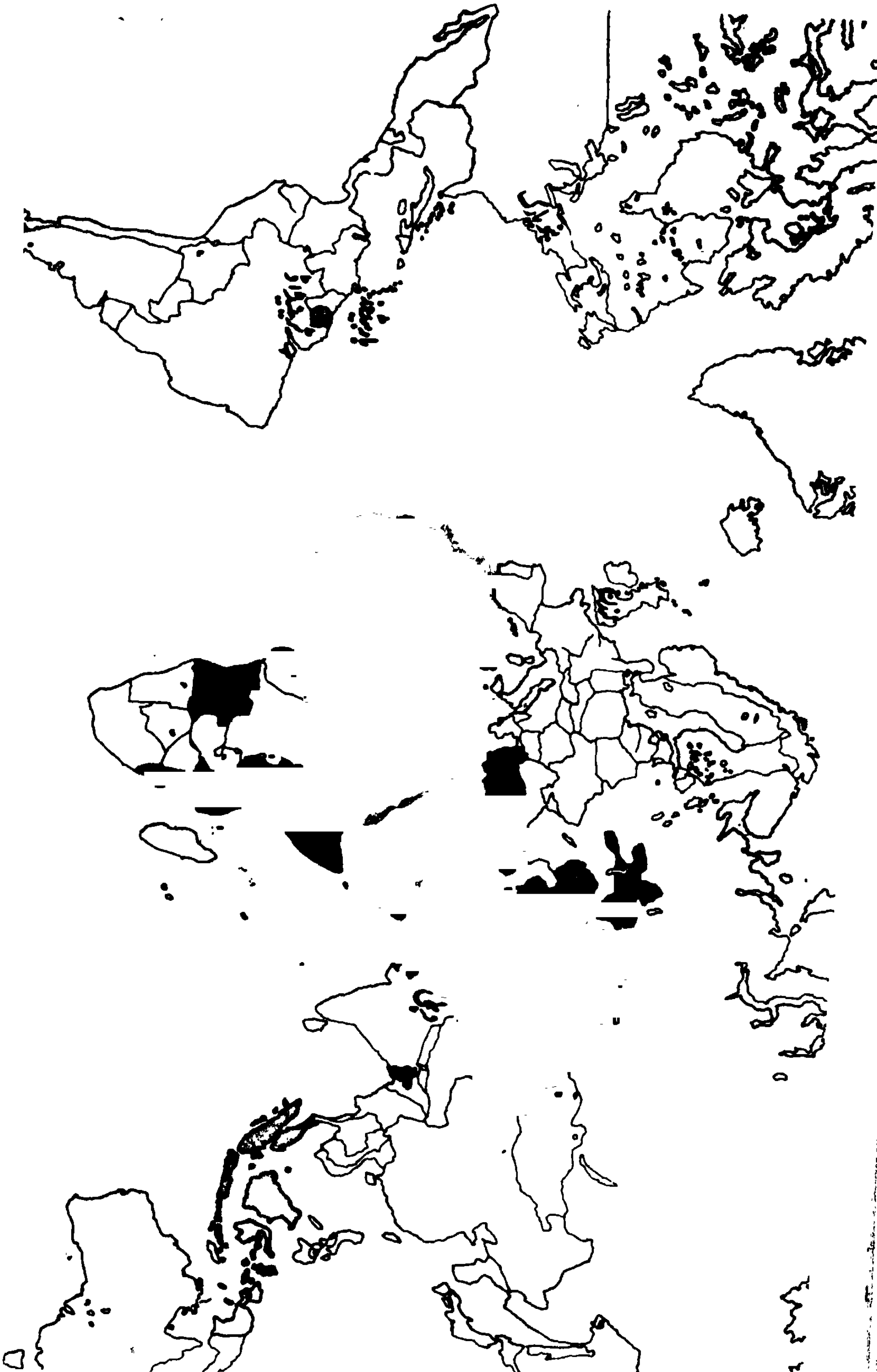
، اے لوگو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے۔ جو ہدایت قبول کریگا وہ اپنے ہی
کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا اور میں تمہارے اوپر ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور تم
ا کی پیروی کرو جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے
لا ہے ۱۰۹—۱۰۸

دعوت کا کام اصلاً اعلان حق کا کام ہے۔ کسی گروہ کے اوپر اس وقت پیغام رسانی کا حق
ا ہو جاتا ہے جب کہ داعی امر حق کو دلیل کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دے اور اسی کے ساتھ اس
ت کا ثبوت دیدے کہ وہ اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔

عی اگر وقت کے معیار کے مطابق امر حق کو مدلل کر دے۔ وہ نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر
ن کی مکمل گواہی دیدے۔ وہ ہر تکلیف اور ناخوش گواری کو برداشت کرتا ہوا اپنے دعوتی کام کو
ری رکھے تو اس کے بعد مخاطب کے اوپر وہ اتمام حجت ہو جاتا ہے جس کے بعد خدا کے یہاں کسی
لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

داعی کا کام اصلاً اتباع وحی ہے۔ یعنی اپنی ذات کی حد تک عملاً مرضئ رب پر قائم رہتے ہوئے
دوسروں کو مرضئ رب کی طرف پکارتے رہنا۔ اس کام کو ہر حال میں حکمت اور صبر اور خیرخواہی کے
اتھ مسلسل جاری رکھنا ہے۔ اس کے بعد جتنے بقیہ مراحل ہیں وہ سب براہ راست طور پر خدا سے متعلق
ں۔ داعی کی طرف سے کوئی دوسرا عملی اقدام صرف اس وقت درست ہے جب کہ خود خدا کی طرف
ے اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہو۔ اور اس کے آثار ظاہر ہو جائیں۔

خدا کا فیصلہ ہمیشہ حالات کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب خدا کے علم میں داعی کا
وتی کام مطلوب حد کو پہنچ چکا ہوتا ہے تو خدا حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جس کو استعمال
کے داعی اپنے عمل کے اگلے مرحلہ میں داخل ہو جائے۔



ایک سفر

براعظم امریکہ دو بڑے خشکی کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ایک کو شمالی امریکہ اور دوسرے کو جنوبی امریکہ کہتے ہیں۔ ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان بحیرۂ کریبین (Caribbean Sea) ہے جس میں تقریباً ۲۰ چھوٹے جزیرے واقع ہیں۔ انھیں میں سے ایک جزیرہ وہ ہے جس کا نام باربیڈوز (Barbados) ہے۔

اس علاقہ میں پہلی کریبین اسلامک کانفرنس ۲۴ - ۲۸ اپریل ۱۹۸۱ کو پورٹ اسپین میں ہوئی تھی۔ دوسری کریبین اسلامک کانفرنس باربیڈوز میں ہوئی۔ مجھے اس کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اس سلسلے میں باربیڈوز کا سفر پیش آیا۔ یہ کانفرنس ۳۱ مارچ سے لیکر ۴ اپریل ۱۹۸۳ تک جاری رہی۔

۲۳ مارچ کی صبح کو پالم ایرپورٹ سے برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۱۴۶ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ہوائی جہاز کا سفر، کم از کم میرے لئے، جلد منزل پر پہنچنے کی خاطر ایک ناخوشگوار چیز کو برداشت کرنا ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم جیسا طویل سفر میں پیدل طے کرسکوں تو یقیناً میں پیدل سفر کو ترجیح دیتا۔ کیونکہ پیدل چلنے والا خدا کی کھلی ہوئی دنیا میں چلتا ہے۔ اور ہوائی جہاز کا مسافر انسان کی بنائی ہوئی اڑن جیل میں۔

ہوائی جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا میگزین ہائی لائف (High Life) شمارہ مارچ ۱۹۸۳ تھا۔ اس میں لارڈ ناروچ (Lord Norwich) کے قلم سے ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا:

Where Cross and Cresent Meet

اس مضمون میں صلاح الدین ایوبی کی ایک دلچسپ کہانی درج تھی۔ عمان اور عقبہ کے درمیان گزرنے والی سڑک پر قدیم شہر موآب ہے۔ اس میں کراک کا قلعہ واقع ہے۔ یہ ایک پہاڑ کے اوپر ہے جہاں سے بحر مردار دکھائی دیتا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی ۱۱۸۳ء میں یہاں داخل ہوا اس کو معلوم ہوا کہ یہ عین وہی دن ہے جب کہ یروشلم کی شہزادی ازبیلا کی شادی تورون کے شہزادہ ہمفری سے ہوئی ہے۔ دلہن کی ماں نے شادی کے

ناشتہ کا کچھ سامان صلاح الدین ایوبی کے پاس بھجوایا۔ صلاح الدین ایوبی نے پوچھا کہ قلعہ کے کس ٹاور میں نوجوان میاں بیوی رات گذاریں گے۔ جب اس کو بتایا گیا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیدیا کہ اس ٹاور پر گولے نہ پھینکے جائیں۔ اس قصہ کو بیان کرنے کے بعد مضمون نگار نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ کاش یہ مثال بار بار دہرائی جاتی:

One wishes that the example could have been more frequently followed

ہائی لائف میگزین میں اشتہار کی اپیل کرتے ہوئے ایک دلچسپ مکالمہ درج ہے۔

I hear that High Life has an audience of over
1.25 million air travellers a month.
Yes, and 64% are bussiness people. In fact, High Life has more
business readers than most business oriented publications.

یہ مکالمہ ظاہری طور پر درست ہے۔ مگر اس کو سمجھنے کے لئے اس میں اتنا اور اضافہ کرنا ہوگا کہ ہائی لائف کی قسم کے "ان فلائٹ میگزین" اتنے کم دلچسپ ہوتے ہیں کہ بہت تھوڑے ہوائی مسافران کو باقاعدہ پڑھنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں۔ "شماریات" کی زبان بظاہر بڑی قطعی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اکثر اوقات حقیقت اس سے زیادہ وسیع ثابت ہوتی ہے کہ وہ شماریات کی حد بندی میں سما سکے۔

گیارہ بجے ہم دبئی پہنچے۔ ہوائی جہاز کو یہاں ایک گھنٹہ ٹھہرنا تھا۔ دبئی کا ہوائی اڈہ ان ہوائی اڈوں میں سے ہے جہاں آگے جانے والے مسافروں کو وقتی طور پر اترنے کی اجازت ہے۔ آپ "ٹرانزٹ پاس" لے کر ایک گھنٹہ کے لئے یہاں اتر سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز سے نکل کر ایک عرب ملک کی زمین پر قدم رکھنا بظاہر "برٹش دنیا" سے نکل کر "مسلم دنیا" میں قدم رکھنا تھا۔ مگر مغربی تہذیب کے غلبہ نے موجودہ زمانہ میں اس فرق کو بہت کم باقی رکھا ہے۔ مسافر جب ہوائی جہاز سے نکل کر باہر آتا ہے تو وہ ایک دنیا اور دوسری دنیا میں بظاہر بس اتنا فرق پاتا ہے کہ جہاز کے اندر تختیوں پر انگریزی الفاظ اوپر لکھے ہوئے تھے اور عربی الفاظ نیچے۔ اس کے برعکس باہر کی دنیا میں تمام تختیوں پر عربی الفاظ اوپر لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور انگریزی الفاظ نیچے۔ تاہم چھ گھنٹہ کی اڑان کے بعد جہاز کویت کی فضا میں پہنچا تو یہاں دوسرے اعلانات کے ساتھ عملہ کی طرف سے یہ اسلامی اعلان بھی کیا گیا کہ "جو مسافر یہاں اتر رہے ہیں ان کی اطلاع کے لئے بتایا جاتا ہے کہ کویت کے اندر

شراب لے جانا بالکل منع ہے۔"

۲۳ مارچ کو جب کہ ہمارا جہاز ایک گھنٹہ کے لئے کویت کے ہوائی اڈہ پر کھڑا تھا، اس وقت ہمارے دو ساتھی کویت کے دورہ پر تھے۔ دہلی سے ٹیلی فون کی گفتگو میں ان کو میرا پروگرام بتایا جا چکا تھا۔ اگر ٹرین کی طرح ہوائی جہازوں پر بھی اگر ملنے کی اجازت ہوتی تو وہ ضرور اندر آ کر مجھ سے ملاقات کرتے۔ مگر ہوائی جہاز کے مخصوص قوانین کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ "ٹرین" بھی سواری ہے اور "ہوائی جہاز" بھی سواری۔ اس لفظی اشتراک کی بنا پر اگر کوئی شخص "پلیٹ فارم" ٹکٹ لینے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچ جائے تو اس کے حصہ میں ناکام واپسی کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا۔

دہلی سے دبئی اور کویت تک کافی ہندستانی مسافر جہاز میں تھے۔ وہ زور زور سے باتیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے جہاز کے اندر سکون کی فضا برہم ہو رہی تھی۔ مجھے ۲۰ اگست ۱۹۸۲ کا دن یاد آیا جب کہ میں مالٹا سے فرانس کی طرف سفر کر رہا تھا۔ ہوائی جہاز میں مجھ سے ملی ہوئی دو سیٹوں پر دو فرانسیسی بچے تھے۔ دونوں بھائی بہن تھے اور برابر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مگر وہ دونوں اتنے آہستہ بولتے تھے کہ میں بالکل ان کی بغل میں ہونے کے باوجود ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ سکا۔ کتنا فرق ہے ایک انسان اور دوسرے انسان میں۔ میں نے ان سے بعض سوالات کئے تو انھوں نے اتنے مہذب انداز میں ان کے جوابات دئے کہ ہندستان میں بہت کم اس کی امید کی جا سکتی ہے۔

۲۳ مارچ کو میں لندن پہنچا۔ وہاں چند روز قیام کے بعد ۲۹ مارچ ۱۹۸۳ کو آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۵۷ ہم کو لے کر اٹلانٹک کے اوپر اڑ رہی تھی۔ آٹھ گھنٹہ مسلسل سمندر کے اوپر اڑنے کے بعد جہاز اینٹی گا (Antigua) اترا۔ یہ بہت چھوٹا جزیرہ ہے۔ جزیرہ میں ہر طرف ہریالی نظر آئی۔ صنعتی کثافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں بڑے شہروں کے وہ لوگ کثرت سے آتے ہیں جو اپنے شہر کی انسان کش خصوصیات سے گھبرا اٹھتے ہیں اور چھٹیاں گزارنے کے لئے قدرت کا سادہ ماحول چاہتے ہیں۔ جہاز سے بہت سے مسافر یہاں اترے اور دوبارہ بہت سے سوار ہوئے۔ یہ سب سیاح تھے ——— اس دنیا میں اگر ترقی یافتہ ہونے کی قیمت ہے تو ان لوگوں کی بھی قیمت ہے جو ترقی کی دوڑ میں ابھی پیچھے ہوں۔

اینٹی گا سے تقریباً ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد ۲۹ مارچ کی شام کو ہم باربیڈوز پہنچے

جواس سفر میں ہماری اصل منزل تھی - لندن سے احمد ڈرامی کا ساتھ ہو گیا تھا - وہ گامبیا (افریقہ) کے رہنے والے ہیں - ہوائی اڈہ پر احمد ڈرامی عام مسافروں کے ساتھ باہر نکل آئے۔ ایمگریشن کی کھڑکی پر انہیں فوراً دس دن کا ویزا دیدیا گیا - مگر مجھے روک لیا گیا - دیر تک میرے کاغذات کی جانچ ہوتی رہی - اس کے بعد میرا پاسپورٹ مجھے واپس دیا گیا تو اس پر صرف ایک دن کی اجازت مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھی ہوئی تھی :

Permitted to enter & remain in the Island for one day

میرے مقامی ساتھیوں نے اس کے بعد دیزا میں دو ہفتہ کی توسیع کرالی - تاہم مجھے یہ کھوج تھی کہ میرے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کیا گیا۔

اس فرق کا راز مجھے اس وقت معلوم ہوا جب کہ میں باربیڈوز شہر (برج ٹاؤن) پہنچا۔ یہاں لوگوں نے بتایا کہ باربیڈوز چونکہ سیاحوں کا جزیرہ ہے، یہاں آنے والوں کے لئے داخلہ کے قوانین بہت نرم ہیں - پہلے یہ اجازت عام تھی۔ اب اس میں ہندستان اور پاکستان کا استثناء ہو گیا ہے - ہندستان اور پاکستان کے لوگوں نے ضابطہ کی خلاف ورزی کی انہوں نے اپنے لوگوں کو یہاں بلایا اور غلط معلومات پیش کر کے ان کو باربیڈوز کا شہری بنا لیا - حکومت کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے یہ قانون بنا دیا کہ ہندستان اور پاکستان سے آنے والے لوگوں کے کاغذات کی سخت جانچ کی جائے اور ان کو پیشگی ویزا کے بغیر باربیڈوز آنے سے روکا جائے ــــ اپنے بھائیوں کے کردار کی یہ قیمت تھی جو مجھ کو باربیڈوز ہوائی اڈہ پر ادا کرنی پڑی -

یورپ اور امریکہ کے سیاح جو یہاں آتے ہیں وہ تفریح کی غرض سے آتے ہیں - وہ یہاں خرچ کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں - اس کے برعکس ہندستان کے لوگ یہاں کمانے کے لئے آتے ہیں - ایک دینے کے لئے آتا ہے اور دوسرا لینے کے لئے - اور دینے والا ہمیشہ مطلوب ہوتا ہے اور لینے والا ہمیشہ غیر مطلوب -

باربیڈوز میں ہندستان سے آئے ہوئے کافی لوگ ہیں - یہ برطانی شہنشاہیت کے زمانہ میں یہاں لائے گئے - برطانیہ نے اپنے عروج کے زمانہ میں دنیا کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا - ان میں بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی شامل تھے - انہیں میں کریبین سمندر کے کئی جزائر بھی شامل ہیں جن میں سے ایک باربیڈوز ہے - سو سال پہلے یہ

جزیرے زیادہ تر غیر آباد تھے ۔ مگر ان پر قدرتی وسائل کافی مقدار میں موجود تھے ۔ برطانیہ نے انیسویں صدی کے آخر میں ان جزائر کے وسائل کو استعمال کرنے کے لئے باہر سے مزدور بھرتی کئے اور ان کو پانی کے جہازوں کے ذریعہ لاکر یہاں بسایا ۔ باربیڈوز میں زیادہ تر گنے کی کاشت کے لئے یہ مزدور لائے گئے ۔ کسی جزیرہ میں قیمتی لکڑی تھی اور وہ برطانیہ کو اپنے فرنیچر اور اپنے مکانوں کی تعمیر کے لئے مطلوب تھی ۔ وغیرہ ۔ ان مقاصد کے تحت ابتداءً ان جزائر میں مزدور قسم کے لوگ لائے گئے ۔ تاہم اب ترقی کرتے کرتے ان جزائر کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ۔ یہاں ہندستان کے مقابلہ میں کمائی زیادہ کی جاسکتی ہے اور پر امن طور پر رہا جاسکتا ہے ۔

سابق مسلمانوں کے لڑکے اور پوتے اب تعلیم یافتہ ہو کر ایک ترقی یافتہ ملک کے شہری بن گئے ہیں ۔ باربیڈوز میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً پانچ سو ہے ۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ ہندو صاحبان کی بڑی بڑی دکانیں اور اسٹور ہیں ۔ مسلمانوں کی زیادہ تعداد پھیری کرکے مال فروخت کرتی ہے ۔ ان کی یہ پھیری کاروں پر ہوتی ہے ۔

مقامی باشندے ان مسلمانوں کو قلی مان (قلی مین) کہتے ہیں ـــــــ ہندستان میں مسلمانوں کو ہندوؤں سے شکایت ہے ۔ مگر باربیڈوز میں وہ اپنے سوا کس کو پائیں گے جس کی شکایت کریں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ اور تابعین اس طرح دنیا میں پھیلے کہ وہ ہر ملک میں اور ہر مقام پر نظر آنے لگے ۔ آج بھی یہ حال ہے کہ آپ جس ملک میں جائیں اور جس علاقہ کو دیکھیں وہاں آپ مسلمانوں کو پائیں گے ۔ تاہم ظاہری یکسانی کے باوجود دونوں واقعات میں زبردست فرق ہے ۔ صحابہ اور تابعین کو دعوت کے محرک نے پھیلایا تھا ، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو معاش کے محرک نے ۔ صحابہ اور تابعین اس تڑپ کے تحت سارے عالم میں پھیل گئے کہ وہ دوسری قوموں کو حق کا پیغام پہنچائیں اور موجودہ مسلمان صرف اس لئے پھیلے ہیں کہ وہ دوسروں کے مادی دسترخوان میں سے اپنے لئے کچھ حصہ لے سکیں ۔ ہمارے اسلاف دینے کے لئے گئے تھے اور ہم لینے کے لئے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ہر جگہ مقامی آبادی کا مطلوب اور محبوب بنے اور ہم ہر جگہ صرف مبغوض (بن) رہے ہیں ۔

بار بیڈوز میں (اور اس طرح کے دوسرے مقامات پر) جو مسلمان ابتداءً آئے تھے، ان کی اکثریت قدیم اسلامی (بالفاظ دیگر مشرقی) انداز زندگی پر قائم ہے۔ مگر ان کی نئی نسل کا رنگ بالکل دوسرا ہے۔ یہ لوگ مغرب کے آزاد ماحول سے شدت کے ساتھ متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی مادری زبان کم اور انگریزی زبان زیادہ سمجھتے ہیں۔ مغربی کلچر اور مغربی فکر ان کے اندر تیزی سے سرایت کر رہا ہے۔ ان کے بڑے ان سے کسی بات کے لئے کہتے ہیں تو وہ نہایت آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ میرے لئے نہیں (Not me) یا یہ میرا کام نہیں ہے:

It's not my business

نقشہ سامنے رکھئے۔ ایک طرف یورپ اور افریقہ ہے اور دوسری طرف امریکی براعظم کے دونوں حصے۔ درمیان میں اٹلانٹک سمندر ہے۔ اگر اٹلانٹک کی دونوں خشکی کو قریب لایا جائے تو دونوں اس طرح ایک دوسرے سے مل جائیں گے جیسے کہ وہ ایک ہی ٹکڑا تھا جس کو توڑ کر الگ الگ کر دیا گیا۔ جدید جغرافی تحقیق کے مطابق یہ محض قیاس نہیں۔ بلکہ واقعہ ہے۔ ماضی میں فی الواقع یہ دونوں خشکی کے ٹکڑے آپس میں ملے ہوئے تھے، پھر وہ ٹوٹ کر جدا ہو گئے۔ اس نظریہ کو جغرافی اصطلاح میں انتشار براعظم (Drifting Continent) کہا جاتا ہے۔ بار بیڈوز اسی علاقہ میں بحر اٹلانٹک کے انتہائی مغربی کنارے پر واقع ہے۔

ہوائی جہاز کی انفلائٹ میگزین میں بحر اٹلانٹک اور اس کے دونوں طرف خشکی کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا —— ہم آپ کو اٹلانٹک کے اس پار ایک عظیم ہوٹل میں اتار سکتے ہیں:

We can land you in a great hotel across the Atlantic

۲۹ مارچ ۱۹۸۳ کو میرے ساتھ گویا اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ میں ہندستان سے چل کر بار بیڈوز کے ہوٹل سام لارڈ کیسل (Sam Lord's Castle) میں پہنچا تو نہ صرف بحر اٹلانٹک بلکہ خشکی کا بھی بڑا حصہ طے کر چکا تھا۔ چنانچہ ہندستان میں میں مغرب کی سمت نماز ادا کرتا تھا۔ مگر بار بیڈوز میں مجھے مشرق کی جانب نماز ادا کرنی پڑی۔

براعظم امریکہ کے دونوں خشکی کے ٹکڑوں کے درمیان میں تقریباً بیس جزیرے ہلال کی صورت میں ہیں جن کو "سمندر کا ہار" کہا جاتا ہے۔ انہیں میں سے ایک جزیرہ

بار بیڈوز (Barbados) ہے۔ اس جزیرہ کا دارالسلطنت برج ٹاؤن (Bridgetown) ہے۔ اسی مقام پر دوسری کریبین اسلامک کانفرنس ہوئی جو ۳۱ مارچ سے لیکر ۴ اپریل ۱۹۸۳ تک جاری رہی۔

باربیڈوز کا نام اس جزیرہ کو پرتگیزیوں نے دیا۔ پرتگیزی سب سے پہلے ۱۵۳۶ء میں اس جزیرہ سے گزرے۔ اس وقت یہ جزیرہ بالکل غیر آباد تھا۔ یہاں کے ساحلوں پر اس وقت خاص طرح کے درختوں کی کثرت تھی جن میں ریشے لٹکتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر پرتگیزیوں نے کہا (Los Barbados) یہ اسپینی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں۔ " داڑھی والا" یہ کہہ کر پرتگیزی آگے بڑھ گئے۔ اس کے بعد ۱۶۴۵ء میں انگریز یہاں آئے تو انہوں نے اسی نام کے ساتھ اس کو آباد کیا۔

باربیڈوز کے خوبصورت ہوٹلوں میں سب سے زیادہ عام منظر یورپ اور امریکہ کے سفید فام سیاح ہیں جو نیم برہنہ لیٹے، بیٹھے یا گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان مردوں اور عورتوں کا کام صرف دو ہے ——— شراب پینا اور باہم عیش کرنا۔ ان میں سے کچھ افراد سے ہماری باتیں ہوئیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا واقعی انہیں زندگی کی لذت حاصل ہے۔ ان کی گفتگو اور ان کے مشاہدے سے میں نے یہی سمجھا کہ وہ صرف لذت کی تلاش میں ہیں۔ عملاً انہیں ان کی مطلوبہ لذت حاصل نہیں۔

مغرب کے لوگ شادی کرتے ہیں۔ جب اس سے انہیں مطلوبہ لذت نہیں ملتی تو طلاق دے کر دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ اس سے بھی مقصد حاصل نہیں ہوتا تو آزاد معاشرہ (Permissive Society) کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی تو ننگے پن کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہ انہیں چیزوں میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مایوسی کے عالم میں مرجاتے ہیں۔ ان کا یہ ناکام خاتمہ صرف اس نادانی کی قیمت ہے کہ انہوں نے موجودہ زندگی میں وہ چیز حاصل کرنی چاہی جو موجودہ دنیا میں ملنے والی نہیں۔

باربیڈوز کی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے اس کو مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ مثلاً:

Tropical Paradise—Happiness Island—Jewel of the Caribbean

جزیرہ باربیڈوز اٹلانٹک کے ہار کا ایک موتی کہا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی صرف ۲۱ میل

اور چوڑائی ۱۱ میل ہے ۔ کل رقبہ ۱۶۶ میل ہے ۔ اس کی صورت تقریباً سری لنکا جیسی ہے ۔ یہاں آپ انٹرنیشنل ڈرائیور لائسنس پر گاڑی چلا سکتے ہیں ۔ ایسے آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ جب وہ ہوائی اڈہ پر اترے تو وہاں پندرہ ڈالر (بار بیڈین) دے کر اپنا نام رجسٹر کرالے ۔

بار بیڈوز میں قتل اور اس طرح کے دوسرے جرائم نہیں ہوتے ۔ اس لئے یہاں وردی پوش پولس بھی کہیں نظر نہیں آتی ۔ یہاں کی کل آبادی ۲۵۰۰۰۰ ہے ۔ بار بیڈوز کے لوگوں کا نظریہ بس کھانا کمانا اور خوش رہنا ہے ۔ یہاں ہر قسم کے کھیلوں کا انتظام ہے ۔ سب سے پہلے سولہویں صدی میں جنوبی امریکہ کے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے ۔ اس کے بعد یہ جزیرہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا ۔ ۱۹۶۶ میں بار بیڈوز نے برطانیہ سے سیاسی آزادی حاصل کی ۔ اب وہ کامن ویلتھ کا ممبر ہے ۔

بار بیڈوز لندن سے ۴۷۵۰ میل دور واقع ہے ۔ مگر وہ برطانی کلچر سے اتنا زیادہ متاثر ہے کہ اس کو چھوٹا انگلینڈ (Little England) کہا جاتا ہے ۔ آب و ہوا بہت اچھی ہے ۔ آبادی تقریباً سب کی سب عیسائی ہے ۔ خاص پیداوار شکر ہے ۔ اس کے بعد آمدنی کے ذرائع مچھلی اور سیاحت اور جہاز رانی ہیں ۔ رسمی طور پر یہاں کی حکمراں ملکہ برطانیہ ہے ۔ انگریزی زبان بار بیڈوز کی سرکاری زبان ہے ۔

بار بیڈوز سیاحوں کا جزیرہ ہے ۔ یہاں تفریح مذہب ہے ۔ بار بیڈوز کی تعارفی کتاب میں ہم کو یہ جملہ لکھا ہوا ملا کہ کرکٹ ہمارا دوسرا مذہب ہے :

Our second religion is Cricket

بار بیڈوز کے اخبارات میں سیاحوں کے تاثرات چھپتے رہتے ہیں ۔ ہم نے اخبار وزیٹر (۲۸ مارچ ۱۹۸۳) میں کناڈا کے باب ینگ (Bob Young) کے تاثرات پڑھے ۔ وہ بارہ سال سے ہر سال اپنی چھٹیاں گذارنے بار بیڈوز آتے ہیں ۔ انہوں نے بار بیڈوز کے سکون اور خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ بار بیڈوز میں ہمیشہ رہوں :

I just want to stay in Barbados forever

آدمی ابدی جنت چاہتا ہے مگر اس کو موجودہ زندگی میں صرف وقتی جنت دی گئی ہے ۔ ہندستان سے نکل کر کریبین سمندر میں پہنچنا گویا کرہ ارض کا تقریباً نصف حصہ طے

کرنا ہے: اس قسم کا سفر کیسا عجیب ہے، اس کا تصور آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ جب میں ہندستان میں تھا تو گویا میں زمین کے اوپر کھڑا ہوا تھا۔ مگر جب میں اپنی منزل پر پہنچا تو ہندستان کی نسبت سے وہاں میں زمین کے نیچے لٹکا ہوا تھا۔

میرا قیام سام لارڈ کیسل کے کمرہ نمبر ۲۲۴ میں تھا۔ یہ ہوٹل دراصل ایک ریزورٹ (Resort) ہے جو سمندر کے کنارے ۷۲ ایکڑ رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے کمرہ کے ایک طرف سرسبز پھولوں کا قدرتی منظر تھا۔ اور دوسری طرف بحر اٹلانٹک کا پانی ہر وقت موجیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ایک ایسا ماحول تھا جہاں ایک طرف اتھاہ سمندر خدا کی عظمت کا اعلان کر رہا تھا۔ دوسری طرف پھولوں اور درختوں کا ہرا بھرا منظر اور ان میں اڑتی ہوئی چڑیوں کی آوازیں خدائی حمد کے نغمے بکھیر رہی تھیں۔ دہلی اور بمبئی میں آدمی اپنے آپ کو تمدن کے پنجرے میں بند پاتا ہے۔ یہاں وہ ہر آن محسوس کرتا ہے کہ ہم خدا کے پڑوس میں ہیں۔ ہم قدرت کی فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں۔

بار بیڈوز میں میں نے جو چیزیں دیکھیں ان میں ایک خاص چیز ہیرلیسن غار (Harrison's Cave) تھے۔ یہ غار اولاً ایک مغربی سیاح نے دریافت کئے۔ ان غاروں کے اندر قدرت کے بعض عجیب مناظر ہیں اور ان کے اندر آبشار اور چشمے جاری ہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً ایک میل کی لمبائی میں سرنگ کھود کر سڑک بنائی گئی ہے۔ اس کے اندر خاص طرح کی ٹرام کے ذریعہ دیکھنے والے اندر جاتے ہیں۔ اور مصنوعی روشنی میں غار کے مناظر دیکھ کر باہر آتے ہیں۔

غار کے وسط میں پہنچ کر ایک منٹ کے لئے تمام روشنیاں بجھا دی جاتی ہیں تاکہ زائرین کو غار کے اندر کی صورت حال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ہم نے ۱۶ اپریل کو یہ غار دیکھے۔ اندر پہنچ کر جب روشنی بجھائی گئی تو وہاں مکمل تاریکی تھی۔ کسی بھی قسم کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آنکھ رکھتے ہوئے ہم سب لوگ اندھے تھے۔ غار کے باہر سورج روشن تھا۔ مگر غار کے اندر تاریکی ہی تاریکی تھی۔ روشنی خدا کا ایک عجیب و غریب انعام ہے۔ اگر خدا کسی سے روشنی واپس لے لے تو اس کے بعد اس کے لئے اس دنیا میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔

کانفرنس میں کریبین جزائر کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ دیگر

ممالک کے اہل علم بھی معقول تعداد میں مدعو تھے۔ مجموعی طور پر تقریباً دو درجن ملکوں کی نمائندگی یہاں موجود تھی۔ ڈیلی گیٹوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ تھی۔

کانفرنس کی کارروائی ۳۱ مارچ ۱۹۸۳ کی شام کو تلاوت قرآن سے شروع ہوئی۔ پہلے دن افتتاحی کارروائی کے بعد صدر کانفرنس کا خطاب ہوا۔ اگلے دنوں میں چھ مقالے پیش ہوئے۔ ہر مقالہ اولاً پڑھا گیا اور اس کے بعد اس کے بارہ میں سوال و جواب ہوا۔

پروگرام کے مطابق یہاں تین دن کے اندر چھ مقالے پیش کئے گئے۔ پہلا مقالہ میرا تھا جو ۲ اپریل ۸۳ کو پیش کیا گیا۔ یہ علاقہ چونکہ مغربی علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کی مادری زبان انگریزی ہے۔ کانفرنس کی تمام کارروائی انگریزی میں ہوئی۔ اس لئے یہ مقالہ میں نے انگریزی میں تیار کیا۔ مقالہ تقریباً ۴۵ منٹ کا تھا۔ مقالہ پڑھنے کے بعد لوگوں نے سوالات کئے جن کے جوابات بھی میں نے انگریزی میں دئے۔

یہ میری زندگی میں غالباً پہلا موقع تھا کہ میں نے انگریزی میں مقالہ پیش کیا اور انگریزی زبان میں لوگوں کے سوالات کے جواب دئے۔ امریکہ کے ایک نومسلم عبداللہ مصطفیٰ (قدیم نام اسٹیوا سکلر) کئی بار ہمارے دفتر میں آئے ہیں۔ میرے خیالات سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ آپ کے لئے دعوتی کام کا اصل میدان امریکہ ہے۔ دوسرے حضرات جو اس وقت وہاں اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں آپ کا انداز دعوت مغرب کو زیادہ اپیل کرنے والا ہے۔ میں نے کہا امریکہ میں کام انگریزی زبان میں کرنا ہوگا۔ اور مجھ کو انگریزی بولنے کی زیادہ مشق نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آخر مجھ سے آپ انگریزی میں بات کرتے ہیں اور میں اچھی طرح آپ کے نقطہ نظر کو سمجھ لیتا ہوں۔ آپ کا انداز سائنٹفک ہوتا ہے اس لئے وہ جلد سمجھ میں آجاتا ہے۔ مجھے ابھی تک عبداللہ مصطفیٰ صاحب کی بات پر زیادہ یقین نہیں تھا۔ مگر باربیڈوز کی کانفرنس کے تجربہ کے بعد اس بارے میں اب خدا کے فضل سے مجھے اعتماد ہوگیا ہے۔

میں نے اپنا مقالہ ۲ اپریل ۱۹۸۳ کی صبح کی نشست میں پڑھا۔ مقالہ ختم کرنے کے فوراً بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی اعتراض کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر انہوں نے یہ کہا کہ یہ مقالہ ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف ایک بار پڑھ دیا جائے۔ یہ

مستقل اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہم سب لوگوں کو اس کے ایک ایک نسخے فراہم لئے جائیں۔ صدر اجلاس کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ مقالہ کی کاپیاں تیار کی جا رہی ہیں در اسی اجلاس کے دوران وہ تمام لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اگلے دن مقالہ کی مطبوعہ کاپی ہر شریک اجتماع کی میز پر موجود تھی۔

پانچ دن کی ہر نشست قرآن کی تلاوت سے شروع ہوئی۔ مسلمانوں کا ہر اجتماع ہمیشہ قرآن کی تلاوت سے شروع ہوتا ہے۔ جب بھی اس طرح کا موقع آتا ہے تو مجھ پر ایک عجیب احساس ہوتا ہے۔ قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ہر صفحہ پر آخرت اور جنت اور دوزخ کا بیان ہے۔ چنانچہ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ قاری پڑھتا ہے تو اس میں ہمیشہ آخرت کا اور جنت دوزخ کا بیان انتہائی شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی وہ بات جو بطور "تلاوت" ہر اجتماع میں دہرائی جاتی ہے وہی آج تک میرے کانوں نے خود اجتماع کی کارروائیوں میں کہیں نہیں سنی۔ دوسرے لوگ جو کسی اجتماع سے لوٹ کر آتے ہیں ان سے بھی جب متعلقہ اجتماع کی کارروائی کے بارہ میں میں پوچھتا ہوں تو ہمیشہ ایسی تفصیلات سننے کو ملتی ہیں جن میں سب کچھ ہوتا ہے مگر یہی ایک چیز نہیں ہوتی۔ اجتماع کا خاتمہ ۴ اپریل ۱۹۸۳ کو قرآن کی تلاوت اور دعاء پر ہوا۔

ڈاکٹر معتوق الزبیدی نے اپنی تقریر میں ایک ایمان افروز واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ویٹکن کے پوپ نے ساحل العاج (Ivory Coast) کا دورہ کیا۔ پوپ کی آمد پر حکومت نے ہدایت جاری کی کہ تمام لوگ، خواہ وہ جس مذہب کے بھی ہوں، پوپ کے استقبال کے لئے نکلیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی اس عمومی حکم کے تحت نکلنا پڑا۔ مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ میدان میں جمع ہوئے۔ وہاں ظہر کا وقت آگیا۔ مسلمانوں نے یہ کیا کہ وہیں بلند آواز سے اذان دی اور میدان میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پوپ نے باجماعت نماز کا منظر دیکھا تو اس پر بہت اثر ہوا۔ پوپ نے کہا: جب تک مسلمان کے اندر یہ اتحاد اور اسپرٹ باقی ہے ہمارا وجود یہاں بالکل بے معنی ہے۔

ایک مصری عالم (عبد المنعم الخطاب) جو امریکہ میں رہتے ہیں، نے بتایا کہ امریکہ کے بلیک مسلم آج اس سے مختلف ہیں جو اس کے ابتدائی بانی ایلیجا محمد کے زمانہ میں تھے۔

ایلجا محمد سفید فام تہذیب کا ردعمل تھے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام صرف کالوں کا مذہب ہے۔ جنت میں کالے لوگ جائیں گے۔ انہوں نے رسول خدا ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔

مگر بلیک مسلم کے موجودہ قائد جو ایلجا محمد کے لڑکے ہیں، جن کا اصل نام اکبر ہے انہوں نے الازھر (قاہرہ) میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد بلیک مسلم طبقہ کے لوگ کثرت سے مسلم ممالک میں گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو دیکھا۔ وہ حج کرنے گئے۔ ان تجربات نے ان میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ خاص طور پر حج میں انہوں نے دیکھا کہ کالے اور گورے قسم کے لوگ ایک ہی قسم کا لباس پہنے ہوئے کعبہ کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ اب بھی اگرچہ بلیک مسلموں میں کچھ خرابیاں ہیں مگر اب انہیں پہلے کی طرح گمراہ نہیں کہا جا سکتا۔

کانفرنس کی کارروائیاں شہر (برج ٹاؤن) سے باہر ایک ہوٹل میں ہوئیں۔ برج ٹاؤن میں پانچ سو سے کچھ زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور شہر جانے کے لئے اصرار کیا۔ چنانچہ میں کانفرنس سے فارغ ہو کر شہر چلا گیا۔ اور وہاں چار روز برابر قیام رہا۔

باربیڈوز میں مسلمان نسبتاً زیادہ ہیں۔ تاہم کریبین کے اکثر جزیروں میں مسلمان آباد ہیں۔ یہ لوگ ابتداءً برطانی سلطنت کے زمانہ میں انیسویں صدی میں یہاں آئے انگریز ان کو زرعی مزدور کے طور پر یہاں لائے تھے۔ اب یہ لوگ یہاں کے باشندے ہیں اور زیادہ تر تجارت کا کام کرتے ہیں۔

باربیڈوز (برج ٹاؤن) میں دو مسجدیں ہیں۔ دونوں آباد ہیں۔ ان دونوں مسجدوں میں اور مسجد کے باہر میری چند تقریریں ہوئیں۔ لوگ بہت دلچسپی کے ساتھ سنتے تھے وہ مصر تھے کہ میں مزید کچھ دن باربیڈوز میں ٹھہروں۔ کچھ لوگ مجھ کو باصرار ٹرینیڈاڈ لے جانا چاہتے تھے۔ اور وہاں کم از کم دو ہفتہ کا پروگرام رکھ رہے تھے۔ مگر بعض فوری کاموں کی وجہ سے مجھے دہلی جلد واپس آنا ضروری تھا اس لئے میں ٹرینیڈاڈ (Trinidad) کا سفر نہ کر سکا۔

باربیڈوز میں جو مسلمان ہیں وہ زیادہ تر گجرات (ہندستان) کے علاقہ سے آئے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر پھیری کی تجارت کرتے ہیں۔ وہ برج ٹاؤن کی بڑی بڑی

دکانوں سے مختلف مال (مثلاً کپڑا وغیرہ) خریدتے ہیں اور اس کو کار پر رکھ کر بستیوں میں جاتے ہیں اور ادھار فروخت کرتے ہیں۔ ان کا کاروبار زیادہ تر ان لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جو نقد ادائگی کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور سامان خرید کر قسطوں میں اس کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یہ مسلمان تاجر دونی قیمت پر ان کے ہاتھ مال بیچتے ہیں اور عام دکانداروں سے زیادہ نفع کماتے ہیں۔ یہاں کی زبان میں ان کو "قلی مان" کہا جاتا ہے۔ یعنی "قلی مین"۔

باربیڈوز کے لوگ اب اس حقیقت کو جاننے لگے ہیں۔ ۵ اپریل ۱۹۸۳ کو اسی قسم کے ایک مسلمان مجھے اپنی تجارتی گاڑی پر لے کر جا رہے تھے۔ ہم لوگ یہاں کا ایک تاریخی مقام دیکھنے جا رہے تھے۔ راستہ میں باربیڈوز کے کچھ عیسائی نوجوان ملے جو مذکورہ "قلی مان" کے گاہک تھے۔ ایک نوجوان نے ان کو دیکھا تو ہنس کر کہا ـــــ تم غریب کو دھوکہ دے کر لوٹنے جا رہے ہو:

You are going to cheat the poor

اس نوجوان نے یہ بات اگرچہ مذاق کے طور پر کہی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ یہاں کی نئی نسل میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ ہندستانی لوگ ان کو لوٹتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں کے ہندستانی مسلمانوں کے لئے عقل مندی یہ ہے کہ وہ اپنے کو حالات کے مطابق بنالیں قبل اس کے کہ مذاق حقیقت کی صورت اختیار کرلے۔

"قلی مان" لوگوں کا کام چونکہ کار کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے تھوڑے دنوں میں وہ ایک "شاندار" کار خرید لیتے ہیں۔ اب مقامی لوگ جب ان کو شاندار کاروں میں سفر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والوں کے پاس شاندار کاریں ہیں اور ہمارے پاس کچھ نہیں۔ کار کو چلتی پھرتی دکان کی صورت دینا بہت عمدہ ہے مگر موجودہ حالت میں وہ غیر ضروری طور پر مسلمانوں کی خوشحالی کا چلتا پھرتا اعلان بن گیا ہے اور مقامی باشندوں میں ان کے خلاف حسد اور رقابت کے جذبات کو بڑھا رہا ہے۔

۸ اپریل ۱۹۸۳ کو میں نے باربیڈوز سے نیویارک کے لئے سفر کیا۔ بی ڈبلیو آئی اے (BWIA) کی فلائٹ سے پانچ گھنٹہ کی پرواز تھی۔ باربیڈوز سے نیویارک کا سفر پورا کا پورا

اٹلانٹک کے اوپر ہوا۔ پانچ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ہم جان کنیڈی ایرپورٹ پر اترے۔ یہ امریکی ایرپورٹ کافی بڑا ہے مگر وہ مجھ کو جدہ کے بین اقوامی ایرپورٹ سے کم شاندار نظر آیا۔

مجھے بعض ضرورتوں کے تحت جلد دہلی پہنچنا تھا۔ اس لئے اصرار کے باوجود میں باربیڈوز میں کم ٹھہرا اور وہاں سے ٹرینیڈاڈ بھی نہ جاسکا۔ چنانچہ میں نیویارک میں بھی زیادہ قیام نہ کر سکتا تھا۔ صرف ایک دن وہاں گزارے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک امریکن مل گیا۔ یہ سیکورٹی گارڈ کا ایک افسر تھا اور بہت شریف اور معقول آدمی تھا۔ اس سے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اپنی بعض انگریزی چیزیں اس کو دیکھنے کے لئے دیں۔ اور پھر اس سے کہا کہ نیویارک میں میرے لئے زیادہ قیام کا وقت نہیں ہے۔ البتہ میں نیویارک کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بخوشی راضی ہو گیا۔ اس نے مجھ کو اپنی گاڑی پر بیٹھایا اور نیویارک کی سڑکوں پر گھماتا رہا۔ اس طرح چند گھنٹوں کے اندر میں نے نیویارک شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی۔

مگر یہاں بھی وہی بات پیش آئی جو میں نے کنیڈی ایرپورٹ کے بارے میں لکھی ہے۔ نیویارک کی ظاہری عظمتوں میں مجھے ایک قسم کی پستی لپٹی ہوئی نظر آئی۔ یہاں کی اونچی اونچی عمارتیں مجھے عمودی سلم (Vertical Slum) کے روپ میں دکھائی دیں۔ اس کی مادی رونقوں میں روحانی تاریکی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں مادی ترقی کے قبرستان میں پہنچ گیا ہوں نہ کہ کسی قسم کی مادی ترقیات کی جنت میں۔

آخر میں جب مذکورہ امریکی نے مجھے ہوائی اڈہ پر لاکر چھوڑا تو میں نے اس کا نام و پتہ پوچھا۔ اس نے اپنا نام لوئی (Mr. Louis) بتایا۔ مگر پتہ بتانے سے یہ کہہ کر معذرت کر دی ——— "ہم سیکورٹی کے لوگ ہیں، ہم کو اپنا پتہ بتانے کی اجازت نہیں"

میرا یہ سفر دہلی سے شروع ہوا۔ اور لندن، باربیڈوز اور نیویارک ہوتا ہوا دوبارہ دہلی پر ختم ہوا۔ اس پورے سفر کی مسافت تقریباً ۲۴ ہزار میل تھی، یعنی تقریباً اتنی ہی جتنی زمینی گولائی کی کل مسافت ہے۔

مختصر مدت میں یہ طویل سفر طے کر کے میں ۲۰ اپریل ۱۹۸۲ کو ایرانڈیا کی فلائٹ نمبر ۱۱۰ سے دہلی ایرپورٹ پر اترا تو میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ قیامت قریب آگئی ہے اور خدا نے مادہ (Matter) کو حکم دے دیا ہے کہ وہ زندگی کے سفر کو

انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ تمام کردے تاکہ خدا اپنی آخری عدالت قائم کرے جہاں خدا کے گواہ لوگوں کے بارہ میں اپنی گواہیاں پیش کریں اور ہر ایک کے لئے اس کے عمل کے مطابق ابدی جنت یا ابدی جہنم کا فیصلہ کر دیا جائے۔

آج زمین پر بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں مگر وہی کام نہیں ہو رہا ہے جو سارے تخلیقی منصوبہ کا اصل مطلوب ہے۔ یعنی حمد خداوندی۔ موجودہ انسانی دنیا اپنے وجود کا جواز کھو چکی ہے۔ اب آخری طور پر وہ لمحہ آچکا ہے جب کہ موجودہ امتحانی دنیا کو ختم کر دیا جائے اور وہ معیاری دنیا شروع ہو جہاں خدا کے سوا کسی اور کی حمد نہ کی جاسکے۔ جو حقیقی بھی ہو اور اسی کے ساتھ ابدی بھی۔

اس کے باوجود موجودہ دنیا کیوں ختم نہیں کی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو ایک آخری عمل کا انتظار ہے جو ابھی تک ان ہوا پڑا ہے۔ یہ عمل ہے آج کے انسانوں کے اوپر اتمام حجت۔ جب تک یہ نہ ہو کہ دعوت حق اٹھائی جائے اور اس کو ابلاغ تام کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اس وقت تک موجودہ دنیا کا خاتمہ ممکن نہیں۔ اس عمل کی تکمیل تک قیامت معلق پڑی رہے گی۔ خدا کو آج سب سے زیادہ اعلان حق کا انتظار ہے۔ مگر دین کے نام پر بے شمار سرگرمیوں کے باوجود یہی وہ کام ہے جس کا کرنے والا کوئی نہیں۔ ہر آدمی خود ساختہ دین کی تبلیغ میں مصروف ہے نہ کہ حقیقۃً خدا کے دین کی تبلیغ میں۔

مسلمانوں میں اسلام کی دھوم تو درکنار ہندستان کے ہندوؤں یا افریقہ کے مشرک قبیلوں میں دین کا پیغام پہنچانے سے بھی اتمام حجت کی وہ شرط پوری نہیں ہوتی جو آج خدا کو مطلوب ہے۔ آج خدا کو عالمی اتمام حجت کا انتظار ہے اور عالمی اتمام حجت صرف اس وقت متحقق ہوگا جب کہ وہ ان قوموں پر انجام دیا گیا ہو جن کو آج کی دنیا میں لیڈر شپ کا مقام حاصل ہے۔ یعنی مغربی قومیں، خاص طور پر امریکہ۔ جن قوموں کو آج عالمی لیڈر شپ کی حیثیت حاصل ہے ان پر اتمام حجت ہی سے عالمی اتمام حجت کی شرط پوری ہوگی اور اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ خدا اسرفیل کو حکم دے کہ اب صور پھونک دو تاکہ تخلیقی منصوبہ کے آخری مرحلہ کی تکمیل کی جاسکے۔

مسلمانان عالم کو آج یہی کام انجام دینا ہے۔ اسی پر ان کی قسمت کا آخری فیصلہ معلق ہے، دنیا کی قسمت کا بھی اور آخرت کی قسمت کا بھی۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول لے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱ - تذکیر القرآن جلد اوّل	ہدیہ ۵۰/-
۲ - الاسلام	۱۵/-
۳ - مذہب اور جدید چیلنج	۲۰/-
۴ - ظہور اسلام	۲۰/-
۵ - احیاء اسلام	۱۲/-
۶ - پیغمبر انقلاب	۲۰/-
۷ - دین کیا ہے	۲/-
۸ - قرآن کا مطلوب انسان	۵/-
۹ - تجدید دین	۳/-
۱۰ - اسلام دین فطرت	۳/-
۱۱ - تعمیر ملت	۳/-
۱۲ - تاریخ کا سبق	۳/-
۱۳ - مذہب اور سائنس	۵/-
۱۴ - عقلیات اسلام	۳/-
۱۵ - فسادات کا مسئلہ	۲/-
۱۶ - انسان اپنے آپ کو پہچان	۱/-
۱۷ - تعارف اسلام	۲/۵۰
۱۸ - اسلام پندرھویں صدی میں	۲/-
۱۹ - راہیں بند نہیں	۳/-
۲۰ - ایمانی طاقت	۳/-
۲۱ - اتحاد ملت	۳/-
۲۲ - سبق آموز واقعات	۳/-
۲۳ - زلزلۂ قیامت	۴/-
۲۴ - حقیقت کی تلاش	۳/-
۲۵ - پیغمبر اسلام	۲/-
۲۶ - منزل کی طرف	۱/-
۲۷ - حقیقت حج	(زیر طبع)
۲۸ - Mohammad The Ideal Character	3/-

تعارفی سٹ

۲۹ - سچا راستہ	۱/-
۳۰ - دینی تعلیم	۳/-
۳۱ - حیات طیبہ	۲/۵۰
۳۲ - باغ جنت	۳/-
۳۳ - نار جہنم	۳/-

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

زندگی کا راز یہ ہے کہ ——

آدمی اس حقیقت کو جان لے کہ ہر پھول کے ساتھ
ایک کانٹا ہوتا ہے اور ہر کانٹے کے ساتھ ایک پھول

جولائی ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۸۰

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جولائی ۱۹۸۳
شمارہ ۸۰

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

نکلی ہوئی جماعتیں

ایک ہپی دہلی کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جسم پر سادہ کھردرے کپڑے، گلے میں مالا، ہاتھ میں کڑا اور کندھے پر ایک چھوٹی ڈھولک۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ کناڈا کا رہنے والا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ کناڈا میں اس کے پاس ذاتی مکان، ذاتی کار، ایک اچھی بیوی اور عمدہ ملازمت تھی۔ اس کے بعد اس نے کہا: مگر یہاں میرا کوئی گھر نہیں۔ جہاں بھی نیند آتی ہے سو جاتا ہوں، چاہے وہ فٹ پاتھ کیوں نہ ہو۔ میرے پاس یہاں کوئی سواری نہیں۔ ملازمت نہیں۔ میری بیوی مجھ کو چھوڑ چکی ہے۔ "یہ جو بال اور داڑھی آپ بڑھی ہوئی دیکھ رہے ہیں، یہ صرف پچھلے چھ مہینہ کی پیداوار ہیں" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ کے اندر سے اپنا پاسپورٹ نکالا۔ پاسپورٹ کی سابقہ تصویر میں وہ ایک خوبرو نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔

"پھر آپ نے کناڈا جیسے ملک کو چھوڑ کر انڈیا کو کیوں پسند کیا" اس کے جواب میں اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ رک رک کر یہ الفاظ کہے:

There I was comfortable physically.
Here I am comfortable spiritually

وہاں مجھ کو جسمانی سکون تھا، یہاں مجھ کو روحانی سکون ہے۔ (الجمعیۃ ویکلی ۱۰ جولائی ۱۹۷۰)

تبلیغی جماعت مسلمانوں میں دینی بیداری کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔ اس کی کامیابی کا خاص راز وہ "تدبیر" ہے جو اس سلسلے میں اس نے اختیار کی ہے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے ماحول سے نکال کر باہر لے جایا جائے۔ آدمی اپنے ماحول میں دنیوی مسائل میں مشغول رہتا ہے۔ اس کا ذہن دینی امور پر سوچنے کے لئے فارغ نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ اپنے ماحول کو چھوڑ کر باہر کی دنیا میں آجاتا ہے تو اس وقت اس کا ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس سے کہا جائے اس کو سنے اور پکڑے۔

مغرب کے یہ ہپی گویا غیر مسلموں میں سے اسی قسم کے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ اپنے آپ نکلی ہوئی جماعتیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلموں کی ان نکلی ہوئی جماعتوں کو دین سکھانے کے لئے اسی طرح استعمال کیا جائے جس طرح تبلیغی جماعت مسلمانوں کو باہر نکال کر انہیں دین سکھانے کی مہم چلا رہی ہے۔

بڑی چھلانگ کب

امریکی خلاباز آرمسٹرانگ (Neil Armstrong) نے جولائی ۱۹۶۹ میں پہلی بار چاند پر قدم رکھا تھا۔ جب وہ اپنی خلائی مشین کے ساتھ چاند پر اترا تو امریکہ کے مشن کنٹرول کو اس کے یہ الفاظ موصول ہوئے: یہ ایک آدمی کے لئے ایک چھوٹا قدم ہے مگر انسانیت کے لئے وہ ایک عظیم چھلانگ ہے:

That's one small step for a man, one giant leap for mankind

آرمسٹرانگ اور اس کے دو ساتھی امریکہ کے ۳۰ بہترین خلابازوں میں سے چنے گئے تھے۔ ان کے اندر وہ خصوصیات امتیازی درجہ میں موجود تھیں جو اس مشکل تاریخی مہم کے لئے درکار تھیں —— پرواز میں غیر معمولی مہارت، ذہانت اور قوت، معلومات کو اخذ کرنے کی صلاحیت، برف کی طرح ٹھنڈا ہونے کے باوجود چیلنج کو بے خطر قبول کرنا۔ پھر ان کو شدید قسم کے تربیتی کورس سے گزرنا پڑا۔ مثلاً وہ دیر دیر تک گہرے پانی میں رہے تاکہ بے وزنی کی حالت کے عادی بن سکیں۔ انہوں نے بے شمار قسم کے ممکن ہنگامی حالات (Emergencies) کا تجربہ کیا۔ انہوں نے فلکیات، خلابازی، راکٹ کی پرواز کے کورس پڑھے۔ انہوں نے خلائی کمپیوٹر اور چاند کی طبیعیات کا مطالعہ کیا۔

ان کا ۳۱۰۰ ٹن کا اپالو ۱۱ ایک عظیم دیو معلوم ہوتا تھا۔ وہ ۳۶ منزلہ عمارت کے برابر اونچا تھا۔ اس کے اندر آٹھ ملین پرزے تھے اور ۹۱ انجن نصب تھے۔ سب سے اوپر وہ چھوٹی سی مشین (Columbia) تھی جس کے اندر خلابازوں کو بیٹھ کر اپنا سفر طے کرنا تھا۔

خلائی مشین نے اوپر بلند ہو کر ڈھائی گھنٹہ زمین کا چکر لگایا۔ اس کے بعد اس کی رفتار ۴۰۲ میل فی منٹ ہو گئی۔ ۳۰۰۰ میل کی بلندی پر پہنچ کر کولمبیا الگ ہو گئی۔ اس مشین کا نیچے اوپر تک تمام حصہ پرزوں سے بھرا ہوا تھا۔ خلابازوں کے بیٹھنے کے لئے مشکل سے اتنی جگہ تھی جتنی ایک ٹیکسی میں ہوتی ہے۔ بالآخر خلاباز چاند پر اترے۔ وہاں سے ۴۶ پونڈ مٹی لی۔ انہوں نے چاند کی سطح پر پانچ لاکھ پونڈ کے آلات چھوڑے۔ چاند کی سطح پر انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ اپنے قدموں کا نشان بھی چھوڑا جو وہاں تقریباً نصف ملین سال تک باقی رہے گا۔

اتنی زیادہ تیاریوں کے بعد وہ چھوٹا قدم اٹھایا جا سکا جس کا نتیجہ ایک بڑی چھلانگ ہو۔

اعلیٰ ظرفی

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سر سید مرحوم کا ایک واقعہ (الافاضات الیومیہ، جلد ۱) ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ایک انگریزی تعلیم یافتہ شخص ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھا۔ کیا سوجھی کہ ایک بڑے انگریز افسر کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں سر سید کا داماد ہوں مجھ کو ملازمت کی ضرورت ہے۔ وہ انگریز بہت ہی خاطر سے پیش آیا اور کہا کہ آپ ٹھہریں۔ اس کو ٹھہرا کر اس کی لاعلمی میں ایک تار سر سید کو دیا کہ فلاں شخص اس نام کا ہمارے پاس ملازمت کے خیال سے آیا ہے اور اپنے آپ کو آپ کا داماد کہتا ہے کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟

جواب میں سر سید نے اس انگریز کو لکھا بالکل صحیح ہے۔ ضرور آپ ملازمت کے لئے کوشش فرمادیں میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ اس شخص کو ملازمت مل گئی۔

ایک روز اتفاقاً اس انگریز نے اس شخص سے یہ واقعہ (سر سید سے تحقیق حال کا) بیان کر دیا۔ یہ بہت ہی شرمندہ ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ شخص علی گڑھ آیا۔ اور سر سید سے مل کر معافی کی درخواست کی اور کہا کہ میں وہی ہوں جس نے اپنے آپ کو آپ کا داماد بتا کر ملازمت لی ہے۔ یہ گستاخی بضرورت تھی۔

سر سید نے جواب میں کہا کہ گو یہ بات اس وقت غلط تھی۔ مگر اب صحیح ہو جائے گی، داماد کہتے ہیں بیٹی کے شوہر کو۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ میری بیٹی آپ کی بیوی ہوتی سو یہ تو نہیں ہو سکتا مگر دوسری صورت ممکن ہے وہ یہ کہ آپ کی بیوی کو میں اپنی بیٹی بنالوں سو میں آپ کی بیوی کو اپنی بیٹی بناتا ہوں اور وہ میری بیٹی اور میں اس کا باپ!

یہ توجیہہ وقتی ہی نہ تھی۔ بلکہ تازندگی باپ بیٹی اور داماد کا سا برتاؤ رکھا۔ بلانا، لینا دینا سب اسی طرح رکھا۔ (تہذیب الاخلاق علی گڑھ)

ساری دنیا کا ہمدرد بننا بہت آسان ہے۔ مگر قوم کا ایک مصیبت زدہ فرد، جس سے ٹھیس بھی پہنچی ہو، اس کے معاملہ کو اپنا معاملہ بنالینا سخت مشکل ہے۔
یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو قوم کا سچا خیر خواہ ہو اور اسی کے ساتھ بڑے دل والا بھی۔

روزہ کے بارہ میں

آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) نے ۱۹ اگست ۱۹۷۸ کی شام کو ساڑھے نو بجے ایک پروگرام رکھا۔ اس کا عنوان تھا "روزہ کیا ہے"۔ یہ آدھ گھنٹہ کی ایک ریڈیائی بات چیت تھی جس میں تین مذاہب کے نمائندوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق روزہ کے تصورات بیان کریں۔

راقم الحروف نے اسلام کی نمائندگی کی۔ بقیہ دو صاحبان حسب ذیل تھے:

پنڈت سچیدانند شاستری (ہندو دھرم)

آرک بشپ ناصر (عیسائیت)

راقم الحروف کو اس ریڈیائی بات چیت کا کوآرڈینیٹر بنایا گیا تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے مذہب کی روشنی میں بتایا کہ اس کے نزدیک روزہ کیا ہے اور وہ اس کے مذہب میں کس لئے اور کس شکل میں فرض کیا گیا ہے۔

روزہ، جس کو عربی میں صوم، ہندی میں برت اور انگریزی میں فاسٹنگ کہتے ہیں، ہر مذہب میں کسی نہ کسی طور پر پایا گیا ہے۔ اگرچہ اس کی مدت اور اس کی شکل میں ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان اختلاف ہے مگر وہ ایک یا دوسری صورت میں ہر جگہ موجود ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ نفس کو کنٹرول میں لانے کی تربیت ہے اور نفس پر کنٹرول (یا نفس کشی) کو ہر مذہب میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذہب جس قسم کے انسان بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کا نفس اس کی عقل کے قبضہ میں ہو اور روزہ آدمی کو اسی کے لئے تیار کرتا ہے۔

آدمی دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ جسم اور روح۔ جسم مادی اور کثیف ہے۔ روح غیر مادی اور لطیف۔ اگر ہم جسم کی ہر خواہش کو بے روک ٹوک پورا کرتے رہیں تو جسم زور آور بن جائے گا اور وہ روح کے اوپر غالب آجائے گا۔ روزہ اسی آزادی پر پابندی لگانے کا دوسرا نام ہے۔ روزہ آدمی کے جسم کو ایک حد کے اندر رکھ کر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ اس کی روح اس کے جسم کے

وپر حکمرانی کرے ۔اس کا لطیف وجود اس کے کثیف وجود کو اپنے قبضہ میں رکھے ۔

دونوں صاحبان نے اسی بات کو اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے لفظوں میں بیان کیا ۔

راقم الحروف نے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ روزہ محض اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہے ۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ آدمی صبح سے شام تک کھانا پینا بند رکھے تو بس اس کا روزہ ہوگیا۔روزہ کی یہ ظاہری صورت دراصل ایک علامت ہے اور اس کے ذریعہ ایک خاص روحانی اور اخلاقی سبق دینا مقصود ہے ۔

وہ سبق یہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو چاہئے کہ وہ صحیح اور غلط اور جائز اور ناجائز میں فرق کرے۔ وہ صحیح اور جائز کو لے لے اور غلط اور ناجائز سے اپنے آپ کو بچائے ۔یہی وہ چیز ہے جو اس کی آخرت میں آنے والی مستقل زندگی کو کامیاب بناتی ہے ۔

یہ روزہ دراصل زندگی کا ایک گہرا اصول ہے ۔ دنیا میں ایک تاجر اپنے کو فضول خرچی سے بچاتا ہے ۔ایک طالب علم اپنے اوقات کو بیکار ضائع کرنے سے بچاتا ہے ۔ایک مزدور اپنے آپ کو کاہلی اور بددیانتی سے بچاتا ہے ۔ اس طرح بچ بچاؤ کی زندگی گزارنے ہی کا نام موجودہ دنیا کی کامیابی ہے ۔ کاہلی ،فضول خرچی ،عیاشی ، ضیاع وقت سے آدمی اپنے آپ کو نہ بچائے تو وہ کسی طرح امتحان کی اس دنیا میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت کا بھی ہے ۔اسلام کے نزدیک آخرت کی کامیابی کا راز "روزہ وار زندگی" ہے ۔آدمی کو اپنی اگلی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے یہ کرنا ہے کہ وہ موت سے پہلے والی زندگی میں متقیانہ روش اختیار کرے ۔ وہ کچھ چیزوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے ۔

آخرت کو برباد کرنے والی چیزوں سے بچنا اور ان کو چھوڑ کر حلال دائرہ میں زندگی گزارنا، یہی وہ سبق ہے جس کو دینے کے لئے روزہ فرض کیا گیا ہے ۔

پھر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو شخص دن بھر روزہ رکھتا ہے، اس کو شام کے وقت کھانے کی لذت ملتی ہے ۔ اسی طرح جو شخص دنیا میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچے گا وہی آخرت میں زندگی کی حقیقی لذتوں کو پائے گا ——— دن کا روزہ اگر موجودہ دنیا کی مشقتوں کی علامت ہے تو شام کا کھانا آخرت کی راحتوں کی علامت ۔

اسلامی کردار

خدا سب سے بڑا ہے۔ وہ سب سے زیادہ کامل ہستی ہے۔ آدمی جب ایسے خدا کو پاتا ہے تو خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا احساس اس کی نفسیات کو بالکل بدل دیتا ہے۔ اس کی اس نفسیات کا اظہار اس کی روزمرہ کی زندگی میں بھی ہوتا ہے اور اس کی دینی سرگرمیوں میں بھی۔

ایسا آدمی بالکل فطری طور پر تواضع اور انکسار کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کی باتوں میں مٹھاس اور اس کے عمل میں نرمی پائی جاتی ہے۔ اس سے کسی کو شر کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ ہر ایک کو اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ انصاف کے حدود کا پابند رہے گا اور اپنے لئے اس چیز کا مطالبہ کرے گا جو فی الواقع اس کا اپنا ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کا حق ادا کرتا ہے اور برائی کا جواب بھلائی سے دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری کا فوراً اعتراف کرلے۔ وہ حسد اور گھمنڈ سے خالی ہوتا ہے۔ کسی کی خوبی کا اعتراف کرنے میں اس کا دل تنگ نہیں ہوتا۔ اس کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ کسی کے اندر عیب دیکھے تو اس کو چھپالے کسی سے قصور ہوجائے تو اس کے قصور کو معاف کردے۔ اس کی ذات کو کسی سے دکھ پہنچے تو اس کے اندر انتقام کی آگ نہیں بھڑکتی۔ وہ دوسروں کے کام آکر خوش ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتا ہے نہ کہ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے۔ وہ تعریف وتنقید سے بے نیاز ہوکر اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔

ایسا آدمی جب خدا کے لئے اٹھتا ہے تو اس کے مدعوئین کو اس کی طرف سے خدائی اخلاقیات کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے معاملہ کرنے میں عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں لوگوں کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ شریف اور بردبار ہوتا ہے وہ خدا پر بھروسہ کرنے والا ہوتا ہے اور جو کچھ ملے اس پر قناعت کرنے والا۔ وہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان حق اور ناحق کی بنیاد پر فرق کرتا ہے نہ کہ اس بنیاد پر کہ کون اس کا اپنا ہے اور کون اس کا اپنا نہیں۔

ساٹھ کیلومیٹر

جابر حسین ایک ریلوے گارڈ تھے۔ ان کی ملازمت کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ ۱۷ جولائی ۱۹۸۱ کو وہ اندور۔ بلاسپور اکسپرس لے کر روانہ ہوئے۔ یہ گارڈ کی حیثیت سے ان کا آخری سفر تھا۔ کیونکہ اگلے دن ۱۸ جولائی سے وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا پورا نقشہ بنا رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے اس نقشہ کو زیر عمل لانے کے کنارے پہنچ چکے ہیں۔ ریلوے گارڈ کی حیثیت سے اپنی ڈیوٹی کے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا "کل سے میری دوسری زندگی شروع ہو گی"

یہ سفر جابر حسین کے لئے واقعی آخری سفر تھا اور اس کے بعد ہی ان کی دوسری زندگی شروع ہو گئی۔ مگر اس معنی میں نہیں جس میں کہ انہوں نے سمجھا تھا بلکہ کسی اور معنی میں۔ ان کی اکسپرس ٹرین اپنی منزل سے ساٹھ کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک مال گاڑی ان کی ٹرین سے ٹکرا گئی۔ گارڈ کا ڈبہ چکنا چور ہو گیا۔ جابر حسین فوراً ہلاک ہو گئے۔ ایک ریلوے افسر نے اس حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

Sixty kilometres more and it would have been the end of his official journey.

جابر حسین نے اگر ۶۰ کیلومیٹر اور طے کر لیا ہوتا تو ریلوے ملازم کی حیثیت سے ان کا سفر پورا ہو جاتا (انڈین اکسپریس ۱۸ جولائی ۱۹۸۱)

یہی اس دنیا میں ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کو لمبی تصور کئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا سفر "۶۰ کیلومیٹر" کے بعد پورا ہو گا۔ مگر موت کا فرشتہ اس کو ۶۰ کیلومیٹر سے پہلے ہی پکڑ لیتا ہے۔ ہر آدمی موجودہ دنیا میں "اپنی کل" کی تعمیر کا ایک نقشہ لئے ہوئے ہے۔ مگر اچانک موت آ کر اس کو بتاتی ہے کہ اس کی "کل" اس دنیا میں شروع نہیں ہوتی جہاں ۱۷ جولائی کے بعد ۱۸ جولائی اور ۱۸ جولائی کے بعد ۱۹ جولائی کی تاریخیں آتی ہیں۔ بلکہ اس کی کل اس ابدی دنیا میں شروع ہوتی ہے جہاں دنیا کے کیلنڈر لپیٹ کر رکھ دئے جاتے ہیں۔ آدمی جہاں اپنے سفر کو ختم سمجھ رہا ہے وہیں سے اس کے حقیقی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

نگاہ کا فرق

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے سے ایک گاڑی گزری جس میں دو جانور جتے ہوئے تھے۔ ایک جانور چلتے چلتے بیٹھ گیا۔ تو مالک نے اس کو کوڑا مارا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو الدرداء کی زبان سے نکلا: ان فیھا لمعتبرا (اس میں بھی عبرت ہے) یعنی جس جانور نے اپنی ذمہ داری پوری کی وہ بچ گیا اور جس جانور نے کوتاہی کی اس پر مالک کا ڈنڈا پڑا۔

حضرت ابو الدرداء اس موقع پر اور بہت سی باتیں کہہ سکتے تھے۔ مثلاً وہ مالک سے کہتے کہ تم نے کیسا برا جانور خریدا ہے۔ اچھا جانور لو جو دوسرے والے کے جوڑ کا ہو لیکن یہ چیزوں کو دنیا کی نظر سے دیکھنا ہے۔ مگر مومن ہر چیز کو آخرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کو ہر واقعہ میں آخرت کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ آج کی دنیا کی چیزوں میں بھی کل کی دنیا کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔

آجکل پریس کا زمانہ ہے۔ ہر آدمی اپنے "تاثرات و مشاہدات" چھاپ رہا ہے۔ مگر غور سے دیکھئے تو کسی کے تاثرات و مشاہدات میں آخرت کی جھلکیاں نظر نہیں آتیں۔ کوئی تمدن کی شان و شوکت بیان کر رہا ہے۔ کوئی اپنے دعوت اور استقبال کے قصوں کو دہرا رہا ہے۔ کوئی انسانوں کی عظمت کی کہانیاں سنا رہا ہے۔ کسی کے "تاثرات و مشاہدات" میں یہ نہیں ملتا کہ کسی موقع پر آگ کی چنگاری میں اس نے جہنم کا مشاہدہ کر لیا ہو۔ کہیں پھولوں کی رعنائی میں اس کو جنت کی جھلک دکھائی دی ہو۔ کہیں کسی دارو گیر کو دیکھ کر اس کو آخرت کے حساب و کتاب کی یاد آ گئی ہو۔

اس قسم کے تمام تاثرات و مشاہدات غفلت کے تاثرات و مشاہدات ہیں۔ یہ چیزوں کو غیر مومن کی آنکھ سے دیکھنا اور غیر مومن کے کان سے سننا ہے۔ یہ غیر مومن قلب سے۔ واقعات کا ردعمل پیش کرنا ہے۔ اور جو شخص قلب و نظر کے اعتبار سے غیر ایمانی مقام پر ہو وہ ظاہری عملیات کی بنا پر خدا کے یہاں ایمانی مقام پر کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ یہ ظاہری عملیات مقدار میں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

موت کے آگے

فرانس کے لوئی یازدہم (۱۴۲۳-۱۴۸۳) نے ساٹھ سال تک بادشاہ کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ آخر عمر میں وہ ایک بند قلعہ میں رہنے لگا جہاں بہت کم لوگوں کو داخلہ کی اجازت تھی۔ قلعہ کے چاروں طرف گہری خندق کھود دی گئی تھی تاکہ کوئی اس کے قریب نہ پہنچ سکے۔ قلعہ کی دیواروں پر ہر وقت چالیس تیر انداز بیٹھے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ چالیس گھوڑ سوار دن رات اس کے چاروں طرف گشت کرتے رہتے تھے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جو بھی بلا اجازت قلعہ کے اندر آنے کی کوشش کرے اس کو پکڑ کر اسی وقت قتل کر دیا جائے۔ قلعہ کے اندر بادشاہ کے لئے ہر قسم کا عیش وعشرت کا سامان مہیا کیا گیا تھا تاکہ بادشاہ کا دل کبھی غمگین نہ ہونے پائے۔

لوئی یازدہم کو زندہ رہنے کا اتنا شوق تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ موت کا لفظ اس کے سامنے ہرگز نہ بولا جائے۔ ایک ماہر ڈاکٹر ہر آن بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اس ڈاکٹر کو دس ہزار سنہری کراون ماہوار دئے جاتے تھے۔ اس وقت یورپ کے کسی میدان جنگ میں چالیس سال کام کرکے بھی ایک فوجی افسر اتنی تنخواہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

تاہم ان میں سے کوئی چیز بادشاہ کو بڑھاپے اور کمزوری سے نہ بچا سکی۔ آخر عمر میں وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ مشکل سے وہ کھانے کی کوئی چیز اٹھا کر اپنے منھ میں ڈال سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی جینے کی خواہش وہم کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس کو کسی نے بتایا کہ کچھوے پانچ سو سال تک جیتے ہیں اور وہ زندگی بخش خواص کے مالک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے کچھ لوگوں کو تین بحری جہاز دیکر جرمنی اور اٹلی روانہ کیا تاکہ وہاں سے اس کے لئے بحری کچھوے لے آئیں۔ یہ کچھوے اس کے قریب ایک بڑے حوض میں رکھے گئے تاکہ اس کو زندگی کا فیضان عطا کر سکیں۔

آخر کار لوئی پر فالج کا حملہ ہوا اور ۳۰ اگست ۱۴۸۳ کو موت نے اس پر قابو پالیا۔ بالآخر اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو نہیں جیت سکتا۔ اس کی زبان سے جو آخری الفاظ مرنے سے پہلے نکلے وہ یہ تھے:

میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔

تاہم اس کی تمام کوششیں بے کار ہو گئیں۔ ۳۰ اگست ۱۴۸۳ کو وہ مر گیا۔ آخر کار بادشاہ فرانس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔

جھوٹا سجدہ

فرشتے اور ابلیس دونوں خدا کی مخلوق ہیں۔ دونوں خدا کو سجدہ کر رہے تھے۔ مگر خدا نے جب آدم کو پیدا کیا اور دونوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو فرشتے فوراً جھک گئے مگر ابلیس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ یہ سجدۂ آدم کی صورت میں خود سجدۂ خداوندی کا امتحان تھا۔ فرشتے حکم خداوندی کی تعمیل میں آدم کے آگے جھکے اس لئے وہ خدا کے آگے جھکنے والے قرار پائے۔ ابلیس حکم خداوندی کے باوجود آدم کے سامنے نہ جھکا اس لئے وہ خدا کا ساجد ہونے کے باوجود خدا کا سرکش ٹھہرا اور ابدی طور پر جہنم کا مستحق ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ امتحان کی دنیا میں خدا کے آگے جھکنے کی جانچ انسان کے آگے جھکنے کی صورت میں ہو رہی ہے۔ وہ سجدہ جھوٹا سجدہ ہے جبکہ آدمی خدا کے آگے سجدہ کرتا ہوا دکھائی دے اور جب انسان سے معاملہ پڑے تو وہ سرکشی کرنے لگے۔ وہ خدا کے سامنے خدا والا ہو اور بندوں کے سامنے بے خدا والا۔

جس خدا نے انسان کو یہ حکم دیا ہے کہ میرے آگے جھکو، اسی خدا کا یہ حکم بھی ہے کہ دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرو۔ کسی انسان کی طرف سے کوئی سچی بات پیش کی جائے تو اس کو مان لو۔ کسی سے شکایت پیدا ہو تو اس کو معاف کر دو۔ کسی کی امانت تمہارے پاس ہو تو اس کو ادا کر دو۔ کسی کے معاملہ میں تمہارے اوپر کوئی اخلاقی ذمہ داری آتی ہو تو اس کو پورا کرو۔ کسی سے تم کم ہو تو اس کے خلاف حسد نہ کرو۔ کسی سے تم بڑے ہو تو اس کے مقابلہ میں گھمنڈ نہ کرو۔ اس قسم کی تمام صورتیں گویا انسان کے سامنے جھکنے کی صورتیں ہیں۔ ہر آدمی کا فرض ہے کہ جس طرح وہ خدا کے آگے جھکا ہے، اسی طرح وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اس کے بندوں کے آگے بھی جھک جائے۔

جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ خدا کے آگے جھکے مگر اسی خدا کے حکم کے باوجود انسان کے سامنے اکڑ دکھائے۔ وہ خدا کے آگے سجدہ کرے مگر اسی خدا کی خاطر انسان کے سامنے جھکنے پر راضی نہ ہو۔ وہ خدا کا پرستار بنا ہوا ہو مگر اسی خدا کے لئے وہ ایک انسان کے منھ سے ظاہر ہونے والے حق کا اعتراف نہ کرے۔ وہ بظاہر خدا والا نظر آتا ہو مگر انسان کے

ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اپنے کو خدا والا ثابت نہ کر سکے ــــــ ایسے آدمی کی عبادت جھوٹی عبادت ہے۔ اس آدمی کا سجدہ جھوٹا سجدہ ہے جو خدا کے سامنے سجدہ کرتا ہوا دکھائی دے مگر جب انسان سے معاملہ پڑے تو اسی خدا کے حکم کے باوجود وہ اس سے اکڑنے لگے، اسی خدا کے حکم کے باوجود اس سے سرکشی کا طریقہ اختیار کرے۔

مسجد کا رکوع اور سجدہ اس بات کا ایک اظہار ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خدا کی تابعداری میں دیدیا ہے۔ یہ تابعداری تقسیم نہیں ہوسکتی۔ وہ معاملہ کے وقت بھی اسی طرح ظاہر ہوگی جس طرح وہ نماز کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا آدمی انسانی تعلقات میں بھی اسی طرح خدا والا نظر آئے گا جس طرح وہ مسجد کی عبادت میں خدا والا نظر آتا ہے۔

لوگ سجدہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے حکم کی بنا پر اس کے آگے سجدہ کر رہے ہیں۔ مگر جب یہ دیکھا جائے کہ جس خدا کے آگے وہ سجدہ کر رہے ہیں اسی خدا کے حکم کے باوجود انسانوں کے سامنے نہیں جھکتے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سجدہ شعور عبدیت کے تحت نہ تھا بلکہ کسی اور وجہ سے تھا اگر شعور عبدیت اس سجدہ کا سبب ہوتا تو وہی شعور عبدیت اس کا محرک کیوں نہ بنتا کہ وہ بندور کے معاملہ میں خدا کے حکم کو تسلیم کرلیں۔

سجدہ، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، خدا کے حکم کے آگے جھکنے کا نام ہے نہ کہ محض سر کو زمین پر رکھدینے کا۔ اگر زمین پر سر رکھنے کا نام سجدہ ہو تو مدینہ کے تمام منافقین روزا اپنا سر زمین پر رکھتے تھے۔ پھر بھی وہ خدا کی نظر میں غیر ساجد قرار پائے۔ اس کی وجہ یہی تھی وہ اگرچہ مخصوص اوقات میں اپنا سر زمین پر رکھتے تھے مگر زندگی کے معاملات میں جب خد کا کوئی حکم ان کی خواہشات سے ٹکراتا تھا تو وہاں وہ خدا کے حکم کے آگے جھکنے پر راضی ہوتے تھے۔

انسان کی قلبی کیفیات ناقابل تقسیم ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک جگہ وہ کچھ ہو او دوسری جگہ کچھ۔ ایک آدمی اگر مسجد کے اندر جھکنے کا مظاہرہ کرے اور مسجد کے باہر کے معاملات میں وہ اکڑ والا بن جائے تو کہا جائے گا کہ اس کا مسجد کا جھکاؤ محض رسمی اور تقلید تھا۔ اس کی اصل شخصیت وہی ہے جو مسجد کے باہر نظر آرہی ہے۔ ایسی حالت میں خدا کے یہا وہ سجدہ نہ کرنے والا شمار ہوگا نہ کہ سجدہ کرنے والا۔

ارتقاء

موجودہ زمانہ کے علمائے حیاتیات عام طور پر نظریہ ارتقاء کو تسلیم کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ارتقاء محض ایک نظریہ نہیں، وہ ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔ مگر جہاں تک دلیل کا تعلق ہے یہ دعویٰ ابھی تک ثابت نہ کیا جا سکا۔

نظریہ ارتقاء کے حق میں تین قسم کی دلیلیں دی جاتی ہیں۔

۱۔ ماں کے پیٹ میں انسان کا جنین مچھلی، چھپکلی، سور اور بندر کے جیسی صورتوں سے گزر کر انسان کی صورت تک پہنچتا ہے۔ ارتقاء پسند علماء کے نزدیک یہ مشاہدہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اپنی تاریخ کے پچھلے دور میں انہیں جانوروں جیسا تھا۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق ماں کا پیٹ نو مہینوں میں انسان کی اس طویل حیاتیاتی تاریخ کو دہراتا ہے جو پیٹ کے باہر اربوں سال کے اندر وقوع میں آئی تھی۔

۲۔ جانوروں اور انسان کے ڈھانچہ میں ایک ارتقائی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مچھلی سے لیکر انسان تک جانوروں کی جو مختلف قسمیں ہیں، ان کی ہڈیوں کے ڈھانچہ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بنیادی یکسانیت کے ساتھ ایک ارتقائی نسبت ہے۔ اوپر کی سطح کے جانور نچلی سطح کے جانور کی ارتقاء یافتہ صورتیں معلوم ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان تک پہنچ کر یہ عمل ارتقاء اپنی کامل صورت اختیار کر لیتا ہے۔

چٹانوں کی تہوں میں قدیم جانداروں کی ہڈیاں متحجر حالت (Fossilised State) میں پائی گئی ہے۔ چٹانوں کا کیمیائی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی تہیں ایک کے بعد ایک مختلف زمانوں میں بنی ہیں۔ اس طرح یہ چٹانی تہیں گویا کتاب فطرت کے اوراق ہیں جو ماضی بعید کی داستان ہم کو بتاتے ہیں۔ چٹانوں کی مختلف تہوں میں متحجر ہڈیوں کے مطالعہ سے دریافت ہوا ہے کہ زمین کے اوپر جانداروں کی جو قسمیں پائی جاتی ہیں، وہ سب کی سب اول روز سے موجود نہ تھیں۔ بلکہ ان کے ظہور میں ایک ارتقائی ترتیب ہے۔ قدیم ترین تہوں میں مچھلی کی قسم کے جانوروں کی متحجر ہڈیاں ملتی ہیں، پھر چھپکلی کی قسم کے جانور، پھر دودھ پلانے والے جانور، پھر بندر، اور آخر میں انسان۔

جواب

یہ مشاہدات جن کے اوپر ارتقار کی استدلالی بنیاد قائم کی گئی ہے، وہ بجائے خود واقعہ ہوسکتی ہے۔ مگر خاص علمی اعتبار سے دیکھا جائے توان کا کوئی بھی تعلق ارتقار کے مفروضہ سے نہیں ہے۔ ان کے ذریعہ اس نظریہ کے حق میں دلیل قائم نہیں ہوتی۔

یہ بات بجائے خود ایک واقعہ ہے کہ انسان کے بچہ کا مشاہدہ جب ماں کے پیٹ میں کیا جاتا ہے تو ابتدائی ایام میں اس کے اور جانور کے بچہ میں بہت کم ظاہری فرق ہوتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مچھلی اور چوپائے کی شکلوں سے گزر کر انسان کی صورت اختیار کررہا ہے۔ مگر صرف اس مشاہدہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قدرت پانچ سو ملین سال کے عمل کو نو مہینوں میں دہراتی ہے، جس قدرت کو اس سے پہلے ایک انسان بنانے میں پانچ سو ملین سال لگ گئے، وہ اب صرف نو مہینوں میں کروروں انسان کس طرح بنا رہی ہے۔ اور اگر قدرت کے عمل کو مختصر کرنا ممکن ہے تو ایک عالم حیاتیات کے لئے یہ ممکن ہونا چاہئے کہ وہ ایک مچھلی کا انڈہ لے اور اس کو اپنی لیبورٹری میں رکھ کر نو مہینے یا نو سال کے اندر اس کو انسان کی صورت میں تبدیل کردے۔ جب کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بالکل ناممکن ہے۔

اس نظریہ کے بے بنیاد ہونے کی اس سے بھی زیادہ بڑی دلیل یہ ہے کہ فرد کی تمام خصوصیات اول روز ہی سے جین میں موجود ہوتی ہیں۔ بڑا ہو کر آدمی جن اوصاف کا حامل ہوتا ہے، وہ سب اس کے اولین ڈھانچہ میں مکمل طور پر موجود رہتا ہے۔ اس کا قد، اس کا رنگ، اس کا مزاج، اس کی ذہانت، سب کچھ اول دن ہی سے اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، انسان کا بچہ پہلے دن سے انسان کا بچہ ہوتا ہے، وہ کسی لمحہ بھی مچھلی یا چھپکلی کا بچہ نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ماں کے پیٹ کے ابتدائی ہفتوں میں اور ہمارے مشاہدے کے پیمانہ میں وہ کس صورت کا دکھائی دے رہا ہے۔

۲۔ ڈھانچہ میں ارتقائی مشابہت سے بھی اصلاً جو بات ثابت ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ مختلف جاندار، اپنے بنیادی ڈھانچہ کے اعتبار سے، ایک دوسرے سے بالکل الگ نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں بعض پہلوؤں سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے کسی بھی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ایک قسم کا جانور دوسری قسم کے جانور کے پیٹ سے نکلا ہے۔ بیل گاڑی، گھوڑ گاڑی اور کار کے ڈھانچوں میں بعض پہلوؤں سے مشابہت ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کر

قدر عجیب ہوگا کہ بیل گاڑی کے بطن سے گھوڑا گاڑی نکلی ہے اور گھوڑا گاڑی کے بطن سے کار نے جنم لیا ہے۔ اور کار کے بطن سے ہوائی جہاز برآمد ہوا ہے۔

متحجرات (Fossils) کے مشاہدہ میں بھی مذکورہ بالا نظریہ کے لئے کوئی لازمی دلیل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں طبقاتی ترتیب کو اگر بلا بحث مان لیا جائے جب بھی اس سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ زمین کے اوپر حیوانات کی آباد کاری میں ایک ترتیب ہے۔ ایک قسم کے جانور ایک زمانہ میں وجود میں آئے۔ دوسری قسم کے جانور دوسرے زمانہ میں۔ مثلاً جس زمانہ میں بندر تھا، انسان نہیں تھا۔ اسی طرح جس زمانہ میں مچھلیاں اور چھپکلیاں بنیں، بندر نہیں پایا جاتا تھا۔ مگر یہاں یکساں قوت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے تخلیق کی ترتیب ثابت ہوتی ہے نہ کہ ارتقاء کی ترتیب۔ ایک کے پیٹ سے دوسرا، دوسرے کے پیٹ سے تیسرا نکلا، یہ ایک علیحدہ مفروضہ ہے۔ مذکورہ مشاہدات میں اس کے لئے براہ راست دلیل موجود نہیں ہے۔ متحجر ہڈیوں کے مطالعہ میں خواہ کتنی ہی احتیاط برتی جائے، ان سے جو بات ثابت ہوگی، وہ صرف یہی ہے کہ کس قسم کے جانور کی ہڈیاں کتنے ہزار سال سے زمین میں دفن ہیں، نہ یہ کہ کون سا جانور کس کے بطن سے نکلا ہے۔

موجودہ ارتقائی تحقیقات سے اگر کوئی چیز ثابت ہوئی ہے تو صرف یہ کہ زمین پر جو مختلف قسم کے جاندار پائے جاتے ہیں وہ سب بیک وقت اول روز سے زمین پر موجود نہیں ہو گئے ہیں بلکہ ان کی تخلیق میں ایک زمانی ترتیب ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہر جاندار اپنے وقت پر مستقل طور پر پیدا کیا گیا یا ایسا ہوا کہ بطریق تناسل ایک جاندار کے بطن سے دوسرا جاندار نکلتا رہا۔

جہاں تک دوسرے مفروضہ کا تعلق ہے اس کے حق میں ابھی تک کوئی دلیل یا مشاہدہ سامنے نہیں آیا۔ دوسری طرف جاندار اوّل کی حد تک سائنسداں یہ مانتے ہیں کہ وہ پہلی بار مستقل طور پر وجود میں آیا۔ پھر جو مفروضہ پہلے جاندار کے لئے صحیح سمجھا گیا ہے وہی دوسرے جاندار کے لئے بھی کیوں صحیح نہیں ہو سکتا۔ جبکہ تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ پہلا جاندار (Amoeba) اپنے جسمانی نظام میں بعض اعتبا سے وہی تمام پیچیدگیاں رکھتا ہے جو آخری جاندار (انسان) میں پائی جاتی ہیں۔ اگر پہلے پیچیدہ جاندا کو پہلی بار وجود میں لانا قدرت کے لئے ممکن تھا تو دوسرے پیچیدہ جاندار کو پہلی بار وجود میں لا اس کے لئے کیوں ناممکن ہو گیا۔

سبب یہاں ہے

ایک امریکی خاتون لندن گئیں۔ وہاں انہوں نے ایک اخبار فروش سے پوچھا کہ باربیکن (Barbican) کا راستہ کون سا ہے۔ اخبار فروش نے بتایا تو تیزی سے اپنے الفاظ ادا کئے۔ اس کے بعد خاتون نے کہا " مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو دوبارہ بتانے کی زحمت دے رہی ہوں۔ میں سمجھ نہ سکی کہ آپ نے کیا کہا۔ اخبار فروش نے جواب دیا:

You know your trouble, love, you were listening with an American accent

محترمہ آپ کو اپنی مشکل معلوم ہے۔ آپ میری بات کو امریکی لہجہ میں سن رہی تھیں (آر۔ ڈی جولائی ۱۹۷۹)۔

اس طرح کی مشکل اکثر سننے والے اور سنانے والے کے درمیان پیش آتی ہے۔ ایک بار راجستھان کے ایک شہر میں میری تقریر ہوئی۔ تقریر کا موضوع سیرت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا۔ میں نے اپنی ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبق آموز واقعات اور آپ کے اقوال سادہ انداز میں بیان کئے۔

جب میں اجتماع گاہ سے باہر آیا تو ایک صاحب ملے۔ انہوں نے کہا " آپ سیرت پر تو کچھ بولے نہیں " مجھے یہ سن کر سخت حیرانی ہوئی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ میں نے خالص سیرت پر تقریر کی ہے اس میں کوئی دوسری چیز شامل نہیں کی ہے۔ مزید پوچھنے پر معلوم ہوا کہ موصوف کے نزدیک سیرت کی تقریر یہ تھی کہ معجزات اور فتوحات اور خرق عادت کی قسم کے واقعات بیان کئے جائیں۔ چونکہ میں نے سادہ واقعات اور نصیحت کی باتیں بیان کی تھیں اس لئے موصوف کو ایسا محسوس ہوا گویا میں نے سیرت پر تقریر ہی نہیں کی۔

یہاں بھی وہی بات ہے جو مذکورہ صدر واقعہ میں نظر آتی ہے۔ میں نے ہدایت اور نصیحت کی زبان میں بات کی، جب کہ سننے والے بزرگ اس کو فتوحات اور کرامات کی زبان میں سن رہے تھے۔ ایسی صورت میں وہ میری بات کیوں کر سمجھتے۔

اسی طرح کہنے والا اگر " اسلام " کی زبان میں کہہ رہا ہو اور سننے والا اس کو " قوم " کی زبان میں سنے۔ کہنے والا " دعوت " کی زبان میں بولے اور سننے والے کے پاس اس کو سمجھنے کے لئے

"سیاست" کی زبان ہو۔ تو ایسی تمام صورتوں میں سنانے والے اور سننے والے کے درمیان ایک ایسا فصل (Gap) پیدا ہو جائے گا کہ بے حد واضح بات بھی سننے والے کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ انتہائی مدلل بات بھی سننے والے کو بے دلیل معلوم ہو گی۔

یہی بات قرآن و حدیث کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ قرآن و حدیث کی بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس کو اسی "زبان" میں سنے جس زبان میں وہ کہی جا رہی ہے۔ اگر وہ کسی دوسری زبان میں سننے لگے تو وہ سن کر بھی نہیں پائے گا۔ وہ پڑھ کر بھی اس کی حقیقت سے محروم رہے گا۔

ایک مثال لیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو توحید کی طرف بلایا۔ مگر اس نے انکار کیا۔ بالآخر حضرت موسیٰ کو خدا نے بتایا کہ فرعون مع اپنے لشکر کے تباہ کیا جانے والا ہے۔ تم اس کے انکار پر دل گرفتہ نہ ہو، البتہ اپنے مسلک پر صبر کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اس کو حق کی دعوت دیتے رہو۔ اس موقع پر ارشاد ہوا ہے: پس تم اور ہارون دونوں قائم رہو اور ان لوگوں کے طریقہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے (یونس ۸۹)

اس آیت کا جو مطلب مفسرین نے لیا ہے وہ صفوۃ التفاسیر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

(ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون) ای لا تسلکا سبیل الجہلۃ فی الاستعجال او عدم الاطمئنان بوعد اللہ تعالیٰ۔ قال الطبری، روی انہ مکث بعد ھذہ الدعوۃ اربعین سنۃ ثم اغرق اللہ فرعون۔

بے علموں کے طریقہ کی پیروی نہ کرو، یعنی جلد بازی اور خدا کے وعدہ کے بارہ میں بے یقینی میں پڑ کر جاہلوں کے راستہ پر نہ چلو۔ طبری نے کہا ہے کہ روایت کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ اس دعا کے بعد چالیس سال تک مصر میں رہے۔ پھر فرعون کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔

مذکورہ تفسیر کے مطابق آیت میں جس چیز کو بے علمی کہا گیا ہے وہ دعوۃ الی اللہ کے کام میں بے صبری اور جلد بازی ہے۔ مگر ایک مفسر قرآن نے اپنی مخصوص ذہنی ساخت کی بنا پر اس سے بالکل دوسرا مطلب نکال لیا۔ وہ اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے وہ باطل کے مقابلہ میں حق کی کمزوری اور اقامت حق کے لئے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور ائمۂ باطل کے ٹھاٹھ اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی

منظور ہے کہ اس کے باغی دنیا پر چھائے رہیں۔ اور شاید حضرت حق خود ہی باطل کے مقابلہ میں حق کی تائید کرنا نہیں چاہتے۔ پھر وہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامت حق کی سعی لا حاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اس ذراسی دینداری پر راضی ہو کر بیٹھ رہا جائے جس کی اجازت کفر و فسق کی سلطانی میں مل رہی ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اور ان کے پیروؤں کو اسی غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ انہیں ناموافق حالات میں کام کئے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں جاہلوں اور نادانوں کو عموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔"

اس آیت میں دعوتی عمل کے ذیل میں بے صبری اور جلد بازی سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور اس کمزوری کو بے علمی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ دعوتی عمل میں آدمی جب صبر اور حکمت کے خلاف کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ تخلیق کے بارہ میں خدا کے منصوبہ کو نہیں سمجھتا۔ مگر مذکورہ بالا تفسیر میں عجیب و غریب طور پر یہ معنیٰ نکال لئے گئے کہ کفر و فسق کی سلطانی قبول کرکے ذراسی دینداری پر راضی ہو جانا بے علمی ہے۔ اس تفسیر میں اور قرآن کی آیت میں صرف "بے علمی" کا لفظ مشترک ہے، باقی سب کچھ مفسر کا اپنا اضافہ ہے۔

مزید یہ کہ اس تفسیر نے دین کے پورے معاملہ کو الٹ دیا ہے۔ وہ بڑی دینداری کو "ذراسی دینداری" قرار دے رہی ہے اور ذراسی دینداری کو بڑی دینداری۔ اس تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھیوں کو زمانۂ دعوت میں فرعون کے ملک میں جس دینداری کا موقع حاصل تھا وہ بس "ذراسی دینداری" تھی۔ خدا نے کہا کہ اس ذراسی دینداری پر قانع نہ ہو جاؤ ورنہ تم جاہل ٹھہرو گے۔

اب دیکھئے کہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو کیا چیز حاصل تھی۔ ان کو "سلطانی باطل" کے باوجود یہ موقع حاصل تھا کہ وہ خدا کی عبادت کریں۔ وہ آخرت کی فکر کریں۔ وہ خدا سے ڈریں اور اس سے محبت کریں۔ وہ اپنے رب کی یادوں میں جئیں۔ وہ دعوت و شہادت کا کام کریں اور خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلائیں۔ اخبات و انابت اور خشوع و تضرع سے لیکر بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی تک سب کچھ کرنے کا موقع انہیں ملا ہوا تھا اور وہ پوری طرح اس میں مشغول تھے۔ مگر یہ تمام اہم ترین چیزیں، مذکورہ تشریح کی روشنی میں " ذراسی دینداری" بن کر رہ گئیں۔

اسلام کا عطیہ

فرانس کے حکمراں نپولین بوناپارٹ نے سوئز میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مصر میں اپنی فوجیں داخل کردی تھیں۔ اور مصر کو فرانس کے قبضہ میں لے لیا تھا۔ ۱۷۹۸ میں جب نپولین اسکندریہ میں داخل ہوا تو اس نے عربی زبان میں ایک منشور شائع کیا اور اس کو مصر کے تمام شہروں میں تقسیم کیا۔ اس منشور کا آغاز حسب ذیل الفاظ سے ہوتا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لا الٰہ الا اللہ، لا ولد لہ و لا شریک لہ فی ملکہ۔
من طرف الفرنساویۃ المبنی علی اساس الحریہ والتسویہ ---

یعنی شروع اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی کوئی اولاد نہیں اور اس کے اقتدار میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ (یہ منشور) فرانس کی طرف سے ہے جس کا نظام آزادی اور مساوات کی بنیاد پر قائم ہے۔

الاسلام والفکر المعاصر للدکتور حلمی مرزوق، دار النھضۃ العربیہ، بیروت ۱۹۸۲، صفحہ ۲۹

نپولین نے بظاہر اپنے اس منشور میں (سیاسی مصلحت کے تحت) اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے توحید کو اسلامی عطیہ ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے آزادی اور مساوات کو مغربی تہذیب کی دین قرار دیا ہے۔ گویا کہ دنیا کو اگر توحید اسلام کے ذریعہ ملی تو آزادی اور مساوات اس کو فرانس کے انقلاب کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح توحید کی نعمت انسان کو عملاً اسلامی انقلاب کے بعد ملی، ٹھیک اسی طرح آزادی اور حریت کا تحفہ بھی اس کو اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں ملا ہے۔

غیر اللہ کو عظمت دینے کا نام شرک ہے اور اسی غیر خدائی عظمت کا یہ نتیجہ تھا کہ انسانی سماج آزادی اور حریت سے محروم تھا۔ شرک نے کچھ انسانوں کو پیدائشی طور پر برتر ٹھہرا کر دوسرے انسانوں کو ان کے مقابلہ میں پیدائشی طور پر کمتر ٹھہرا رکھا تھا۔ توحید نے ایک خدا کے مقابلہ میں سب کو یکساں حیثیت دیدی۔ توحیدی انقلاب کے بعد تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس نے بالآخر تمام انسانوں کو برابر ثابت کر کے انہیں اس ارتقائی مرحلہ تک پہنچایا جس کو انسانی آزادی اور انسانی مساوات کہا جاتا ہے۔

نماز

قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ جس عبادت کا حکم دیا گیا ہے وہ نماز ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ نماز ادا نہ کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہوگا (مدثر ۴۳)

نماز کی حقیقت کیا ہے اور کون سی نماز خدا کی نظر میں نماز ہے، اس سلسلے میں تمام ضروری تفصیلات قرآن میں موجود ہیں۔ قرآنی آیات کے مطالعہ سے ان کو واضح طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ نماز کی حقیقت اور اس کے آداب سے متعلق قرآن کے کچھ حوالے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ہر نماز کا ایک وقت ہے اور اس کی ادائگی میں وقت کی پابندی ضروری ہے	نساء ۱۰۳
جب کوئی شخص نماز پڑھنے کے لئے اٹھے تو پہلے اپنے کو پاک صاف کر لے	مائدہ ۶
نماز کی ادائگی کے وقت نمازی کو اپنے ماحول سے الگ ہو کر خدا کی طرف متوجہ ہونا چاہئے	مزمل ۸
نماز پڑھنے والا نماز اس طرح پڑھے کہ اس کا شعور پوری طرح نماز میں شامل ہو جائے	نساء ۴۳
چاہئے کہ نماز آدمی کے اوپر نگراں بن جائے جو اس کو تمام برے کاموں سے روکے	عنکبوت ۴۵
نماز کی جانچ کا معیار یہ ہے کہ وہ آدمی کو خدا کی یاد کرنے والا بنا دے	طٰہٰ ۶
نماز کے وقت خدا کا اس طرح استحضار ہو جانا چاہئے کہ آدمی کے اوپر پستی کا احساس طاری ہو جائے	مومنون ۲
جب نماز کا وقت آجائے تو دوسرے تمام کام کو چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑ پڑو	جمعہ ۹
نماز کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا نمازیوں کے لئے باہم مل کر رہنے کا سبق ہے	بقرہ ۴۳
نماز ایک واسطہ ہے جس کے ذریعہ آدمی خدا سے اس کی مدد مانگتا ہے	بقرہ ۱۵۳
نماز میں آدمی جب پوری طرح مشغول ہوتا ہے تو وہ خدا کے قریب ہو جاتا ہے	علق ۱۹
نماز اس بات کا پیغام دیتی ہے کہ آدمی تمام جاہلی طریقوں کو چھوڑ دے	ہود ۸۷
نماز وہ ہے جو آدمی کے اوپر اس طرح چھائے کہ وہی اس کی پہچان بن جائے	فتح ۲۹
نماز کسی آدمی کے لئے اس کی تنہائیوں کی بہترین ساتھی ہے	فرقان ۶۴
نماز ہر آدمی پر ساری عمر تک کے لئے فرض ہے	معارج ۲۳
نماز کی اسی طرح حفاظت کرو جس طرح تم اپنے مال کی حفاظت کرتے ہو	بقرہ ۲۳۸
نماز کی حقیقت آخرت کے ڈر کی وجہ سے خدا کے سامنے گر پڑنا ہے	زمر ۹
نماز میں آدمی کھڑا ہو تو اس کو ایک عاجز اور محتاج بندہ کی طرح کھڑا ہونا چاہئے	بقرہ ۲۳۸

سُوْرَةُ هُوْدٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَلٰثٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَفِيْهَا عَشْرُ رُكُوْعَاتٍ

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾

آیاتہا ۱۲۳   سورۃ ھود مکیہ — ۱۱   رکوعاتہا ۱۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ال ر۔ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر ایک دانا اور خبیر ہستی کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ میں تم کو اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تم کو ایک مدت تک برتوائے گا اچھا برتوانا، اور ہر زیادہ کے مستحق کو اپنی طرف سے زیادہ عطا کرے گا۔ اور اگر تم پھر جاؤ تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے   ۱—۴

قرآن کی دعوت یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے۔ وہ ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنائے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی سے امید رکھے۔ اس کے ذہن و دماغ پر اسی کا غلبہ ہو۔ اپنی زندگی کے معاملات میں وہ سب سے زیادہ اس کی مرضی کا لحاظ کرے۔ وہ اپنے آپ کو عابد کے مقام پر رکھ کر خدا کو معبود کا مقام دینے پر راضی ہو جائے۔

پیغمبرانہ دعوت دراصل اسی چیز سے انسان کو باخبر کرنے کی دعوت ہے۔ قرآن میں اس کو انتہائی محکم زبان اور واضح اسلوب میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اب انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اس کے مقابلہ میں صحیح ردعمل پیش کرے۔ حسد، گھمنڈ، مصلحت بینی اور گروہ پرستی جیسی چیزوں کے زیر اثر آکر وہ اس کو نظر انداز نہ کردے۔ بلکہ سیدھی طرح اس کو مان کر خدا کی طرف پلٹ آئے۔ وہ اپنے ماضی کی غلطیوں کے لئے خدا سے معافی مانگے اور مستقبل کے لئے خدا سے مدد

کی درخواست کرے۔

آدمی کے سامنے کھانا پیش کیا جائے اور وہ کھانے کو قبول کرلے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی جسمانی پرورش کا انتظام کیا۔ اس کے برعکس اگر وہ کھانا قبول نہ کرے تو گویا اس نے اپنے آپ کو جسمانی پرورش سے محروم رکھا۔ ایسا ہی معاملہ دعوت حق کا ہے۔ جب آدمی حق کو قبول کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس رزق ربانی کو قبول کرتا ہے جو اس کے اندر داخل ہو کر اس کی روح اور اس کے جسم کی صالح پرورش کا سبب بنے اور بالآخر اس کو روحانی ترقی کے ان منازل کی طرف لے جائے جو اس کو جنت کے باغوں کا مستحق بناتی ہے۔

جو شخص دعوت حق کو قبول نہ کرے اس نے گویا اپنی روح کو ربانی پرورش کے مواقع سے محروم کردیا۔ حق کو ماننے والا اگر تواضع میں جی رہا تھا تو یہ دوسرا شخص گھمنڈ کی نفسیات میں جیے گا۔ حق کو ماننے والے کے لمحات اگر خدا کی یاد میں بسر ہو رہے تھے تو اس کے لمحات غیر خدا کی یاد میں بسر ہوں گے۔ حق کو ماننے والا اگر مواقع حیات میں اطاعت خداوندی کا رویہ اختیار کئے ہوئے تھا تو یہ اس کی جگہ سرکشی کا رویہ اختیار کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلا شخص اس دنیا سے اس حال میں جائے گا کہ اس کی روح صحت مند اور ترقی یافتہ روح ہوگی اور جنت کی فضاؤں میں بسائے جانے کی مستحق ٹھہرے گی۔ اور دوسرے شخص کی روح بیمار اور پچھڑی ہوئی روح ہوگی اور صرف اس قابل ہوگی کہ اس کو جہنم کے کوڑا خانہ میں پھینک دیا جائے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ ۙ
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (٥)
وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا
وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (٦)

دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو لپیٹتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں۔ خبردار، جب وہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں، اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ دلوں کی بات تک جاننے والا ہے۔ اور زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ اور وہ جانتا ہے جہاں کوئی ٹھہرتا ہے اور جہاں وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک کھلی کتاب میں موجود ہے ۶-۵

قریش کے بعض سرداروں نے ایسا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو وہ بے پروائی کے ساتھ اٹھے۔ اپنی چادر اپنے اوپر ڈالی اور روانہ ہوگئے۔

یہ دراصل کسی بات کو نظر انداز کرنے کی ایک صورت ہے۔ کوئی آدمی جب داعی کو حقیر سمجھے اور اس کے مقابلہ میں اپنے کو برتر خیال کرے تو اس وقت وہ اسی قسم کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ مگر آدمی بھول جاتا ہے کہ جس نفسیات کے تحت وہ ایسا کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے۔ یہ صرف ایک انسان (داعی) کو نظر انداز کرنا نہیں ہے بلکہ خود خدا کو نظر انداز کرنا ہے جو ہر کھلے اور چھپے کو جاننے والا ہے۔

پھر آدمی کا حال اس وقت کیا ہوگا جب وہ خدا کا سامنا کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ جس خدا کو اس نے نظر انداز کیا تھا وہی وہ ہستی تھا جس سے اس کو وہ سب کچھ ملا تھا جو اس کے پاس تھا۔ حتیٰ کہ وہ اسباب بھی جن کے بل پر اس نے خدا کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ آدمی خدا کی دنیا میں ہے اور بالآخر وہ خدا کی طرف جانے والا ہے۔ مگر وہ اس طرح رہتا ہے جیسے کہ نہ آج خدا سے اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ آئندہ اس کا خدا سے کوئی واسطہ پڑنے والا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ
لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ
لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ
إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا
ع عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں اچھا کام کرتا ہے۔ اور اگر تم کہو کہ مرنے کے بعد تم لوگ اٹھائے جاؤ گے تو منکرین کہتے ہیں یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اور اگر ہم کچھ مدت تک ان کی سزا کو روک دیں تو کہتے ہیں کہ کیا چیز اس کو روکے ہوئے ہے۔ آگاہ، جس دن وہ ان پر آپڑے گا تو وہ ان سے پھیرا نہ جاسکے گا اور ان کو گھیرے گی وہ چیز جس کا وہ مذاق اڑا رہے تھے ۸ — ۷

موجودہ دنیا کو خدا نے چھ دنوں، یعنی چھ دوروں (Periods) میں پیدا کیا ہے۔ زمین پر

ایک ایسا دور گزرا ہے جب کہ اس کی سطح پانی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ خدا کی سلطنت کے اس حصہ میں اس وقت صرف پانی نظر آتا تھا۔ اس کے بعد خدا کے حکم سے خشکی کے علاقے ابھر آئے اور پانی سمندروں کی گہرائی میں جمع ہوگیا۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ زمین پر موجودہ انواع حیات ظہور میں آئیں۔

خدا اگرچہ قادر ہے کہ واقعات کو اچانک ظاہر کر دے۔ مگر یہ دنیا انسان کے لئے بطور امتحان گاہ بنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو منصوبہ کے تحت بنایا اور اپنی تخلیقات پر اسباب کا پردہ قائم رکھا۔

دنیا کی پیدائش اور اس پر انسان کی آبادکاری سے خدا کا مقصود اچھا عمل کرنے والے کا انتخاب ہے۔ "اچھا عمل" دراصل حقیقت پسندانہ عمل کا دوسرا نام ہے۔ یعنی کسی دباؤ کے بغیر وہ کرنا جو از روئے حقیقت آدمی کو کرنا چاہئے۔ حقیقت پسند شخص وہ ہے جو اسباب کے ظاہری پردہ سے گزر کر خدا کی چھپی ہوئی کارفرمائی کو دیکھ لے۔ بظاہر اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے اختیار کرلے۔ سرکشی کی زندگی گزارنے کا موقع رکھتے ہوئے خدا کا تابعدار بن جائے۔

موجودہ دنیا میں ایسے ہی حقیقت پسند انسانوں کا چناؤ ہو رہا ہے۔ جب چناؤ کی یہ مدت ختم ہوگی تو موجودہ نظام کو ختم کرکے دوسرا معیاری نظام بنایا جائے گا جہاں تمام اچھی چیزیں صرف اچھا عمل کرنے والوں کے لئے ہوں گی اور تمام بری چیزیں صرف برا عمل کرنے والوں کے لئے۔

اللہ تعالیٰ اپنے قانون مہلت کی وجہ سے منکروں اور سرکشوں کو فوراً نہیں پکڑتا۔ ان کو انتہائی حد تک موقع دیتا ہے کہ وہ یا تو متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کرلیں یا آخری طور پر اپنے آپ کو مجرم ثابت کردیں۔ یہ قانون مہلت بعض سرکشوں کے لئے غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت کو بھول کر بڑی بڑی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ مگر جب وہ خدا کی پکڑ میں آجائیں گے اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ وہ خدا کے مقابلہ میں کس قدر بے بس تھے۔

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ۝٩ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝١٠ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝١١

اور اگر ہم انسان کو اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں پھر اس سے اس کو محروم کردیتے ہیں تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی تھی، اس کو ہم نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ساری مصیبتیں مجھ سے دور ہوگئیں، وہ اترانے والا اور اکڑنے والا بن جاتا ہے۔ مگر جو لوگ

صبر کرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور بڑا اجر ۱۱—۹

موجودہ دنیا میں آدمی کو کبھی راحت دی جاتی ہے اور کبھی مصیبت ۔ مگر یہاں نہ راحت انعام کے طور پر ہے اور نہ مصیبت سزا کے طور پر ۔ دونوں ہی کا مقصد جانچ ہے ۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے وہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مختلف حالات میں آدمی نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا ۔

وہ آدمی ناکام ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب اس کو خدا کی طرف سے کوئی راحت پہنچے تو وہ فخر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے ۔ اور جو افراد اس کو اپنے سے کم دکھائی دیں ان کے مقابلہ میں وہ اکڑنے لگے ۔ اسی طرح وہ شخص بھی ناکام ہے کہ جب اس سے کوئی چیز چھنے اور وہ مصیبت کا شکار ہو تو وہ ناشکری کرنے لگے ۔ کسی محرومی کے بعد بھی آدمی کے پاس خدا کی دی ہوئی بہت سی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر آدمی ان کو بھول جاتا ہے اور کھوئی ہوئی چیز کے غم میں ایسا پست ہمت ہوتا ہے گویا اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے ۔

اس کے برعکس ایمان میں پورا اترنے والے وہ ہیں جو صابر اور صالح العمل ہوں ۔ یعنی ہر جھٹکے کے باوجود اپنے آپ کو اعتدال پر باقی رکھیں اور وہی کریں جو خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے انہیں کرنا چاہئے ۔

صبر یہ ہے کہ آدمی کی نفسیات حالات کے زیر اثر نہ بنے بلکہ اصول اور نظریہ کے تحت بنے ۔ حالات خواہ کچھ ہوں وہ ان سے بلند ہو کر خالص حق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے ۔ وہ حالات سے غیر متاثر رہ کر اپنے عقیدہ اور شعور کی سطح پر زندہ رہنے کی طاقت رکھتا ہو ۔ اسی قسم کی زندگی نیک عملی کی زندگی ہے ۔ جو لوگ اس نیک عملی کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو اگلی زندگی میں خدا کی رحمتوں کے حصہ دار ہوں گے اور خدا کی ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے ۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهِۦ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا۟ لَوْلَآ أُنزِلَ
عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَآءَ مَعَهُۥ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَآ أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ وَكِيلٌ ﴿۱۲﴾
أَمْ يَقُولُونَ ٱفْتَرَىٰهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا۟ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِۦ مُفْتَرَيَٰتٍ وَٱدْعُوا۟ مَنِ
ٱسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿۱۳﴾ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا۟ لَكُمْ فَٱعْلَمُوٓا۟

أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۴﴾

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس چیز کا کچھ حصہ چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے۔ اور تم اس بات پر دل تنگ ہو کر وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کتاب کو گھڑ لیا ہے۔ کہو، تم بھی ایسی ہی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر وہ تمہارا کہا پورا نہ کر سکیں تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر کیا تم حکم مانتے ہو ۱۲—۱۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شرک کی تردید کی اور لوگوں کو توحید کی طرف بلایا تو آپ کے مخاطبین بگڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی باتوں سے ان کے ان بڑوں پر زد پڑتی تھی جن کے دین کو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا اور جن سے انتساب پر وہ فخر کرتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ قدیم عربوں کے یہ اکابر تاریخی طور پر ان کی نظر میں باعظمت بنے ہوئے تھے، جب کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ ابھی تاریخ کی عظمتیں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت آپ لوگوں کو ایک بے حیثیت انسان کے روپ میں نظر آتے تھے۔ عرب کے لوگ یہ دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے کہ ایک معمولی آدمی ایسی باتیں کہہ رہا ہے جس سے ان کے اکابر واعاظم بے اعتبار ثابت ہو رہے ہیں۔

ایسی حالت میں داعی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ، کم از کم وقتی طور پر، تنقیدی انداز سے پرہیز کرے اور صرف مثبت طور پر اپنا پیغام پیش کرے۔ "شاید تم وحی کے بعض حصہ کی تبلیغ چھوڑ دو گے" سے مراد وحی خداوندی کا یہی تنقیدی حصہ ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو وضاحت مطلوب ہے اور تنقید کے بغیر وضاحت ممکن نہیں۔ پھر اگر حق کو پوری طرح کھولنے کے نتیجہ میں لوگ داعی کو استہزاء اور مخالفت کا موضوع بنائیں تو اس سے گھبرانے کی کیا ضرورت۔ مدعو کی طرف سے یہ مخالفانہ ردعمل تو دراصل وہ قیمت ہے جو کسی آدمی کو بے آمیز حق کا داعی بننے کے لئے اس دنیا میں ادا کرنی پڑتی ہے۔

خدا کے داعی کے برحق ہونے کا سب سے زیادہ یقینی ثبوت اس کا ناقابل تقلید کلام ہے۔ جو لوگ پیغمبر کو حقیر سمجھ رہے تھے اور یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ اس بظاہر معمولی آدمی کو وہ سچائی ملی ہے جو ان کے اکابر کو بھی نہیں ملی تھی، ان سے کہا گیا کہ پیغمبر کی صداقت کو اس معیار پر نہ جانچو کہ مادی اعتبار سے وہ کیسا ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے دیکھو کہ وہ جس کلام کے ذریعہ اپنے

دعوت پیش کر رہا ہے وہ کلام اتنا عظیم ہے کہ تم اور تمہارے تمام اکابر مل کر بھی ویسا کلام نہیں بنا سکتے۔ یہ ناقابل تقلید امتیاز اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے بول رہا ہے۔ پیغمبر کے برسر حق ہونے کی اس واضح نشانی کے بعد آخر لوگوں کو خدا کا حکم بردار بننے میں کس چیز کا انتظار ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتے ہیں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دیدیتے ہیں۔ اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا وہ برباد ہوا اور خراب گیا جو انہوں نے کمایا تھا ١٦ — ١٥

دین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملاوٹی دین، دوسرا بے آمیز دین۔ ملاوٹی دین دراصل دنیا کے اوپر دین کا لیبل لگانے کا دوسرا نام ہے۔ وہ دنیا اور دین کے درمیان مصالحت کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ ملاوٹی دین کی بنیاد پر بڑے بڑے ادارے قائم ہوتے ہیں۔ اس کے نام پر مال اور عزت اور قیادت حاصل ہوتی ہے۔

بے آمیز دین کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ بے آمیز دین کی دعوت جب کسی ماحول میں اٹھتی ہے تو وہ صرف ایک نظری سچائی ہوتی ہے۔ معاشی مفادات اور قیادتی مصالح اس کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں جو لوگ ملاوٹی دین کے نام پر عزت اور مقام حاصل کئے ہوئے ہوں ان کے سامنے جب بے آمیز دین کی دعوت آتی ہے تو وہ سخت متوحش ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کو اختیار کرنے کی صورت میں انہیں نظر آتا ہے کہ تمام دنیوی چیزیں ان سے چھن جائیں گی۔

اس اعتبار سے کسی ماحول میں بے آمیز دین کی دعوت کا اٹھنا وہاں ایک نازک امتحان کا برپا ہونا ہے۔ ایسے وقت میں جو لوگ دنیا کی عزت اور دنیا کے مفادات کو قابل ترجیح سمجھیں اور بے آمیز دین کا ساتھ نہ دیں ان کی ساری دوڑ دھوپ دنیا کے خانہ میں چلی جاتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے

اس دین کا ساتھ دیا جس میں ان کے دنیوی مفادات محفوظ تھے۔ اور اس دین کا ساتھ نہ دیا جس میں انھیں اپنے دنیوی مفادات چھنتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ بظاہر خواہ دینی سرگرمیوں میں مشغول ہوں، اصل مقصود کے اعتبار سے وہ دنیا کے حصول میں مشغول ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوششوں کا آخرت میں کوئی نتیجہ ملنا ممکن نہیں۔

انھوں نے اگرچہ اپنی سرگرمیوں کو دین کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ وہ اپنے قومی میلوں کے اوپر جشن دینی کا بورڈ لگاتے تھے۔ وہ اپنی قومی لڑائیوں کو جہاد کا نام دیتے تھے۔ وہ اپنی قیادتی نمائش کو دینی کانفرنس کہتے تھے، وہ اپنے سیاسی ہنگاموں کو خدائی کی اصطلاحات میں بیان کرتے تھے، وہ اپنے دنیوی جذبات کے تحت دھوم مچاتے تھے اور اس کو خدا اور رسول کے ساتھ جوڑتے تھے۔ مگر یہ ساری تعمیرات دنیا کی زمین میں تھیں، وہ آخرت کی زمین میں نہ تھیں، اس لئے قیامت کا زلزلہ انہیں بالکل برباد کر دے گا۔ اگلی دنیا میں ان کا کوئی انجام ان کے حصہ میں نہ آئے گا۔

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَٰبُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

بھلا ایک شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل پر ہے، اس کے بعد اللہ کی طرف سے اس کے لئے ایک گواہ بھی آ گیا، اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود تھی، ایسے ہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جماعتوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے وعدہ کی جگہ آگ ہے۔ پس تم اس کے بارہ میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے ۱۷

پیغمبر اسلام نے عرب میں توحید کی دعوت پیش کی تو کچھ لوگوں نے اس کو مانا اور زیادہ لوگ اس کے منکر ہو گئے۔ یہی ہر زمانہ میں دعوت حق کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

خدا نے ہر آدمی کو فطرت صحیح پر پیدا کیا ہے۔ مگر دو پیش کی دنیا میں ہر طرف ایسی نشانیاں

پھیلی ہوئی ہیں جو اپنے خالق کا اعلان کرتی ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے تخلیقی منصوبہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ پھر انسانیت کے بالکل ابتدائی زمانہ سے خدا کے رسول آتے رہے اور خدا کی باتیں لوگوں کو بتاتے رہے۔ انہیں میں سے ایک پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جن کی لائی ہوئی کتاب اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اب جو شخص سنجیدہ ہو اور چیزوں سے سبق لینا جانتا ہو تو وہ حقیقت سے اتنا مانوس ہوگا کہ داعی جب اس کے سامنے حقیقت کا اعلان کرے گا تو فوراً وہ اس کو پہچان لے گا۔ اس کا دل اور اس کا دماغ حق کے حق ہونے پر گواہی دیں گے۔ وہ آگے بڑھ کر اس کو اس طرح اختیار کر لے گا جیسے وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہو۔

مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں دیکھتے۔ وہ سطحی تماشوں اور وقتی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنا مزاج بگاڑ لیتے ہیں۔ غیر متعلق چیزوں کی مصروفیت انہیں اس کا موقع نہیں دیتی کہ وہ داعی اور اس کی دعوت پر ٹھہر کر سوچیں۔ چنانچہ ان کے سامنے جب حق کی دعوت آتی ہے تو وہ اس کو پہچان نہیں پاتے وہ اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر اس کے منکر بلکہ مخالف بن جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی اور خدا کے تخلیقی منصوبہ کی ناقدری کی۔ ان کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسانی فطرت، زمین و آسمان کے واقعات اور پچھلی آسمانی کتابیں قرآن کے حق ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔ اس کے بعد اگر لوگوں کی اکثریت اس کا انکار کرتی ہے تو اس کی وجہ منکرین کے اندر تلاش کی جائے گی نہ یہ کہ خود قرآن کے کتاب حق ہونے پر شک کیا جائے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَ
يَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾
الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۖ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ
كَافِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ
مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا
يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾

حج کا سفر

اگست ۱۹۸۲ میں میں بعض ملکوں کے سفر پر نکلا۔ اس سفر میں "حج" کا پروگرام شامل نہ تھا۔ حتی کہ میرے ذہن میں اس کا تصور بھی نہ تھا۔ روانڈا (افریقہ) پہنچا تو وہاں سے اچانک سفر حج کے اسباب پیدا ہو گئے۔ اس معاملہ میں میرے ساتھ بالکل وہ صورت پیش آئی جو کسی شاعر نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے :

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال　　　کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

حج کا یہ سفر اسلامک سنٹر (کیگالی) کے ڈائرکٹر جناب محمد سلیمان القائد کے ساتھ ہوا۔ وہ چونکہ اس سے پہلے دو بار حج کر چکے تھے اس لئے پورے سفر میں ان کی رہنمائی بہت مفید ثابت ہوئی کیگالی سے ہم ایتھیوپین ایرلائنز کے ذریعہ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ کی صبح کو روانہ ہوئے۔ ہماری پہلی منزل اینٹبی (Entebbe) تھی۔ یہاں جہاز ایک گھنٹہ ٹھہرا اور ہم کو موقع ملا کہ ہم یوگنڈا کے اس شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکیں۔ اینٹبی ایک چھوٹا ہوائی اڈہ ہے۔ مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی شادابی نیز سمندر کے ساحل نے اس کو کافی خوبصورت بنا دیا ہے۔ اسی مقام پر ۱۹۷۸ میں ہائی جیکنگ کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا جب کہ فلسطینیوں نے ایک اسرائیلی جہاز کو بجبر اینٹبی کے ہوائی اڈہ پر اتار لیا تھا۔ چند روز تک غیر یقینی صورت حال رہی۔ اس کے بعد اچانک اسرائیلی ہوائی جہاز اینٹبی کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ انھوں نے حیرت انگیز مہارت کے ساتھ فلسطینیوں کو مغلوب کیا اور پھر اپنے تمام آدمیوں کو لے کر اسرائیل پہنچ گئے۔

ہماری دوسری منزل عدیس ابابا تھی۔ یہاں سے ہمیں ہوائی جہاز بدلنا تھا۔ اس سلسلے میں یہاں ایک روز قیام رہا۔ عدیس ابابا ایتھیوپیا کا دارالسلطنت ہے۔ ایتھیوپیا (حبشہ) وہ ملک ہے جہاں صحابہ کرام نے پہلی ہجرت کی تھی۔ اسی خاک سے بلال حبشی پیدا ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہاں کا حکمراں نجاشی تھا۔ وہ نہایت عادل حکمراں تھا اور اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاہم یہاں کی اکثر آبادی بدستور اپنے عیسائی مذہب پر قائم رہی۔ ایتھیوپیا کے ایک سرحدی علاقہ (اریٹیریا) میں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ مگر ان مسلمانوں کو اس کے سوا اور کوئی کام معلوم نہیں کہ یہاں کی عیسائی حکومت سے بے معنی سیاسی لڑائی

لڑتے رہیں۔ وہ یہاں کے عیسائیوں کو دین خدا کا مدعو نہ بنا سکے۔ البتہ اپنی ناکام سیاست کے ذریعہ انہوں نے یہاں کے عیسائیوں کو اپنا قومی حریف ضرور بنا لیا ہے۔

۱۵ ستمبر کو ہم جدہ پہنچے۔ یہاں کے ہوائی اڈہ پر بڑا سخت مرحلہ پیش آیا۔ ہم چیکنگ کے مقام پر پہنچے تو میدان حشر کا منظر تھا۔ بے رحم چہرے کھڑے ہوئے لوگوں کے سامان کی بری طرح تفتیش کر رہے تھے۔ جس چیز کو چاہتے توڑ دیتے۔ جس چیز کو چاہتے اٹھا کر اپنے پیچھے رکھے ہوئے بڑے بڑے ٹب میں ڈال دیتے۔ بالآخر میری باری آئی۔ میرے پاس کپڑے اور قلم اور مسواک جیسی چند چیزیں تھیں۔ البتہ کاغذات کا کافی ذخیرہ تھا۔ یہ مختلف مضامین اور تاثرات تھے جو میں پچھلے ایک مہینہ کے سفر میں لکھتا رہا تھا۔ چیکنگ پوسٹ پر کھڑے ہوئے آدمی نے بے رحمی کے ساتھ تمام کاغذات کو لپیٹ کر فاتحانہ انداز سے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ میری ہر اپیل اس کے لئے قطعاً غیر موثر ثابت ہو رہی تھی۔ غیر مطبوعہ مضامین کی اس طرح بربادی میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اپنی اس بے بسی کو دیکھ کر میں انہیار عصبی کے مرحلہ کو پہنچنے والا تھا کہ اچانک ایک معجزہ پیش آیا۔ ہوائی اڈہ کے اسٹاف کا ایک عرب نوجوان وہاں آ گیا۔ اس نے میرے بکس پر میرا نام اور پتہ دیکھا اور بولا: هل انت وحيد الدين خان، صاحب الاسلام يتحدى۔ میں نے کہا: نعم۔ اس کے بعد اس نے فوراً مذکورہ آدمی سے کہا: ان کو میں جانتا ہوں۔ یہ بہت خاص آدمی ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ اس کے بعد آدمی نے میرے تمام کاغذات میرے حوالے کر دئے اور میری جان میں جان آئی۔

یہ صورت حال دراصل اس تخریبی سیاست کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جس میں بہت سی نام نہاد اسلامی جماعتیں اور اسلامی حکومتیں شریک ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہم قوموں اور مسلم حکمرانوں کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں سرگرم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکمراں طبقہ باہر سے آنے والوں کے بارے میں انتہائی حد تک شکی ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص باہر سے آ رہا ہے وہ کسی سازشی منصوبہ کا جزء ہے۔ اس کے پاس اگر کوئی بیگ ہے تو وہ اس لئے ہے کہ اس میں وہ ہتھیار چھپا کر لائے۔ اس کے پاس اگر کچھ کاغذات ہیں تو وہ یقیناً کوئی باغیانہ لٹریچر ہے جو ان کے ملک میں باہر سے درآمد کیا جا رہا ہے۔ اسلام کے نام پر جاری ہونے والی اس تخریبی سیاست نے اسلام یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ تو نہیں پہنچایا البتہ ان کو نئے نئے عذاب میں یقیناً مبتلا کر دیا ہے۔

مکہ میں مجھے ایک اسپتال میں جانا پڑا۔ قاعدہ کے مطابق میں نے پہلے ایک کاغذ لکھوایا جس میں میرا نام اور "الہند" لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے دوسری منزل پر ایک کمرہ میں داخل کیا گیا جہاں ایک عرب ڈاکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ میں وہی وحیدالدین خان ہوں جس نے الاسلام یتحدی لکھی ہے تو وہ بیتاب ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے۔ اس نے اپنے اسٹاف کے آدمیوں کو بلا کر کہا ھذا شیخ کبیر ولہ کتاب عظیم۔ فارغ ہو کر میں اس کے کمرہ سے نکلا تو خلاف معمول وہ باہر تک مجھے پہنچانے آیا۔

مکہ میں ہم جس مطوف (احمد حسین خوان، شارع ابراہیم الخلیل) کے یہاں ٹھہرے تھے، ان کا مکان باب الھجرہ کی جانب حرم سے بہت قریب تھا۔ اس کی وجہ سے بہت سا وقت حرم میں گذارنے کا اتفاق ہوا۔ کعبہ کے پردہ تک پہنچ کر دعائیں مانگنے کی توفیق بھی ملی۔

مذکورہ مکان میں پہلی منزل پر ہم سے ملے ہوئے کمرہ میں تیونس کی وزارت تعلیم کے (مفتش اوّل) مقیم تھے۔ ہمارے کمرہ کا نمبر ۱ تھا، ان کے کمرہ کا نمبر ۲۔ ۱۸ استمبر کو ایک ملاقات میں انہیں معلوم ہوا کہ میں "وحیدالدین خاں" ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے۔ وہ فوراً بولے ـــــ نعم، بل ھواحسن ماقرأت (ہاں، بلکہ وہ سب سے اچھی کتاب ہے جو میں نے پڑھی) انہوں نے بتایا کہ تیونس کے تمام مدارس ثانویہ میں آپ کی کتاب کو بطور ٹکسٹ بک کے داخل کر دیا گیا ہے۔ اور وہ ہمارے یہاں فلسفہ اور اسلامیات کے موضوع کے تحت باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے کمرہ سے اپنے صاحبزادہ کو بلایا اور کہا کہ ان سے ملو۔ یہ وقت کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ (اکبر علماء المعاصرین)

تیونس کے جریدہ الہدایہ کے لئے انہوں نے میرا انٹرویو بھی لیا۔

حج میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جو طبیعت پر بے حد شاق معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر آدمی اگر اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کر لے تو وہی چیز اس کے لئے رزق ربانی کا سبب بن جائے گی جو عام حالات میں صرف رزق نفسانی کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثلاً آپ مسجد حرام میں نماز پڑھ رہے ہیں اور انسانوں کا ہجوم آپ کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ آپ نہ صحیح طور پر رکوع کر سکیں اور نہ صحیح طور پر سجدہ۔ ایسے موقع پر اگر آپ سامنے والے انسان کو دیکھیں تو صرف غصہ اور نفرت پیدا ہو گا۔ اس کے برعکس

اگر آپ یہ کہہ اٹھیں کہ خدایا میری اس ٹوٹی پھوٹی نماز کو قبول کرلے۔ کیونکہ میری بظاہر صحیح نماز بھی اتنی ہی ٹوٹی پھوٹی نماز ہے جتنی کہ میری یہ نماز، تو آپ کا ذہن بالکل دوسری طرف پھر جائے گا اور آپ کو خدا کا رزق ملنے لگے گا۔ اسی طرح رمی اور دوسرے مواقع پر انسان کا بے پناہ ہجوم، منیٰ اور عرفات میں گرمی کی شدت، پانی لینے کے لئے ایک کا دوسرے پر ٹوٹنا وغیرہ۔ ان مواقع پر اگر آپ صرف سامنے کے انسان کو دیکھیں تو آپ کے اندر صرف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ سوچنے لگیں کہ دنیا کی معمولی مصیبت کا یہ حال ہے تو آخرت کی بڑی مصیبت میں میرا کیا حال ہوگا تو اچانک آپ محسوس کریں گے کہ جو چیز بظاہر مصیبت نظر آرہی تھی اس نے خدا کی رحمت بن کر آپ کے اوپر سایہ کرلیا ہے۔

ہم ۶ ستمبر کو جدہ سے مکہ پہنچے تو ہمارے ساتھی محمد سلیمان القائد نے اپنے سامان کو چک کرتے ہوئے پایا کہ وہ اپنا کیس (حقیبہ) جدہ کے ہوائی اڈہ پر چھوڑ آئے ہیں۔ اس میں ان کے بیس ہزار ریال تھے۔ یہ حادثہ بڑا سخت تھا۔ اس کے بعد میں مکہ میں ٹھہرا اور وہ امید و بیم کی کیفیت لے کر دوبارہ جدہ کے لئے روانہ ہوئے کہ شاید بیگ دوبارہ مل جائے۔ مجھے سخت تشویش تھی۔ میں نماز کے لئے کھڑا ہوا تو بے اختیار میری زبان سے نکلا: اللهم اجعله لنا درساً ولا تجعله لنا خسارةً (یعنی خدایا: بیگ ضائع نہ ہو اور وہ دوبارہ مل کر ہمارے لئے سبق کا ذریعہ بن جائے۔ دن بھر اسی قسم کی دعا دل سے نکلتی رہی۔ محمد سلیمان القائد صاحب مغرب بعد جدہ سے لوٹے تو ان کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شرطہ کے دفتر میں بیگ مل گیا۔ اس کی پوری رقم اور دوسرے کاغذات بدستور اس میں موجود تھے۔

جدہ کے ہوائی اڈہ پر میری بھی دو چیزیں گم ہوئیں —— گھڑی اور قلم۔ مگر وہ دوبارہ نہ مل سکیں۔ ممکن ہے اس میں اس کا بھی دخل ہو کہ میں نے زیادہ تلاش نہیں کیا۔

حج کے بہت سے پہلو ہیں مگر اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ آدمی جب سفر کرکے مقامات حج تک پہنچتا ہے تو اس پر خاص طرح کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں پہنچ گیا ہے۔ وہ اپنے خدا کو چھو رہا ہے وہ اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ وہ اس کی طرف دوڑ رہا ہے۔ وہ اس کی خاطر سفر کر رہا ہے۔ وہ اس کے حضور قربانی پیش کر رہا ہے۔

وہ اس کے دشمن کو کنکریاں مار رہا ہے۔ وہ اس سے مانگ رہا ہے جو کچھ وہ مانگنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے پا رہا ہے جو کچھ اسے پانا چاہئے۔

عرفات کا میدان اس سلسلہ میں بڑا عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ خدا کے بندے قافلہ در قافلہ چاروں طرف سے چلے آرہے ہیں۔ سب کے جسم پر ایک ہی سادہ لباس ہے۔ ہر ایک اپنی امتیازی صفت کو کھو چکا ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی لفظ جاری ہے۔ لبیک اللھم لبیک، لبیک اللھم لبیک۔ یہ منظر دیکھ کر قرآن کی وہ آیت یاد آنے لگتی ہے۔ ونفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الی ربھم ینسلون۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفات کا اجتماع حشر کے اجتماع کی ایک دنیوی تصویر ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے الحج عرفة (عرفات کے میدان میں قیام ہی حج ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کا اہم ترین فائدہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی میدان حشر میں خدا کے سامنے اپنی حاضری کو یاد کرے۔ جو کچھ کل عملاً بیتنے والا ہے اس کو آج ہی ذہنی طور پر اپنے اوپر طاری کر لے۔

کعبہ خدائے واحد کا گھر ہے۔ جس کو دو پیغمبروں (حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ) نے مل کر بنایا۔ ان پیغمبروں کی خدا پرستی اور خدا کے لئے ان کی قربانی کے حیرت انگیز واقعات اس مسجد سے وابستہ ہیں۔ پھر پیغمبر اسلام اور آپ کے پاک اصحاب کی زندگیاں اور ان کی تمام خدا پرستانہ سرگرمیاں اس کی فضاؤں میں بسی ہوئی ہیں۔

خدا پرستی اور خدا کے لئے قربانی کی اس طویل تاریخ کو آدمی کتابوں میں پڑھتا ہے۔ وہ اس کے حافظہ کے خانہ کا جزء بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جب وہ کعبہ کے سامنے پہنچتا ہے تو حافظہ کی تمام یادیں اچانک جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک تاریخ کے سامنے کھڑا ہوا پاتا ہے۔ خدا سے خوف اور محبت کی تاریخ، خدا کے لئے قربان ہو جانے کی تاریخ، خدا کو اپنا سب کچھ بنانے کی تاریخ، خدا کو قادر مطلق کی حیثیت سے پالینے کی تاریخ، خدا کی خاطر اپنے آپ کو مٹا دینے کی تاریخ۔

اس قسم کی ایک عظیم ربانی تاریخ اس کے سامنے کعبہ کی صورت میں مجسم ہو جاتی ہے۔ وہ حجری حروف میں لکھی ہوئی اس کو نظر آنے لگتی ہے۔ یہ تجربہ اس کے دماغ کو ہلاتا ہے اور اس کے سینہ کو پگھلا دیتا ہے۔

یہ میری محرومی تھی کہ میں نے ابھی تک حج کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔ اس سال میں

ایک اور سفر کے لئے نکلا۔ مگر خدا نے عجیب وغریب طور پر ایشیا اور یورپ اور افریقہ کا سفر کراتے ہوئے مجھ کو حجاز پہنچا دیا تاکہ میں حج کی سعادت حاصل کرسکوں۔ حج کرنے والا اگرچہ میں تھا، مگر حج کرانے والا صرف خدا تھا۔ اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہ تھا۔

حرم میں پہنچ کر جب کعبہ پر نظر پڑی تو یہ ایک ایسا منظر تھا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کعبہ کو دیکھنا اور کعبہ کے پڑوس میں اپنے آپ کو پانا اتنا لذیذ ربانی تجربہ ہے جس کے اظہار سے میرا قلم عاجز ہے۔ اس غیر متوقع نعمت کو پاکر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ میں نے کہا: خدایا، میں نے ابھی تک اپنی زندگی میں حج کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔ گویا کہ میں حج کئے بغیر مرنے پر راضی تھا۔ تیرا کیسا عجیب احسان ہے کہ تو نے مجھ کو اس محرومی سے بچالیا۔

کعبہ زمین پر خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہاں بھٹکی ہوئی انسانی روحوں کو خدا کا آغوش دیا جاتا ہے۔ وہاں پتھرائے ہوئے سینوں میں عبدیت کے چشمے جاری کئے جاتے ہیں۔ وہاں بے نور آنکھوں کو خدا کی تجلیات دکھائی جاتی ہیں۔ تاہم سب کچھ اس کے لئے ہے جو اس کی استعداد لے کر وہاں جائے۔ بے استعداد لوگوں کے لئے حج بس ایک قسم کی سیاحت ہے۔ وہ وہاں جاتے ہیں تاکہ جیسے گئے تھے ویسے ہی دوبارہ واپس چلے آئیں۔

وہاں میں نے جو خدائی مناظر دیکھے جس طرح وہ ناقابل بیان ہیں اسی طرح وہ انسانی مناظر بھی ناقابل بیان ہیں جو وہاں مجھے دیکھنے کو ملے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ یا تو دنیا کی باتیں کرنے میں مشغول ہیں یا دنیا کا سامان خریدنے میں۔ کچھ لوگ دوسروں کو دھکا دے کر اپنی پرجوش مذہبیت کا ثبوت دے رہے تھے حالانکہ اس قسم کی چیزیں حرم میں جائز نہیں۔

جہاں ہر طرف خدا کے جلوے بکھرے ہوئے تھے تاکہ آدمی ان میں محو ہو جائے وہاں لوگ انسانی جلووں میں گم تھے۔ جہاں خدا کے فرشتے اترے ہوئے تھے تاکہ لوگ ان سے باتیں کریں وہاں لوگ انسانوں سے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ جہاں ہر طرف آخرت کا سامان بک رہا تھا وہاں لوگوں کو دنیا کا سامان خریدنے کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ جس جگہ کا یہ حق تھا کہ خدا کا ڈر انہیں پیچھے کر دے وہاں لوگ دوسروں کو دھکا دے کر آگے بڑھ جانے میں تیزی دکھا رہے تھے۔

مسجد حرام نہایت وسیع ہے اور ویسی ہی ہے جیسا کہ اس کو ہونا چاہیے۔ مگر حاجیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے، اس وسعت کے باوجود، اس کو تنگ کر دیا ہے۔ تاہم ایک چیز

مجھے شدت سے محسوس ہوئی ۔ اور وہ مسجد حرام کے باہر کا ماحول ہے ۔ مسجد حرام کے باہر کھلی ہوئی جگہ نہیں ۔ مسجد حرام کو بستی سے جو چیز جدا کرتی ہے وہ صرف ایک سڑک ہے ۔ نہایت ضروری تھا کہ مسجد حرام کے چاروں طرف نہایت وسیع کھلا ہوا میدان ہوتا ۔ مگر موجودہ حالت یہ ہے کہ مسجد حرام کو چاروں طرف سے ہوٹلوں کی اونچی عمارتوں کے جنگل نے گھیر رکھا ہے ۔ سعودی حکومت نے اگرچہ اطراف کے بہت سے مکانات کو خرید کر حرم کی توسیع کی ہے مگر یہ کام ابھی اور کرنا باقی ہے ۔

حاجیوں کو میں نے دیکھا کہ ارکان حج ادا کرتے ہوئے وہ بس رٹی ہوئی دعائیں دہراتے ہیں یا کتاب ہاتھ میں لے کر اس سے پڑھتے رہتے ہیں ۔ حج کی فقہی ادائیگی اگرچہ اس سے ہو جاتی ہے مگر حج کے دوران ذکر و دعا سے جو چیز مطلوب ہے اس کا حق اس طرح ادا نہیں ہوتا ۔ حج کے دوران آدمی پر وہ کیفیت گزرنی چاہئے جو حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان پر گزری تھی ۔ مثلاً جب آدمی سعی کرتا ہے تو اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلنے چاہئیں کہ خدایا تو نے اس سعی کے بعد هاجرہ کے لئے برکت کا ابدی چشمہ جاری کر دیا تھا ، میری سعی کو بھی تو ایسی سعی بنا دے جس کے بعد میرے لئے خیر کے ایسے چشمے جاری ہو جائیں جو دنیا سے آخرت تک مجھے برکت دیتے رہیں ۔

السید سابق نے اپنی مشہور کتاب فقہ السنہ میں بجا طور پر لکھا ہے :

ویستحب لہ ان یکثر من الذکر والدعاء ویتخیر منہما ماینشرح لہ صدرہ دون ان یتقید بشئ اویردد مایقولہ المطوفون فلیس فی ذلک ذکر محدود الزمنا الشارع بہ ۔ ومایقولہ الناس من اذکار وادعیۃ فی الشوط الاول والثانی وھکذا فلیس لہ اصل ولم یحفظ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شئ من ذلک فلطائف ان یدعوا نفسہ ولاخوانہ بماشاء من خیری الدنیا والاخرۃ (المجلد الاول ، صفحہ ۶۹۴)

طواف کرنے والے کو چاہئے کہ طواف کے وقت خوب ذکر اور دعا کرے اور ان میں سے جن پر اسے شرح صدر ہو ان کو اختیار کر لے بغیر اسکے کہ اپنے کو کسی سے مقید کرلے یا معلمین کے کہے کو دہراتا رہے ۔ کیونکہ طواف میں کوئی متعین ذکر نہیں ہے جسکا شارع نے ہم کو پابند کیا ہو ۔ اور عوام جو اذکار اور دعائیں شوط اول ، شوط ثانی وغیرہ میں پڑھتے ہیں ان کی کوئی اصل نہیں ۔ اور اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ثابت نہیں ۔ طواف کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بھائیوں کیلئے جس طرح چاہے دنیا اور آخرت کی بہتری مانگے ۔

حج کے مسائل جو قرآن و حدیث میں ہیں وہ اتنے کم ہیں کہ چند صفحات میں لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر فقہاء نے، دوسری عبادات کی طرح حج کے بے شمار مسائل وضع کر رکھے ہیں جن کا احاطہ عام آدمی کے لئے ممکن نہیں۔ اس "اضافہ" کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ حجاج کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔ مگر اس استدلال میں کوئی وزن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض فقہی مسائل پڑھ کر کوئی شخص نہ نماز پڑھ سکتا اور نہ حج کر سکتا۔ یہ کام ایسا ہے جو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے مفصل احکام بتانے کے بجائے یہ فرمایا۔ صلوا کما رأیتمونی اصلی (جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو اسی طرح تم بھی نماز پڑھو)

یہی اصل طریقہ ہے۔ رسول اللہ کو دیکھ کر صحابہ نے نماز پڑھی۔ صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے۔ تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے۔ جس طرح یہ سلسلہ آج تک چلا جا رہا ہے۔ اگر لوگوں کے پاس صرف فقہ کے نام نہاد تفصیلی مسائل ہوتے تو لوگ کبھی صحیح طور پر نماز نہ پڑھ سکتے۔ امام ابو حنیفہ اس فن کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر وکیع کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے ان سے کہا کہ میں نے مناسک کی ادائیگی میں پانچ غلطیاں کیں۔ پھر ایک حجام نے مجھے بتایا۔ (قال وکیع: قال لی ابو حنیفه، اخطأت فی خمسة ابواب من المناسك فعلّمنيها حجام، ذكره المحب الطبری بالتفصیل)

حاجیوں میں تقریباً ۹۵ فی صد تعداد زیادہ عمر والوں کی نظر آئی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو بے حد بوڑھے ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ ایسے بھی تھے جنہیں بار بار کف آتا تھا اور وہ تھوکنے پر مجبور تھے۔ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ پلاسٹک کا تھیلا لئے ہوئے ہیں اور اس کے اندر تھوک رہے ہیں۔ یہ منظر بھی نظر آیا کہ کاغذ میں تھوک کر کاغذ کو حرم میں ڈال دیا۔ اس قسم کے تمام لوگوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنا حج بدل کرائیں۔ حج بدل جو موجودہ زمانہ میں مُردوں کے لئے عام ہو گیا ہے وہ شریعت میں اصلاً ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

عن الفضل بن عباس ان امرأة من خثعم قالت یا رسول الله ان فریضة الله علی عباده فی الحج۔ ادرکت ابی شیخاً کبیراً	فضل بن عباس کہتے ہیں کہ بنو خثعم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حج بندوں کے اوپر خدا کا فریضہ ہے

لایستطیع ان یثبت علی الراحلة افاحج عنه. قال نعم۔ وذلک فی حجة الوداع (رواہ الجماعۃ)

میرا ایک بوڑھا باپ ہے، وہ سواری پر نہیں بیٹھ سکتا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔

حج بدل کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی مرگیا ہو اور یہ وصیت کی ہو کہ میری طرف سے حج ادا کر دینا۔ یہ صورت استنباطی طور پر نکلتی ہے

امام مالک کے نزدیک مُردہ کی طرف سے حج بدل اسی وقت ہے جب کہ موت سے پہلے اس نے وصیت کی ہو۔ قال مالک: انما یحج عنه اذا اوصی، اما اذا لم یوص فلا یحج عنه۔ لان الحج عبادۃ غلب فیه جانب البدنیة فلا یقبل النیابة، فقه السنة، المجلد الاول صفحہ ۶۳۷)

حج ہر صاحب استطاعت پر عمر میں ایک بار فرض ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے (الحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة، (بخاری ومسلم) حضرت عمرو بن العاص کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

لما جعل اللہ الاسلام فی قلبی اتیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقلت ابسط یدک فلأبایعک۔ قال فبسط فقبضت یدی فقال مالک یا عمرو۔ قلت اشترط۔ قال تشترط ماذا۔ قلت ان یغفرلی۔ قال اما علمت ان الاسلام یهدم ما قبله وان الهجرة تهدم ما قبلها وان الحج یهدم ما قبله (رواہ مسلم)

جب اللہ نے اسلام میرے دل میں ڈالا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اپنا ہاتھ پھیلائیے تاکہ میں بیعت کروں۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے ہاتھ پھیلایا۔ مگر میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ آپ نے کہا اے عمرو ایسا کیوں۔ میں نے کہا کہ میری ایک شرط ہے۔ آپ نے فرمایا، تمہاری کیا شرط ہے۔ میں نے کہا یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اور ہجرت پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اور حج پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

حج مبرور کو اکثر لوگ حج مقبول کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا حج جس کے ساتھ گناہ شامل نہ ہو (الحج الذی لا یخالطه اثم)

حسن بصری تابعی نے کہا ہے کہ حج مبرور وہ ہے جس سے آدمی اس طرح لوٹے کہ وہ دنیا سے بے رغبت ہو اور آخرت کا شوق اس کے اندر پیدا ہوجائے (ان یرجع زاھداً فی الدنیا راغباً فی الآخرۃ) حقیقت یہ ہے کہ حج کو اگر صحیح شعور اور جذبہ کے ساتھ کیا جائے تو نہ صرف دوران حج آدمی گناہوں سے بچا رہے گا بلکہ اس طرح لوٹے گا کہ ہر برائی سے اس کا دل متنفر ہو اور ہر بھلائی کی طرف اس کے اندر رغبت پیدا ہوچکی ہو۔

میں جب بھی حرم میں گیا تو حجر اسود کے پاس بھیڑ دیکھی اس لئے میں نے حجر اسود تک جانے کی کوشش نہیں کی۔ طواف بھی اشارہ کے ذریعہ کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حجر اسود کی صورت میں اسلام کے اندر بھی ایک بت موجود ہے۔ مگر یہ بات سراسر واقعہ کے خلاف ہے۔

بت (صنم) کس چیز کا نام ہے۔ یہ دراصل خدا کے شرکاء مقرر کرنے کا نام ہے۔ کچھ انسانی یا غیر انسانی ہستیوں کو خدا کا شریک فرض کر لیا جاتا ہے اور ان کی صورت بناکر انہیں پوجا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی "خدائے واحد" کا کوئی بت موجود نہیں۔ جو قومیں ایک خدائے برتر کے ساتھ بہت سے دوسرے خداؤں کو مانتی ہیں ان کے یہاں صرف دوسرے خداؤں کے بت پائے جاتے ہیں، خدائے برتر کا کوئی بت ان کے یہاں نہیں پایا جاتا کیونکہ بت پرستی لازماً "شرکت" کو چاہتی ہے، شرکت کے بغیر بت پرستی کا کوئی وجود نہیں۔

اسلام میں شرکت کا کوئی تصور نہیں۔ اسی لئے حجر اسود کے ساتھ بھی بت کا کوئی تصور نہیں۔ حجر اسود صرف ایک علامتی پتھر ہے۔ مومن اس پتھر کو چھو کر یا اس کی طرف اشارہ کرکے علامتی طور پر گویا خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ یہ ایک قسم کی براہ راست بیعت ہے، جب کہ دوسری بیعت بالواسطہ بیعت ہوتی ہے۔ حجر اسود خدائے واحد سے عہد کی علامت (Symbol) ہے۔ جب کہ بت خدائے واحد کے سوا دوسرے شریکوں کی شکل (Image) ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حجر اسود کو بت سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے شراب کو خمر کے ہم معنی سمجھ لینا۔ اس سلسلے میں یہاں میں ایک لطیفہ بیان کروں گا۔ ایک بار دہلی میں ایک صاحب نے مجھ سے کہا: عرب تو کھلم کھلا شراب پیتے ہیں۔ حتی کہ میں نے حرم کی سیڑھیوں پر لوگوں کو شراب پیتے ہوئے دیکھا" اس عجیب وغریب قسم کی غلط فہمی کا راز میری سمجھ میں اس وقت آیا

جب کہ میں نے حج کیا۔ اصل یہ ہے کہ عربوں میں بند ڈبہ کی مشروبات پینے کا بہت رواج ہے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ لڑکے بالٹیوں میں بند ڈبہ کی مشروبات بھرے ہوئے فروخت کرتے رہتے ہیں اور لوگ انہیں لے لے کر پیتے رہتے ہیں۔

ان ڈبوں میں ایسے ڈبے بھی ہوتے ہیں جن پر موٹے حرفوں میں "شراب" لکھا ہوا ہوتا ہے۔ شراب کا لفظ موجودہ عربی میں مشروب (Drink) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ان ڈبوں میں پھلوں کے رس طبی طور پر تیار کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض ڈبوں میں ایک سے زیادہ چیزوں کے رس ہوتے ہیں ان پر لکھا ہوا ہوتا ہے شراب فواکہ مشکلہ (Mixed Nectar) ۔جس چیز کو ہندستان میں شراب کہا جاتا ہے اس کو عربی میں خمر کہتے ہیں۔

۱۴۰۲ھ کا حج ستمبر ۱۹۸۲ میں پڑا۔ اس موقع پر تمام دنیا کے مسلمان تقریباً ۲۵ لاکھ کی تعداد میں حرمین کے علاقہ میں جمع ہوئے۔ خوش قسمتی سے میں بھی حج کے اس عالمی اجتماع میں شریک تھا۔ اس موقع پر سب سے زیادہ عجیب چیز جو میں نے دیکھی وہ یہ کہ ان مسلمانوں کے چہروں یا ان کی سرگرمیوں پر اس تازہ حادثہ کا کوئی اثر نہ تھا جو عین انہیں دنوں میں فلسطینیوں کے ساتھ لبنان میں پیش آیا۔ تمام دنیا کے مسلم اخبارات و جرائد ان دنوں اسرائیلی مظالم کی داستانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر حج کیلئے جمع ہونے والے مسلمانوں پر بظاہر اس کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بدستور ہنس رہے تھے۔ ان کے چہرے بدستور غفلت اور بے حسی کا نشان بنے ہوئے تھے۔ مکہ اور مدینہ کے بازاروں میں خرید و فروخت کی چہل پہل بدستور اسی طرح جاری تھی جیسے ہر سال ان دنوں میں یہاں جاری رہتی ہے۔

یہ حج ایسے وقت میں پڑا جو بلا شبہہ مسلمانوں کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کا سب سے زیادہ نازک وقت تھا۔ ایک ایسی قوم جس کو ہم مردود اور مغضوب سمجھتے ہیں اس نے ایک ایسے مسئلہ میں مسلمانوں کو بدترین شکست دی جس کے معاملہ میں تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف ہم آواز ہیں۔ یہودیوں نے زبردستی فلسطین پر قبضہ کیا۔ اپنے علاقہ کو کئی گنا حد تک بڑھا لیا۔ فلسطینیوں کو نہ صرف ان کے وطن سے بلکہ اطراف کے تمام علاقوں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ ان کی آخری سرحدی قیام گاہ لبنان تھی، یہاں بھی اس نے مسلسل بمباری کے ذریعہ فلسطینیوں کو اس قدر تباہ و برباد کیا کہ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ لبنان میں اپنے ہتھیاروں کو چھوڑ کر دور کے علاقوں میں چلے جائیں۔ چند سال پہلے تک دنیا کا کوئی مسلمان اسرائیل کا وجود

تسلیم کرنے پر راضی نہ تھا۔ انور سادات نے ۱۹۷۸ میں کیمپ ڈیوڈ کے معاہدہ کے تحت اسرائیل کے وجود کو تسلیم کیا تو تمام دنیا کے مسلمانوں نے انور سادات کو غدار کہا، حتی کہ اسے قتل کر ڈالا۔ مگر آج فلسطینی مجاہدوں سمیت تمام مسلمان ذہنی طور پر اس کے لئے راضی ہو چکے ہیں کہ وہ اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیں۔

ایسی ذلت آمیز شکست مسلمانوں کو اپنی طویل تاریخ میں کبھی پیش نہیں آئی۔ مگر حج کے عالمی اجتماع میں اس کا کوئی قابل مشاہدہ اثر پانا ناممکن تھا۔ میرے علم کے مطابق صرف یہ واقعہ ہوا کہ کچھ ایرانیوں نے منی کی سڑکوں پر "مرگ بر اسرائیل" کے نعرے لگائے۔ مگر جن لوگوں کو مسلم ممالک کی سیاست کا اندازہ ہے انہیں یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی کہ یہ نعرہ حقیقتہً سعودی حکومت کے خلاف تھا نہ کہ اسرائیلی حکومت کے خلاف۔ یہ مجاہدین اسلام اگر واقعتہً اسرائیل کی ہلاکت چاہتے ہیں تو کیوں نہ انہوں نے اپنی فوجیں لبنان یا اسرائیل کے اندر داخل کر دیں۔ کیوں ایسا ہے کہ وہ مسلم ملک میں داخل ہو کر اسرائیل کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔

اس الم ناک صورت حال کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف مسٹر صادق میہوم نے اپنی ایک گفتگو میں اشارہ کیا۔ صادق نیہوم عربی سمیت چھ زبانوں کے ماہر ہیں اور اس وقت جنیوا میں مقیم ہیں۔ انہوں نے کہا: اسرائیل ہم کو نہیں مارتا، ہم تو پہلے ہی سے مرے ہوئے لوگ ہیں (اسرائیل لم تقتلنا، نحن موتی من قبل)

ہماری قیام گاہ حرم سے بہت قریب شارع ابراہیم الخلیل پر تھی۔ چنانچہ کھانے اور سونے کے علاوہ میرا بیشتر وقت حرم میں گزرتا تھا۔ میرا معمول تھا کہ باب العمرہ کے پاس زمزم کے پانی سے وضو کرتا اس کے بعد سیر ہو کر زمزم پیتا اور پھر حرم میں داخل ہو جاتا۔ اکثر اوپر کے حصہ میں، کیونکہ اوپر کے حصہ میں زیادہ سکون رہتا تھا۔ وہاں نماز پڑھتا، تلاوت کرتا، کعبہ کو دیکھتا۔ روزانہ گھنٹوں اس طرح گزر جاتے کہ وقت کا کچھ اندازہ نہ ہوتا۔ خواہ کتنی ہی زیادہ دیر ہو چکی ہو، جب لوٹتا تو معلوم ہوتا کہ ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر دل کی جو کیفیت ہوتی تھی اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

میں چونکہ افریقہ کی طرف سے انٹرنیشنل پاسپورٹ پر یہاں آیا تھا۔ اور عربوں کے ساتھ ٹھہرا تھا، اس لئے ہندستانی حاجیوں سے میری واقفیت نہ ہو سکی۔ البتہ میرے لئے

ثانی اشٹین نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ نورالدین آزاد صاحب (بمبئی) حج کے لئے جارہے ہیں۔ اس لئے ان سے ملنے کی خواہش تھی۔ میں نے کئی دن ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہ نظر نہ پڑے۔ اور ان کی قیام گاہ کا مجھے علم نہ تھا۔ آخر میں مایوس ہو گیا۔ اور بطور خود سمجھ لیا کہ اب ان سے مکہ میں ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ ۳۰ ستمبر کی شام کو میں حرم میں لیٹا ہوا تھا کہ نیند آگئی۔ خواب میں دیکھا کہ میں حرم میں داخل ہوا ہوں تو سامنے نورالدین آزاد صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ بعینہ اسی صورت میں اگلے دن (یکم اکتوبر کو) پیش آیا۔ میں حرم میں داخل ہو کر ابھی صحن میں کھڑا تھا کہ اچانک نورالدین آزاد صاحب نظر پڑ گئے۔ ان کے ساتھ بمبئی کے کچھ اور حجاج سے ملاقات ہوئی۔

۴ اکتوبر ۱۹۸۲ کی شام ہم نے طواف وداع کیا، اور رات کو مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے۔ کعبہ کا آخری طواف کر کے جب میں حرم سے نکلا تو میری عجیب کیفیت تھی۔ بار بار مڑ کر حرم کو دیکھتا تھا۔ قدم آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور دل پیچھے کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنے وطن اصلی سے نکل کر اپنے دار الھجرت کی طرف جا رہا ہوں۔ اس طرح کی کیفیات کے ساتھ ہم مسجد حرام سے رخصت ہو کر ۴ اکتوبر کی شب کو مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے۔

مکہ میں حراء وغیرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مدینہ میں مسجد نبوی کے علاوہ بدر، جبل احد، مسجد قبا، جبل جن، وادیٔ عقیق، جنت البقیع وغیرہ مقامات دیکھے۔ مدینہ کی جامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ یونیورسٹی) بھی دیکھی۔ وہاں کے اعلیٰ ذمہ داروں (رئیس اور امین عام وغیرہ) سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب لوگ الاسلام یتحدی کو پڑھے ہوئے تھے۔ ۹ اکتوبر ۱۹۸۲ کو مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے ایک تقریر ہوئی۔ زیادہ تر ہندستانی اور کچھ عرب طلبہ اجتماع میں شریک تھے۔ تقریر کا موضوع یہ تھا کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد دعوت الی اللہ ہے نہ کہ اس قسم کی سیاسی اور قومی سرگرمیاں جو آج تمام مسلم ملکوں میں پائی جا رہی ہیں۔

حرم نبوی میں داخلہ بڑا اثر انگیز تھا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کی ایک پوری تاریخ آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ میری زبان سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، میں تیرے رسول پر صلوۃ وسلام بھیجتا ہوں۔ مجھ کو اپنے رسول کی امت میں شامل کر لے۔ مجھ کو ان لوگوں میں لکھ لے جن

کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن شفاعت فرمائیں گے۔ اور جن کی شفاعت کو قبول کرکے آپ انہیں جہنم سے بچالیں گے اور جنت میں داخل کریں گے ـــــــ کیسا عجیب ہے وہ دن جو آچکا ہے اور کیسا عجیب ہے وہ دن جو آنے والا ہے۔

۵ اکتوبر ۱۹۸۲ کو ہم مدینہ پہنچے ۔ راستہ میں بدر اور دوسرے مقامات ملے۔ مگر آج کا "بدر" بس نام کا بدر ہے ۔ اس کو دیکھ کر حافظہ کے خانہ میں ضرور یہ تصور جاگتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام اور غیر اسلام کی پہلی فیصلہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔ مگر موجودہ بدر کا ظاہری ماحول اس کی تصویر پیش کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تاہم بعض شہداءِ بدر کی قبریں اب بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

مدینہ میں ہمارا قیام مسجد نبوی کے بالکل قریب ایک ہوٹل میں تھا۔ اذان اور تکبیر تک کی آواز ہمارے کمرہ میں پہنچتی تھی۔ کئی دن تک مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ مگر نمازیوں کا ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ بمشکل کسی کو سکون اور توجہ کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ مکہ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں میرے ساتھ یہی صورت پیش آئی تھی۔ اس کے بعد میں مسجد حرام کی اوپر کی منزل پر نماز پڑھنے لگا۔ وہاں مجھے کافی سکون رہتا تھا۔ مسجد نبوی کو معلوم نہیں کس مصلحت کی بنا پر دو منزلہ نہیں بنایا گیا کہ میرے جیسا کوئی آدمی وہاں پناہ لے سکے۔

مسجد نبوی غیر معمولی طور پر وسیع اور شاندار ہے۔ مگر زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ، تمام وسعتوں کے باوجود اس کو ناکافی بنا دیا ہے۔ تاہم میرے جیسے آدمی کے لئے یہ منظر کوئی خوشگوار منظر نہ تھا کہ مسجد نبوی کے اطراف کو دکانوں اور ہوٹلوں نے گھیر رکھا ہے۔ صرف ایک طرف کا حصہ دکانوں اور ہوٹلوں سے خالی ہے جس کے اوپر خیمہ نما تعمیرات نمازیوں کے لئے کھڑی ہوئی ہیں۔ کاش مسجد کے چاروں طرف کھلا ہوا میدان ہوتا تو مسجد کی عظمت زیادہ نمایاں ہوتی۔

آج کے مدینہ میں قدیم زمانہ کے مدینہ کا کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا۔ آج کا مدینہ بس جدید طرز کی عمارتوں کا ایک شہر ہے۔ تاہم وہ جدید طرز کی شہری منصوبہ بندی کی خصوصیات سے خالی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نو تعمیر عمارتوں کا ایک جنگل ہے جو عدم تخطیط کی زمین پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ غالباً اسی عدم تخطیط یا سوءِ تخطیط کا یہ نتیجہ ہے کہ مسجد نبوی

کے چاروں طرف اس کے شایان شان زمین خالی چھوڑی نہ جاسکی۔

یہی حال مکہ کا ہے اور یہی حال مدینہ کا، مکہ اور مدینہ دونوں اسلامی تاریخ کے اہم ترین مقامات ہیں۔ سو سال پہلے یہاں کثرت سے تاریخی آثار موجود تھے۔ مگر اصلاحی مجاہدین نے ان تمام آثار کو بدعت کے مقامات قرار دے کر مٹا دیا۔ ہمارے مصلحین کو واقعہ کا صرف ایک پہلو معلوم تھا۔ یہ کہ یہاں بعض جاہل قسم کے لوگ بدعتی افعال کرتے ہیں۔ انہیں اس کی خبر نہ ہوسکی کہ یہ اسلامی تاریخ کے زندہ نشانات ہیں۔ اور ان کو مٹا کر وہ اسلامی تاریخ کو اس کے ایک قیمتی جزء سے محروم کر رہے ہیں جس کی تلافی کبھی ممکن نہ ہوگی —— موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں علمی ذوق کی کمی نے اسلام کو کیسے کیسے نقصانات پہنچائے ہیں۔

۳ ستمبر ۱۹۸۲ کو حج کے مناسک کی تکمیل ہوئی۔ اور ہم دوبارہ مکہ واپس آئے۔ مطابع دار الثقافہ (مکہ) کی طرف سے ہر سال حاجیوں کے اعداد و شمار شائع کئے جاتے ہیں۔ اس کے اعلان کے مطابق اس سال (۱۴۰۲ھ) سعودی عرب کو چھوڑ کر دوسرے تمام ممالک سے آنے والے حاجیوں کی کل تعداد ۸۵۳۵۵۵ تھی۔ زیادہ تعداد والے چند ملکوں کے نام یہ ہیں:

۰۱	مصر	۹۸۴۰۸
۰۲	ایران	۸۹۵۰۳
۰۳	نائیجیریا	۸۱۱۲۸
۰۴	پاکستان	۷۲۸۴۴
۰۵	انڈونیشیا	۵۷۴۷۸
۰۶	ترکی	۵۳۷۸۸
۰۷	الجزائر	۴۰۴۰۰
۰۸	شام	۲۷۸۹۰
۰۹	ہندستان	۲۶۲۲۹

سعودی حکومت کے بے شمار انتظامات نے موجودہ زمانہ میں حج کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ تاہم ایک چیز ایسی ہے جس کا اس کے پاس شاید کوئی حل نہیں۔ اور

وہ حاجیوں کا ہجوم ہے ۔ خاص طور پر شیطان کو پتھر مارنے کے موقع پر لوگ جس طرح ایک دوسرے کے اوپر ٹوٹتے ہیں وہ انتہائی حد تک افسوس ناک ہے ۔ بے شمار انسان بیک وقت شیطان کو مارنے کے لئے اس طرح ہجوم کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامتی شیطان کو کنکری مارنے کا انہیں اتنا جوش ہے کہ اس کی خاطر وہ حقیقی انسان کو کچل دینا چاہتے ہیں ۔ خدا کے ایک حکم کی تعمیل کے شوق میں خدا کے دوسرے حکم کو نظر انداز کرنے کی اس سے زیادہ بری مثال اب تک میں نے اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھی تھی ۔ کئی آدمی ایسے نظر پڑے جن کے ہاتھ یا پاؤں میں پلاسٹر بندھا ہوا تھا ۔ ایک منظر یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ رمی کے وقت ایک حاجی گر پڑا اور حاجیوں کے قدموں کے نیچے کچل کر ختم ہو گیا ۔ لوگوں نے بتایا کہ اس طرح کے واقعات ہر سال ہوتے رہتے ہیں ۔ کیسا عجیب ہے وہ حج جس میں انسانی دشمن کی ایک علامت کو مارنے کے جوش میں خود انسان کو مار ڈالا جائے ۔

حج ایک قسم کا تجدید ایمان ہے ۔ حج سے پہلے کا ایمان گویا ایک موقت ایمان ہے ۔ اس کے بعد مومن جب مکہ پہنچتا ہے اور لبیک لبیک کہہ کر بیت اللہ کا طواف کرتا ہے تو گویا وہ اپنے ایمان کی تجدید کرتا ہے ۔ وہ براہ راست خدا سے " بیعت " ہوتا ہے ۔

حج کے بعد گناہوں کی معافی عین اس قانون کے تحت ہے جو قبولیت اسلام سے متعلق ہے ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آدمی کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ۔ بندے کے ساتھ یہ معاملہ ایمان اول کے بعد شروع ہو جاتا ہے ۔ اور ایمان ثانی کے بعد گویا اس کی تکمیل ہوتی ہے ۔ ایمان اول اگر بالواسطہ ایمان تھا تو ایمان ثانی براہ راست ایمان ہے ۔ معذوری کی حالت میں ایمان اول ہی خدا کی رحمت سے آدمی کے گناہوں کی معافی کے لئے کافی ہو جاتا ہے ۔ مگر صاحب استطاعت کے لئے ایمان ثانی کے بعد اس کی تکمیل ہوتی ہے ۔ شاید اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص استطاعت رکھتا ہو اور پھر بھی حج ادا کئے بغیر مر جائے تو خدا کو اس کی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر مرا (من ملك زادًا و راحلةً تبلغه حج بيت الله الحرام و لم يحج فلا عليه ان يموت يهوديا او نصرانيا ، رواه الترمذی والبیہقی)

حقیقت یہ ہے کہ حج تمام عبادتوں کا سردار ہے ۔ کعبہ کا جو درجہ دوسری مسجدوں کے درمیان ہے وہی درجہ حج کا دوسری عبادتوں کے درمیان ۔

آپ کے نام

مکرمی و محترمی　　　　　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اسلامی مرکز کی ابتدا نومبر ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ ۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا۔ اور مکتبہ الرسالہ قائم ہوا۔ ان کا خاص مقصد اسلامی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنا تھا۔ بفضلہ تعالیٰ یہ کام اردو زبان میں کامیاب طور پر جاری ہے۔ فکری طور پر اسلامی مرکز کا فکر سب سے زیادہ غالب فکر بنتا جارہا ہے۔ یہ مشن اب ملکی حدود سے گزر کر بین اقوامی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔

اب یہ طے کیا گیا ہے کہ اسلامی مرکز کے منصوبہ کے تحت مزید شعبوں کو بھی باقاعدہ طور پر قائم کیا جائے۔ مثلاً دار التصنیف، دار الترجمہ، جدید طرز کی اسلامی درس گاہ، داعیوں کی تربیت کا کورس، مختلف زبانوں میں پریس، مکمل اسلامی لائبریری۔ تربیتی اور تبلیغی ادارہ، الرسالہ کا انگریزی اور عربی اڈیشن، مکتبہ الرسالہ کی کتابوں کی دوسری عالمی زبانوں میں اشاعت وطباعت کا انتظام، وغیرہ

اس جامع منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے کثیر وسائل کی ضرورت ہے۔ وسیع عمارت، کارکنوں کی ایک ٹیم اور دوسرے ضروری وسائل کے بغیر یہ کام نہیں کیا جاسکتا۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے ہم کو آپ کے خصوصی مالی تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

ہماری آپ سے اپیل ہے کہ آپ خود بھی اس مالی تعاون میں حصہ لیں اور اپنے حلقۂ تعارف میں دوسروں کو بھی اس اہم ترین دینی کام میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔

واضح ہو کہ اسلامی مرکز میں ہر نوعیت کے مختلف شعبے ہیں۔ اور ان کے لئے عام عطیات وتعاون کے علاوہ زکوٰۃ وصدقات کی مدکی رقمیں بھی بھیجی جاسکتی ہیں۔ رقم بھیجتے ہوئے براہ کرم اس کی مدکی صراحت فرمائیں۔

اسلامی مرکز کا مقصد دور جدید میں اسلام کا احیاء اور ملت اسلامی کی تعمیر ہے۔ بلاشبہہ یہ وقت کا اہم ترین کام ہے۔ ہم کو پوری امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہمارے ساتھ مالی تعاون کریں گے اور اپنے بس بھر اس میں پوری شرکت فرمائیں گے۔

وحیدالدین خاں، صدر اسلامی مرکز

دفتر الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

July 1983
Issue No. 80

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

١- تذکیر القرآن جلد اوّل ہدیہ ۵۰/-
٢- الاسلام ۱۵/-
٣- مذہب اور جدید چیلنج ۲۰/-
۴- ظہورِ اسلام ۲۰/-
۵- احیاءِ اسلام ۱۲/-
٦- پیغمبرِ انقلاب ۲۰/-
٧- دین کیا ہے ۲/-
٨- قرآن کا مطلوب انسان ۵/-
٩- تجدیدِ دین ۳/-
١٠- اسلام دینِ فطرت ۳/-
١١- تعمیرِ ملت ۳/-
١٢- تاریخ کا سبق ۳/-
١٣- مذہب اور سائنس ۵/-
١۴- عقلیاتِ اسلام ۳/-
١۵- فسادات کا مسئلہ ۲/-
١٦- انسان اپنے آپ کو پہچان ۱/-
١٧- تعارفِ اسلام ۲/۵۰
١٨- اسلام پندرھویں صدی میں ۲/-
١٩- راہیں بند نہیں ۳/-
٢٠- ایمانی طاقت ۳/-
٢١- اتحادِ ملت ۳/-
٢٢- سبق آموز واقعات ۳/-
٢٣- زلزلۂ قیامت ۴/-
٢۴- حقیقت کی تلاش ۳/-
٢۵- پیغمبرِ اسلام ۲/-
٢٦- منزل کی طرف ۱/-
٢٧- حقیقتِ حج (زیرِ طبع)
٢٨- Mohammad The Ideal Character 3/-

تعارفی سٹ

٢٩- سچا راستہ ۱/-
٣٠- دینی تعلیم ۳/-
٣١- حیاتِ طیبہ ۲/۵۰
٣٢- باغِ جنت ۳/-
٣٣- نارِ جہنم ۳/-

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

چھوٹے برتن میں زیادہ پانی نہیں سماتا
ٹھیک اسی طرح ————————
چھوٹے دل کے ساتھ بڑی کامیابی جمع نہیں ہوتی

اگست ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۸۱

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

اگست ۱۹۸۳
شمارہ ۸۱

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ ان شاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

روزہ اور عید

روزہ ہماری دنیا کی زندگی کی علامت ہے اور عید ہماری آخرت کی زندگی کی علامت۔ روزہ گویا امتحان ہے اور عید اس کا انجام۔ روزہ پابندیوں کا مرحلہ ہے اور عید آزادی کا مرحلہ۔ روزہ مشقت اور محنت کا دور ہے اور عید آرام اور خوشی کا دور۔

روزہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کی ساری زندگی طرح طرح کی پابندیوں میں گزرتی ہے۔ یہ کرو اور وہ نہ کرو، اس وقت کھاؤ اور اُس وقت نہ کھاؤ، کب سوؤ اور کب بستر سے اٹھ جاؤ۔ غرض پورا ایک مہینہ اس طرح گزارا جاتا ہے گویا کہ آدمی کی پوری زندگی دوسرے کے قبضہ میں ہے۔ آدمی کو اپنی مرضی پر نہیں بلکہ دوسرے کی مرضی پر چلنا ہے۔ اس طرح روزہ آدمی کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی نگرانی میں دئے ہوئے ہو، وہ ہر معاملہ میں خدا کے حکموں کی پابندی کر رہا ہو۔

اس طرح کے ایک پرمشقت مہینہ کے بعد عید کا دن آتا ہے۔ عید کے دن اچانک تمام احکام بدل جاتے ہیں —— پہلے روزہ رکھنا فرض تھا، اب روزہ رکھنا حرام ہے۔ پہلے لازمی ضرورتوں تک پر پابندی لگی ہوئی تھی، اب کہدیا گیا کہ آزادی سے گھومو پھرو اور خوشیاں مناؤ۔ حتی کہ غریبوں کے لئے صاحب حیثیت لوگوں پر صدقۂ فطر مقرر کیا گیا تاکہ وہ بھی آج کے دن کی خوشیوں سے محروم نہ رہیں۔ یہ گویا آخرت کی زندگی کی ایک تصویر ہے۔ یہ اس دن کو یاد دلاتا ہے جب کہ خدا کے سچے بندوں پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالی جائیں گی۔ وہ ابدی آرام اور ابدی خوشی کی جنتوں میں داخل کر دئے جائیں گے، خواہ آج وہ ظاہر بینوں کو کمزور اور بے قیمت کیوں نہ نظر آتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ اور عید ہماری زندگی کے دو مرحلوں کی یاد دلانے کے لئے ہیں۔ روزہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ دنیا کے مرحلہ میں ہمیں کس طرح رہنا ہے۔ اور عید ہم کو بتاتی ہے کہ آخرت کے آنے والے مرحلہ میں ہماری زندگی کیسی زندگی ہوگی۔ ایک دنیا کی زندگی کی ابتدائی علامت ہے اور دوسری آخرت کی زندگی کی ابتدائی علامت۔

پانے کے باوجود محروم

چارلی چپلن (۱۹۷۷ - ۱۸۸۹) فلمی دنیا کا ایک مشہور ترین آدمی تھا۔ وہ فلموں میں ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس نے ۵۲ سالہ فلمی زندگی میں بے شمار دولت کمائی۔ چارلی چپلن ایک انگریز تھا۔ اس نے امریکہ میں فلمی ترقی حاصل کی اور پھر سوئزرلینڈ میں اس نے ۳۷ ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے لئے ایک شاندار مکان بنایا۔ جب وہ مرا تو اس کی ملکیت میں دس ملین پونڈ موجود تھے۔ اس کو بڑے بڑے انعامات اور خطابات سے نوازا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ چارلی چپلن کو دنیا کے ہر حصہ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی تقریباً ۸۰ فلمیں ایسی ہیں جو مسلسل کہیں نہ کہیں دکھائی جاتی ہیں۔ حتی کہ ۱۷-۱۹۱۴ میں اپنی ابتدائی زندگی میں اس نے جن فلموں میں کام کیا تھا وہ فلمیں بھی ابھی تک تاجرانہ حیثیت سے کامیاب ہیں۔ یہ ابتدائی فلمیں بھی آج محض تاریخی یادگار کے طور پر نہیں دکھائی جاتیں بلکہ جدید تفریح کے معیار سے ان کو دیکھا جاتا ہے۔ چارلی چپلن موجودہ زمانہ کا واحد فلمی کردار ہے جو اب بھی اتنے شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں ۳۰۰ ملین ایسے لوگ ہیں جنہوں نے چارلی چپلن کی ۸۰ فلموں میں سے ایک ایک فلم کو دیکھا ہے۔

چارلی چپلن کی ابتدائی زندگی نہایت غربت میں گزری تھی۔ چنانچہ بعد کو کثیر دولت کا مالک ہونے کے باوجود اس کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ دوبارہ مفلس نہ ہو جائے۔ اس نے ایک کے بعد ایک چار شادیاں کیں۔ آخر عمر میں وہ بالکل ناکارہ ہو گیا۔ اس کی زندگی وہیل چیر (پہیہ دار کرسی) پر گزرتی تھی۔ اس کی نگاہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے بولنے اور سننے کی طاقتیں جواب دے گئی تھیں۔ حقیقی چارلی چپلن بستر پر ناکارہ پڑا ہوا تھا۔ مگر فلمی چارلی چپلن بدستور سینما ہاؤسوں میں لوگوں کی تفریح کا مرکز بنا ہوا تھا۔

چارلی چپلن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "اس نے کسی بھی دوسرے انسان کے مقابلہ میں زیادہ لوگوں کو زیادہ خوشی دی اور زیادہ ہنسایا"۔ مگر اس کا اپنا انجام یہ ہوا کہ وہ آخر عمر میں اپنے بڑھاپے کو بے بسی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا اور اس کا ہنسنا اس سے رخصت ہو چکا تھا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ کو چار بجے صبح اس وقت اس کا انتقال ہو گیا جب کہ صرف چند گھنٹے بعد اس کا خاندان کرسمس کی سالانہ تقریبات منانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

چارلی چپلن کے ایک سوانح نگار (ڈینس گیفرڈ (Denis Gifford) نے اس کے انجام کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں:

وہ جب کام کرتا تھا تو وہ محض فلم سے کچھ زیادہ کی تخلیق کرتا تھا۔ ہنسی اور محبت کے ساتھ جینا، خواب اور امیدیں۔ مگر ہمیشہ خوشیوں پر خاتمہ کہاں تھا، اگر بالآخر وہ کل کی سڑک پر قدم رکھنے سے زیادہ کچھ نہ ہو (آر۔ ڈی جون ۸ ، ۱۹۷)

چارلی چپلن کی موت کے بعد ایک مبصر نے اس کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے تھے:

Chaplin's life has been filled to the brim with what most lives consist of yearning after......wealth and fame and creative play and beautiful women..... but he does not know how to enjoy any of the four.

Max Eastman in Ladies Home Journal

چارلی چپلن کی زندگی ان چیزوں سے آخری کنارے تک بھری ہوئی تھی جس کی دوسرے اکثر لوگ صرف تمنا کرتے ہیں ـــــ دولت، شہرت، تخلیقی اداکاری اور خوبصورت عورتیں۔ مگر اس کو نہیں معلوم تھا کہ ان چاروں میں کسی ایک سے بھی وہ کس طرح لطف اندوز ہو۔

چارلی چپلن کی یہ کہانی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ چارلی چپلن کی طرح پاکر محروم رہتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ پائے بغیر محروم۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں پانے والا بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا نہ پانے والا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس سب سے بڑی حقیقت کو جانتے ہوں۔

امریکہ کی ایک نوجوان عورت نے خودکشی کرلی۔ اس کی جیب میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک پرچہ تھا۔ اس میں درج تھا: مجھے خوشی کی تلاش تھی۔ اس کے لئے میں نے نشہ کا استعمال کیا۔ میں جنسی آوارگی کی حد تک گئی۔ مگر مجھے کہیں خوشی نہیں ملی۔ اب میں مایوس ہو کر اپنے آپ کو ختم کر رہی ہوں۔

اکثر آزاد خیال مردوں اور عورتوں کا یہی حال ہے۔ وہ خوشی کی تلاش میں سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔ مگر آخر میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی تلاش کا جواب موجود نہیں۔ اس کے بعد کچھ مایوسانہ زندگی گزار کر طبعی موت مرتے ہیں اور کچھ لوگ جھنجھلاہٹ میں آکر خودکشی کر لیتے ہیں۔

کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کیسے ناکام ہیں وہ لوگ جن کا نام کامیاب انسانوں کی فہرست میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔

حقیقی ادب، خیالی ادب

اندر ملہوترا ٹائمس آف انڈیا کے مغربی نمائندہ ہیں۔ انہوں نے مسٹر ہرمن کی کتاب (جنگ کی ہوائیں) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پچھلے پورے سال یہ کتاب اٹلانٹک کے دونوں کناروں پر سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں تقریباً سرفہرست رہی:

All through the last year, Mr. Herman's work The Winds of War remained close to the top of the weekly list of best-sellers on both sides of the Atlantic.

"اٹلانٹک کے دونوں کنارے" سے مراد یورپ اور امریکہ ہیں۔ یہ ایک خوبصورت ادبی اسلوب ہے۔ مگر یہ ادبی اسلوب واقعہ کی بنیاد پر بنا ہے۔ اس کے بالمقابل خیالی ادب ہے جس کے لئے واقعہ سے مطابقت ضروری نہیں۔ مثلاً شبنم ایک مادی واقعہ ہے۔ اس کا ایک معلوم طبیعی مفہوم ہے۔ مگر شاعر جب اپنے خیالات کی دنیا میں ایک تصویر بناتا ہے تو اس کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ شبنم فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔ وہ اگر اپنے فرضی محبوب سے اپنی ملاقات کا ذکر کر رہا ہو تو وہ کہے گا:

صبا نے وہ تگ ودو کی ہے اعلان مسرت میں　　کہ ٹپکا ہے پسینہ جا بجا شبنم کی صورت میں

اس کے برعکس اگر شاعر کے فرضی محبوب کا انتقال ہو جائے تو یہی شبنم "گریہ شبنم" میں ڈھل جائے گی۔ اس وقت شاعر کو دکھائی دیگا گویا شبنم کے قطرے آسمان کے آنسو ہیں جو شدت غم کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے نکل پڑے ہیں۔

امریکی خلاباز مسٹر نیل آرم اسٹرانگ نے ۱۹۶۹ میں جب پہلی بار چاند پر قدم رکھا تو ان کی زبان سے نکلا — یہ ایک آدمی کے لئے ایک چھوٹا قدم ہے مگر انسانیت کے لئے وہ ایک عظیم چھلانگ ہے:

That's one small step for a man, one giant leap for mankind

یہ جملہ ایک عظیم سفر کے بعد نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم حالات ہی عظیم ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ جس آدمی نے بے شمار مراحل سے گزر کر ایسا قدم اٹھایا ہو جو فی الواقع انسانیت کے لئے ایک چھلانگ بننے والا ہو وہی وہ شخص ہوتا ہے جس کے احساسات ان الفاظ میں ڈھل جائیں جس کا ایک نمونہ مسٹر آرم اسٹرانگ کے جملہ میں نظر آتا ہے۔ فرضی تخیل سے فرضی ادب پیدا ہوتا ہے اور حقیقی عمل سے حقیقی ادب۔

پانچ سکنڈ کا فاصلہ

۳ جون ۱۹۷۹ کو راقم الحروف میرٹھ میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی صدر بازار کی سڑک پر ایک ساتھ جا رہے تھے۔

اس کے بعد اچانک ایک واقعہ ہوا۔ ہمارے سامنے ایک مکان کے آگے کا حصہ دھماکہ کے ساتھ گر پڑا۔ اینٹ اور پتھر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ اس وقت ہم دونوں جائے حادثہ سے بمشکل پانچ سکنڈ کی مسافت پر تھے۔ اگر ہم پانچ سکنڈ آگے ہوتے یا مکان پانچ سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً ہم دونوں اس کی زد میں آجاتے۔ ہمارا سفر شاید درمیان ہی میں ختم ہو جاتا جس کی منزل ہم نے بہت آگے سمجھ رکھی تھی۔

میں نے سوچا۔ آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے۔ کسی بھی آدمی کے لئے ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ اس کا پانچ سکنڈ کا سفر پورا ہو جائے اور اچانک وہ اپنے آپ کو دوسری دنیا میں پائے۔

آدمی اگر اچھی طرح اس بات کو جان لے کہ اس کے اور موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے تو اس کی دنیا بالکل بدل جائے۔ وہ ایک اور ہی قسم کا انسان بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جینے لگے۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جان لے کہ وہ ہر وقت موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ایسی موت جس کے مابعد آدمی، حدیث کے الفاظ میں، یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہو جاتا ہے۔ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں جا گرتا ہے۔ آدمی کا ہر قدم اس کو دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے قریب پہنچا رہا ہے۔ مگر انسان اتنا بے حس بنا ہوا ہے کہ اس کو اس کی خبر نہیں۔

لوگ جھوٹی خدا پرستی پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ آخرت میں صرف حقیقی خدا پرستی کسی شخص کے کام آئے گی۔ حقیقی خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی اس طرح اللہ سے ڈرنے لگے کہ وہ اس کے ذہن پر چھا جائے، وہ اس کے صبح و شام کا نگراں بن جائے۔ وہ جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ خدا کے سامنے ایسا کر رہا ہے۔ اس کو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ستانے لگے۔

لندن میں چند روز

بار بیڈوز جاتے ہوئے میں چند دن کے لئے لندن میں ٹھہرا۔ لندن میں میرا قیام ۲۳ مارچ کی شام سے لے کر ۲۹ مارچ ۱۹۸۳ کی صبح تک رہا۔ اس دوران میں جو مشاہدات و تاثرات سامنے آئے، ان کو مختصراً یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

لندن کے ہوائی اڈہ ہیتھرو پر میں اترا تو آسمان میں بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ ابھی پچھلے دن آسمان کھلا ہوا تھا اور گرمی کا سا موسم ہو رہا تھا کہ اچانک برسات جیسا موسم ہو گیا۔ یہ انگلستان کی عام موسمی خصوصیت ہے۔ یہاں کا موسم تقریباً سال بھر غیر یقینی رہتا ہے۔ وہ بار بار اچانک طور پر بدل جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں کے موسم کو ادبی زبان میں نقص غائن (Treacherous Weather) کہتے ہیں۔ ابھی گرمی تھی، ابھی ٹھنڈ آ گئی۔ ابھی آسمان کھلا ہوا تھا، ابھی بادل چھا گیا۔

انگریز قوم کو بار بار اپنے آپ کو موسم کے موافق بنانا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی تمام سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ انگریزی قوم میں حیرت انگیز طور پر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بہت جلد اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے موافق کر لیتی ہے۔ اور اس طرح اپنے مفادات کو محفوظ رکھتی ہے۔ جیسا کہ اس نے استعماری نظام کے خاتمہ کے بعد کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی قوم کی اس مفاہمانہ خصوصیت کی کم از کم ایک وجہ، موسموں کی مذکورہ حالت بھی ہے جس نے انہیں زندہ رہنے کے لئے حالات سے موافقت کا سبق دیا۔ ایک انگریز عام طور پر خلاف مزاج بات پر مشتعل نہیں ہوتا۔ وہ گرم بات کا بھی ٹھنڈے طریقہ سے استقبال کرتا ہے۔ انگلستان کی موسمی صورت حال نے انگریزوں کی اخلاقیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

میں ۲۲ مارچ کو لندن پہنچا تو اس کے صرف ایک دن پہلے سر رچرڈ اٹن برو کی فلم "گاندھی" کو برٹش اکیڈمی کا خصوصی انعام دیا گیا تھا۔ اور اس کی شاندار تقریب منائی گئی تھی۔ اس فلم کو نہ صرف ہندستان میں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ہیرو آف پیس (Hero of Peace) کی زندگی کو دیکھنے کی خاطر بے پناہ لوگ سینما ہاؤس کی کھڑکیوں پر ٹکٹ لینے کے لئے لمبی لمبی لائن لگا رہے ہیں۔ امریکہ میں یہ فلم اب تک ۳۰ ملین

ڈالر حاصل کر چکی ہے۔

ہندستان کے مسلمانوں کا خیال ہے کہ ملک کی آزادی میں انہوں نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے بطور خود اپنے قائدین کے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے سیاسی الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ رئیس الاحرار، بطلِ حریت، شیخ الہند، امام الہند، وغیرہ۔ مگر ہمارے اپنے محدود خول کے باہر آزادیٔ ہند کی جو تاریخ مرتب ہو رہی ہے اس میں سارا مقام ان لوگوں کو مل رہا ہے جن کے نام کے ساتھ اس قسم کے شاندار القاب شامل نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے غصہ اور جھنجھلاہٹ کی کم از کم ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ہماری جھنجھلاہٹ دراصل ہماری خوش خیالیوں کی قیمت ہے۔ اگر آپ فرضی طور پر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیں اور دنیا آپ کی بڑائی کو نہ مانے تو اس کے بعد جو واقعہ ہوگا وہ یہی ہے کہ آپ دوسروں کو عدم اعتراف کا ملزم قرار دے کر دوسروں سے نفرت کرنے لگیں گے ـــــ پچھڑاپن صرف ایک کمی ہے۔ مگر خوش خیالی ایک جرم ہے جس کی فرد اور قوم دونوں کو بہت مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے۔

دہلی سے میں فجر کی نماز پڑھ کر چلا تھا۔ اور ظہر اور عصر کی نمازیں میں نے لندن پہنچ کر ادا کیں۔ حالانکہ دہلی سے لندن کا سفر تقریباً چودہ گھنٹہ کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی اور لندن کے اوقات میں تقریباً ۵ ½ گھنٹے کا فرق ہے۔ دہلی والوں کے لئے دن بڑا نہیں ہوا۔ اور نہ وہ لندن والوں کے لئے بڑا ہوا۔ البتہ میرے لئے بڑا ہو گیا۔ کیونکہ میں دہلی کی فضا سے نکل کر اسی دن لندن کی فضا میں پہنچ گیا۔ جہاں شام کا وقت دہلی کے مقابلہ میں ۵ ½ گھنٹہ بعد آتا ہے۔ ایک شخص دہلی سے نکلے اور اسی دن وہ لندن پہنچ جائے تو قدرتی طور پر اس کے لئے اس وقت بھی دن ہوگا جب کہ دہلی والوں کے لئے شام آچکی ہوگی۔

یہ ایک علامت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے اتنے زیادہ امکانات رکھے ہیں کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اس وقت بھی اجالے میں ہوں جب کہ دوسروں پر رات کا اندھیرا چھا چکا ہو۔

جہاز کے اندر لندن کا اخبار ٹیلی گراف پڑھنے کو ملا۔ اس کا روزانہ ایڈیشن ۲۸ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور سنڈے ایڈیشن ۴۰ صفحات پر۔

ڈیلی ٹیلی گراف (۲۲ مارچ ۱۹۸۳) میں یہ خبر درج تھی کہ ایک مسلم خاتون (مسز محمودہ پٹیل) جن کی عمر ۳۰ سال ہے، انہوں نے اپنے ایک مرض کے سلسلے میں لندن کے ایک ڈاکٹر کا علاج کرایا۔

ڈاکٹر نے غلط تشخیص کی اور غلط دوا دیدی جس کی وجہ سے ان کا ایک بازو جزئی طور پر مفلوج ہوگیا۔ انہوں نے ڈاکٹر کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ چنانچہ لندن ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ مسز پٹیل کو ڈاکٹر کی طرف سے ۸۵۰۰۰ پونڈ ہرجانہ دلائے جائیں۔

اس اخبار میں دوسری خبر یہ تھی کہ ایک نوجوان (Michael Robinson) جس کی عمر ۲۵ سال ہے، وہ ایک فارم میں کام کرتا تھا۔ وہاں زرعی مشین سے اس کے سر میں چوٹ آگئی اور اس کا دماغ متاثر ہوگیا۔ اس نوجوان نے بھی مقدمہ دائر کیا۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اس نوجوان کو تلافی کے لئے ۲۲۰۰۰۰ پونڈ ادا کئے جائیں۔

اس طرح کے واقعات ہمارے ملک میں روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ایسے مصیبت زدگان کا ہمارے یہاں جو انجام ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے قریب جب حضرت مسیح دنیا میں آئیں گے تو وہ دمشق کی جامع مسجد کے منارہ پر اتریں گے اور کہیں گے کہ سیڑھی لاؤ۔ اس کے بعد سیڑھی لگائی جائے گی۔ اور وہ اس کے ذریعہ سے اتر کر زمین پر قدم رکھیں گے۔ آسمان سے اتر کر مسجد کے منارہ پر ٹھہرنا اور سیڑھی مانگنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ جب میں ہوائی جہاز کا سفر کرتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ ہوائی جہاز چالیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آکر ہوائی اڈہ پر اترا اور پھر اس کے بلند دروازوں پر مخصوص قسم کی اونچی سیڑھیاں لگائی گئیں تاکہ مسافر اس کے ذریعہ سے زمین پر اتریں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث تمثیلی زبان میں تو نہیں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ حضرت مسیح ہوائی جہاز کے دور میں آئیں گے۔

آپ اپنے مقام سے مشرق کی طرف لمبا اور تیز رفتار سفر کریں تو دن آپ کے لئے چھوٹا ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جب آپ مشرق سے مغرب کی طرف لمبا اور تیز رفتار سفر کرتے ہیں تو دن آپ کے لئے بڑا ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کی طرف ہوائی جہاز سے لمبا سفر کر کے جب آپ اپنی اگلی منزل پر پہنچتے ہیں تو اس وقت بھی دن آپ کے لئے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ آپ کے اپنے مقام پر وہ ڈوب چکا ہوتا ہے۔ حتی کہ آپ اپنے سابق مقام پر مغرب کی نماز پڑھ کر مغرب کی سمت تیز رفتار سفر کریں تو اگلی منزل پر پہنچ کر سورج آپ کو دوبارہ نکلا ہوا دکھائی دے گا ——————

عمل کے ذریعہ آدمی وقت کے اوپر بھی غالب آجاتا ہے۔

لندن کا اخبار ٹائمس ۳۲ صفحات پر نکلتا ہے۔ اس کی ۲۵ مارچ ۱۹۸۳ کی اشاعت میں ایک باتصویر خبر صفحہ اول پر درج تھی جس کی مزید تفصیلات نے صفحہ ۲۰ کے تہائی حصہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ خبر کا عنوان تھا:

Gurinder Singh Mandla: Broke school rules

ایک سکھ نوجوان گورندر سنگھ منڈلا (۱۸ سال) پارک گروو اسکول (برمنگھم) میں پڑھتا تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر لی (Audley Dowell Lee) نے اس کی پگڑی پر اعتراض کیا۔ کیونکہ وہ اسکول یونیفارم کے خلاف تھا۔ سکھ طالب علم نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر نے اس کا نام اسکول سے خارج کر دیا۔

اس کیس کو فیڈریشن آف سکھ آرگنائزیشن نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ انہوں نے اس پر پچاس ہزار پونڈ خرچ کئے اور پانچ سال تک مقدمہ لڑتے رہے۔ وہ عدالت سے اپنا مقدمہ ہار گئے۔ تاہم وہ ہمت نہیں ہارے۔ اب انہوں نے اپنا مسئلہ برطانیہ کے ہاوس آف لارڈز میں پیش کیا۔ ہاؤس آف لارڈز نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ دیا کہ برطانیہ کے قانون نسلی تعلقات (Race Relations Act) کے تحت سکھ طالب علم کو پگڑی پہننے سے روکا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہ ان کے خلاف ایک امتیاز (Discrimination) کا معاملہ ہوگا۔ اس فیصلہ سے ان تمام سکھوں کو فائدہ پہنچے گا جو دو لاکھ پچاس ہزار کی تعداد میں برطانیہ میں آباد ہیں۔

انگریز اپنی روایات کے بے حد پابند ہیں۔ وہ اسکول یونیفارم کے معاملہ میں اس قسم کی خلاف ورزی کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ مگر قانون کی موجودگی میں وہ دھاندلی کا طریقہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے سخت ناپسندیدگی کے باوجود انہوں نے سکھوں کو یہ اجازت دیدی کہ وہ اسکول یونیفارم کی خلاف ورزی کریں۔ اور پگڑی پہن کر اسکول میں آئیں۔ اصول کو نہ توڑنے کا یہی مزاج ہے جو کسی قوم کو کرپشن سے بچاتا ہے۔ اصول کو توڑنا روایت کو توڑنا ہے۔ اگر آپ غیروں کی ضد میں اصول توڑیں تو اپنوں کے درمیان بھی آپ اصول کا احترام باقی نہیں رکھ سکتے۔

انگریزوں نے جب عراق پر قبضہ کیا تو اس زمانہ کا ایک لطیفہ ہے جو انگریزی قوم کے مزاج کو بہت خوبی کے ساتھ بتاتا ہے۔ سرپرسی کاکس (Sir Percy Cox) بصرہ میں انگریز گورنر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صبح کے وقت قریب کی مسجد سے موذن نے فجر کی اذان دی۔ سرپرسی کاکس کے لئے یہ نئی آواز تھی۔ اس نے متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ بتایا گیا کہ یہ

مسلمانوں کی اذان ہے۔ وہ ہر نماز کے وقت نمازیوں کو باخبر کرنے کے لئے اس قسم کی اذان دیتے ہیں۔ سرپرسی کاکس نے کہا:

"اس سے ہمارے امپائر کو کوئی خطرہ تو نہیں"

کہا گیا کہ نہیں۔ اس نے کہا، پھر انہیں کرنے دو جو وہ کر رہے ہیں۔

اس سے انگریز قوم کا مزاج معلوم ہوتا ہے اور غالباً ان کا یہ مزاج بھی سکھوں کو پگڑی کا حق دینے کا سبب ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے نوآبادیاتی دور میں انگریزوں کے اس مزاج کو استعمال نہیں کیا۔ مثلاً اگر وہ غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تو انگریز قطعاً اس میں رکاوٹ نہ ڈالتے۔ بلکہ تاریخی ریکارڈ سے ثابت ہے کہ انگریزوں نے خود یہ چاہا کہ مسلمان سیاسی لڑائی چھوڑ کر تعلیم اور تبلیغ کے کام میں لگ جائیں۔ جس میں ان کے نزدیک ان کی امپائر کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر مسلمان اس موقع کو استعمال کرتے تو آج یقینی طور پر تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ جس عمل کو انگریز اپنے امپائر کے لئے بے خطر سمجھتا تھا، اسی میں سارے باطل امپائر کی موت چھپی ہوئی تھی لیکن مسلم لیڈروں کو سب کچھ معلوم ہے مگر یہی اہم ترین بات ان میں سے کسی کو نہیں معلوم۔

مسلم قوموں کا تقابل اگر موجودہ زمانہ کی مغربی قوموں سے کیا جائے تو ایک عجیب فرق نظر آئے گا۔ مغربی قوموں میں حقیقت پسندی ہے اور مسلم قوموں میں جذباتیت۔ یہ فرق اتنا زیادہ عام ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ ادب، سیاست، معاشرت، اقتصادیات، تعلیم، غرض کوئی شعبہ اس سے خالی نہیں۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جدید دور میں مغربی قوموں کا مزاج سائنس کی فضا میں بنا اور مسلمانوں کا مزاج سیاست کی فضا میں۔ اور یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ سائنس حقیقت پسندی پیدا کرتی ہے اور سیاست جذباتی ہنگامہ آرائی۔

ہم میں سے جن لوگوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں، ان کو ہندستان کی تقسیم سے پہلے کے وہ مناظر اچھی طرح یاد ہیں جب کہ "تقسیم ہند"، کو مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل سمجھ لیا گیا تھا۔ اقبال اس نظریہ کو پیش کرنے کے نتیجہ میں مفکر اعظم اور محمد علی جناح اس کو لیکر اٹھنے کی بنا پر قائد اعظم بن گئے تھے۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں مجھے ایک کتاب پڑھنے کو ملی جس میں اس گزرے ہوئے دور کا

ایک عبرت ناک ورق موجود تھا۔ یہ ورق یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔ مارچ ۱۹۴۰ میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں "پاکستان" کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ مسٹر جناح اس اجلاس کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

> The problem in India is not of an inter-communal character but manifestly of an international one, and it must be treated as such. So long as this basic and fundamental truth is not realized, any constitution that may be built will result in disaster and will prove destructive and harmful not only to the Musalmans but to the British and Hindus also. If the British government are really in earnest and sincere to secure peace and happiness of the people of this sub-continent, the only course opened to us all is to allow the major nations separate homelands by dividing India into 'autonomous national states.' There is no reason why these states should be antagonistic to each other. On the other hand, the rivalry and the natural desire and efforts on the part of one to dominate the social order and establish political supremacy over the other in the government of the country will disappear. It will lead more towards natural goodwill by international pacts between them, and they can live in complete harmony with their neighbours. This will lead to further a friendly settlement all the more easily with regard to minorities by reciprocal arrangments and adjustments between Muslim India and Hindu India, which will far more adequately and effectively safeguard the rights and interests of Muslims and various other minorities

"ہندستان کا مسئلہ دو فرقوں کا مسئلہ نہیں بلکہ دو قوموں کا مسئلہ ہے، اور اس کو اسی طرح حل کیا جانا چاہئے۔ اس بنیادی حقیقت کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک جو دستور بھی بنایا جائے گا وہ تباہ کن ہوگا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے نقصان کا باعث ہوگا بلکہ برطانیہ اور ہندوؤں کے لئے بھی۔ برطانی حکومت اگر فی الواقع اس برصغیر کے لوگوں کو امن اور خوشی دینا چاہتی ہے تو ہم سب کے لئے ایک ہی کھلا ہوا راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ملک کو آزاد قومی ریاستوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کو علیٰحدہ وطن دیدیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ ریاستیں کیوں ایک دوسرے کی مخاصم ہوجائیں گی۔ اس کے بجائے یہ ہوگا کہ اس کے بعد باہمی رقابت اور ایک دوسرے کے اجتماعی نظام پر غلبہ حاصل کرنے کا جذبہ اور ایک دوسرے پر سیاسی برتری حاصل کی خواہش ختم ہوجائے گی۔ اس طرح کی تقسیم ان کے درمیان مزید بین اقوامی معاہدات کے ذریعہ باہم اچھے تعلقات کا سبب ہوگی۔ اور وہ کامل ہم آہنگی سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہیں گی۔ اس کے بعد زیادہ آسانی کے ساتھ یہ ممکن ہوجائے گا کہ اقلیتوں کے بارہ میں دو طرفہ بنیاد پر دوستانہ معاملہ کیا جاسکے اور مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کے درمیان بہتر تعلقات قائم

کئے جاسکیں جو زیادہ مناسب اور زیادہ موثر طور پر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے گا۔[۱۱]

اس تقریر کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ جن خوبصورت الفاظ پر چالیس سال پہلے پوری قوم کی قوم دوڑ پڑی تھی وہ الفاظ حقیقتِ واقعہ سے کتنا زیادہ دور تھے ۔ لندن میں میری ملاقات بہت سے ہندستانیوں اور پاکستانیوں سے ہوئی ۔ سب سے زیادہ عجیب بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ آزاد اور مدنی کے سیکولر ہندستان اور اقبال اور جناح کے اسلامی پاکستان سے زیادہ یہ لوگ انگریزوں کے لندن میں اپنے آپ کو محفوظ اور کامیاب سمجھتے ہیں ، وہی انگریزوں کا لندن جس کو دونوں گروہوں نے مشترک طور پر جہنم فرض کر لیا تھا اور اپنے خوابوں کے دیس کو اپنے لئے جنت یقین کر رکھا تھا ۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر رچرڈ نکسن نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے قائدین (Leaders) اس کتاب میں بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ مصنف نے ہندستان اور پاکستان کے لیڈروں کے بارہ میں بھی اپنے خیالات پیش کئے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ جنگ عظیم ثانی کے بعد کی تاریخ میں بے معنی فوجی اخراجات کی سب سے زیادہ الم ناک مثالوں میں سے ایک وہ ہے جو ہندستان اور پاکستان کے جھگڑے کی صورت میں پائی جاتی ہے :

The Indo-Pakistani conflict was one of the most tragic examples of senseless military spending in post-war history.

رچرڈ نکسن کے الفاظ خواہ ہمیں کتنے ہی ناپسند ہوں ۔ مگر یہ خود ہمارے اپنے لیڈروں کے پیدا کردہ ہیں ۔ ہندستان اور پاکستان کے موجودہ حالات اگر ایسے نہ ہوتے تو امریکہ کے سابق صدر کو یہ کہنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی ۔

یہاں جو ایشیائی مقیم ہیں ان کے دو سب سے بڑے مسئلے ہیں ـــــ مقامی باشندوں کا انہیں حقیر سمجھنا ۔ اور اپنے بچوں کے بارہ میں ان کی بے بسی ۔

انگریز قوم بے حد متحمل مزاج قوم ہے ۔ اس لئے بہت زیادہ کھلے طور پر ایشیائیوں سے اس کی بیزاری کا اظہار نہیں ہوتا ۔ مگر روزمرہ کی زندگی میں ایشیائیوں کو بار بار اس کا تلخ تجربہ اٹھانا پڑتا ہے ۔ مثلاً ایک ایشیائی خاندان کا بچہ ایک روز باہر سے آیا اور غم زدہ ہو کر اپنی ماں سے بولا "ممی انگریز بچے ہم کو بلیک (کالا) کیوں کہتے ہیں ۔ ہم بلیک تو نہیں ہیں" ایک صاحب جنہوں نے

انگریز خاتون سے شادی کی ہے۔ ان کے اپنے بچے جب خفا ہوتے ہیں تو اپنے والد کو کہتے ہیں "بلیک"

جو بچے یہاں پیدا ہوتے ہیں وہ انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ انگریزی ٹیلی وژن دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ صرف انگریزی میں بول سکتے ہیں وہ اپنے والدین کی زبان نہیں جانتے۔ والدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں سے اپنی مادری زبان میں بات نہیں کرسکتے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ بچوں کی آزادی ہے جو یہاں کا پورا ماحول انہیں سکھا رہا ہے۔ موجودہ مغرب کا خاص مزاج ہے اپنے آپ سے باہر کسی اتھارٹی کو نہ ماننا۔ بچے یہاں کی فضا میں ہر وقت یہی سبق سیکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف خدا و رسول سے منحرف ہو رہے ہیں بلکہ اپنے ماں باپ کی بات ماننے کو اپنی انفرادی آزادی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ صفائی سے کہتے ہیں کہ دوسرا کوئی شخص ہمارے اوپر پابندی کیسے لگا سکتا ہے۔ ہم جو کچھ کریں گے اپنی سمجھ سے کریں گے نہ کہ دوسرے کی سمجھ سے۔

کچھ ایشیائی خاندان مقاومت کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سے خاندانوں نے حالات سے مصالحت کرلی ہے۔ ایک دیندار خاندان کی بچی جو اپنے گھر میں یہ سنتی تھی کہ صرف ذبیحہ کا گوشت کھانا چاہئے۔ اس سے اسکول میں ایک دوسرے مسلمان خاندان کی بچی نے کہا کہ ہم لوگ ذبیحہ اور غیر ذبیحہ کا فرق نہیں کرتے۔ ہم وہی کھاتے ہیں جو بازار میں ملتا ہے۔ پہلے خاندان کی بچی اپنے گھر آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا " ممی آپ ہم لوگوں کو غیر ذبیحہ کا گوشت کھانے سے منع کرتی ہیں۔ حالانکہ فلاں مسلمان گھر کے لوگ غیر ذبیحہ کا گوشت کھاتے ہیں۔ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں۔ کیا ہمارا اسلام دوسرا ہے اور ان کا اسلام دوسرا ؟"

ایشیائی لوگ مغربی ملکوں میں زیادہ کمائی کے لئے جاتے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک اس کی بہت زیادہ اہمیت نہیں۔ محنتی آدمی اپنے ملک میں بھی کافی کمائی کرسکتا ہے۔ اگرچہ یہ فرق ضرور ہے کہ باہر جو کچھ کم محنت کرکے مل جاتا ہے اس کو اپنے ملک میں پانے کے لئے زیادہ محنت کا ثبوت دینا ہوگا۔

البتہ مغربی ملکوں میں ایک خاص چیز ہے جو ہندستان جیسے ملکوں میں موجود نہیں۔ اور وہ ہے معاملات میں دیانت داری۔ ایک صاحب نے لندن کی ایک دکان سے جوتا خریدا۔ جوتا پہلے ہی استعمال میں پھٹ گیا۔ ان کے پاس خریداری کی رسید محفوظ نہ تھی۔ تاہم انہوں نے جوتا کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کو خط لکھا۔ اس کے جواب میں ان کے پاس جو معذرت نامہ آیا اس کے ساتھ لفافہ میں پوری قیمت کا بینک چک بھی موجود تھا۔

یہاں پیدائش کے بعد فوراً ہی بچہ کو حکومت سے وظیفہ لینے کا حق ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ بچہ ایک ایسے ماں باپ کا ہو جو یہاں اپنے ملکی پاسپورٹ پر مقیم ہیں۔ آپ کو صرف ایک بار ضروری فارم لینے کے لئے متعلقہ دفتر جانا پڑے گا۔ آپ فارم پر کرکے بھیج دیجئے اور ڈاک سے آپ کے یہاں ہر مہینہ چک کے ذریعہ وظیفہ کی رقم آتی رہے گی۔ لندن کے لوگ اگرچہ ایشیائی لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر قانونی طور پر ان کے جو حقوق ہیں ان کو دینے میں کبھی ان کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جاتا۔ ایشیائیوں سے امتیازی سلوک کرنا اپنے نظام کو خراب کرنے کی قیمت پر ہوگا، اور وہ پسند نہیں کرتے کہ دوسروں کی ضد میں خود اپنے نظام کو خراب کرلیں۔

ایشیائی لوگوں سے امتیاز کی بات مجھ سے یہاں کے کچھ ایشیائی لوگوں نے کہی۔ اس کے بعد میں نے اس کا ذکر ایک انگریز سے کیا۔ اس نے کہا کہ یہ جنرلائزیشن ہے۔ یعنی جزئی واقعات کو عمومی واقعات بنا دیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ انگریزوں کے اندر نسلی تعصب نہیں پایا جاتا۔ عام انگریز ایشیائی لوگوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے وہ خود اپنے درمیان ایک دوسرے کو دیکھتا ہے۔ پرانے انگریز جنہوں نے نوآبادیاتی زمانہ دیکھا ہے ان میں کچھ احساس برتری ضرور ہے۔ مگر نئی نسل کے نوجوانوں میں ایسا بالکل نہیں۔

میں اب تک جن جن ملکوں میں گیا ہوں، ان میں کم از کم ایرپورٹ پر مجھے سب سے زیادہ بہتر اخلاق کا ثبوت لندن میں ملا ہے۔ مثلاً نیویارک کے ایرپورٹ پر جن امریکی نوجوانوں سے میرا سابقہ پیش آیا ان میں سے اکثر کے اندر میں نے احساس برتری کی جھلک دیکھی۔ مگر لندن کے ہوائی اڈہ پر جو انگریز نوجوان ڈیوٹی پر متعین تھے۔ انہوں نے ہمیشہ نرمی اور شرافت کا ثبوت دیا۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انڈیا اور انگلستان کے درمیان تعلقات دوسرے تمام ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ گہرے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ہندستان اور بیرونی دنیا کے درمیان ٹیلی فون کا ربط سب سے پہلے انگلینڈ کے واسطہ سے قائم ہوا۔ ایشیا اور یورپ کے یہ دو اہم ملک یکم مئی ۱۹۳۳ کو ٹیلی فون کے ذریعہ مربوط ہوئے۔ آج بھی یہ حال ہے کہ ہندستان سے بیرونی ٹیلی فون ٹرافک کا تقریباً چالیس فی صد حصہ لندن ہو کر گزرتا ہے۔

اس ٹیلی فونی ربط کی پچاس سالہ تقریب ۳ مئی ۱۹۸۳ کو لندن اور نئی دہلی میں بیک وقت منائی گئی۔ اس موقع پر تقریب کا آغاز کرتے ہوئے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے وزیر اعظم انگلستان مسز مارگریٹ تھیچر سے ٹیلی فون پر بات کی۔

ہندستان میں زندہ رہنے کے لئے آدمی کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ــــــ قوت خریداری اور خریدی جانے والی چیز کے بارہ میں جانکاری۔ چونکہ زندگی کی ضروریات بے شمار ہیں۔ آدمی کو کمانے اور قوت خرید حاصل کرنے میں اتنا مصروف ہونا پڑتا ہے کہ وہ ہر چیز کے بارہ میں جانکاری حاصل نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں خریدار کو بار بار دھوکا کھانا پڑتا ہے۔ وہ اپنی محنت سے کمائے ہوئے پیسہ کو بازار میں اس طرح دے دیتا ہے کہ اس کے بدلے میں اس کو ایسی چیز ملتی ہے جو چند دن کے استعمال کے بعد صرف اس کے مکان کے کباڑ میں اضافہ کرے۔

لندن میں اور مغرب کے دوسرے شہروں میں یہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ محنت کرکے کمائیں۔ اگر آپ کے پاس رقم ہے تو آپ بازار سے اس اطمینان کے ساتھ خریداری کرسکتے ہیں کہ آپ جو چیز حاصل کرنا چاہتے تھے وہی چیز آپ نے پائی ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز۔ حتی کہ اگر آپ کے پاس بازار جاکر خریداری کرنے کا وقت نہیں ہے تو آپ اپنی ضرورت کی ہر چیز ٹیلی فون پر منگا سکتے ہیں۔ اور اس طرح منگائی ہوئی چیز بھی دوبارہ عین آپ کی مرضی کے مطابق ہوگی۔

مغربی قوموں میں یہ چیز غالباً سائنسی روایات سے آئی ہے۔ سائنس حقیقت پسندی کا ذہن پیدا کرتی ہے اور یہ تمام خصوصیات بلاشبہہ حقیقت پسندی کے مختلف نتائج ہیں۔

۲۵ مارچ کو لندن میں میری قیام گاہ پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رشید صدیقی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف یو کے اسلامک مشن (لندن) کے صدر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے یہاں میرا پروگرام رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے رضامندی دیدی۔ لندن سے میری روانگی ۲۹ مارچ کو تھی، اس لئے یہ طے ہوا کہ ۲۸ مارچ ۱۹۸۳ کی شام کو پروگرام رکھا جائے۔

یو کے اسلامک مشن کا صدر دفتر لینڈس ڈاون روڈ (لندن) میں قائم ہے۔ اس کے علاوہ انگلستان میں اس کی ۲۵ شاخیں ہیں۔ مرکزی دفتر میں کچھ تعلیم یافتہ افراد جمع ہوئے۔ جن سے سوال وجواب کی صورت میں بات چیت ہوئی۔ مختلف دینی موضوعات زیر بحث آئے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ جہالت ہے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوجائیں تو ان کے اکثر مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔ یہ سن کر ایک نوجوان نے کہا:

مغرب میں تو تعلیم بہت عام ہے۔ مگر یہاں کے مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے۔ چنانچہ

یہاں کے لوگ اب De-learning کی بات کرنے لگے ہیں۔ وہ اب سوچ رہے ہیں کہ بے تعلیمی شاید زیادہ بہتر طور پر انسانی مسائل کو حل کرے گی''

مذکورہ مسلم نوجوان انگلستان کے ایک انگریزی پرچہ میں کام کرتے ہیں۔ میرے دل میں آیا کہ میں ان سے کہوں کہ آپ جو اپنے وطن سے آکر یہاں رہ رہے ہیں تو کیا یہاں آپ اپنی بے علمی کی قیمت پا رہے ہیں۔ اگر بے علمی مسئلہ کا حل ہو تو آدمی کو سب سے پہلے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو بے علم بنانا چاہئے۔ مگر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے علم کو نمبر ایک اہمیت دئے ہوئے ہیں اور ملت کے بچوں کو وہ بے علمی کا سبق دے رہا ہے۔ یہی غیر سنجیدگی ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہمارے تمام مسائل پیدا کئے ہیں۔

مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر کے بارہ میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک تقریر میں اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : نحن ابناء الفراعنہ سنرمیکم فی البحر (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں۔ ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) لندن میں معلوم ہوا کہ یہ سراسر یہودیوں کی اختراع تھی۔ انہوں نے خود سے اس کو وضع کرکے اس کو مشہور کر دیا تاکہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کرنے کا جواز فراہم ہو سکے۔

انگلستان کے ایک مورخ ارسکن چائلڈرس (Erskine Childers) نے یہودیوں کی اکاذیب پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں صدر ناصر کے مذکورہ فقرہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ارسکن چائلڈرس نے اپنی تحقیق ناصر کی زندگی میں شروع کی تھی۔ اس نے جب اخبارات میں یہ رپورٹ پڑھی تو اس نے صدر ناصر کو خط لکھا کہ آپ نے یہ بات اپنی کس تقریر میں کہی ہے ، ناصر نے لکھا کہ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے کبھی یہ بات کہی ہو۔ تاہم میں نے اپنے عملہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ میری تمام تقریروں کا جائزہ لے۔

ناصر کی تمام تقریروں کا ٹیپ موجود تھا ، وہ سب کا سب دوبارہ سنا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سراسر گھڑی ہوئی بات ہے۔ ورنہ ناصر نے کبھی ایسی بات نہیں کہی ، یہودیوں نے اپنے سیاسی مقصد کے تحت یہ جھوٹ گھڑا۔ اور مسلمانوں کا حال چونکہ یہ ہے کہ اپنے مخالف کے بارہ میں ہر الٹی بات کو فوراً مان لیتے ہیں۔ چنانچہ جو صدر ناصر کے مخالف تھے وہ اس کو لے اڑے۔ ارسکن چائلڈرس نے اپنی کتاب میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

راقم الحروف جمال عبدالناصر کا کسی درجہ میں بھی حامی نہیں۔ مگر کسی آدمی کی طرف وہی

بات منسوب کرنی چاہیے جو فی الواقع اس نے کی ہو یا کہی ہو۔ مثلاً جمال عبدالناصر نے ۱۹۵۵ میں نہر سوئز کو نیشنلائز کیا میں اس کو سراسر حماقت سمجھتا ہوں۔ اپنی قیادت کو نمایاں کرنے کے سوا اس کا کوئی وجہ جواز نہیں۔ نہر سوئز ایک بین اقوامی معاہدہ کے تحت برطانیہ اور فرانس کے زیر انتظام تھی۔ یہ معاہدہ صرف چند سال بعد ختم ہونے والا تھا۔ اگر ناصر صبر کرتے تو چند سال بعد وہ اپنے آپ ختم ہو جاتا، مگر ناصر نے اپنی قیادت کو نمایاں کرنے کے لئے غیر ضروری طور پر قبل از وقت اس کو نیشنلائز کیا اور اس کی قیمت مصر کو بہت بڑی تباہی کی صورت میں بھگتنی پڑی۔

ہانگ کانگ کو برطانیہ نے پٹہ پر چین سے لیا تھا۔ اس کی مدت ۱۹۹۷ میں ختم ہونے والی ہے۔ چینی بالکل خاموش بیٹھے ہوئے ہیں کہ جب یہ مدت ختم ہو تو معاہدہ کی تجدید نہ کرکے دوبارہ ہانگ کانگ پر اپنا قبضہ بحال کرلیں۔ اسی طرح کیوبا میں ایک جزیرہ سابق معاہدہ کے تحت امریکی فوج کے قبضہ میں ہے۔ اس کو بھی وہاں کا موجودہ حکمراں کیسترو برداشت کررہا ہے۔ حالانکہ وہ امریکہ کا سخت مخالف ہے۔ وہ اس انتظار میں ہے کہ چند سال بعد جب معاہدہ کی مدت ختم ہو تو اس کی تجدید سے انکار کردے اور اس طرح امریکی فوجوں کو واپس بھیج دے۔ مگر جمال عبدالناصر نے انتہائی غیر مدبرانہ طور پر نہر سوئز کو قبل از وقت قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا اور اس کے نتیجہ میں مصر اور خود نہر سوئز دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

شاہ فاروق مصر کے آخری بادشاہ تھے۔ انہوں نے اپنے زوال کے وقت کہا تھا کہ دنیا میں بالآخر پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کا اور ایک برطانیہ کا۔ شاہ فاروق کی یہ بات لفظ بلفظ درست ثابت ہوئی۔ آج فی الواقع یہی پانچ بادشاہ دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ چار تاش کے، کیونکہ تاش کے بادشاہ کو اپنی بادشاہت باقی رکھنے کے لئے کسی ملک کی ضرورت نہیں۔ وہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بھی اپنی بادشاہت کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اور جہاں تک برطانیہ کے بادشاہ کا تعلق ہے، اس کو برطانی قوم کی بڑھی ہوئی روایت پسندی نے قائم کر رکھا ہے۔

اس وقت ملکہ الزبتھ برطانیہ کی تاجدار ہیں۔ بادشاہ یا ملکہ کا لفظ بظاہر بڑا پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ یا ملکہ بننا اتنی زیادہ قیمت مانگتا ہے کہ اس کو جاننے کے بعد ایک حقیقت پسند آدمی کی نظر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ گھٹ جاتی ہے۔

بادشاہ اپنے ملک کا سب سے بڑا قیدی ہوتا ہے۔ لندن کے سفر کے زمانہ میں یہاں

کی ملکہ کے بارہ میں ایک دلچسپ مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا پہلا جملہ یہ تھا:

Mystery is the Secret the Royalty

(بادشاہت کا راز اس کا پراسرار ہونا ہے) اگر لوگ یہ جان لیں کہ بادشاہ بھی انہیں جیسا ایک انسان ہے تو بادشاہت کی جڑیں اکھڑ جائیں۔" کو اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ کوئی دکھائی دے تو اس کو سب سے دور کی شاخ پر بیٹھنا چاہئے۔ اور اسی کے ساتھ اپنے منھ کو بند رکھنا چاہئے "لوگوں کے اوپر بادشاہ بننے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ بادشاہ کو اپنے سے زیادہ عقل مند اور بڑا سمجھیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ بادشاہ مسلسل لوگوں سے دور رہے اور کم سے کم بولے۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کبھی عوام کے درمیان ہنسی نہیں :

She never smiled in public

برطانیہ کا بادشاہ برطانی لوگوں کی روایت پرستی کی بنا پر ابھی تک بادشاہ بنا ہوا ہے۔ مگر زمانہ کی تبدیلی نے موجودہ زمانہ کے بادشاہ کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دئے ہیں جن کا حل بظاہر آسان نہیں۔

موجودہ زمانہ آزادی خیال کا زمانہ ہے۔ جابرانہ حکومتیں بھی موجودہ زمانہ میں یہ نہیں کر پاتیں کہ وہ پریس کی آزادی پر پابندی لگا دیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ مشہور ہے۔ فرانس کے جنرل ڈیگال جب اپنے ملک میں برسر اقتدار آئے تو ابتداءً اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے کافی جبر سے کام لیا۔ لوگوں پر مظالم بھی کئے گئے۔ مگر اسی زمانہ میں مشہور فلسفی سارتر آزاد تھا اور حکومت کی پالیسیوں پر کھلی تنقیدیں کرتا تھا۔ کسی نے جنرل ڈیگال سے کہا کہ آپ کی حکومت نے سارترے کے مخالف قلم کو آزاد کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ ڈیگال نے جواب دیا:

سارترے جیسے لوگ حکومتوں کا ضمیر ہوتے ہیں اور ضمیر کو قید نہیں کیا جا سکتا۔

برطانی پریس نے آجکل شاہی خاندان کے اندرونی حالات چھاپنے شروع کر دئے ہیں۔ لندن کے اخبار سن (Sun) نے شہزادی ڈائنا کے بارہ میں لکھا کہ محل کے باورچی خانہ میں وہ ننگے پاؤں تھیں اور ٹوسٹ پر مکھن لگا رہی تھیں۔ اس طرح کے انکشافات شاہی خاندان کی عظمت (Majesty) کو مجروح کرتے ہیں۔ چنانچہ ملکہ الزبتھ نے لندن کی عدالت میں مذکورہ اخبار کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ اس کو محل کی اندرونی باتوں کو چھاپنے سے روکا جائے۔

اسی طرح ۱۹۸۲ میں جب مسٹر فاگن (Michael Fagan) محل میں داخل ہوا اور ملکہ کی

خوابگاہ تک پہنچ گیا جہاں وہ اکیلی تھیں تو لوگوں نے سوال کرنا شروع کیا کہ فلپ صاحب کہاں تھے :

Where was Philip

اس کے بعد اخباروں نے انکشاف کیا کہ چونکہ مسٹر فلپ (ملکہ کے شوہر) سوتے وقت خراٹا لیتے ہیں اس لئے ان کو ملکہ کے کمرہ میں سونے کی اجازت نہیں۔ وہ رات کے وقت دوسرے کمرہ میں سوتے ہیں۔ کالم نگار اپنی رپورٹ ان الفاظ پر ختم کرتا ہے :

> It must be a hard life for the royal family these days trying to keep sane, trying to be both human and royal at the same time. The more they try to maintain that dignity in public, the more hysterical they are likely to get in private. And with cooks ready to tell all to the press, they have no place to laugh or cry. It is a dilemma of our times.

شاہی خاندان کے لئے یقیناً یہ بڑی سخت زندگی ہے کہ ان حالات میں وہ اپنے آپ کو اعتدال پر قائم رکھیں۔ ایک ہی وقت میں وہ عام آدمی بھی ہوں اور بادشاہ بھی۔ عوام میں وہ جتنا زیادہ اپنی شاہی عظمت کو باقی رکھنے کی کوشش کریں گے اتنا ہی زیادہ اندیشہ ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں جذباتی بن جائیں۔ ایسے باورچیوں کے ساتھ جو پریس کو ہر بات بتانے کے لئے تیار رہتے ہیں، ان کے لئے نہ ہنسنے کا موقع باقی رہا ہے اور نہ چیخنے کا۔ یہ ہمارے وقت کی ایک دوطرفہ مشکل ہے۔

ایک ملکہ یا شہزادہ باہر سے دیکھنے میں لوگوں کو پرکشش معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کو اندر سے دیکھئے تو صورت حال بالکل مختلف ہوگی۔

ہفتہ وار ٹائم (نیویارک) میں خطوط کے کالم میں شاہی تعاقب (Royal Hunt) کے عنوان کے تحت ایک خاتون لکھتی ہیں :

> When I was little, I dreamed of marrying a prince. After reading about how the press pursues the princess of Wales I realize how nice it is that my prince is a pharmacist.

جب میں چھوٹی تھی تو میں کسی شہزادہ سے شادی کرنے کا خواب دیکھتی تھی۔ اب یہ پڑھنے کے بعد کہ پریس کس طرح شہزادی ویلز کا پیچھا کرتا ہے، میری سمجھ میں آیا کہ یہ کتنا اچھا ہے کہ میرا "شہزادہ" ایک دوا ساز ہے۔

شاہی ادارہ کو باقی رکھ کر برطانی لوگ زبردست فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شاہ اور ملکہ کا

لفظ برطانیہ میں سیکڑوں سال کی قابل احترام تاریخ رکھتا ہے۔ اس طرح شاہ اور ملکہ برطانی عوام کے لئے اتحاد اور اتفاق کا مرکزی نقطہ (فوکس) فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ فائدہ ہے جو اندرونی اتحاد کی صورت میں برطانیہ کو شاہی ادارہ سے حاصل ہوتا ہے۔

آسٹریلیا میں یہ ذہن ابھرا کہ آسٹریلیا کامل طور پر برطانیہ سے موجودہ دستوری رشتہ کو ختم کرلے۔ برطانیہ نے یہ کیا کہ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈائنا کو وہاں بھیج دیا۔ میں جن دنوں لندن میں تھا، دونوں شاہی افراد آسٹریلیا کے دورہ پر تھے۔ ٹائمس (۲۹ مارچ ۱۹۸۳) نے رپورٹ شائع کی تھی کہ شاہی جوڑا جب سڈنی پہنچا تو عوام بیتاب ہوکر سڑکوں پر نکل پڑے۔ عوامی سمندر میں ایک شخص نے پلے کارڈ بلند کیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ شاہ واپس جاؤ (Go Home Royals) ایک معمر خاتون لپک کر آئیں اور پلے کارڈ چھین کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ عظمت اور تقدس کی طویل روایت کے ساتھ آسٹریلیا کے شاہی دورہ نے وہاں کے معاملہ کو ٹھنڈا کر دیا۔

برطانیہ نے اگرچہ اپنا سیاسی امپائر کھو دیا ہے۔ مگر اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی عالمی تصویر کو محفوظ رکھا ہے۔ پاکستان ایرویز کے بعد برٹش ایرویز غالبا واحد ہوائی کمپنی ہے جس کے جہازوں میں چھ زبانوں کے ساتھ اردو زبان میں بھی ہدایات لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرح انگریز اپنی عالمی تصویر کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے ان کو زبردست سیاسی اور تجارتی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

جو ممالک اب بھی "برطانی کامن ویلتھ" کے نام سے برطانیہ کی چھتری میں موجود ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ باندھے رکھنے کے لئے بھی بادشاہت کا ادارہ بہت موثر ہے، جب بھی کسی ملک میں ناراضگی کی لہر اٹھتی ہے تو انگریز اپنے بادشاہ یا ملکہ کو وہاں بھیج دیتے ہیں۔ جو وہاں جاکر کیمرہ کے سامنے مسکراتا ہے اور ہاتھ ہلاکر لوگوں کو مبارک باد دیتا ہے۔ اس کے بعد تمام مسئلے اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔

اس طرح برطانیہ نے اپنے پچھلے مقبوضات میں بہت بڑے پیمانہ پر اپنے اقتصادی مفادات محفوظ کر رکھے ہیں۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں میں نے اپنی گھڑی میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ چنانچہ جب لندن میں چھ بجے کا وقت ہوتا تو میری گھڑی میں بارہ بج رہے ہوتے۔ ایک مرتبہ جب میں نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی تو ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں لندن والوں کے مقابلہ میں چھ گھنٹے

آگے ہوں۔ مگر بہت جلد میری غلط فہمی دور ہوگئی جب مجھے یاد آیا کہ میرا آگے ہونا صرف اس بنا پر ہے کہ میں لندن میں بیٹھ کر دہلی کی گھڑی اپنے ہاتھ پر باندھے ہوئے ہوں۔

اس طرح کی خوش فہمی اس وقت بڑی خطرناک ہوتی ہے جب کہ وہ فکری اور اعتقادی روپ اختیار کرکے آدمی کے ذہن میں داخل ہو جائے۔ ایسا آدمی اپنے جھوٹے تخیلات کی بنا پر بڑے بڑے اقدامات کر گزرتا ہے۔ اور جب قانون قدرت کے مطابق وہ ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لئے مزید غلطی یہ کرتا ہے کہ دوسروں کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار قرار دے کر ان کے خلاف احتجاج اور شکایت کا طوفان جاری کر دیتا ہے۔ پہلے اگر اس نے فرضی اقدام کی نادانی کی تھی تو اب وہ فرضی شکایت کی نادانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے وقت اور اپنے مسائل کو برباد کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے آخری انجام کو پہنچ کر قبر میں چلا جاتا ہے تاکہ وہاں تقدیر کے پردہ پر اپنی حقیقی تصویر کو دیکھے، صرف اس قیمت پر کہ دوبارہ اس کے لئے لوٹنے یا تلافی کرنے کا موقع نہ ہو۔

واپسی کے وقت ایک عجیب لطیفہ پیش آیا۔ روم سے میں ایر انڈیا پر سفر کر رہا تھا۔ ایر انڈیا میں انگریزی کے ساتھ ہندی میں اعلان ہوتا ہے۔ اناؤنسر نے اعلان کرتے ہوئے کچھ الفاظ کہے تو مجھے سنائی دیا:

"بمان میں آگ لگنے کا ڈر ہے"

یہ سن کر میں سمجھا کہ شاید کوئی بات گڑبڑ ہوگئی ہے اور ہوائی جہاز میں آگ لگنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا۔ مگر دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اصل بات یہ تھی کہ میں نے پورا اعلان نہیں سنا۔ پورا اعلان یہ تھا:

ٹائلٹ میں سموکنگ نہ کریں۔ اس سے بمان میں آگ لگنے کا ڈر ہے۔

ہمارے سماج میں پچاس فی صد سے زیادہ باتیں اسی قسم کی ادھوری معلومات کی بنا پر ہوتی ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو رائے قائم کرنے سے پہلے تحقیق کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

انجمن خدام القرآن (لاہور) ایک خالص غیر سیاسی ادارہ ہے جو ہر سال محاضرات قرآنی (قرآنی سیمنار) کے نام سے لاہور میں اجتماع کرتا ہے، اس میں ملک اور بیرون ملک کے علماء اور دانشور قرآن کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کرتے ہیں۔

سال رواں میں انجمن خدام القرآن کا یہ اجتماع یکم اپریل تا ۵ اپریل ۱۹۸۳ منعقد ہوا۔

اس اجتماع میں شرکت کے لئے میرے نام دعوت نامہ آیا تھا۔ انجمن نے اپنے اعلانات میں میرا نام بھی شائع کردیا تھا۔ مگر افسوس کہ میں اس اجتماع میں شریک نہ ہوسکا۔ میں نے ۲ مارچ ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں درخواست دی تھی مگر پاکستان کی ''اسلامی حکومت'' نے مجھے ویزا نہیں دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مارچ کے پہلے عشرہ میں ہندستان میں ناوابستہ ممالک کے سربراہان مملکت کی کانفرنس تھی۔ اس سلسلے میں پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق صاحب نئی دہلی آئے ہوئے تھے۔ نئی دہلی کے دوران قیام انہوں نے ایک روز پاکستانی سفارت خانہ کا معائنہ کیا۔ وہاں ہندستانی لوگوں نے بتایا کہ ان کو پاکستان کے سفر کے لئے ویزا حاصل کرنے میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ جناب ضیاء الحق صاحب نے حکم دیا کہ آج کی تاریخ تک جتنی درخواستیں آچکی ہیں ان سب کو ویزا جاری کردیا جائے۔ چنانچہ پاکستانی سفارت خانہ نے اس دن ۲۴ گھنٹہ کام کرکے تقریباً دو ہزار درخواستوں کا ویزا جاری کردیا۔

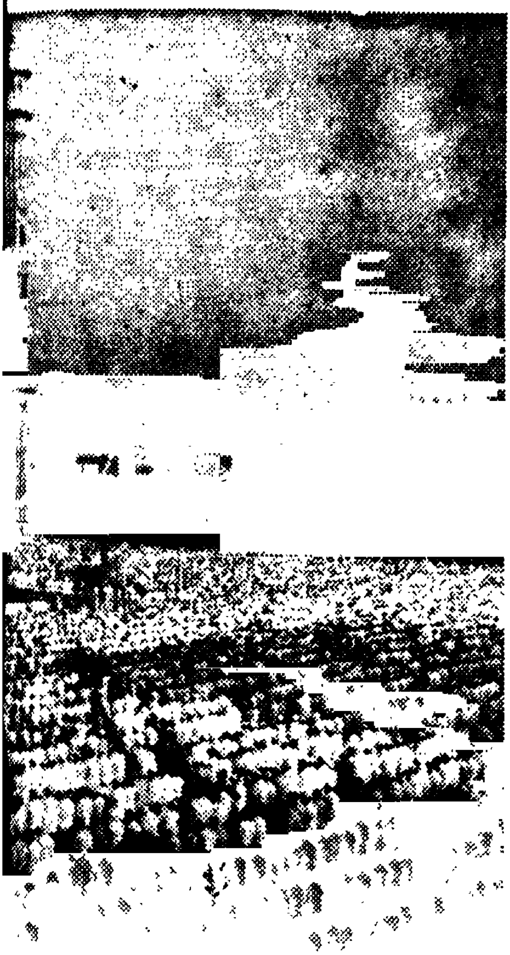
امید تھی کہ اس مجموعی فیاضی میں ہم کو بھی حصہ ملا ہوگا۔ کیونکہ انہیں تاریخوں میں ہماری درخواست بھی پاکستانی سفارت خانہ میں موجود تھی۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ۲۲ مارچ کو ہمارا آدمی پاکستانی سفارت خانہ گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ ویزا جاری کرنے کے بارہ میں صدر پاکستان کا جو حکم تھا وہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے پاکستان جارہے ہوں۔ آپ چونکہ کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے ہیں اس لئے آپ کے ویزہ کے لئے اسلام آباد سے منظوری ملنا ضروری ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ میں اگلے دن لندن کے لئے روانہ ہورہا ہوں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آپ لندن کے پاکستانی سفارت خانہ میں معلوم کرلیں۔ اسلام آباد سے اجازت نامہ آتے ہی ہم لندن کے پاکستانی سفارت خانہ کو ٹیلیکس کردیں گے۔

لندن میں میرے قیام کے آخری دن ۲۸ مارچ کو لندن کے پاکستانی سفارت خانہ میں ٹیلیفون کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ ہم کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ ویزا نہ ملنے کی وجہ سے میں لاہور کے قرآنی سیمنار میں شریک نہ ہوسکا۔

کیسی عجیب ہوگی وہ اسلامی حکومت جس کو نہ صرف غیر اسلامی پارٹیوں سے خطرہ ہو بلکہ خود اسلام سے بھی خطرہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی حکومتوں کو اسلام سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا ان مسلم حکومتوں کو ہے جنہوں نے اپنے دعوے کے مطابق اپنے یہاں مکمل اسلام قائم کر رکھا ہے۔

NDIA

12 PAGES 70 PAISE



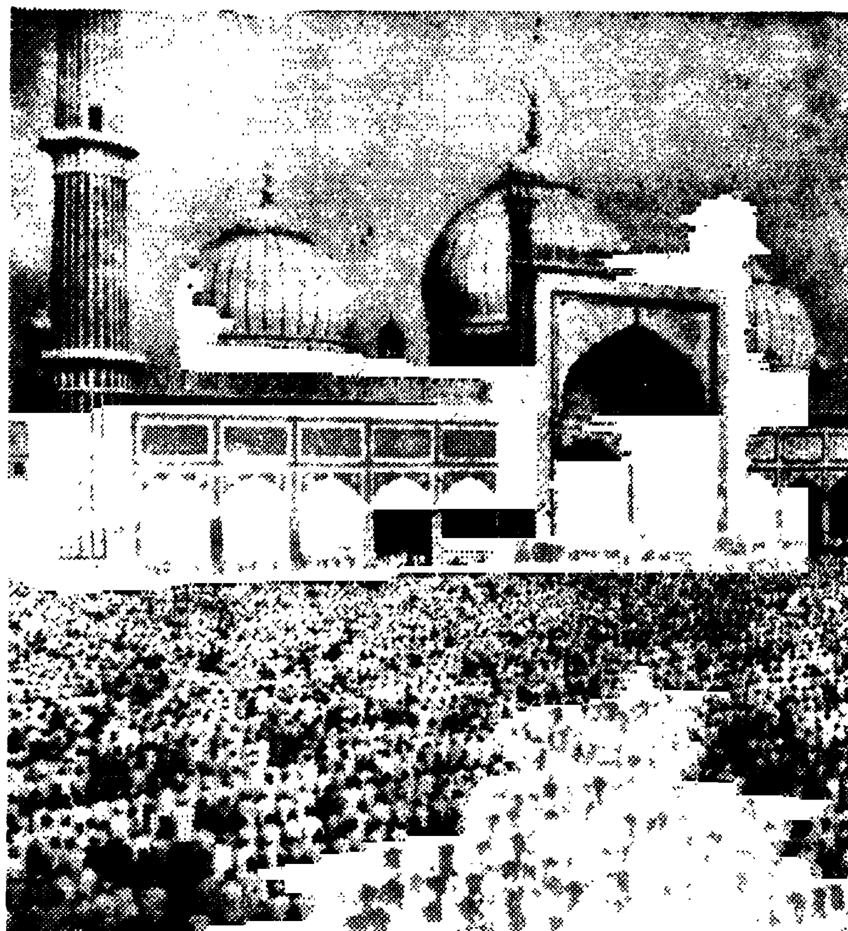
hoto.

ہندستانی مسلمان

اس تصویر میں دہلی کے مسلمان عید الفطر (۱۲ جولائی ۱۹۸۳) کی اجتماعی نماز ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کتنا مقدس اور شاندار ہے یہ منظر۔ ہر سال عید کے موقع پر اس قسم کی تصویریں دار السلطنت کے بڑے بڑے اخبارات میں صفحۂ اوّل پر نمایاں طور پر شائع ہوتی ہیں۔ یہ تصویریں گویا مسلمانوں کے عزّت و وقار کی علامت ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں نے اگرچہ اپنی نادانی سے بہت کچھ کھو دیا ہے مگر انھوں نے سب کچھ نہیں کھویا ہے۔ اگر وہ "ناممکن" سے اپنا سر نہ ٹکرائیں بلکہ "ممکن" سے اپنی کوششوں کا آغاز کریں تو ان کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ یہاں ان کے لئے آج بھی وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہتے ہیں، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔

TIMES OF

CITY NEW DELHI: WEDNESDAY, JULY 13, 1983



Eid prayers at Jama Masjid in Delhi on Tuesday.–

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے ۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا ۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے ظالموں کے اوپر ۔ ان لوگوں کے اوپر جو اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں، یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں ۔ وہ لوگ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے ۔ ان پر دہرا عذاب ہوگا ۔ وہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا ۔ اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے   ۱۸ — ۲۲

"خدا پر جھوٹ گھڑنے" سے مراد خدا کی ذات پر جھوٹ گھڑنا نہیں ہے ۔ اس سے مراد خدا کی بات پر جھوٹ گھڑنا ہے ۔ خدا اپنا پیغام سنانے کے لئے خود سامنے نہیں آتا بلکہ ایک انسان کی زبان سے اس کا اعلان کراتا ہے ۔ یہ انسان اس وقت بظاہر ایک معمولی انسان ہوتا ہے، مگر اس کے کلام میں خدا کی واضح جھلکیاں ہوتی ہیں ۔ اگر لوگ اس کو اس کے کلام کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ اس کی عظمتوں میں خدا کو پالیں ۔ مگر لوگوں کی سطحیت اور ظاہر پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں سنانے والے کی معمولی حیثیت میں اٹک کر رہ جاتی ہیں ۔ پیغام بر کا معمولی ہونا انھیں نظر آتا ہے مگر پیغام کا غیر معمولی ہونا انہیں دکھائی نہیں دیتا ۔ چنانچہ وہ اس کو ایک عام انسان کا معاملہ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ اس کی بات میں چھوٹے اعتراضات نکالتے ہیں ۔ اور اس کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ۔

اس ظالمانہ رویہ کی اصل وجہ بے خوفی کی نفسیات ہے ۔ لوگوں کو آخرت پر یقین نہیں ۔ ان کے دلوں میں خدائے قہار وجبار کا خوف نہیں ۔ اس لئے وہ اس پیغام کے بارہ میں سنجیدہ نہیں ہوپاتے ۔ اور جس معاملہ میں آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ اس کے متعلق صحیح ردعمل پیش کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے گا ۔ مگر لوگوں کی یہ غیر سنجیدگی اس وقت رخصت ہو جائے گی جب وہ قیامت میں مالک کائنات کے سامنے کھڑے ہوں گے ۔ اس وقت ان کی موجودہ آزادی ان سے چھن چکی ہوگی ۔ جن اسباب و وسائل کے بھروسہ پر وہ سرکش بنے ہوئے تھے وہ خدا کا ٹیپ ریکارڈر بن کر ان کے خلاف گواہی دینے لگیں گے ۔ اس وقت عیاناً یہ کھل جائے گا کہ خدا کے داعی کو جو انہوں نے جھٹلایا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو سمجھنے سے عاجز تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے بارہ میں سنجیدہ نہ تھے ۔ قیامت کی ہولناکی اچانک انہیں سنجیدہ بنا دے گی ۔ اس وقت اپنی بے بسی کے ماحول میں وہ اس بات کو پوری طرح سمجھ

لیں گے جس کو دنیا میں اپنی آزادی کے ماحول میں سمجھ نہیں پاتے تھے۔

اللہ نے انسان کو ایسی اعلیٰ صلاحیتیں دی ہیں کہ اگر وہ ان کو استعمال کرے تو وہ ہر بات کو اس کی گہرائی تک سمجھ سکتا ہے۔ اور اپنے دنیوی معاملات میں واقعۃً وہ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ مگر آخرت کے معاملہ میں آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ کان رکھتے ہوئے بہرا بن جاتا ہے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے۔

آدمی کی کامیابی اس کی سنجیدگی (Sincerity) کی قیمت ہے۔ جو لوگ دنیا کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ دنیا میں کامیاب رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ آخرت میں کامیاب رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۴

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی وہی لوگ جنت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ کیا تم غور نہیں کرتے　　۲۳—۲۴

اخبات کے معنی ہیں عاجزی کرنا۔ عربی میں کہتے ہیں **ھو خبیت القلب** (وہ شکستہ دل ہے) یہی ایمان کا خلاصہ ہے۔ ایمان نہ کوئی وراثت ہے اور نہ کسی لفظی مجموعہ کی لسانی ادائگی۔ ایمان ایک دریافت ہے۔ آدمی جب اپنے سمع و بصر (بالفاظ دیگر شعور) کو استعمال کر کے خدا کو پاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کا ادراک کرتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسی کا نام عجز (اخبات) ہے۔ عجز خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کی پہچان کا لازمی نتیجہ ہے۔

ایمان، اخبات اور عمل صالح تینوں ایک ہی حقیقت کے تین پہلو ہیں۔ ایمان خدا کے وجود اور اس کی صفات کمال کی شعوری دریافت ہے۔ اخبات اس قلبی حالت کا نام ہے جو خدا کی دریافت کے نتیجہ میں لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ عمل صالح اسی شعور اور اسی کیفیت سے پیدا ہونے والی خارجی صورت ہے۔ آدمی جب خدا کے ذہن سے سوچتا ہے۔ جب اس کا دل خدائی کیفیات سے بھر جاتا ہے تو اس وقت اس کے عین فطری نتیجے کے طور پر اس کی ظاہری زندگی خدائی عمل میں

ڈھل جاتی ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ جو شخص ایمان، اخبات اور عمل صالح کا پیکر بن جائے وہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ اور وہی وہ انسان ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائیگا۔

دنیا میں اعلیٰ ترین امتحانی حالات پیدا کرکے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اپنے آپ کو کیا ثابت کرتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع وبصر (شعور) کو صحیح طور پر استعمال کرکے حقیقت واقعہ کو جانا اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیا۔ یہ دیکھنے اور سننے والے لوگ ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع وبصر کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس کو نہ حقیقت واقعہ کی معرفت حاصل ہوئی اور نہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال سکا۔ یہ اندھے اور بہرے لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں بالکل مختلف قسم کے انسان ہیں۔ اور دو مختلف انسانوں کا انجام ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ ﴿٢٥﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تم کو کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس کی قوم کے سردار وں نے کہا، جنہوں نے انکار کیا تھا کہ ہم تو تم کو بس اپنے جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی تمہارا تابع ہوا ہو سوائے ان کے جو ہم میں پست لوگ ہیں، بے سمجھے بوجھے۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ تم کو ہمارے اوپر کچھ بڑائی حاصل ہو۔ بلکہ ہم تو تم کو جھوٹا خیال کرتے ہیں ۲۷ — ۲۵

خدا کے جتنے پیغمبر آئے، اسی لئے آئے کہ وہ انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کریں۔ یہ منصوبہ کہ انسان موجودہ دنیا میں بغرض امتحان رکھا گیا ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر مختلف چیزوں کی عبادت کے مواقع ہیں۔ مگر اصل مطلوب صرف یہ ہے کہ انسان خدا کا عابد بنے۔ جو لوگ خدا کے عابد نہ بنیں وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے لئے مرنے کے بعد کی زندگی میں سخت عذاب ہے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہی بات کہی۔ وہ اس کے لئے نذیر مبین بن گئے۔ مگر

آپ کی قوم نے آپ کی بات نہیں مانی۔

اس کی وجہ لوگوں کی ظاہر پرستی تھی۔ انسان کی گمراہی کی نظریاتی طور پر بہت سی قسمیں ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر دور کے انسانوں کی گمراہی صرف ایک رہی ہے۔ اور وہ ہے ظاہر پرستی یا دنیا پسندی۔ دنیا پرست لوگ، عین اپنے مزاج کے مطابق، دنیوی چیزوں کو حق اور ناحق کا معیار سمجھتے ہیں۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جس کے پاس ظاہری رونقیں ہوں وہ حق پر ہے اور جو دنیا کی رونقوں سے محروم ہو وہ ناحق پر۔

خدا کا داعی جب اٹھتا ہے تو اپنے ہم عصروں کو وہ صرف انسانوں میں سے ایک انسان نظر آتا ہے۔ دنیوی اعتبار سے اس کے گرد وپیش بڑائی کا کوئی خصوصی نشان نہیں ہوتا۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جس دین کا علم بردار ہوتا ہے اس کے ساتھ چونکہ ابھی تک دنیوی فائدے وابستہ نہیں ہوتے، اس لئے اس کی طرف بڑھنے والے زیادہ وہ تہی دست لوگ ہوتے ہیں جنہیں ایک "نئے دین" کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کچھ کھونا نہ پڑے۔ یہ صورت حال خاص طور پر، وقت کے بڑوں کے لئے، فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب دنیا ان کے ساتھ نہیں ہے تو حق بھی ان کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ قوم میں ایسے لوگ بھی نکلتے ہیں جو ان کو جھوٹا اور دھوکا باز کہنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ
عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ
عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا
رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ
طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ
الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ
يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

نوح نے کہا اے میری قوم، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ پر اپنے پاس سے رحمت بھیجی ہے، مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا سکتے ہیں جب کہ تم

اس سے بیزار ہو۔ اور اے میری قوم میں اس پر تم سے کچھ مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور میں ہرگز ان کو اپنے سے دور کرنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے رب سے ملنا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میری قوم، اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابلہ میں کون میری مدد کرے گا۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی خبر رکھتا ہوں۔ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں ان کو اللہ کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو میں ہی ظالم ہوں گا ۲۸ — ۳۱

یہاں "بینہ" سے مراد دلیل ہے اور رحمت سے مراد نبوت ہے (تفسیر النسفی) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر جب کسی قوم کو دعوت دیتا ہے تو وہ دو چیزوں کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ دلیل اور نبوت۔ پیغمبر کے بعد کوئی داعی بھی اسی وقت داعی ہے جب کہ وہ انہیں دو چیزوں پر کھڑا ہو۔ اس فرق کے ساتھ کہ دلیل کے بعد دوسری چیز جو اس کے پاس ہوگی وہ بالواسطہ طور پر پیغمبر سے ملی ہوئی ہوگی۔ جب کہ پیغمبر کے پاس وہ براہ راست خدا کی طرف سے آئی ہے۔

قوم جس وقت خدا کے داعی کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے کہ اس کے یہاں ظاہری اعتبار سے کوئی قابل لحاظ چیز نہیں، عین اسی وقت اس کے پاس ایک بہت بڑی قابل لحاظ چیز موجود ہوتی ہے۔ اور وہ دلیل اور ہدایت ہے۔ دلیل اور ہدایت کی بڑائی کامل طور پر خدا کے داعی کے پاس موجود ہوتی ہے۔ مگر یہ بہرحال معنوی بڑائی ہے۔ اور جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر میں اٹکی ہوئی ہوں ان کو معنوی بڑائی کیوں کر دکھائی دے گی۔

دعوت الی اللہ کا کام خالص اخروی کام ہے۔ اس کی صحیح کارکردگی کے لئے ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان زر اور زمین کے جھگڑے نہ ہوں۔ یہ ذمہ داری خود داعی کو لینی پڑتی ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ہو۔ اور اس کی خاطر وہ ہر قسم کے مادی اور معاشی جھگڑے یک طرفہ طور پر ختم کر دے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ وہ ایک طرف دعوت دے اور دوسری طرف مدعو سے دنیوی چیزوں کے لئے احتجاج اور مطالبہ بھی کر رہا ہو، وہ داعی نہیں، مسخرہ ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہ مدعو کی نظر میں ہو سکتی ہے اور نہ خدا کی نظر میں۔

مدعو کا امتحان یہ ہے کہ وہ بظاہر ایک بے عظمت انسان کے اندر حق کی عظمت کو دیکھ لے۔ — اسی طرح داعی کا امتحان یہ ہے کہ وہ کسی بے دین کا اس لئے استقبال نہ کرنے لگے کہ وہ مال وجاہ کا مالک ہے۔ اور کسی دین دار کو اس لئے ناقابل لحاظ نہ سمجھ لے کہ اس کے پاس دنیوی شان وشوکت

کی چیزیں موجود نہیں۔ داعی اگر ایسا کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ زبان سے آخرت کی اہمیت کا وعظ کہہ رہا ہے اور عمل سے دنیا کی اہمیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنی تردید آپ ہے۔ اور جو شخص اپنی تردید آپ کرے اس کی بات کی دوسروں کی نظر میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

انہوں نے کہا کہ اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کر لیا۔ اب وہ چیز لے آؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے رہے ہو، اگر تم سچے ہو۔ نوح نے کہا اس کو تو تمہارے اوپر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ جا سکو گے۔ اور میری نصیحت تم کو فائدہ نہیں دے گی اگر میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں جب کہ اللہ یہ چاہتا ہو کہ وہ تم کو گمراہ کرے۔ وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے ۳۲ — ۳۴

حضرت نوح نے اپنی قوم سے جدال (جھگڑا اور مناظرہ) نہیں کیا تھا۔ وہ سنجیدہ انداز میں اپنا صالح پیغام ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مگر آپ کی سنجیدہ دعوت آپ کی قوم کو الٹی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جب اس کی اپنی ذات زد میں آ رہی ہو تو وہ سنجیدگی کھو دیتا ہے۔ ایسی بات کو وہ دلیل اور ثبوت کے اعتبار سے نہیں دیکھتا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس کو رد کر دیتا ہے۔ داعی حق کی ٹھوس دلیل بھی اس کو بحث و جدال معلوم ہونے لگتی ہے۔

"بہت جدال کر چکے" کا جملہ در اصل یہ بتانے کے لئے نہیں ہے کہ نوح نے کیا کہا تھا۔ بلکہ وہ اس کو بتاتا ہے کہ سننے والوں نے آپ کی بات کو کیا درجہ دیا تھا۔

اسی طرح مخالفین نوح کا عذاب کو طلب کرنا حقیقۃً عذاب کو طلب کرنا نہیں تھا۔ بلکہ حضرت نوح کا مذاق اڑانا تھا کہ دیکھو یہ شخص ایسی بات کہہ رہا ہے جو کبھی ہونے والی نہیں۔ وہ اپنی پوزیشن کو اتنا مستحکم سمجھتے تھے جس میں ان کے خیال کے مطابق کہیں سے عذاب آنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی ذہن کے تحت انہوں نے کہا کہ ہمارے انکار کی سزا میں جس عذاب کی تم خبر دیتے رہے

ہو وہ عذاب لاؤ۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ایسا عذاب کبھی آنے والا نہ تھا اس لئے معناً اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں اور تم ناحق پر۔

حضرت نوح نے جواب دیا کہ تم معاملہ کو میری نسبت سے دیکھ رہے ہو اور چونکہ میں کمزور ہوں اس لئے تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عذاب کبھی تمہارے اوپر آسکتا ہے۔ اگر معاملہ کو خدا کی نسبت سے دیکھتے تو تم یہ نہ کہتے۔ کیونکہ پھر تمہیں نظر آجاتا کہ اس دنیا میں ظالموں کے لئے عذاب کا آنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج کا نکلنا اور زلزلہ کا پھٹنا۔

داعیٔ حق کی بات کو ماننے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ سننے والا اس کو کہنے والے کے اعتبار سے نہ دیکھے بلکہ جو کہا گیا ہے اس کے اعتبار سے دیکھے۔ چونکہ حضرت نوح کی قوم آپ کی بات کو بس ایک عام انسان کی بات سمجھ رہی تھی، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اس ذہن کے تحت تم میری بات کی قدر وقیمت کبھی نہیں پا سکتے۔ اب تو تمہارے لئے اسی دن کا انتظار کرنا ہے جب کہ خدا براہ راست تمہارے سامنے آجائے۔

ع ۳ ۱۱

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿٣٥﴾

کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرا جرم میرے اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو اس سے میں بری ہوں ٣٥

جو لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر نے یہ کلام خود گھڑ لیا ہے، یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے، وہ وحی والہام کے منکر نہ تھے۔ حتیٰ کہ وہ ماضی کے رسولوں کو مانتے تھے۔ پھر انہوں نے ایسا کیوں کہا۔ یہ دراصل وحی کا انکار نہیں تھا۔ بلکہ صاحب وحی کا انکار تھا۔ جو شخص خدا کی طرف سے بول رہا تھا وہ دیکھنے میں ان کو ایک معمولی انسان دکھائی دیتا تھا۔ ان کا ظاہر پرست مزاج سمجھ نہیں پاتا تھا کہ ایسا ایک آدمی وہ شخص کیسے ہوسکتا ہے جس کو خدا نے اپنے پیغام بری کے لئے چنا ہو۔

''میرا جرم میرے اوپر، تمہارا جرم تمہارے اوپر'' یہ دراصل کلمۂ رخصت ہے۔ جب مخاطب دلیل سے بات کو نہیں مانتا۔ ہر قسم کی وضاحت کے باوجود وہ انکار پر تلا ہوا ہے تو داعی محسوس کرتا ہے کہ اس کے لئے اب آخری چارۂ کار صرف یہ ہے کہ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوجائے کہ میں اور تم دونوں حاکم اصلی کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔ وہاں ہر ایک کا حال کھل

جائے گا۔ اور ہر آدمی اپنی حقیقت کے اعتبار سے جیسا تھا اس کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے گا۔ جب دلیل کی حد ختم ہو جائے تو داعی کے لئے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ وہ یقین کی زبان میں کلام کرکے علٰحدگی اختیار کرلے۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۚ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ۝

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا سوا اس کے جو ایمان لا چکا۔ پس تم ان کاموں پر غمگین نہ ہو جو وہ کر رہے ہیں۔ اور ہمارے روبرو اور ہمارے حکم سے تم کشتی بناؤ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے بات نہ کرو، بیشک یہ لوگ غرق ہوں گے۔ اور نوح کشتی بنانے لگا۔ اور جب اس کی قوم کا کوئی سردار اس پر گذرتا تو وہ اس کی ہنسی اڑاتا، انہوں نے کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں۔ تم جلد جان لوگے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر دے اور اس پر وہ عذاب اترتا ہے جو دائمی ہے ۳۹ — ۳۶

انسان سے جو ایمان مطلوب ہے وہ ایمان وہ ہے جب کہ آدمی شعوری طور پر اپنے آزادانہ فیصلہ سے ایمان قبول کرے۔ پیغمبر کے طویل دعوتی عمل کے باوجود جو لوگ ایمان نہ لائیں وہ ایسا کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ آزادانہ فیصلہ کے تحت خدا کے مومن بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی آزادی چھین لی جائے اور ان کو لے جا کر براہ راست خدائے ذوالجلال کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تاکہ جس چیز کا انہوں نے مومنانہ اقرار نہیں کیا تھا، اس کا وہ مجرمانہ اقرار کریں اور اپنی سرکشی کی سزا بھگتیں۔

حضرت نوح کی سیکڑوں سال کی تبلیغ کے بعد ان کی قوم کے لئے یہ وقت آگیا تھا۔ اس

کے بعد حضرت نوح سے کہدیا گیا کہ اب تبلیغ کے کام سے فارغ ہو کر کشتی تیار کرو تاکہ جب سرکشوں کو غرق کرنے کے لئے خدا کا سیلاب آئے تو اس وقت تم اور تمہارے ساتھی اہل ایمان اس میں پناہ لے سکیں۔

حضرت نوح نے ایک بہت بڑی تین منزلہ کشتی تیار کی۔ اس کو بنانے میں کئی سال لگ گئے۔ جس زمانہ میں حضرت نوح اپنے چند ساتھیوں کو لیکر کشتی بنارہے تھے تو قوم کے سرکش لوگ آتے جاتے ہوئے اسے دیکھتے۔ چونکہ وہ لوگ عذاب کی بات کو محض فرضی سمجھ رہے تھے اس لئے جب انہوں نے دیکھا کہ آنے والے مفروضہ عذاب سے بچنے کے لئے کشتی بھی تیار کی جارہی ہے تو وہ حضرت نوح کا اور بھی زیادہ مذاق اڑانے لگے۔

ایک آدمی سرکشی اور ناانصافی کے ذریعہ دولت سمیٹ رہا ہو تو ظاہر پرست آدمی اس کے گرد دنیا کا سازوسامان دیکھ کر اس کو کامیاب سمجھے گا۔ مگر جو شخص جانتا ہو کہ دنیا کا نظام اخلاقی قوانین پر چل رہا ہے، وہ مذکورہ شخص کی وقتی کامیابی میں مستقبل کی عظیم تباہی کا منظر دیکھ رہا ہو گا —— قوم نوح کے ظاہر پرست لوگ اگرچہ حضرت نوح کا مذاق اڑا رہے تھے، مگر حقیقتِ واقعہ کی نظر میں خود ان کا مذاق اڑ رہا تھا۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝٤٠ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٤١ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٤٢ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝٤٣ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٤٤

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور طوفان ابل پڑا ہم نے نوح سے کہا کہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوا ان اشخاص کے جن کی بابت پہلے کہا جاچکا ہے اور سب ایمان والوں کو بھی۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور نوح نے کہا کہ کشتی میں سوار ہوجاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا بھی۔ بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ اور کشتی پہاڑ جیسی موجوں کے درمیان ان کو لیکر چلنے لگی۔ اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جو اس سے الگ تھا۔ اے میرے بیٹے، ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور کافروں کے ساتھ مت رہ۔ اس نے کہا میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی سے بچالے گا۔ نوح نے کہا کہ آج کوئی اللہ کے حکم سے بچانے والا نہیں مگر وہ جس پر اللہ رحم کرے۔ اور دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ ڈوبنے والوں میں شامل ہوگیا۔ اور کہا گیا کہ اے زمین، اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا۔ اور پانی سکھا دیا گیا۔ اور معاملہ کا فیصلہ ہوگیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہو ظالموں کی قوم ۴۰ — ۴۴

جب کشتی بن کر تیار ہوگئی تو خدا کے حکم سے طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ زمین سے پانی کے دہانے پھوٹ پڑے۔ اوپر سے مسلسل بارش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہوگیا۔ تمام لوگ اس میں ڈوب گئے۔ صرف وہ چند انسان اور کچھ مویشی بچے جو حضرت نوح کی کشتی میں سوار تھے۔ حتی کہ حضرت نوح کا بیٹا بھی غرق ہوگیا —— خدا کی نظر میں کسی کی قیمت اس کے عمل کے اعتبار سے ہے نہ کہ رشتہ کے اعتبار سے، خواہ وہ رشتہ پیغمبر کا کیوں نہ ہو۔

جب تمام ڈوبنے والے ڈوب چکے تو خدا نے حکم دیا کہ طوفان تھم جائے۔ اور طوفان تھم گیا۔ پانی سمندروں اور دریاؤں میں چلا گیا اور زمین دوبارہ رہنے کے قابل ہوگئی۔

طوفان نوح کے موقع پر دیکھنے والوں نے یہ منظر دیکھا کہ اونچے پہاڑ پر چڑھنے والے ڈوب گئے اور ہولناک موجوں کے باوجود کشتی میں بیٹھنے والے سلامت رہے۔ اس کی وجہ خود پہاڑ میں یا کشتی میں نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حکم خداوندی کا معاملہ تھا۔ حکم خداوندی اگر پہاڑ کے ساتھ ہوتا تو پہاڑ اپنے چڑھنے والوں کو بچاتا اور کشتی کا سہارا لینے والے ہلاک ہوجاتے۔ مگر اس موقع پر حکم خداوندی کشتی کے ساتھ تھا۔ اس لئے کشتی والے محفوظ رہے اور دوسری چیزوں کی پناہ لینے والے غرق ہوگئے۔

دنیا میں اسباب کا نظام محض ایک پردہ ہے۔ ورنہ یہاں جو کچھ ہورہا ہے براہ راست خدا کے حکم سے ہورہا ہے۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری پردہ سے گزر کر اصل حقیقت کو دیکھ

لے۔ وہ اسباب کے اندر خدائی طاقتوں کو کام کرتا ہوا پالے۔

وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِیۡنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ۫ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّیۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِیۡنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۴۷﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں ہے، اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے۔ اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔ خدا نے کہا اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں نہیں۔ اس کے کام خراب ہیں۔ پس مجھ سے اس چیز کے لئے سوال نہ کر جس کا تمہیں علم نہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ نوح نے کہا کہ اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اور اگر تو مجھے معاف نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں برباد ہو جاؤں گا ۴۷ - ۴۵

طوفان نوح میں جو لوگ غرق ہوئے ان میں خود حضرت نوح کا بیٹا کنعان بھی تھا۔ حضرت نوح نے اس کو اپنی کشتی میں بٹھانا چاہا۔ مگر اس کے لئے ڈوبنا مقدر تھا اس لئے وہ نہیں بیٹھا۔ پھر انہوں نے اس کے بچاؤ کے لئے خدا سے دعا کی تو جواب ملا کہ یہ نادانی کا سوال ہے، ایسے سوالات نہ کرو۔

اصل یہ ہے کہ خدا کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں ہوتا کہ جو لوگ بزرگوں کی اولاد ہیں۔ یا جو کسی حضرت کا دامن تھامے ہوئے ہیں ان سب کو نجات یافتہ قرار دے کر جنتوں میں داخل کر دیا جائے۔ خدا کے یہاں نجات کا فیصلہ خالص عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ نسبی یا گروہی بنیادوں پر۔

دنیا میں اگر نسبی رشتہ کا اعتبار ہے تو آخرت میں اخلاقی رشتہ کا اعتبار۔ طوفان نوح اسی لئے آیا تھا کہ انسانوں کے درمیان دوسری تمام تقسیمات کو توڑ کر اخلاقی تقسیم قائم کر دے۔ جو عمل صالح والے لوگ ہیں ان کو خدائی کشتی میں بٹھا کر بچا لیا جائے اور غیر عمل صالح والے تمام لوگوں کو طوفان کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی واقعہ دوبارہ قیامت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور زیادہ کامل طور پر ہوگا۔

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ
ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ
اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ ع

کہا گیا کہ اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر اور ان گروہوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور (ان سے ظہور میں آنے والے) گروہ کہ ہم ان کو فائدہ دیں گے، پھر ان کو ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب پکڑلے گا۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم تمہاری طرف وحی کررہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ پس صبر کرو بے شک آخری انجام ڈرنے والوں کے لئے ہے ۴۸ — ۴۹

جب تمام برے لوگ غرق ہوچکے تو طوفان تھم گیا۔ پانی دھیرے دھیرے زمین میں اور سمندروں میں چلا گیا۔ حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی تھی، آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سے نکل کر زمین پر اترے۔ زمین دوبارہ خدا کے حکم سے سرسبز اور آباد ہوگئی۔

حضرت نوح جن لوگوں کے درمیان آئے وہ حضرت آدم کی نبوت کو ماننے والے لوگ تھے۔ آپ کے بعد آپ کی امت ابتداءً راہ راست پر رہی۔ اس کے بعد اس کی اگلی نسلوں میں بگاڑ آیا تو دوبارہ انبیاء بھیجے گئے۔ یہ بعد کو آنے والے انبیاء ان قوموں میں آئے جو حضرت نوح کی نبوت کو مانتی تھیں۔ اس کے باوجود جب انہوں نے وقت کے نبی کو مان کر اپنی اصلاح نہ کی تو وہ ہلاک کردی گئیں۔ گویا صرف کسی نبی کو ماننا یا اس کی طرف اپنے کو منسوب کرنا نجات یافتہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایمان مطلوب ہے جو زندہ ایمان ہو اور جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ وہ آدمی کی زندگی کو نیک عملی کی زندگی میں تبدیل کردے۔

حضرت نوح کی تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ باطل پرستوں کا زور خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اور ان کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہوجائے۔ بالآخر ان کے لئے جو چیز مقدر ہے وہ ہلاکت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اہل ایمان خواہ کتنے ہی کم ہوں اور خواہ وہ بظاہر کتنے ہی بے زور ہوں۔ مگر جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوتا ہے تو یہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنائے جاتے ہیں، ابتداءً موجودہ دنیا میں اور آخری طور پر آخرت میں۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اِنْ اَنْتُمْ

إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ يَٰقَوْمِ لَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَى ٱلَّذِى فَطَرَنِىٓ ۚ
أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾ وَيَٰقَوْمِ ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوٓا۟ إِلَيْهِ يُرْسِلِ ٱلسَّمَآءَ عَلَيْكُم
مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا۟ مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ھود کو بھیجا۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے میری قوم، میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔ اور اے میری قوم، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تمہارے اوپر خوب بارشیں برسائے گا۔ اور تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ اور تم مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔ ۵۲ — ۵۰

قوم عاد کی ہدایت کے لئے حضرت ھود کو اٹھایا گیا جو انہیں کے بھائی تھے۔ یہ پیغمبروں کے باب میں ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قوم کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ بخوبی طور پر قوم کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی زبان کو جانتے ہیں اور زیادہ موثر طور پر اس کے اندر دعوت حق کا کام کر سکتے ہیں۔

حضرت ھود نے اپنی قوم کو ایک اللہ کی عبادت کا پیغام دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تمہارا جو دین ہے وہ محض ایک جھوٹ ہے جو تم نے گھڑ لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا طریقہ معروف معنوں میں صرف "مثبت طور پر" اپنی بات کہنے کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ وہ کھلی کھلی تنقید بھی کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک تنقید و تجزیہ کے ذریعہ ناحق کا ناحق ہونا واضح نہ کیا جائے اس وقت تک حق کا حق ہونا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ہر پیغمبر کے زمانہ میں ایسا ہوا کہ اس کے مخالفین اس کی پیغمبری کو ماننے کے لئے یہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی بڑا عہدیدار ہو، اس کو دولت کے خزانے حاصل ہوں، وہ عالی شان عمارتوں میں رہتا ہو۔ مگر حق کے داعی کو جانچنے کا یہ معیار صحیح نہیں۔ داعی کی صداقت جانچنے کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ اپنے مشن میں پوری طرح سنجیدہ ہو، اس کی بات آخری حد تک مدلل ہو۔ وہ ہر قسم کی دنیوی غرض سے بالاتر ہو۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ عین حقیقتِ واقعہ ہو۔ اس کا پیغام کائناتی نظام سے کامل مطابقت رکھتا ہو۔ اس کو اختیار کرنا کامیابی کی شاہراہ پر چلنا ہو۔

تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا (بیفزاید شمارا قوتے با قوتے شما) کا مطلب مادی

قوت میں اضافہ نہیں ہے۔ کیونکہ قوم عاد اپنے زمانہ میں نہایت طاقتور تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر نے جب ان کو عذاب سے ڈرایا تو انہوں نے کہا کہ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے (من اشد منا قوۃ، حم السجدہ ۱۵) اس لئے مادی قوت میں اضافہ کی بات، دعوتی اعتبار سے ان کے لئے زیادہ پرکشش نہیں ہو سکتی تھی۔

اس آیت میں قوت پر اضافہ کا مطلب ہے مادی قوت پر ایمانی قوت کا اضافہ۔ پیغمبر کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم ایمانی زندگی اختیار کر لو تو اس سے تم کو اخلاقی اور روحانی قوت حاصل ہوگی۔ موجودہ مادی زور کے ساتھ اخلاقی اور روحانی زور ملنے سے تمہاری طاقت گھٹے گی نہیں۔ بلکہ وہ مزید بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

انہوں نے کہا کہ اے ھود، تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر نہیں آئے ہو، اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اور ہم ہرگز تم کو ماننے والے نہیں ہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تمہارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔ ھود نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بری ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو، اس کے سوا۔ پس تم سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو، پھر مجھ کو مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا جو میرا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے ۵۶ — ۵۳

قوم نے حضرت ہود سے کہا کہ تمہارے پاس اپنے برسرحق ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع بھی حضرت ہود کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ آنجناب کے پاس یقیناً دلیل تھی، مگر وہ مخاطبین کو دلیل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آدمی عام طور پر کسی

بات کو خالص دلیل کی بنیادوں پر جانچ نہیں پاتا۔ بلکہ اس اعتبار سے دیکھتا ہے کہ جو شخص اس کو پیش کر رہا ہے وہ کیسا ہے۔ چونکہ پیش کرنے والا اپنے زمانہ میں لوگوں کو ایک ناقابل لحاظ انسان دکھائی دیتا تھا اس لئے اس کی بات بھی لوگوں کو ناقابل لحاظ نظر آتی تھی۔

جب ایک شخص وقت کے جمے ہوئے مذہب کو چھوڑ کر خالص بے آمیز دین کی دعوت لیکر اٹھتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ماحول میں وہ اجنبی بلکہ حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ لوگ اس کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی ایسا شخص ہو جس کو خلل دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو۔ حضرت ہود کے معاملہ میں یہی صورت حال تھی جس کی وجہ سے ان کی قوم کے لوگوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ـــــ "ہمارا تو خیال ہے کہ تمہارے اوپر ہمارے بزرگوں کی مار پڑ گئی ہے" مگر داعیٔ حق کی صداقت کا ثبوت، نظری دلائل کے بعد، ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے مخالفین ہر قسم کی کوششوں کے باوجود اس کو زیر نہیں کر پاتے۔

خدا کے پیغمبر جن قوموں میں آئے وہ سب خدا کو ماننے والی تھیں۔ گویا داعی بھی خدا پرست ہونے کا مدعی تھا اور مدعو بھی خدا پرست ہونے کا مدعی۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا دونوں میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے۔ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ خدا صراط مستقیم (سیدھی شاہراہ) پر ہے۔ اس لئے جو دین کے سیدھے خط پر چل رہا ہے وہ براہ راست خدا تک پہنچے گا اور جو ٹیڑھے راستوں پر چل رہا ہے اس کا راستہ ادھر ادھر بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ خدا تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرت ہود نے جب کہا کہ "میرا رب صراط مستقیم پر ہے" تو دوسرے لفظوں میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ میں جس چیز کی طرف بلا رہا ہوں وہ صراط مستقیم (دین کی شاہراہ) ہے۔ اور تم لوگ جن چیزوں کو دین سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہو وہ دین کی شاہراہ کے اطراف میں پگڈنڈیاں نکال کر ان کے اوپر دوڑنا ہے۔ اس قسم کی دوڑ آدمی کو خدا تک نہیں پہنچاتی، وہ اس کو ادھر ادھر بھٹکا کر چھوڑ دیتی ہے۔

ان آیات کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضرت ہود کی بتائی ہوئی صراط مستقیم یہ نکلتی ہے ـــــ توحید، عبادت الٰہی، استغفار، توبہ، نعمتوں پر خدا کا شکر، توکل علی اللہ، خدا کو اپنا پروردگار ماننا، صرف خدا کو تمام طاقتوں کا مالک سمجھنا، خدا کو اپنے اوپر نگراں بنا لینا۔ کبر کی روش کے بجائے اطاعت کی روش اختیار کرنا۔

یہ سب دین کی بنیادی تعلیمات ہیں۔ ان تعلیمات پر چلنا اور ان کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا گویا دین کی شاہراہ پر چلنا ہے۔ اس پر چلنے والا سیدھے خدا تک پہنچتا ہے۔ اس کے سوا جن چیزوں کو آدمی اہمیت دے اور ان کی دھوم مچائے وہ گویا اصل شاہراہ کے دائیں بائیں پگڈنڈیاں نکال

کر ان کے اوپر دوڑ رہا ہے۔ ایسی دوڑ آدمی کو صرف خدا سے دور کرنے والی ہے، وہ اس کو خدا کے قریب نہیں پہنچا سکتی۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا
تَضُرُّوْنَهٗ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷ وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا
هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۸ وَتِلْكَ
عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۵۹
وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ
اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝۶۰ ع ۵ ۱۱

اگر تم اعراض کرتے ہو تو میں نے تم کو وہ پیغام پہنچا دیا جس کو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ اور میرا رب تمہاری جگہ تمہارے سوا کسی اور گروہ کو جانشیں (خلیفہ) بنائے گا۔ تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور جب ہمارا حکم آپہنچا، ہم نے اپنی رحمت سے بچا دیا ھود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور ہم نے ان کو ایک سخت عذاب سے بچا دیا۔ اور یہ عاد تھے کہ انہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا۔ اور اس کے رسولوں کو نہ مانا اور ہر سرکش اور مخالف کی بات کی اتباع کی۔ اور ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اس دنیا میں اور قیامت کے دن۔ سن لو، عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سن لو، دوری ہے عاد کے لیے جو ھود کی قوم تھی　۶۰ — ۵۷

جو لوگ خدا کی بات کو نظر انداز کر دیں، خدا بھی انہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ جو موجودہ دنیا میں جزئی طور پر پیش آتا ہے یہی قیامت میں کلی اور آخری طور پر پیش آئے گا۔ اس وقت تمام سرکش لوگ خدا کی رحمتوں سے دور کر دئے جائیں گے۔ اور خدا کی رحمت صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو دنیا کی زندگی میں خدا کے تابع اور وفادار بن کر رہے تھے۔

اس دنیا میں خدا نے ''استخلاف'' کا اصول رائج کیا ہے۔ یعنی ایک قوم کو ہٹانے کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ زمین پر متمکن کرنا۔ دنیا میں یہ تمکن امتحان کی غرض سے وقتی طور پر ہوتا ہے۔

آخرت میں خدا کی معیاری دنیا میں یہ تمکن انعام کے طور پر مستقل طور پر سچے اہل ایمان کو حاصل ہو گا۔

موجودہ امتحانی دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں آدمی ہمیشہ خیر اور شر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کو آزادی ہوتی ہے کہ دونوں میں سے جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ مزید یہ کہ اکثر حالات میں اس دنیا میں شر کا غلبہ ہوتا ہے۔ خیر کی جانب صرف نشانیوں (نظری دلائل) کا زور ہوتا ہے۔ دوسری طرف شر کی جانب مادی طاقت موجود ہوتی ہے، وہ بھی اتنی بڑی مقدار میں کہ اس کے علم بردار سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر ماحول کے اندر ایسی دباؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں کہ عام آدمی حق کی طرف بڑھنے کی جرأت ہی نہ کرے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُجِيبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا ۖ أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تم کو زمین سے بنایا، اور اس میں تم کو آباد کیا۔ پس معافی چاہو، پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب قریب ہے، قبول کرنے والا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اے صالح اس سے پہلے ہم کو تم سے امید تھی۔ کیا تم ہم کو ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے اور ہم بڑے خلجان میں ہیں۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت دی ہے تو مجھ کو خدا سے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں۔ پس تم کچھ نہیں بڑھاؤ گے میرا سوائے نقصان کے ۶۱-۶۳

حضرت صالح نے اپنی قوم کو ایک خدا کی عبادت کی طرف بلایا۔ یہی ہر زمانہ میں تمام پیغمبروں کا مقصد تھا۔ مگر حضرت صالح کی قوم آپ کے پیغام کو قبول نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اس کو براہ راست خدا سے جوڑنے کی بات کرتے تھے، جب کہ قوم کا حال یہ تھا کہ وہ خدا کے نام پر صرف اپنے اعاظم واکابر سے جڑی ہوئی تھی۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے کسی چیز کی اہمیت اور معنویت صرف اس وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ ان کے قومی بزرگوں کے قول وعمل میں اس کی تصدیق مل جائے۔ اب چونکہ حضرت صالح کے پاس صرف دلیل کا زور تھا، ان کی قوم ان کی بات کی اہمیت کو محسوس نہ کر سکی۔ حضرت صالح جس دین کی طرف بلا رہے تھے اس کی اہمیت خدا کی وحی اور زمین وآسمان کی نشانیوں میں غور کرنے سے واضح ہوتی تھی۔ جب کہ ان کی قوم صرف اس دین کی اہمیت سے باخبر تھی جو اکابر قوم کے ملفوظات اور معمولات سے ثابت ہوتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوم آپ کے دلائل کے مقابلہ میں لاجواب ہو کر بھی بس ایک قسم کے شبہہ کی حالت میں پڑی رہی۔

حضرت صالح، دوسرے تمام پیغمبروں کی طرح، شخصیت اور ذہانت میں اپنی قوم کے ممتاز فرد تھے۔ لوگ امید رکھتے تھے کہ بڑے ہو کر وہ قوم کے ایک کارآمد فرد ثابت ہوں گے۔ مگر وہ بڑی عمر کو پہنچے تو انہوں نے قوم کے مروجہ مذہب پر تنقید شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر قوم کے لوگوں کو ان کے بارہ میں سخت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے کہا، ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ تم ہمارے قائم شدہ مذہبی نظام کے ایک ستون بنوگے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے مذہبی نظام کو بے بنیاد ثابت کرنے پر اپنا سارا زور لگائے ہوئے ہو ـــــ یہی معاملہ ہر دور میں خدا کے سچے داعیوں کو اپنی قوم کی طرف سے پیش آیا ہے۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا
بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ
اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾ وَاَخَذَ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ

أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ

اور اے میری قوم، یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی ہے۔ پس اس کو چھوڑ دو کہ وہ اللہ کی زمین میں کھائے۔ اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ بہت جلد تم کو عذاب پکڑ لے گا۔ پھر انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ تب صالح نے کہا کہ تین دن اور اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو۔ یہ ایک وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا۔ پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے (محفوظ رکھا)۔ بیشک تیرا رب ہی قوی اور زبردست ہے۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک ہولناک آواز نے پکڑ لیا پھر صبح کو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ جیسے کہ وہ کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سنو، ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو، پھٹکار ہے ثمود کے لئے ۶۴ — ۶۸

حضرت صالح اپنی قوم سے کہتے تھے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔ ان کی قوم اگرچہ خدا اور رسالت کی منکر نہ تھی مگر اس نے حضرت صالح کی بات کو ایک مذاق سمجھا۔ کیونکہ حضرت صالح کے پاس اپنی پیغمبری کو ثابت کرنے کے لئے صرف نظری دلیل تھی اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ صرف نظری دلیل کی بنیاد پر بہت کم اس کے لئے تیار ہوتا ہے کہ ایک مانوس چیز کو چھوڑے اور دوسری غیر مانوس چیز کو اختیار کرلے۔

حضرت صالح کی قوم جب نظری نشانیوں کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوئی تو آخری مرحلہ میں اس کے مطالبہ کے مطابق اس کے لئے حسّی نشانی بھی ظاہر کر دی گئی۔ یہ ایک اونٹنی تھی جو لوگوں کے سامنے ٹھوس چٹان کے اندر سے نکل آئی۔ ایسی نشانی کے بارہ میں خدا کا قانون ہے کہ جب وہ ظاہر کی جاتی ہے تو اس کے بعد لوگوں کے لئے امتحان کی مزید مہلت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حضرت صالح نے اعلان کر دیا کہ اب تم لوگ یا تو توبہ کر کے میری بات مان لو، ورنہ تم سب لوگ ھلاک کر دئے جاؤ گے۔ مگر جو لوگ نظری دلائل کی قوت کو محسوس نہ کرسکیں وہ حسی دلائل کو دیکھ کر بھی اس سے عبرت پکڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد بھی حضرت صالح کی قوم اپنی سرکشی سے باز نہ آئی۔ حتی کہ اس نے خود اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے لئے مزید مہلت کا سوال نہ تھا۔ چنانچہ وہ مٹا دی گئی

قوم صالح (ثمود) کا علاقہ شمال مغربی عرب (الحجر) تھا۔ حضرت صالح کو حکم ہوا کہ تم یہاں سے باہر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنے مخلص ساتھیوں کو لے کر شام کی طرف چلے گئے۔ اس کے بعد ایک سخت زلزلہ آیا اور ساری قوم اس کی لپیٹ میں آکر بری طرح ہلاک ہوگئی۔

ایک آیت

سورہ لقمان کے آخر میں ارشاد ہوا ہے : بیشک قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اور وہی بارش اتارتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے۔ اور کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔ اور کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔

جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قیامت کی ساری تفصیلات انسان کے علم میں نہیں۔ مگر زندگی کی بہت سی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں۔ ہم اپنی بشری محدودیت کی وجہ سے ان کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ پھر بھی کوئی شخص ان کا انکار نہیں کرتا۔ زندگی کے تمام معاملات اسی قسم کی "ناکافی" معلومات کی بنیاد پر چلائے جاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی معلومات کو قیامت کے انکار کے لئے معقول وجہ مان لینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

بارش آتی ہے اور آنے والی ہے، مگر انسان کو قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی آج بھی محکمۂ موسمیات اس معاملہ میں اتنا ہی عاجز ہے جتنا قدیم دور کا انسان اپنے کو عاجز محسوس کرتا تھا۔

عورت حاملہ ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جننے والی ہے۔ مگر کیا جنے گی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ پیدا ہونے والا کتنی مدت تک دنیا میں رہے گا اور کب مر جائے گا۔ وہ کیا کمائے گا۔ وہ برا نکلے گا یا بھلا۔ وہ دوسروں کو کیا دے گا اور خود کیا حاصل کرے گا۔ اندر کا انسان باہر آکر کیا ثابت ہوگا۔ یہ سب باتیں لامعلوم رہتی ہیں۔ پھر بھی انسان یقین رکھتا ہے کہ عورت کے پیٹ سے ایک جان ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ مذکورہ عدم واقفیت کو اس کے انکار کی وجہ نہیں بنالیتا۔

کسی آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ وہ آئندہ کیا کچھ حاصل کرے گا۔ آدمی پروگرام بناتا ہے مگر اس کی تکمیل ہمیشہ غیر یقینی رہتی ہے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے۔ مگر اس کا منصوبہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے گا، اس کو کوئی نہیں جانتا۔

موت ہر ایک کے لئے یقینی ہے۔ مگر کون شخص کہاں مرے گا اور کہاں اپنی کتاب زندگی کا آخری صفحہ لکھے گا، اس کے بارے میں کوئی بھی قطعی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ کب، کیا، کتنا اور کہاں کے سوالات جن کو لوگ قیامت کے انکار کے لئے بنیاد بناتے

ہیں، ٹھیک انہیں سوالات کی موجودگی میں دوسری باتوں کو مان لیتے ہیں اور ان کی بنیاد پر ا
زندگی کا نظام چلاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی کمتر واقفیت کی بنا پر قیامت کے بارے میں کیوں شک
کیا جانے لگے۔

اور اللہ ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے۔ (وَیعلمُ ما فی الارحام) اس آیت کی تف
عام طور پر یہ مشہور ہوگئی ہے کہ یہ خدا ہی کے علم میں ہے کہ حاملہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے۔
لڑکی۔ مگر آیت کے الفاظ میں اس تفسیر کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔

آیت کے الفاظ بالکل عام ہیں۔ " رحم کے اندر کیا ہے، یہ خدا ہی کو معلوم ہے "۔ ا
الفاظ میں ہر وہ بات آسکتی ہے جو پیدا ہونے والے کی زندگی اور مستقبل سے متعلق ہو۔ یہا
ایسا کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو مذکر اور مؤنث کے ساتھ خاص کیا جا
جہاں تک قرآن کی قدیم تفسیروں کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر دو بات
کہی جاتی رہی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک تفسیر کا حوالہ نقل کرتے ہیں۔

(ویعلم ما فی الارحام) ای من ذکر او انثی، شقی او سعید صفوۃ التفاسیر، محمد علی الصابونی

خدا ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے، یعنی مذ یا مؤنث، برا یا بھلا۔

اس آیت میں مذکر اور مؤنث کا قصہ زیادہ تر عوامی ذوق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے
عوام کو چونکہ اس سے بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے کہ ان کے یہاں پیدا ہونے والی اولا
لڑکا ہے یا لڑکی، اس لئے یہ تفسیر مشہور ہوگئی۔ ورنہ خود قدیم تفاسیر میں شقی او
سعید کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ یعنی یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ پیدا ہونے والا بڑا ہو کر برا نکلے
گا یا بھلا ثابت ہوگا۔ "برا اور بھلا" کے الفاظ انتہائی عام اور وسیع ہیں۔ ان میں انسا ن
کی زندگی سے متعلق ہر بات موجود ہے۔ انسان زیادہ عمر کو پہنچ کر جو کچھ بنتا ہے وہ سب
ان دو لفظوں میں شامل ہے۔

مذکر اور مؤنث کے بارہ میں پہلے بھی انسان اندازے کرتا تھا اور موجودہ زمانہ میں
مزید اضافہ کے ساتھ اس کا اندازہ کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ تاہم اصل بات بدستور انسان کے
لا معلوم ہے۔ اور وہ یہ کہ مکمل معنوں میں پیدا ہونے والے کے بارہ میں پیشین گوئی کی
جائے کہ وہ کیسا عورت یا مرد ثابت ہوگا اور کیسا عورت یا مرد ثابت نہیں ہوگا۔ رحم ماد
کا یہ راز اب بھی انسان کے لئے لا معلوم ہے۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi 110 006

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

۱ - تذکیر القرآن جلد اوّل ہدیہ ۵۰/-

۲ - الاسلام ۱۵/-

۳ - مذہب اور جدید چیلنج ۲۰/-

۴ - ظہورِ اسلام ۲۰/-

۵ - احیاءِ اسلام ۱۲/-

۶ - پیغمبرِ انقلاب ۲۰/-

۷ - دین کیا ہے ۲/-

۸ - قرآن کا مطلوب انسان ۵/-

۹ - تجدیدِ دین ۳/-

۱۰ - اسلام دینِ فطرت ۳/-

۱۱ - تعمیرِ ملت ۳/-

۱۲ - تاریخ کا سبق ۳/-

۱۳ - مذہب اور سائنس ۵/-

۱۴ - عقلیاتِ اسلام ۳/-

۱۵ - فسادات کا مسئلہ ۲/-

۱۶ - انسان اپنے آپ کو پہچان ۱/-

۱۷ - تعارفِ اسلام ۲/۵۰

۱۸ - اسلام پندرھویں صدی میں ۲/-

۱۹ - راہیں بند نہیں ۳/-

۲۰ - ایمانی طاقت ۳/-

۲۱ - اتحادِ ملت ۳/-

۲۲ - سبق آموز واقعات ۳/-

۲۳ - زلزلۂ قیامت ۴/-

۲۴ - حقیقت کی تلاش ۳/-

۲۵ - پیغمبرِ اسلام ۲/-

۲۶ - منزل کی طرف ۹/-

۲۷ - حقیقتِ حج (زیرِ طبع)

۲۸ - Mohammad The Ideal Character 3/-

تعارفی سٹ

۲۹ - سچا راستہ ۱/-

۳۰ - دینی تعلیم ۳/-

۳۱ - حیاتِ طیبہ ۲/۵۰

۳۲ - باغِ جنت ۳/-

۳۳ - نارِ جہنم ۳/-

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ ——
انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا

ستمبر ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۸۲

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

ستمبر ۱۹۸۴
شمارہ ۸۲

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

AL-RISALA

Islamic Monthly

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کے انگریزی اڈیشن کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہوگا۔ نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ انگریزی الرسالہ کے ٹائٹل کا نمونہ زیر نظر شمارہ کے آخری صفحہ پر دیا جارہا ہے۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپیے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

اختلاف کا سبب دنیا

ہر قسم کے جھگڑوں کے پیدا ہونے کا واحد سبب دنیا کو اہمیت دینا ہے۔ لوگ اگر آخرت کو اہمیت دینے لگیں تو کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو فوراً ختم ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کا امیر کون ہو۔ یہ بے حد اختلافی مسئلہ تھا۔ مہاجرین کا خیال تھا کہ امیر کسی مہاجر کو ہونا چاہئے۔ انصار کہتے تھے کہ انصار میں سے کسی شخص کو امیر بنایا جائے۔ اس کے بعد ذی ہوش افراد نے لوگوں کے سامنے یہ بات رکھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخر وقت میں حضرت ابو بکر کو نماز کا امام بنایا تھا۔ نماز کی امامت انتظام دین کا معاملہ ہے، اور امارت اور خلافت انتظام دنیا کا معاملہ۔ پھر اللہ کے رسول نے جس شخص کو انتظام دین کے لئے اہل سمجھا ہو وہ بدرجۂ اولیٰ انتظام دنیا کا اہل ہوگا۔

اس سلسلے میں یہاں دو روایتیں نقل جاتی ہیں:

اخرج النسائی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت الانصار منا امیر ومنکم امیر فاتاھم عمر رضی اللہ عنہ فقال الستم تعلمون ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد امر ابا بکر ان یصلی بالناس فایکم تطیب نفسہ ان یتقدم ابا بکر۔ فقالوا نعوذ باللہ ان نتقدم ابا بکر (جمع الفوائد)

حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو انصار نے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر تم میں سے ہو۔ تو حضرت عمر ان کے پاس آئے اور کہا کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پھر تم میں سے کون یہ پسند کرے گا کہ وہ ابو بکر کے آگے بڑھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم ابو بکر کے آگے بڑھیں۔

عن علی رضی اللہ عنہ قال لقد امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابا بکر ان یصلی بالناس وانی لشاھد وما انا غائب وما بی مرض فرضینا لدنیانا مارضی بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا (کنز العمال)

حضرت علی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ میں اس وقت موجود تھا میں غائب نہیں تھا۔ مجھے کوئی بیماری بھی نہیں تھی۔ لہٰذا ہم اپنی دنیا کے لئے اس شخص پر راضی ہیں جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے دین کے لئے راضی ہوگئے تھے۔

ناقابل معافی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک لڑائی میں ایک مسلمان کے سر پر زخم آ گیا۔ وہ زخمی حالت میں تھا کہ اگلی صبح کو اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر ڈالنا سخت مہلک تھا۔ اس نے دوسرے مسلمان ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتے۔

مسلمان نے جب دیکھا کہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے تو اسی حالت میں اس نے غسل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حالت نازک ہو گئی اور وہ مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ کو بے حد دکھ ہوا۔ آپ نے فرمایا: قتلوہ قتلھم اللہ (انھوں نے اس کو ہلاک کر ڈالا، خدا انھیں ہلاک کرے)

مذکورہ مسئلہ واضح طور پر اجتہادی تھا۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے بارہ میں اتنے سخت الفاظ فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد میں غلطی کی معافی کی بھی ایک حد ہے۔ عام حالات میں اجتہادی خطا پر پکڑ نہیں ہے۔ مگر جب معاملہ زیادہ نازک ہو جب ایسا مسئلہ درپیش ہو جس سے آدمی کی زندگی اور موت وابستہ ہو جائے تو ایسی حالت میں اجتہادی رائے پیش کرنے سے بچنا چاہئے۔ ایسے موقع پر اجتہادی رائے دینا اور اس پر اصرار کرنا بے حسی کی بات ہے اور بے حسی ایمان کی موت کی نشانی ہوتی ہے۔

اوپر کی حدیث صرف ایک ایسی اجتہادی غلطی سے متعلق ہے جس کا نقصان انفرادی سطح پر ظاہر ہوا ہو۔ پھر یہی بات مزید شدت کے ساتھ ان واقعات کے بارہ میں صادق آتی ہے جب کہ کوئی قائد ملت کو ایسی اجتہادی رائے پر دوڑا دے جس کا نتیجہ ملت کے لئے اجتماعی ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوا ہو۔

"غسل کے وقت آدمی کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو" اس مسئلہ میں مفتی اگر غلط فتویٰ دیدے تو اس میں کسی کے لئے جان و مال کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ مگر ایک شخص جو شدید طور پر زخمی ہے وہ غسل کرے یا نہ کرے، اس معاملہ میں غلط فتویٰ سے آدمی کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اس لئے دونوں قسم کے مسائل پر غلطی کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ پہلی قسم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جس میں اجتہادی غلطی پر بھی آدمی کو حسن نیت کا ثواب مل سکتا ہے۔ مگر دوسری قسم کے مسئلہ میں اجتہادی غلطی کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ نازک معاملات جن کے ساتھ فرد اور قوم کی قسمتیں ہوں، ان میں مفتی کے لئے لازم ہے کہ وہ آخر وقت تک چپ رہے۔ اور اگر بولے تو اس وقت بولے جب کہ فی الواقع وہ خدا کے سامنے اس کے لئے بری الذمہ ہو چکا ہو۔

اختلاف دشمن کا ہتھیار

اسرائیل کے سابق وزیر جنگ موشے دایان (۱۹۸۱-۱۹۱۵) نے اپنی خود نوشت سوانح عمری *(The Story of my life)* میں لکھا تھا کہ غیر متحد عرب جو ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں ، اسرائیل کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے۔

The Arabs, disunited and at odds with one another over every issue, big and small, present no threat.

اب ۱۹۸۳ کے نصف آخر میں خود فلسطینی تنظیم (الفتح) میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ شروع ہو گیا ہے۔ لبنان میں فلسطینیوں کی ناکامی کے بعد ان کے ایک بڑے طبقہ میں یاسر عرفات کی قیادت پر اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ ابوموسیٰ کے جھنڈے کے نیچے یاسر عرفات کو قیادت سے ہٹانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف یاسر عرفات قیادت کے منصب سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس طرح فلسطینیوں میں دو گروہ بن گئے ہیں اور وہ آپس میں خوں ریز تصادم میں مصروف ہیں۔

ان حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اسرائیل کے وزیر خارجہ تیزاک شامر (Yitzhak Shamir) کا قول نقل کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں یہ کہوں گا کہ یہ اسرائیل کے حق میں اچھا ہے کہ فلسطینی تنظیم کے درمیان اندرونی جھگڑے، علیٰحدگی اور تقسیم پائی جا رہی ہے:

I must say that it is good for Israel that there are domestic quarraels, breakups and divisions within the organization of the PLO.

واشنگٹن پوسٹ نے مزید نقل کیا ہے کہ اسرائیل کے محکمہ جنگ کے ایک افسر نے کہا کہ اسرائیل میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ لبنان کے شمالی اور مشرقی حصہ میں یاسر عرفات کے خلاف بڑھتی ہوئی بغاوت کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ جنوبی لبنان میں اسرائیلی فوجیوں پر فلسطینی حملوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ اسرائیل کے محکمہ جنگ کے دوسرے افسر نے اس کے جواب میں کہا:

They are busy among themselves, and that is good for us.

وہ لوگ خود اپنے درمیان مصروف ہیں اور یہ ہمارے لئے بہت اچھا ہے (گارجین، ۳ جولائی ۱۹۸۳)

آپس میں لڑنا گویا اپنا دشمن آپ بننا ہے۔ یہ اس تخریبی کام کو خود اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے جس کو دشمن اپنے ہاتھوں سے انجام دینا چاہتا ہے۔

تاریخ سبق دیتی ہے

مسلم دنیا پر تاتاریوں کا حملہ (۶۱۷ھ) اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ تھا۔ عجیب بات ہے کہ یہ حملہ عین اس زمانہ میں ہوا جب کہ مسلمانوں نے یورپ کی صلیبی اقوام پر فتح (۵۸۷ھ) حاصل کی تھی اور شاہ مصر صلاح الدین ایوبی کے تحت اپنی فوجی برتری کی شاندار روایات قائم کی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) کے صرف ۲۵ سال بعد تاتاری قبائل کو کیسے یہ جرأت ہوئی کہ وہ مسلم سلطنت پر حملہ کر دیں۔

اس کا راز مسلمانوں کا آپس کا اختلاف تھا' اس زمانہ میں بغداد میں خلیفہ ناصر لدین اللہ کی حکومت تھی۔ خراسان میں خوارزم شاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ دونوں مسلمان تھے۔ خوارزم شاہ اگرچہ ایک آزاد حکمراں تھا۔ تاہم آئینی طور پر وہ خلیفہ بغداد کے ماتحت تھا اور اس کے ملک میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ خوارزم شاہ کے ذہن میں بغاوت کے خیالات پیدا ہوئے۔ اس نے ۶۱۵ھ میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھنا بند کر دیا اور اپنی سلطنت کو دریائے دجلہ تک وسیع کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔

خلیفہ ناصر لدین اللہ اس پر برہم ہو گیا۔ وہ اس وقت کوئی فوجی کارروائی کرنے کے موقف میں نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ہوشیاری کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ہم عصر مورخ کامل بن اثیر نے لکھا ہے کہ اس نے یہ تدبیر کی کہ چین کی سرحد پر بسنے والے تاتاریوں کو خوارزم شاہ کے خلاف اکسا دیا۔ یہ وحشی قبائل چنگیز خاں کی قیادت میں اپنے علاقے سے نکلے اور خوارزم شاہ کی سلطنت (خراسان) میں گھس آئے۔ خوارزم شاہ نے مقابلہ میں شکست کھائی۔ وہ بھاگ کر طبرستان چلا گیا جہاں ۶۱۷ھ میں کس مپرسی کی حالت میں مر گیا۔

خراسان اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد تاتاریوں کا حوصلہ بڑھا۔ اس کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھے اور خود خلیفہ ناصر لدین اللہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ تاتاریوں کو اگرچہ فوری طور پر بغداد پر قبضہ کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم سلطنت بغداد پر تاتاریوں کے مسلسل حملہ نے خلیفہ ناصر لدین اللہ کو اتنا پریشان کیا کہ اس کو سخت قسم کی پیچش ہو گئی' جو مدت تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ خلیفہ نہایت کمزور ہو گیا اور اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ اسی اندھے پن کی حالت میں ۶۲۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

دو مسلم قائدین جو ایک دوسرے کو قبر میں پہنچانا چاہتے تھے خود قبر میں پہنچ گئے۔ خوارزم شاہ خطبہ کی موقوفی کے دو سال بعد اور ناصر لدین اللہ حملہ کروانے کے چار سال بعد۔

تعصّب کی حد

جار اللہ زمخشری (۵۳۸ - ۴۶۷ھ) ایک معتزلی عالم تھے۔ معتزلہ سے عام مسلمانوں کا اختلاف اتنا بڑھا کہ وہ ان کی کتابوں کے دشمن ہوگئے۔ فرقہ معتزلہ میں کثرت سے علماء تھے اور انھوں نے بہت بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں مگر ان کی تمام کتابیں جلادی گئیں۔ اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ زمخشری کا ہے۔ زمخشری اگرچہ معروف معتزلی تھا۔ تاہم اس کی دو کتابیں المفصل (نحو) اور الکشاف (تفسیر قرآن) آج بھی موجود ہیں اور علمائے اہل سنت کے درمیان بدستور مقبول ہیں۔ اور علمی مرجع کے طور پر کام دیتی ہیں۔

اسی طرح ابن منظور (۶۳۰ - ۷۱۱ھ) ایک شیعہ تھا۔ شیعی گروہ اور اہل سنّت کے درمیان ایک ہزار سال سے زبردست اختلافات موجود ہیں۔ آج تک ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شیعہ علماء کی کتابیں صرف شیعہ فرقہ کے درمیان رائج ہیں۔ سنّی علماء ان کو دیکھتے ہیں تو تردید کے لئے نہ کہ استفادہ کے لئے۔ مگر یہاں بھی بعض استثناء ہیں۔ مثلاً ابن منظور کی کتاب لسان العرب (لغت) کو علماء اہل سنّت کے درمیان خصوصی مقام حاصل ہے اور اہل علم عام طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

زمخشری کا اعتزال اور ابن منظور کی شیعیت ان کی کتابوں کو علماء اہل سنّت کے درمیان مقبول بنانے میں حارج نہ ہوسکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بعض اہم موضوعات پر ایسی قیمتی کتابیں لکھیں جن کے مثل اس خاص موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہ تھی۔ ان کی مقبولیت ان کے امتیازی عمل کی قیمت ہے۔ بعض آدمی کا کام اتنا بلند ہوجاتا ہے کہ اعتقادی اختلافات ان کو قبول کرنے میں حارج نہیں ہوتے۔

زندگی کے معاملات کو سمجھنے کے لئے جن لوگوں کو صرف "تعصّب" کا لفظ معلوم ہے انھیں ایک اور حقیقت کی خبر نہیں۔ وہ یہ کہ تعصب کے عمل کی بھی ایک حد ہے۔ ایک حد کے بعد تعصب غیر موثر ہوجاتا ہے یہ حد ہے "امتیاز"۔

اگر آپ اپنی کارکردگی کو عام معیار سے بڑھا کر امتیاز کے درجہ میں پہنچا دیں تو تعصّب کی دیواریں اپنے آپ گر جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا دشمن بھی آپ کا اتنا ہی قدر داں بن جاتا ہے جتنا آپ کا دوست۔

کیسی عجیب غفلت

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴-۱۸۷۲) ایک نومسلم تھے۔ وہ پنجاب کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن سے غیر معمولی ذہین تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام "عبید اللہ" اس لئے رکھا کہ وہ اس سلسلے میں سب سے پہلے جس کتاب سے متاثر ہوئے وہ "تحفۃ الہند" تھی جس کے مصنف کا نام "عبید اللہ" ہے۔

اس کتاب میں اسلام کا تقابل دوسرے مذاہب سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سکھ مذہب اور ہندو دھرم سے غیر مطمئن ہوگئے۔ اس کتاب نے ان کے اندر اسلام کی طرف ابتدائی رجحان پیدا کر دیا۔ تاہم ابھی وہ قطعی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ بعد کو انھوں نے بتایا کہ "میں سوچتا تھا کہ اسلام بت پرستی کے خلاف ہے۔ مگر مسلمان اپنے بزرگوں کی قبروں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی تو ایک طرح کی بت پرستی ہے"۔ یہ سوال ان کے لئے اسلام قبول کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

اپنے دل کی یہ کھٹک انھوں نے کچھ مسلمانوں سے بیان کی۔ چنانچہ ایک مسلمان نے انھیں شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" دی اور اس کو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اس کتاب کا موضوع شرک کی مختلف صورتوں کی تردید اور توحید کا اثبات ہے۔ انھوں نے جب اس کتاب کو پڑھا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اسلام توحید خالص کا دین ہے۔ انھوں نے جانا کہ مسلمانوں کی قبر پرستی مسلمانوں کے اپنے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ قبر پرستی کا بھی ویسا ہی مخالف ہے جیسا وہ بت پرستی کا مخالف ہے۔

ان دو کتابوں کے مطالعہ کے بعد ان کا نظریاتی سفر بڑی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ تاہم آبائی مذہب کو چھوڑ کر نئے مذہب کی طرف بڑھنے کے لئے جس طاقت ور محرک کی ضرورت ہے وہ ابھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ کام ایک اور کتاب کے مطالعہ سے انجام پاگیا۔ یہ "احوال الآخرت" تھی۔ اس کتاب میں قیامت کی ہولناکی اور جنت دوزخ کی باتیں درج ہیں۔ پچھلی کتابوں کے مطالعہ سے اگر ان کا دماغ ہلا تھا تو آخری کتاب کے مطالعہ سے ان کا دل ہل گیا اور انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔

یہ تینوں کتابیں جن کا ذکر ہوا وہ اردو کتابیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۵۰ سال یا ۱۰۰ سال پہلے کے ہندستان میں یہ ممکن تھا کہ اردو زبان کو غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ کیسا عجیب اور کیسا قیمتی امکان تھا جس کو ہمارے تمام اصاغر واکابر نے بے فائدہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں کھو دیا۔ قانون قدرت کے مطابق اس کی سزا ہمیں یہ ملی ہے کہ اب غیر مسلموں میں دین پہنچانے کے لئے ہمیں کئی اجنبی زبانوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کرنا ضروری ہو گیا ہے اور اردو زبان کا یہ حال ہوا ہے کہ غیر مسلم تو درکنار اب خود مسلم نسلوں تک بھی اس کے ذریعہ دین کا پیغام پہنچانا ممکن نہیں۔ جو کام پہلے صرف ایک زبان کے ذریعہ ہو سکتا تھا اس کے لئے اب ہم کو کئی زبانوں کی ضرورت ہے۔

آزادی کے بعد ہندستان کے مسلمانوں کی جدوجہد کا کم ازکم ایک نمایاں عنوان اردو رہا ہے۔ اردو کے خاتمہ کا مرثیہ پڑھنا ہمارے تمام لیڈروں کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ جب آزادی ہند سے پہلے ملک کی سب سے زیادہ عام زبان اردو تھی تو آزادی ہند کے بعد وہ یہاں اجنبی کیسے بن گئی۔

زبان ان چیزوں میں سے ہے جس کا تسلسل اگر تاریخ میں ایک بار قائم ہو جائے تو اس کو توڑنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ تسلسل قائم ہونے کے بعد وہ خود اپنے زور پر قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بہت بڑا اجتماعی بھونچال ہی اس کو توڑ سکتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں اس کا تسلسل تاریخ میں جاری رہے گا۔ وہ ختم نہیں ہو سکتا۔

ہندستان میں اردو کے خاتمہ کے واحد ذمہ دار خود مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے اس ملک میں دو قومی سیاست چلائی اور اس کو اس اجتماعی بھونچال تک لے گئے جس کا دوسرا نام تقسیم ہے۔ تقسیم ملک کا بھونچال ہی دراصل وہ واقعہ ہے جس نے اردو کے تسلسل کو ہندستان میں ختم کر دیا۔ اگر مسلمانوں کی احمقانہ سیاست سے یہ بھونچال پیش نہ آتا تو ناممکن تھا کہ اس ملک میں اردو کا اس طرح خاتمہ ہو جائے جو آج ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر آتا ہے۔

اس کی ایک مثال ہندستان کی فلمی صنعت ہے۔ ہندستانی فلموں کی دنیا میں اردو زبان آج بھی زندہ ہے جب کہ ملک کے بقیہ حصہ میں وہ موت سے دوچار ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "فلم" کی حیثیت ہر ملک میں اور اسی طرح ہندستان میں بھی، ایک جزیرہ کی ہے۔ فلم کی دنیا عام طور پر سیاسیات اور قومی ہنگاموں سے الگ الگ زندہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی فلموں کے جزیرہ میں اردو آج بھی "پہلے کی طرح" زندہ ہے۔ جب کہ بقیہ ملک میں وہ اپنی سابقہ حیثیت کھو چکی ہے۔

غیر علمی طریقہ

فون کریمر اور گولڈ زیہر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ایک عجیب وغریب موضوع پر بحث کی۔ اور وہ یہ کہ ——— ''کیا عجمی لوگ جنت میں عرب عورتوں سے نکاح کریں گے'' یہ مستشرقین اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی فتوحات کے پیچھے صرف یہ جذبہ تھا کہ عربوں کی سیادت غیر عرب اقوام پر قائم ہو۔ ان کا یہ جذبہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھیں یہ پسند نہیں آیا کہ جنت میں کوئی عرب خاتون کسی عجمی مسلمان کی بیوی بنے۔

یہ قصہ المبرد نے کتاب الکامل میں نقل کیا ہے۔

جو شخص اس عبارت کو پڑھے گا وہ بادی النظر میں یہی سمجھے گا کہ مسلمانوں میں سے ایک بڑے گروہ نے اس موضوع پر بحث کی۔ اور جن لوگوں نے یہ بحث کی وہ یقیناً فقہاء ہوں گے۔ کیوں کہ یہ موضوع فقہ سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن اگر آپ مستشرق کے بیان کو کافی نہ سمجھیں بلکہ خود اس کے ماخذ کی تحقیق کریں تو آپ پر ایک عجیب انکشاف ہوگا، اب آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ ''لوگ'' جنھوں نے اس موضوع پر بحث کی کہ غیر عرب مرد اور عرب عورتوں کے درمیان جنت میں نکاح ہوگا یا نہیں، وہ صرف ایک اعرابی تھا جو بادیہ سے آیا تھا۔ یعنی ایک معمولی شخص نہ کہ کوئی جماعت۔

اصمعی جو لغت کی تحقیق کے سلسلہ میں اہل بادیہ سے خاص دلچسپی لیتا تھا، اس نے ایک اعرابی کو ایسا کہتے ہوئے سنا۔ وہ دوسرے آدمی سے کہہ رہا تھا کہ تمھارا کیا خیال ہے، کیا یہ اعاجم جنت میں عرب عورتوں سے نکاح کریں گے۔ دوسرے آدمی نے جواب دیا: خدا کی قسم ہاں، عمل صالح کے ذریعہ (اتری ھذہ العجم تنکح نساءنا فی الجنة۔ فقال اری ذالك واللہ بالعمل الصالح) اس قصہ کو مبرد نے اپنی کتاب میں تفنن کے طور پر نقل کر دیا۔ (الکامل للمبرد، جلد ۲، فصل الموالی عند العرب)

اس قسم کا استدلال واضح طور ایک انفرادی واقعہ کو عمومی بنانا ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام علماء جانتے ہیں کہ کسی واحد واقعہ کو عمومی بنا کر پیش کرنا سراسر غیر علمی طریقہ ہے۔ مگر اسی غیر علمی طریقہ کو انھوں نے اس وقت علمی سمجھ لیا جب کہ اس سے ان کا نام نہاد مقصد حاصل ہو رہا تھا۔

حقیقت حج

اکتوبر ۱۹۸۲ میں فریضۂ حج کے بارہ میں ایک مقالہ بعنوان ''حقیقت حج'' چھپا تھا۔ اب اس مقالہ کو علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ قیمت ——— پچھتر پیسے

عبرت ناک

قاضی نذرالاسلام بنگلہ زبان کے مشہور شاعر تھے۔ ٹیگور (۱۹۴۱-۱۸۶۱) کو جب نوبل انعام ملا تو نذرالاسلام نے ان کو مبارک باد کا خط بھیجا۔ اس کے جواب میں ٹیگور نے جو خط لکھا تھا وہ ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے۔ اس میں ٹیگور نے نذرالاسلام کو لکھا: نوبل انعام کے اصل مستحق تم تھے، میں نہیں۔

نذرالاسلام نہایت پرجوش انقلابی شاعر تھے۔ وہ آزادی کی حمایت میں اور انگریزی استعمار کے خلاف شعلہ بار نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس سے نوجوانوں میں آزادی کے جذبات بھڑکتے تھے۔ چنانچہ انگریزی حکومت نے نذرالاسلام کو گرفتار کرکے رانچی کے جیل میں قید کر دیا۔ وہاں ان کو جس کمرہ میں رکھا گیا وہ قلم، سیاہی اور کاغذ جیسی چیزوں سے بالکل خالی تھا۔ ان کے لئے بظاہر ناممکن بنا دیا گیا کہ وہ کچھ لکھ سکیں۔

قاضی نذرالاسلام کے دماغ میں آزادی کے ترانے ابلتے تھے مگر وہ اپنے قید کے کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے تھے جس سے وہ ان کو لکھ سکیں۔ بالآخر انھوں نے یہ کیا کہ شیو بنانے کے بلیڈ سے اپنی انگلی کو زخمی کیا جس کے نتیجہ میں انگلی سے خون جاری ہوگیا۔ اب انھوں نے اپنی انگلی کو قلم بنایا اور خون کو روشنائی اور پھر جیل کی دیواروں پر آزادی کے اشعار لکھ ڈالے۔

یہی واقعہ ہے جس کے بارے میں جوش ملیح آبادی نے اپنا یہ شعر کہا ہے:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے زبردست قربانیاں دی ہیں۔ مگر یہ تمام قربانیاں حقیقۃً قوم اور وطن اور سیاست کی راہ میں تھیں۔ اپنے سیاسی جذبات کے اظہار کے لئے انھوں نے اپنے خون کو روشنائی بنا ڈالا۔ اور قومی مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے اپنے جان و مال کو لٹا دیا۔ مگر پوری جدید تاریخ میں کوئی بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے دعوت کی راہ میں اپنے آپ کو ہلکان کیا ہو۔

مسلمان کا اصل مقصد اقوام عالم تک خدا کے پیغام کو پہنچانا ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ چھوڑ رکھا ہے۔ وہ سب کچھ کرتے ہیں مگر اسی ایک کام کو نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں ان کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو "دعوت" کا نام دیدیتے ہیں۔ یہی واحد سب سے بڑی کوتاہی ہے جس کی بنا پر مسلمان موجودہ زمانہ میں خدا کی نصرت کے مستحق نہ ہو سکے۔

اظہار دین

هوالذی ارسل رسولہٗ بالهدی ودین الحق لیظهرهٗ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون

اللہ نے اپنا رسول بھیجا ہدایت اور سچا دین لے کر تاکہ اس کو سب دینوں سے اوپر کر دے، اگرچہ شرک کرنے والے کتنا ہی ناخوش ہوں۔

یہ آیت قرآن میں تین مقامات پر آئی ہے (التوبہ، الفتح، الصف) اس سے مراد فکری غلبہ ہے نہ کہ اسلام کے تمام قوانین کو نافذ کر دینا۔ کیونکہ آیت میں اظہار کا لفظ ہے نہ کہ نفاذ کا۔

اظہار کے لفظ میں ظہور اور غلبہ کا مفہوم ہے۔ قرآن میں ہے واظهرہ اللہ (التحریم ۳) یعنی خدا نے چھپی بات کو ظاہر کر دیا۔ فلا یظهر علی غیبہ احدا (الجن ۲۶) یعنی خدا کے غیب پر کوئی مطلع نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا دوسرا مفہوم غلبہ ہے۔ قرآن میں ہے یا قوم لکم الملك الیوم ظاهرین فی الارض (غافر ۲۹) یعنی تمہارے پاس اقتدار ہے اور تم زمین میں برتری رکھتے ہو۔ فاید نا الذین آمنوا علی عدوهم فاصبحوا ظاهرین (الصف ۱۴) یہ آیت حضرت مسیح کے پیرووں کے بارہ میں ہے ان کو یہود پر خدا کی مدد سے غلبہ مل گیا۔ یہ غلبہ کبھی بھی اس معنی میں نہیں تھا کہ حضرت مسیح کی شریعت کے تمام قوانین یہود کے اوپر نافذ ہو گئے ہوں۔ یہ صرف اس معنی میں تھا کہ حضرت مسیح کے بعد جب مسیحی مذہب پھیلا اور بالآخر رومی بادشاہ قسطنطین اعظم مسیحی ہو گیا تو رومن امپائر کے باشندے کثرت سے مسیحی بن گئے۔ اس طرح ہر جگہ مسیحیوں کی اکثریت ہو گئی اور وہ یہودیوں کے اوپر چھا گئے۔

"اظہار" کا لفظ نہ باعتبار لغت نفاذ قانون یا اقامت نظام کے معنی میں ہے اور نہ قرآن میں کسی مقام پر وہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خود مذکورہ آیت میں لیظهرہ علی الدین (دین پر غالب کر دے) فرمایا گیا ہے۔ لیظهرہ علی الناس (لوگوں کے اوپر غالب کر دے) نہیں فرمایا گیا۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قوانین انسان کے اوپر نافذ ہوتے ہیں نہ کہ دین یا ادیان کے اوپر۔

خدا کا یہ منصوبہ تھا کہ "مشرکین" نے خدا اور رسول کے نام پر جو خود ساختہ مذاہب بنا رکھے ہیں ان کو مغلوب کر کے دین اسلام کو ان کے اوپر فکری اور تاریخی حیثیت سے غالب کر دیا جائے۔ یہ کام پیغمبر اسلام کے ذریعہ مکمل طور پر انجام پا یا گیا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

روپیہ سے راکھ تک

گھنشیام داس برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) ہندستان کے مشہور ترین صنعت کار تھے۔ ان کی اعلیٰ کامیابی کا راز ان کی بے حد با اصول زندگی تھی۔ انھوں نے ۱۲ سال کی عمر میں معمولی کاروبار سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر وہ عظیم ترقی تک پہنچے آج ان کا خاندان ہندستان کا واحد سب سے بڑا کاروباری خاندان ہے۔

مسٹر برلا کا معمول تھا کہ صبح ۵ بجے اٹھتے اور شام ۹ بجے تک مسلسل کام میں مشغول رہتے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ شراب کے بجائے کافی پیتے تھے۔ دو کھانے کے درمیان پانی کے سوا اور کچھ نہیں لیتے تھے۔ اکثر اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے پکاتے۔

مسٹر برلا روزانہ صبح کو ٹہلنے کے لئے نکلتے تھے۔ اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، خواہ وہ ہندستان میں ہوں یا ہندستان کے باہر۔ ۱۱ جون ۱۹۸۳ کو وہ لندن میں تھے۔ وہ حسب معمول صبح کے ناشتہ کے بعد ریجنٹ اسٹریٹ پر ٹہلنے کے لئے نکلے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد انھیں تکلیف محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنے دو مددگاروں کو بتایا جو اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ وہ انھیں فوراً گھر واپس لائے۔ گھر آتے ہی وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد انھیں لندن کے مڈل سکس اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال میں انھیں تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا۔ وہاں انھوں نے کہا ——— ڈاکٹر، مجھے کیا تکلیف ہے۔

What is wrong with me, Doctor ?

ڈاکٹروں نے کہا۔ ہم پانچ منٹ میں معائنہ کر کے بتاتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ ڈاکٹروں کا معائنہ مکمل ہو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مسٹر برلا کی وصیت تھی کہ جہاں میرا انتقال ہو وہیں میرے آخری مراسم ادا کئے جائیں۔ چنانچہ مسٹر برلا کی لاش کو لندن میں بجلی کے ذریعہ جلا دیا گیا۔ اور ان کی راکھ ہندستان لا کر یہاں کی ندیوں میں بہا دی گئی۔ مسٹر برلا کی اسکول میں تعلیم نہیں ہوئی۔ تاہم بعد کو انھوں نے ذاتی محنت سے اپنے اندر لیاقت پیدا کی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بنے۔ ان کی ایک کتاب کا ہندی نام ہے ——— روپیہ کی کہانی۔

مسٹر برلا نے "روپیہ کی کہانی" لکھی، حالانکہ بالآخر وہ خود "راکھ کی کہانی" بننے والے تھے۔ یہی ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی اپنی کامیابی کی داستان لکھ رہا ہے۔ حالانکہ آخر کار وہ جہاں پہنچنے والا ہے وہ مکمل بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

حقیقت انسانی

سب سے بڑی نیکی حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ اس دنیا میں سارا اختیار صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان بالکل عاجز اور بے بس ہے۔ مگر اس دنیا میں انسان کو بظاہر ایسے حالات میں رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح آزاد اور خود مختار محسوس کرے۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ جو آدمی حقیقی صورت حال کو سمجھے اور اس کا اعتراف کر کے خدا کے آگے جھک جائے، وہ قابل انعام ٹھہرا۔ اس کے برعکس جو آدمی امتحانی پردے کو پھاڑنے میں کامیاب نہ ہوا اور خدا کی بڑائی کے آگے اپنے کو نہ جھکائے وہ مجرم ہے۔ ایسا شخص عنقریب سخت ترین عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

دنیا میں وہ مسئلہ ہمیشہ بہت بڑے پیمانے پر پایا گیا ہے جس کو خرابی کا مسئلہ (Problem of evil) کہا جاتا ہے۔ انسان کے ساتھ موجودہ دنیا میں بے شمار قسم کے دکھ لگے ہوئے ہیں۔ ایک شخص تندرست و توانا ہے اور اچانک موت آکر اس کو دبوچ لیتی ہے۔ ایک شخص کے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے اور اس کے شاندار جسم کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اسی طرح بیماریاں، قحط، زلزلے اور طرح طرح کی آفتیں انسان کے منصوبوں کو اس طرح تہس نہس کرتی رہتی ہے۔ جیسے ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

بظاہر یہ بڑا بے رحمی کا معاملہ ہے۔ مگر اس کے اندر زبردست حکمت چھپی ہوئی ہے۔ یہ تمام ناخوشگوار واقعات اس لئے پیش آتے ہیں کہ انسان کی آنکھ کھولیں۔ وہ انسان کو یاد دلائیں کہ بظاہر با اختیار ہونے کے باوجود وہ کس قدر بے بس ہے۔ سب کچھ کا مالک ہونے کے باوجود وہ کتنا زیادہ بے کچھ ہے۔ یہ خرابیاں دراصل بڑی قیامت سے پہلے چھوٹی قیامت ہیں۔ اس طرح ظواہر کا پردہ پھاڑ کر انسان کو اصل حقیقت کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ قیامت میں جو پردہ مکمل طور پر پھاڑا جانے والا ہے وہ حادثات کے ذریعہ جزئی طور پر پھاڑ دیا جاتا ہے۔

دنیا کی مصیبتیں انسان کو اس کی بے بسی کی یاد دلاتی ہیں۔ وہ اس کو ذہنی طور پر اس قابل بناتی ہیں کہ وہ حقیقت واقعہ کو پالے اور اس کو مان کر خدا کے انعامات کا مستحق بنے۔ آنے والی ابدی دنیا میں انسان حقیقی طور پر آزاد اور خود مختار ہوگا۔ وہاں وہ ہر قسم کے دکھ اور غم سے مکمل طور پر محفوظ رہے گا۔ مگر یہ درجہ کسی کو بطور انعام ملے گا نہ کہ بطور استحقاق۔ جس نے اپنے عجز کو جان لیا وہی اس قابل ہے کہ اس کو آزادی کی نعمت عطا ہو۔ جو اپنی بے اختیاری پر راضی ہوگیا اسی نے اس اہلیت کا ثبوت دیا کہ خدا اس کو اپنی معیاری دنیا میں با اختیار بنا کر رکھے۔

روحانی تہذیب

بچوں کا ایک کھیل ہوتا ہے جس کا نام جگسا پزل (Jigsaw Puzzle) ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کی مکمل تصویر کو الگ الگ ٹکڑوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ یہ گتہ یا پلاسٹک یا لکڑی کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یہ مختلف انداز کے ٹکڑے بچوں کو دے دئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کو اس طرح جوڑ دو کہ فلاں چیز (مثلاً اونٹ) کی صورت بن جائے۔ جو بچہ ٹکڑوں کو جوڑ کر مطلوبہ صورت بنا لے وہ کامیاب کہا جاتا ہے اور جو بچہ مطلوبہ صورت نہ بنا سکے وہ ناکام قرار پاتا ہے۔

ایک اسکول میں بچوں کو جانچنے کے لئے اسی قسم کا ایک کھیل دیا گیا۔ اس میں موٹے گتہ کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ ان کو جوڑ کر ہندستان کا نقشہ بنانا تھا۔ بچے ٹکڑوں کو ادھر ادھر جوڑتے رہے۔ مگر ہندستان کی مکمل تصویر کسی طرح نہ بن پاتی تھی۔ آخر ایک طالب علم کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "ممکن ہے ان ٹکڑوں میں کہیں کوئی اشارہ موجود ہو" یہ سوچ کر اس نے ایک ٹکڑے کو الٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ہلکی سیاہی سے "آسام" لکھا تھا۔ اب اس کو ایک سراغ مل گیا۔ اس کے بعد اس نے مزید ٹکڑے الٹے تو ہر ایک پر ملک کی کسی نہ کسی ریاست کا نام دھندلے حروف میں درج تھا۔ اب وہ راز کو سمجھ گیا۔ اس نے جان لیا کہ ہر ٹکڑا کسی نہ کسی متعین ریاست کی نمائندگی کر رہا ہے۔

بچہ کے ذہن میں ہندستان کے مجموعی نقشہ کا تصور پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اس اجمالی تصور کے مطابق ٹکڑوں کو جوڑنا شروع کیا۔ اب فوراً ہی ہندستان کا نقشہ بن کر تیار تھا۔ یہ طالب علم کامیاب ہوا اور بقیہ تمام طالب علم ناکام قرار دیدئے گئے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اس دنیا کا ہے جس کے بنانے والے نے اس کو بنا کر انسان کو یہاں رکھا ہے۔ یہ دنیا بھی ایک قسم کا جگسا پزل کا کھیل ہے۔ انسان کا امتحان یہی ہے کہ وہ یہ کھیل کھیلے اور اس میں کامیابی حاصل کرے۔

انسان کو مشین کی ضرورت تھی۔ اس کو خود کار سواریوں کی ضرورت تھی۔ اس کو آرام دہ مکانات کی ضرورت تھی۔ اس کو بے شمار دوسری مادی چیزیں درکار تھیں۔ مگر قدرت نے ایسا نہیں کیا کہ ان چیزوں کو بنا بنایا آسمان سے اتار دے۔ اس دنیا میں ہوا اور پانی اور روشنی جیسی چیزیں تو موجود ہیں مگر ٹائپ رائٹر موٹر کار اور رہائشی بنگلے کہیں تیار شدہ حالت میں موجود نہیں۔ ان چیزوں کو آدمی خود بنا کر تیار کرتا ہے۔

ان کو بنانے کی صورت کیا ہوتی ہے وہ یہ کہ قدرت نے ان کے تمام اجزا خام شکل میں زمین پر پھیلا دیئے۔ کچھ چیزوں کو زمین کے نیچے دفن کر دیا۔ یہ گویا ایک عظیم جگسا پزل کے بہت سے ٹکڑے ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اب انسان کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ ان کو تلاش کر کے حاصل کرے اور ان کو جوڑ کر بامعنی چیزیں بنائے۔

جدید مادی تہذیب کی صورت میں انسان نے بے شمار نئی نئی چیزیں بنائی ہیں۔ یہ سب چیزیں اگرچہ مکمل طور پر ہماری اس دنیا کے سامانوں سے بنی ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی موجودہ تکمیلی صورت میں کہیں موجود نہیں تھی۔ انسان نے ان کے مختلف بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کیا اور لمبے تجربے کے بعد ان کو جگسا پزل کی طرح جوڑ کر بامعنی چیزوں کی صورت میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی عمل کے نتائج ہیں جن کو ٹیلی فون، کار اور فرنیچر کہتے ہیں۔

یہ ہماری مادی تہذیب کا معاملہ تھا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری روحانی تہذیب کا بھی ہے۔ دونوں جگہ قدرت نے ایک ہی نمونہ کو ہمارے لئے پسند کیا ہے۔ روحانی دنیا کی تعمیر کا معاملہ بھی ایک قسم کے جگسا پزل کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا کی تعمیر کے لئے قدرت نے ہمارے چاروں طرف مادی ٹکڑے بکھیرے تھے۔ یہاں قدرت نے اسی طرح بہت سے معنوی ٹکڑے ہمارے چاروں طرف بکھیر دئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہر ٹکڑے پر مخفی اشارات بھی درج ہیں۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ان اشارات کو پڑھے اور ان کے مطابق مختلف ٹکڑوں کو اپنے اپنے مقام پر جوڑ کر صحیح اور بامعنی تصویر بنائے۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ آدمی کو بہر حال یہاں اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ ان ٹکڑوں پر لکھے ہوئے مخفی اشاروں کو پہچانے اور ان کے مطابق بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر مطلوبہ تصویر بنائے۔ مادی تہذیب کی تعمیر میں اگر انسان قدرت کے اس نہج کی پیروی نہ کرتا تو اس کو کبھی جدید طرز کا جگمگاتا ہوا شہر دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر وہ روحانی تہذیب کی تعمیر میں سنجیدگی کے ساتھ اس نہج کی پیروی نہ کرے تو اس کے لئے یہاں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

انسان کی تمام گمراہیاں اسی مخصوص جانچ میں ناکام ہونے کا نتیجہ ہیں۔ انسان مادی تہذیب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ان کا جگسا پزل بنانے کے معاملہ میں انتہائی سنجیدہ تھا اس لئے وہاں وہ پوری طرح کامیاب ہوا۔ اس کے برعکس روحانی تہذیب کے معاملہ میں وہ پوری طرح سنجیدہ نہیں۔ اسی لئے اس دوسرے میدان میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان صحیح طور پر اپنا جگسا پزل بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

شرک، الحاد اور دوسرے تمام غلط قسم کے فکری نظام اسی لئے وجود میں آئے کہ انسان قدرت کے مختلف ٹکڑوں پر لکھے ہوئے اشارات کو پڑھ نہ سکا اور ان کو اِدھر کا اُدھر اور اُدھر کا اِدھر جوڑ دیا۔ مثال کے طور پر مظاہر کائنات میں تنوع کو دیکھ کر اس نے خدائی میں تنوع کا عقیدہ قائم کر لیا۔ اس نے کہا کہ جب چیزیں کئی ہیں تو ان کے خدا بھی کئی ہونے چاہئیں۔ حالانکہ مظاہر کائنات میں تنوع خدا کی صفات میں تنوع کی علامت تھی نہ کہ خود خدائی میں تنوع کی علامت۔ اسی طرح کائنات میں نظام تعلیل ((Causatian)) کی دریافت کو اس نے خدا کی دریافت کے ہم معنی سمجھ لیا۔ حالانکہ وہ خدا کے طریق کار کی دریافت کے ہم معنی تھا نہ کہ خود خدا کی دریافت کے ہم معنی، وغیرہ۔

اب دیکھئے کہ ان ٹکڑوں پر کس قسم کے اشارات لکھے ہوئے ہیں اور کس طرح انھیں بامعنی طور پر جوڑا جاسکتا ہے۔ جب ہم اس نظر سے انسان اور کائنات کے معاملہ پر غور کرتے ہیں تو مختلف رہنما چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً ہنسی۔ اس کائنات میں صرف ایک انسان ہے جو ہنستا ہے۔ ہنسنے کی طاقت ہوا اور پانی، جنگل اور پہاڑ، چاند اور ستارے، کسی چیز میں نہیں۔ حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں میں بھی نہیں۔ ہنسنا انسان کی انتہائی امتیازی خصوصیت ہے۔ ہنسنا شعوری لذت کی علامت ہے اور لذت کا شعور انسان کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری معلوم کائنات میں انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے لئے ہنسی (بالفاظ دیگر خوشی) مقدر کی گئی ہے۔ انسان کے سوا کوئی بھی دوسری مخلوق ایسی نہیں جو ہنسے اور خوشی منائے۔

اس کے بعد جب ہم مزید غور کرتے ہیں تو ہمیں اس جگسا پزل کا ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہاتھ آتا ہے۔ اور وہ لذّت ہے۔ یہاں بھی ہم پاتے ہیں کہ انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو لذّت کو جانتا ہے۔ کھانا، پینا، ازدواجی تعلقات وغیرہ بظاہر انسان اور جانوروں میں مشترک ہیں۔ مگر جانوروں کے لئے ان چیزوں میں کوئی لذّت نہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں جبلت اور ضرورت کے لئے کرتے ہیں نہ کہ لذت لینے کے لئے۔ اس کے برعکس انسان جب کھاتا پیتا ہے، جب وہ ازدواجی تعلّق قائم کرتا ہے تو وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لطف و لذّت انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ کسی بھی دوسری مخلوق کو یہ چیز حاصل نہیں۔

مذکورہ اشارات نے ہمیں کائناتی جگسا پزل کے دو ٹکڑوں کی طرف رہنمائی کی۔ ایک ہنسی اور دوسرے لذّت۔ اس سے ہم نے جانا کہ انسان کی فطرت کے اعتبار سے اس کی کامیابی یہ ہوگی کہ اس کو خوشی ملے، وہ لذّت کا مالک بن سکے۔

اس کے بعد ہم مزید مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے علم میں ایک اور ٹکڑا آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہنسی

ر لذّت کے احساسات اگرچہ صرف انسان کو ملے ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں کوئی انسان ان کو پورے طور پر
سل کرنے پر قادر نہیں۔ یہاں کی محدودیتیں (Limitations) فیصلہ کن طور پر انسان کی راہ میں
ل ہیں۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، موت اور اسی طرح اپنے اندر اور باہر کی دوسری کمیاں ہماری دنیا
ا زندگی کو بے مسرت اور بے لذت کر دیتی ہیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں ان کو ہم موجودہ دنیا میں حاصل
ہیں کر پاتے۔

یہاں پہنچ کر جب ہم مزید غور کرتے ہیں تو ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ اور
انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ تمام معلوم چیزوں میں وہی ایک ایسی مخلوق ہے جو کَل (Tomorrow) کا
سور رکھتا ہے۔ سورج آج ڈوبتا ہے اور کل طلوع ہوتا ہے۔ مگر سورج کو کل کا شعور نہیں۔ چیونٹی
لے موسم کے لئے خوراک جمع کرتی ہے اور بیا اپنی آئندہ نسل کے لئے گھونسلے بناتا ہے۔ مگر چیونٹی یا بیا
سب کچھ جبلت (Instinct) کے تحت کرتے ہیں نہ کہ "کَل" کے تصور کے تحت۔

تمام موجودات میں "کل" کا تصور صرف انسان کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا
ہے کہ کل کی کامیابی صرف انسان کے لئے خاص ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز ہم چاہتے ہیں اور
نی محدودیتوں کی وجہ سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے وہ ہمارے لئے کل کے دن (بالفاظ دیگر مستقبل
ں) مقدر کی گئی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہم اپنی اس طلب کا صرف جزئی تعارف حاصل کرتے ہیں۔
ں کو ہم کامل طور پر صرف کل کے دور میں پائیں گے۔

یہاں پہونچ کر ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہماری رہنمائی کرتا ہے اور وہ نیند ہے۔ ہر آدمی پر
ند طاری ہوتی ہے۔ وہ بے خبر ہو کر سو جاتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ آدمی کا جسم ایک قسم کی
وت کی آغوش میں ہوتا ہے اس کا ذہن (یا روح) پوری طرح زندہ ہوتا ہے۔ آدمی کا ذہن اس
قت بھی سوچتا ہے۔ وہ سفر کرتا ہے۔ وہ فیصلے کرتا ہے۔ گویا جسمانی موت کے باوجود انسان کا ذہنی
جود پوری طرح زندہ رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی نہ صرف کل کا تصوّر رکھتا ہے بلکہ وہ کل کے
ن تک زندہ موجود بھی رہتا ہے۔ موت کے باوجود وہ ختم نہیں ہوتا۔ آدمی کی زندگی ایک ایسا تسلسل
ہے جو "آج" سے لے کر "کل" تک چلا گیا ہے۔

اب ہماری تصویر حیات ایک حد تک پوری ہو چکی ہے۔ تاہم ایک چیز ابھی باقی ہے۔ وہ
یہ کہ کل کا دن کس کے لئے کیا ہوگا اور کس کے لئے کیا نہیں ہوگا۔ یہاں جب ہم اپنی تلاش جاری
رتے ہیں تو دوبارہ ہم کو جگسا پزل کا ایک اور اشاراتی ٹکڑا ملتا ہے، جو ہماری تصویر کو مکمل کر دیتا

معلوم کائنات میں یہ صرف انسان کی انفرادی خصوصیت ہے کہ وہ کسی چیز کو صحیح سمجھتا ہے اور کسی چیز کو غلط۔ حقیقت واقعہ کا اعتراف اس کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے اور حقیقت واقعہ کا انکار اس کے نزدیک سب سے بڑی بُرائی اسی طرح امانت اور خیانت، احسان مندی اور احسان فراموشی، سچ اور جھوٹ، وعدہ خلافی اور بے وفائی، انصاف اور ظلم، تواضع اور سرکشی، حق کی ادائیگی اور حق کی پامالی کے درمیان وہ فرق کرتا ہے۔ وہ ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے۔ یہ واقعہ انسان کے معاملہ کو دوسری مخلوقات کے معاملہ سے الگ کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی کامیابی اخلاقی معیار پر جانچی جائے گی جب کہ دوسری چیزوں کی کامیابی صرف مادی اعتبار سے دیکھی جاتی ہے۔

ہمارے جگسا پزل کا یہ آخری ٹکڑا ہماری تصویر کو بالکل مکمل کر دیتا ہے۔ اس کو ملانے کے بعد حیات انسانی کا جو کامل تصور بنتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ہی واحد مخلوق ہے جس کے لئے اس کے پیدا کرنے والے نے خوشی اور لذّت کو مقدّر کیا ہے۔ مگر یہ خوشی اور لذّت اس کو "آج" کی زندگی میں ملنے والی نہیں۔ یہ اس کو صرف "کل" کی زندگی میں ملے گی۔ تاہم یہ لازوال نعمت ہر آدمی کو اپنے آپ نہیں مل جائے گی۔ اس کے لئے اسے ایک امتحان میں کامیاب ہونا پڑے گا۔ وہ یہ کہ آدمی "آج" کی زندگی میں اس کے واقعی استحقاق کا ثبوت دے۔ وہ انکارِ حق سے بچے اور اقرارِ حق کی میزان پر پورا اُترے۔ وہ غلط روش کو چھوڑے اور صحیح روش کو اختیار کرے۔ وہ وقتی سطح پر جینے کے بجائے ابدیت کی سطح پر جئے۔ وہ صرف "آج" والا بن کر رہنے کے بجائے "کل" والا بن کر رہے۔ جو شخص ایسا کرے گا وہ آنے والی "کل" کی زندگی میں کامل انسان کے روپ میں ظاہر ہوگا۔ وہ اس خوشی اور لذّت کو ابدی طور پر پالے گا جس کا موجودہ زندگی میں اس نے صرف ابتدائی تعارف حاصل کیا تھا۔

مادی تہذیب وقتی دنیا کی تعمیر ہے اور روحانی تہذیب ابدی دنیا کی تعمیر۔ تاہم دونوں دنیاؤں میں کامیابی کا ایک ہی اصول ہے۔ قدرت کے متفرق اشاروں کو پڑھ کر ان سے ایک کامل نقشہ بنانا۔

موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں نے قدرت کے اشاروں کو نہیں پڑھا اور قدرت کے چھپے ہوئے مواقع کو اپنے حق میں استعمال نہیں کیا وہ پچھڑی ہوئی قومیں بن کر رہ گئیں۔ ان کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی سیاسی اور معاشی غلام بن کر رہ جائیں۔

اسی طرح آنے والی دنیا میں وہ لوگ کامیاب رہیں گے جنھوں نے اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل کی اور وہ لوگ برباد ہو کر رہ جائیں گے جو اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل نہ کر سکے۔ ہماری موجودہ زندگی ہماری اگلی زندگی کا تعارف ہے۔ انسان کا آج کا انجام اس کے کل کے انجام کو بتا رہا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا
حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ
مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ
لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ
اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ
اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے مجھ کو اچھا رزق بھی دیا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میں خود وہی کام کروں جس سے میں تم کو روک رہا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک ہو سکے۔ اور مجھے توفیق تو اللہ ہی سے ملے گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے۔ اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم، ایسا نہ ہو کہ میری ضد کرکے تم پر وہ آفت آپڑے جو قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آئی تھی، اور لوط کی قوم تو تم سے دور بھی نہیں۔ اور اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا رب مہربان اور محبت والا ہے۔
۸۸-۹۰

ماننے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے تقلیدی طور پر ماننا۔ دوسرا صحیح سمجھ کر ماننا۔ پہلی صورت میں آدمی کسی بات کو اس لئے مانتا ہے کہ لوگ اس کو مانتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ اس کو اس لئے مانتا ہے کہ اس نے خود دلیل کی بنیاد پر پایا ہے کہ وہ بات صحیح ہے۔ اول الذکر اگر رسمی اقرار ہے تو ثانی الذکر شعوری دریافت۔

حق کو دلیل (یا شعور) کی سطح پر پانا ہی مومن کا اصل سرمایہ ہے۔ اسی سے وہ زندہ یقین حاصل ہوتا ہے جب کہ آدمی ہر چیز سے بے پروا ہو کر لوگوں کے درمیان کھڑا ہو اور حق کی نمائندگی کر سکے۔ حق کی شعوری یافت ہر دوسری چیز کا بدل ہے۔ جس کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کو پھر کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عام آدمی "روٹی" پر جیتا ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو دلیل حق پر جیتا ہے۔ اس طرح کا رزق (شعوری یافت) ملنے کے بعد آدمی کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے۔

قول وعمل کا تضاد رسمی ایمان کا نتیجہ ہے اور قول وعمل کی یکسانیت شعوری ایمان کا نتیجہ۔

"شقاق" کی تشریح میں حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ میری دشمنی تم کو ایمان کا راستہ چھوڑ دینے پر نہ ابھارے کہ اس کے بعد تم کو وہ سزا ملے جو کافروں کو ملی (لا یحملنکم معاداتی علیٰ ترک الایمان فیصیبکم ما اصاب الکفار) القرطبی

داعی چونکہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو ایک عام انسان کی مانند نظر آتا ہے۔ اس لئے اس کی ناقدانہ باتوں سے وہ لوگ بگڑ اٹھتے ہیں جن کو ماحول میں اونچی حیثیت حاصل ہو۔ ایک معمولی آدمی کی یہ جرأت ان کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے کہ وہ ان پر اور ان کے بڑوں پر تنقید کرے۔ اس وجہ سے ان کے اندر داعی کے خلاف ضد اور نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔

کسی آدمی کے اندر اس قسم کی نفسیات کا پیدا ہونا اس کا نہایت کڑے امتحان میں مبتلا کیا جانا ہے۔ کیونکہ ایسا آدمی ایک شخص کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے اس کی طرف سے آنے والی خدائی بات کو بھی حقیر سمجھ لیتا ہے۔ وہ ایک انسان کو نظر انداز کرنے کے نام پر خود خدا کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾

انھوں نے کہا کہ اے شعیب، جو تم کہتے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے۔ اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ اور تم ہم پر کچھ بھاری نہیں۔ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے۔ اور اللہ کو تم نے پس پشت ڈال دیا۔ بے شک میرے رب کے قابو میں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور اے میری قوم، تم اپنے طریقہ پر کام کئے جاؤ اور میں اپنے طریقہ پر کرتا رہوں گا۔ جلد ہی تم کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کے اوپر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ اور انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں ۹۱ - ۹۳

حضرت شعیب کو حدیث میں خطیب الانبیاء کہا گیا ہے۔ آنجناب اپنی قوم کو اس کی اپنی قابل فہم زبان میں نہایت موثر انداز میں سمجھاتے تھے۔ پھر آپ کی بات اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم کا ذہنی

سانچہ بگڑا ہوا تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز اور تھا اور حضرت شعیب کے سوچنے کا انداز اور۔ اس بنا پر آنجناب کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

قوم انسانوں کی تعظیم میں گم تھی۔ آپ اس کو ایک اللہ کی تعظیم کی طرف بلاتے تھے۔ وہ خوش عقیدگی کو نجات کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھی، آپ کا کہنا تھا کہ صرف عمل کے ذریعہ نجات ہوسکتی ہے۔ قوم کا خیال تھا کہ وہ اپنے کو مومن کہتی ہے اس لئے وہ مومن ہے۔ آپ نے کہا کہ مومن وہ ہے جو خدا کی میزان میں مومن قرار پائے۔ قوم کے نزدیک نماز کی حیثیت بس ایک غیر موثر قسم کے رسمی ضمیمہ کی تھی۔ آپ نے اعلان کیا کہ نماز آدمی کی زندگی اور اس کے آمد و خرچ کی محاسب ہے۔ قوم سمجھتی تھی کہ ایمان بس ایک بے روح اقرار ہے، آپ نے بتایا کہ ایمان وہ ہے جو ایک زندہ شعور کے طور پر حاصل ہوا ہو۔

اس طرح حضرت شعیب اور ان کی قوم کے درمیان ایک قسم کا فصل (Gap) پیدا ہو گیا تھا۔ یہی ذہنی فصل قوم کے لئے آپ کی سیدھی اور سچی بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بنا رہا۔

"اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے"۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم کس قدر بے حس اور ظاہر پرست ہو چکی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ حضرت شعیب نے جب قوم کے دینی بھرم کو بے نقاب کیا تو قوم کے لوگ ان کے دشمن بن گئے۔ اس وقت حضرت شعیب کے ساتھ نہ عوام کی بھیڑ تھی جو لوگوں کو روکے اور نہ آپ دولت اور حیثیت کے مالک تھے جس کو دیکھ کر لوگ مرعوب ہوں۔ آپ کے پاس صرف صداقت اور معقولیت کا زور تھا اور ایسے لوگوں کے نزدیک صرف صداقت اور معقولیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

ایسی حالت میں وہ یقیناً آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیتے۔ تاہم جس چیز نے انھیں اس قسم کے اقدام سے روکا وہ قبیلہ کے انتقام کا اندیشہ تھا۔ قبائلی دور میں قبیلہ کے کسی فرد کو مارنے کا مطلب یہ تھا کہ قبائلی دستور کے مطابق پورا قبیلہ اس سے خون کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو جائے۔ یہ اندیشہ قوم شعیب کے لئے آپ کے خلاف کسی انتہائی اقدام میں مانع بن گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے موجودہ زمانہ میں شریر افراد کی شرارت سے اکثر اوقات لوگ اس لئے محفوظ رہتے ہیں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے کوئی جارحیت کی تو ان کو پولیس اور عدالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

اور جب ہمارا حکم آیا، ہم نے شعیب کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو کڑک نے پکڑ لیا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا کہ کبھی ان میں بسے ہی نہ

تھے۔ سنو، پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو۔ ۹۵-۹۴

حضرت شعیب کی قوم کے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مدین کے مالک ہیں جو چیز انھیں امتحان کی مصلحت کے تحت دی گئی تھی اس کو انھوں نے اپنا مستقل حق سمجھ لیا۔ اس احساس کے تحت انھوں نے آپ کے خلاف جارحانہ تدبیریں کیں۔ انھوں نے آپ کو یہ دھمکی بھی دی کہ ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے (الاعراف ۸۸) مگر وہی زمین جس کو وہ اپنی زمین سمجھتے تھے اور جس کے وہ مالک بنے ہوئے تھے۔ وہاں خدا کے حکم سے ہولناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زلزلہ آیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ پورا علاقہ تباہ ہوگیا۔ وہ خود اپنی دنیا میں اس طرح مٹ کر رہ گئے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔

البتہ قوم کے وہ افراد جنھوں نے حضرت شعیب کی بات مانی تھی اور آپ کے ساتھ ہوگئے تھے ان کو خصوصی نصرت سے بچالیا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ پھر وہ فرعون کے حکم پر چلے حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے ہوگا اور ان کو آگ پر پہنچائے گا۔ اور کیسا برا گھاٹ ہے جس پر وہ پہنچیں گے۔ اور اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ کیسا برا انعام ہے جو ان کو ملا۔ ۹۹-۹۶

حضرت موسیٰ نے حق کی دعوت آخری ممکن حد تک پیش کردی۔ انھوں نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نہ صرف نظری طور پر بے دلیل کردیا۔ بلکہ عصا کے معجزے کی صورت میں اپنی صداقت کا کھلا ہوا ظاہری ثبوت بھی انھیں دکھادیا پھر بھی فرعون کی قوم فرعون ہی کے ساتھ رہی، وہ حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے نزدیک ساری اہمیت اقتدار اور دنیوی ساز وسامان کی تھی اور یہ چیزیں وہ حضرت موسیٰ کے اندر نہ دیکھتے تھے۔ وہ آپ کی باتوں پر حیران ضرور ہوتے تھے۔ مگر جب وہ حضرت موسیٰ کا مقابلہ فرعون سے کرتے تو ان کو ایک طرف بے سروسامانی دکھائی دیتی اور دوسری طرف ہر قسم کا مادی جاہ وجلال۔

یہ تقابل ان کے لئے فیصلہ کُن بن گیا۔ اور وہ دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ فرعون کو چھوڑ دیں اور اس سے الگ ہو کر حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو جائیں۔

جو لوگ دنیا میں کسی کا ساتھ صرف اس لئے دیں گے کہ اس کے پاس مادی بڑائی کی چیزیں تھیں، وہ آخرت میں بھی اس کے ساتھ کر دئے جائیں گے۔ مگر دنیا کے برعکس، یہ بہت برا ساتھ ہوگا۔ کیونکہ اس دن اس آدمی سے اس کا تمام سامان چھن چکا ہوگا۔ اب اس کا وجود صرف ذلّت اور بربادی کا نشان ہوگا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی اسی آگ میں پہنچا دے گا جو خود اس کے لئے اس کی گمراہ قیادت کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے مقدر کی جا چکی ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

یہ بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تم کو سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب تک قائم ہیں اور بعض مٹ گئیں۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ پھر جب تیرے رب کا حکم آگیا تو ان کے معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ اور انھوں نے ان کے حق میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں بڑھایا۔ ۱۰۰ - ۱۰۱

قدیم تاریخوں میں بادشاہوں اور فوجی جنرلوں کے حالات درج ہیں مگر نبیوں اور ان کی اقوام کے حالات کسی تاریخ میں درج نہیں۔ دوسری طرف قرآن کو دیکھئے تو اس میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ نبیوں اور ان کی قوموں کے حالات ملتے ہیں۔ بقیہ باتیں اس نے اس طرح نظر انداز کر دی ہیں جیسے اس کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ انسان نے جو تاریخ لکھی اس میں اس نے وہی بات چھوڑ دی جو خالق کے نزدیک سب سے زیادہ قابل تذکرہ تھی۔

دورِ نبوت کی ان ہلاک شدہ بستیوں میں سے بعض بستیاں ایسی ہیں جو ابھی تک آباد ہیں۔ جیسے مصر جو فرعون کا مقام تھا۔ دوسری طرف قوم ہود اور قوم لوط جیسی اقوام ہیں جن کی بستیاں ان کے باشندوں سمیت ناپید ہو گئیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کے کچھ نشانات کھنڈر کی صورت میں کھڑے ہیں یا زمین کی کھدائی سے برآمد کئے گئے ہیں۔

ان بستیوں کا ہلاک کیا جانا بظاہر ایک ظالمانہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب یہ دیکھئے کہ کیوں ایسا ہوا

تو وہ عین مطابق حقیقت بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی بدعملی کے نتائج تھے۔ جو کچھ ہوا وہ ان کی بدکرداری کے بعد ہوا نہ کہ ان کی بدکرداری سے پہلے۔

جب بھی آدمی سرکشی اور ظلم کرتا ہے تو وہ کسی برتے پر کرتا ہے۔ وہ کچھ چیزوں یا ہستیوں کو اپنا سہارا سمجھ لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ مشکل وقتوں میں اس کے مددگار ثابت ہوں گے۔ مگر یہ سہارے اسی وقت تک سہارے ہیں جب تک خدا ڈھیل دے رہا ہو۔ جب خدا کے قانون کے مطابق ڈھیل کی مدت ختم ہو جائے اور خدا اپنا آخری فیصلہ ظاہر کر دے اس وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب محض جھوٹے مفروضے تھے جن کو اس نے اپنی نادانی کی وجہ سے سہارا سمجھ لیا تھا۔

وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ‌ ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنۡ خَافَ عَذَابَ الۡاٰخِرَةِ‌ ؕ ذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّشۡهُوۡدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعۡدُوۡدٍ ؕ ﴿۱۰۴﴾ يَوۡمَ يَاۡتِ لَا تَكَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ‌ ۚ فَمِنۡهُمۡ شَقِىٌّ وَّسَعِيۡدٌ ﴿۱۰۵﴾

اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب کہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا ہے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہے جس میں سب لوگ جمع ہوں گے۔ اور وہ حاضری کا دن ہوگا۔ اور ہم اس کو ایک مدت کے لئے ٹال رہے ہیں جو مقرر ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو کوئی جان اس کی اجازت کے بغیر کلام نہ کر سکے گی۔ پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت ۱۰۵ - ۱۰۲

موجودہ دنیا میں انسان کو رہنے اور بسنے کا موقع صرف امتحان کی بنا پر حاصل ہے۔ پیغمبروں کے ذریعہ اتمام حجت کے بعد بھی جو لوگ منکر بنے رہیں وہ خدا کی زمین میں مزید ٹھہرنے کا حق کھو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے منکرین کو خدا نے ہلاک کر دیا (عنکبوت ۴۰) یہ ہلاکت زیادہ تر اس طرح ہوئی کہ عام زمینی آفتوں میں شدت پیدا کر دی گئی مثلاً آندھی، سیلاب، یا زلزلہ، جو عام حالات میں ایک حد کے اندر رہتے ہیں، ان کو غیر محدود طور پر شدید کر دیا گیا۔

ماضی میں اس طرح قوموں کی تباہی کے واقعات کو جغرافی تاریخ کے علماء موسمی تغیرات (Climatic Pulsations) کا نام دیتے ہیں۔ گویا جو کچھ ہوا وہ محض جغرافی اتھل پتھل کے نتیجہ میں ہوا۔ اگرچہ وہ اس واقعہ کی کوئی توجیہہ نہیں کر پاتے کہ اس قسم کے شدید موسمی تغیرات صرف ماضی میں کیوں پیش آئے۔ وہ اب (ختم نبوت

کے بعد) کیوں نہیں پیش آتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعات سادہ معنوں میں صرف جغرافی واقعات نہ تھے بلکہ یہ حکم خداوندی کا ظہور تھا۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام عدل پر قائم ہے۔ یہاں خود قانون قدرت کے تحت لازماً ایسا ہونے والا ہے کہ ظالم اپنے ظلم کی سزا پائے اور عادل کو اپنے عدل کا انعام ملے۔ ان واقعات کو موسمی تغیرات کہنا ان کو جغرافیہ کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کو خدائی تغیرات مانا جائے تو وہ آدمی کے لئے خوف خدا اور فکر آخرت کا زبردست سبق بن جائیں گے۔

پیغمبروں کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے وہ گویا بڑی قیامت سے پہلے اس کی ایک چھوٹی نشانی تھے۔ ان میں ایسا ہوا کہ منکرین کو ایک مدت تک ڈھیل دی گئی۔ اس کے بعد خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو سب کے سب ہلاک کر دئے گئے۔ صرف وہ لوگ بچ سکے جو حق کا ساتھ دینے کی وجہ سے خدا کے نزدیک نیک بخت قرار پا چکے تھے۔ ان کے علاوہ جو لوگ خدا کی میزان میں سرکش اور بد بخت تھے وہ لازمی طور پر عذاب کی زد میں آئے۔ حتیٰ کہ پیغمبروں کی سفارش بھی ان کو بچا نہ سکی، جیسا کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴿١٠٧﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴿١٠٨﴾ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ ﴿١٠٩﴾

ع ۹

پس جو لوگ بد بخت ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ ان کو وہاں چیخنا ہے اور دھاڑنا۔ وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور جو لوگ نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے، وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے بخشش ہے بے انتہا۔ پس تو ان چیزوں سے شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو بس اسی طرح عبادت کر رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کر رہے تھے۔ اور ہم ان کا حصہ انھیں پورا پورا دیں گے بغیر کسی کمی کے ۱۰۹ - ۱۰۶ -

قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت اور سب سے زیادہ تکرار کے ساتھ جس چیز کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ حالت پر چھوڑ نہیں دئے جائیں گے۔ بلکہ موت کے بعد وہ خدا کی عدالت میں حاضر کئے جائیں گے۔ وہاں ہر ایک اپنی کارکردگی کے مطابق جنت یا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اس اہمیت اور تکرار کی وجہ لوگوں کا "شک" ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ زمین پر بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت کو نہیں مانتے۔ بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر عمل کرتے ہیں۔ بیشتر انسان خدا پسند زندگی کے بجائے خود پسند زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ پھر بھی سارے لوگ کامیاب ہیں۔ بظاہر یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا کہ خدا کے وفاداروں کو کوئی خصوصی انعام مل رہا ہو۔ یا خدا کے نافرمانوں کو کوئی خاص سزا بھگتنی پڑتی ہو۔

اس بنا پر لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ انسانوں کا جو انجام مسلسل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے سوا بھی کوئی انجام ان کے لئے مقدر ہے۔ یہاں قرآن بتاتا ہے کہ لوگوں کا مسلسل غیر حق پر چلنا اس لئے نہیں ہے کہ انھوں نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور پھر اس کو معقول پا کر اسے اختیار کر لیا۔ اس کا سبب دراصل رواج کی پیروی ہے نہ کہ دلیل اور معقولیت کی پیروی۔

اس کے باوجود لوگوں کے عمل کا انجام ان کے سامنے نہیں آتا تو اس کا سبب مہلت امتحان ہے۔ زمین پر موت سے پہلے کی زندگی جانچ کی زندگی ہے۔ اس لئے موت تک انسان کو یہاں ڈھیل دی جا رہی ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ موت اس مقررہ مدت کا خاتمہ ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مقام امتحان سے اٹھا کر مقام عدالت میں پہنچا دیا جائے۔ وہاں ہر ایک کو وہی ملے گا جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جائے گا جس کو اس نے استحقاق کے بغیر اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ پھر اس میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات نہ آچکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور ان کو اس میں شبہ ہے کہ وہ مطمئن نہیں ہونے دیتا اور یقیناً تیرا رب ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا۔ وہ باخبر ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۱۱۱-۱۱۰

"موسیٰ کی کتاب میں اختلاف"، کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مخاطبین اس کے بیانات کے بارہ میں کئی رائے ہو گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے جھٹلایا اور کچھ لوگوں نے تسلیم کیا (فاختلف فی ذالك الکتاب۔ فکذّب بہ بعضھم وصدّق بہ بعضھم، الطبری)

جب بھی کوئی بات کہی جائے تو آدمی اس کے بارہ میں ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک، صحیح تعبیر۔ دوسرے، غلط تعبیر۔ اگر سننے والے فی الواقع سنجیدہ ہوں تو وہ ہمیشہ ایک ہی صحیح تعبیر تک پہنچیں گے ان کی سنجیدگی ان کے لئے اتحاد رائے کی ضامن بن جائے گی۔ اس کے برعکس اگر وہ بات کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہوں تو وہ اس کو کوئی اہمیت نہ دیں گے اور اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کی مختلف تعبیریں کریں گے۔ کوئی ایک بات کہے گا، کوئی دوسری بات۔ اس طرح ان کی غیر سنجیدگی انھیں اختلاف رائے تک پہنچا دے گی۔

یہ صورت تمام پیغمبروں کے ساتھ پیش آئی۔ اس کے باوجود خدا اس کو گوارا کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو عمل کی جگہ بنایا ہے اور اگلی آنے والی دنیا کو بدلہ پانے کی جگہ۔ خدا کی یہی سنت ہے جس کی بنا پر لوگوں کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔ موجودہ صورت حال اسی مہلت امتحان کی بنا پر ہے نہ کہ خدا کے عجز یا لوگوں کے کسی استحقاق کی بنا پر۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لئے اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ۱۵ - ۱۱۲

دعوت حق کا ابتدائی استقبال نظر انداز کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد مخالفت شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ مخالفت اپنے آخری نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ داعیوں کے لئے بڑا نازک وقت ہوتا

ہے۔ اس وقت ان کے درمیان دو قسم کے ذہن ابھرتے ہیں۔ کچھ لوگ جھنجھلا کر یہ چاہنے لگتے ہیں کہ مخالفین سے ٹکرا جائیں اوران لوگوں سے قوت کے ذریعے نپٹیں جن کے لئے نظری دلائل بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ دوسرا ذہن وہ ہے جو یہ سوچتا ہے کہ مخاطبین کے لئے قابل قبول بنانے کی خاطر اپنی دعوت میں کچھ ترمیم کرلی جائے۔ دعوت کے ان اجزا کا ذکر نہ کیا جائے جن کو سن کر مخاطبین بگڑ جاتے ہیں۔

پہلا رویہ اگر حد سے تجاوز کرنا ہے تو دوسرا رویہ باطل سے مصالحت کرنا۔ اور یہ دونوں ہی اللہ کی نظر میں یکساں طور پر غلط ہیں۔ خاص طور پر دوسری چیز (قابل قبول بنانے کی خاطر تبدیلی) تو جرم کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ حق کا اعلان ہے۔ اور مصالحت کی صورت میں حق کا واضح اعلان نہیں ہوسکتا۔

دعوت کی راہ میں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے تو داعی کو چاہئے کہ خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع کرے کیونکہ سب کچھ کرنے والا وہی ہے۔ خدا کی مدد ہی تمام مشکلات کے حل کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایسے اہل خیر ہوتے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ ایسے تھوڑے لوگ نکلے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا۔ اور ظالم لوگ تو اسی عیش میں پڑے رہے جو انھیں ملا تھا اور وہ مجرم تھے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کردے حالانکہ اس کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں ۱۱۷ - ۱۱۶

یہاں پچھلوں سے مراد پچھلی امتیں، بالفاظ دیگر، پچھلی مسلم قومیں ہیں۔ قوم کا بگاڑ ہمیشہ اس طرح ہوتا ہے کہ دنیوی سامان جو خدا کی طرف سے انھیں اس لئے دیا گیا تھا کہ اس سے ان کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے، وہ ان کے لئے سرکشی اور دنیا پرستی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

ایسی حالت میں مسلم قوم کی اصلاح کے لئے جو کام کرنا ہے اس کا عنوان شریعت کی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ حکم ایک مسلمان کی اس ذمہ داری کو بتاتا ہے جو اپنے قریبی ماحول کی اصلاح کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں ہمیشہ ایسے افراد موجود رہنے چاہئیں جو مسلمانوں کو خدا اور آخرت کی یاد دلائیں۔ وہ ان کے اخلاق کی نگرانی کریں۔ وہ معاملات میں

ان کو راہ راست پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

کسی قوم میں ایسے اہل خیر کا نہ نکلنا ہمیشہ دو سبب سے ہوتا ہے۔ یا تو پوری قوم کی قوم بگڑ چکی ہو اور اس میں کوئی صالح انسان باقی نہ رہا ہو۔ یا صالح افراد موجود تو ہوں مگر عمومی بگاڑ کی وجہ سے وہ زبان کھولنے کی ہمت نہ کرتے ہوں۔ انھیں اندیشہ ہو کہ اگر انھوں نے سچی بات کہی تو قوم کے درمیان وہ بے عزت ہو کر رہ جائیں گے۔

مذکورہ دونوں صورتوں میں قوم خدا کی نظر میں اپنا اعتبار کھو دیتی ہے اور اس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ ایک یا دوسری صورت میں وہ عتاب خداوندی کی زد میں آ جائے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے، سوا ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے۔ اور اس نے اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکٹھے بھر دوں گا ۱۹ — ۱۱۸

ہماری دنیا میں انسان کے سوا دوسری بے شمار مخلوقات بھی ہیں۔ یہ سب ہمیشہ فطرت کے ایک ہی مقرر راستہ پر چلتی ہیں۔ اسی طرح انسان کو بھی خدا ایک ہی صراط مستقیم کا پابند بنا سکتا تھا۔ مگر انسان کے بارہ میں خدا کی یہ اسکیم ہی نہیں۔ انسان کے سلسلہ میں خدا کا منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جائے جو خود اپنے آزادانہ اختیار کے تحت ایک چیز کو لے اور دوسری چیز کو چھوڑ دے۔ انسان کی دنیا میں اختلاف (کسی کا ایک راستہ پر چلنا اور کسی کا دوسرے راستہ پر) دراصل اسی خاص خدائی منصوبہ کی بنا پر ہے۔

یہ منصوبہ یقیناً ایک پرخطر منصوبہ تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت سے لوگ آزادی کا غلط استعمال کر کے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنالیں گے۔ مگر اسی پرخطر منصوبہ کے ذریعے وہ اعلیٰ روحیں بھی چنی جا سکتی تھیں جو خدا کی رحمت خاص کی مستحق قرار پائیں۔ خدا نے اپنی رحمتیں ساری کائنات کو بطور عطیہ دے رکھی ہیں۔ اب خدا نے یہ منصوبہ اس لئے بنایا تاکہ اپنی رحمت وہ اپنی ایک مخلوق کو یہ کہہ کر دے کہ یہ تمہارا حق ہے۔

خدا کی رحمت اس شخص کو ملتی ہے جس کا شعور اتنا بیدار ہو گیا ہو کہ وہ امتحانی اختیار کے اندر اپنی حقیقی بے اختیاری کو جان لے۔ وہ انسانی قدرت کے پردہ میں خدا کی قدرت کو دیکھ لے۔ یہ شعور ایسے

آدمی سے سرکشی کی طاقت چھین لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ جب خدا اپنی رحمت کو اس کا حق کہہ کر پیش کرے تو اس کا شعور حقیقت پکار اٹھے ـــــــــ خدایا یہ بھی تیری رحمتوں ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ ورنہ میرا عمل تو کسی قیمت کا مستحق نہیں۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور ہم رسولوں کے احوال سے سب چیز تمھیں سنا رہے ہیں۔ جس سے تمھارے دل کو مضبوط کریں اور اس میں تمھارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لائے ان سے کہو کہ تم اپنے طریقہ پر کرتے رہو اور ہم اپنے طریقہ پر کر رہے ہیں۔ اور انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اللہ کے پاس ہے اور وہی تمام امور کا مرجع ہے۔ پس تم اس کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور تمھارا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو ۱۲۳ - ۱۲۰

قرآن میں رسولوں کے احوال اس لئے سنائے گئے ہیں کہ بعد کے داعیوں کو اس سے سبق حاصل ہو۔ رسولوں کے احوال میں داعی دیکھتا ہے کہ ان کی مخاطب قوموں نے ان سے جھگڑے کئے۔ سیدھی بات کو غلط رخ دے کر انھیں مطعون کیا۔ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ ان کو اس طرح رد کر دیا جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

مگر بالآخر اللہ نے ان کی مدد کی۔ ان کی بات سب سے برتر ثابت ہوئی۔ مخالفین کی تمام کارروائیاں ناکام ہوکر رہ گئیں۔ دونوں گروہوں کا یہ مختلف انجام اپنی ابتدائی صورت میں موجودہ دنیا ہی میں پیش آیا اور آخرت میں وہ اپنی کامل ترین صورت میں پیش آئے گا۔

ان مثالوں سے داعی کو یہ تاریخی اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ اس کو دعوت حق کی راہ میں جو مشکلیں پیش آرہی ہیں ان میں اس کے لئے نہ مایوسی کا سوال ہے اور نہ گھبراہٹ کا۔ دعوت حق کی راہ میں یہ چیزیں ہمیشہ پیش آتی ہیں۔ اور اس کو بھی بالآخر اسی طرح کامیابی حاصل ہوگی جس طرح اس سے پہلے خدا کے سچے داعیوں کو حاصل ہوئی۔

تاریکی میں سفر

لندن کے اخبار گارجین (۱۳ مارچ ۱۹۸۳) کے ایک تین کالمی مضمون کی سرخی ہے ـــــــ تاریکی میں ایک بہادرانہ سفر:

A brave journey through the dark.

یہ مضمون آرتھر کوئسلر (Arthur Koestler) کے بارہ میں ہے۔ آرتھر کوئسلر انگلستان کا ایک مشہور ادیب اور مفکّر تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی سنتھیا (Cynthia) نے مارچ ۱۹۸۳ میں اپنے لندن کے مکان میں خودکشی کرلی۔ موت کے وقت آرتھر کوئسلر کی عمر ۷۷ سال تھی۔

آرتھر کوئسلر بہت سی کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے ـــــــ دوپہر میں تاریکی (Darkness at Noon) یہ کتاب ۳۲ زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔ یہ کتاب کمیونزم کے خلاف ہے۔ اس میں مصنّف نے دکھایا ہے کہ نام نہاد عوامی نظام میں بھی کس طرح انسان کے اوپر انسان کا ظلم جاری رہتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا استغلال کرتا ہے۔

آرتھر کوئسلر کو ذاتی طور پر وہ تمام دنیوی چیزیں حاصل تھیں جن کی ایک انسان تمنا کرتا ہے۔ وہ مشہور عالم تھا۔ اپنے پیچھے اس نے چار لاکھ پونڈ چھوڑے ہیں جن کے بارہ میں اس نے وصیت کی کہ وہ ایک برطانی یونیورسٹی کو دے دیے جائیں جو اس رقم کو (Parapsychology) کی تحقیق میں لگائے۔

آرتھر کوئسلر نے کیوں خودکشی کرلی۔ اس کی وجہ اس کی مایوسی تھی۔ وہ دنیا میں برائیاں دیکھ کر بے حد پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان برائیوں کی کیا توجیہہ کرے۔ ۱۹۷۴ میں اس کے مقالات کا ایک مجموعہ چھپا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ تکنیکی ترقیوں اور اخلاقی سلوک کے درمیان بہت نمایاں قسم کی علامتی نابرابری پائی جاتی ہے:

> There is a striking, symptomatic disparity between the growth-curves of technological achievement on the one hand and of ethical behaviour on the other.

اس کے بعد وہ جدید تہذیب سے اپنی مایوسی کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے کہ ہم دور سیاروں کے گرد گھومنے والے خلائی جہازوں کی حرکت کو کنٹرول کرسکتے ہیں مگر شمالی آئرلینڈ کے حالات پر کنٹرول کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں:

We can control the motions of the satellites, orbiting the distant planets, but can not control the situation in Northern Ireland.

جانور اپنی نوع کو ہلاک نہیں کرتے۔ مگر انسان خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال کی تحقیق کرتے ہوئے آرتھر کوئسلر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی دماغ کے مختلف حصوں میں ارتقاء کے دوران عدم توازن (Imbalance) پیدا ہوگیا ہے۔ یہی عدم توازن مردم کشی کے بڑے بڑے واقعات کا اصل سبب ہے۔

تاہم یہ تحقیقات اس کو سکون نہ دے سکیں۔ وہ بالآخر اس رائے پر پہنچا کہ انسان کے لئے موجودہ حالات میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ خودکشی کرلے۔ اس کا آخری فلسفہ یہ تھا کہ موت اس شخص کے لئے قابل استقبال اور قدرتی ریلیف ہوسکتی ہے جس کا واحد بدل غم اور مصیبت ہو:

Death could be a welcome and natural relief for someone whose only alternative was pain and suffering.

The Guardian (London) March 13, 1983

آرتھر کوئسلر نے اپنے اس نظریہ پر خود عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس دنیا سے الگ کرلیا جو نہ اس کی مرضی کے مطابق تھی اور نہ وہ اس کو بدلنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ انسان ایک روشن فضا میں آنکھ کھولتا ہے پھر وہ موت کی اندھیری دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی کے باوجود انسان کی اخلاقی ترقی ممکن نہ ہوسکی۔ اس نے دیکھا کہ آدمی خلا میں گھومنے والی مشین کو کنٹرول کرلیتا ہے۔ مگر انسان کو کنٹرول کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ اس نے دیکھا کہ جانور تک اپنے ہم جنسوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر انسان خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ انسان اپنے سارے وسائل کو استعمال کرکے فلاحی نظام بناتا ہے مگر وہ نظام روشنی میں تاریکی کے ہم معنی ہوجاتا ہے۔ ان حالات نے اس کو مایوس کردیا اور اس نے خودکشی کرلی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے آخرت کا تصور نہ ہو تو اس کی زندگی کتنی بے معنی ہوجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی معنویت اسی وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ اس کو آخرت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔ آخرت کے بغیر یہ دنیا اتنی بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ ایک حساس مفکر یہی کرسکتا ہے کہ وہ خودکشی کرلے تاکہ اس کے خیال کے مطابق اس کو موجودہ ناقابل فہم دنیا سے چھٹی مل جائے۔

قدردانی

خلیفہ عبدالحکیم ابتدائً عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد میں شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ وہ طویل رخصت پر انگلستان گئے تو یہ جگہ خالی ہوگئی۔ مولانا عبدالباری ندوی (۱۹۷۶-۱۸۹۰) قائم مقام صدر کی حیثیت سے اس عہدہ پر مقرر کئے گئے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے پرائیوٹ طور پر انگریزی پڑھی تھی۔ مگر سند کے اعتبار سے ان کے پاس میٹرک کی سند بھی نہ تھی۔ ان کے تقرر میں خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا حصہ تھا جو اس وقت حیدر آباد میں صدرالصدور تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی حیدر آباد میں ۱۹۲۲ سے لے کر ۱۹۴۵ تک رہے۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ وہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

"حیدر آباد میں میری ملازمت کے دو سال گذر جانے کے بعد حسب قاعدہ استقلال کی کارروائی پیش ہوئی۔ اس زمانہ میں حیدر آباد میں گزیٹڈ پوسٹ پر استقلال کے لئے خود اعلیٰ حضرت کی منظوری ضروری تھی۔ ابھی غالباً کارروائی اعلیٰ حضرت تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ڈیوڑھی میں (شروانی صاحب کے کسی مہربان) نے اعلیٰ حضرت کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ شروانی صاحب نے فلسفہ کا صدر ایسے شخص کو بنوا دیا ہے جس کو فلسفہ تو کیا سرے سے کوئی ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے شیروانی صاحب سے جواب طلب کر لیا۔ شیروانی صاحب نے میرا رسالہ "مذہب اور عقلیات" کے ساتھ اپنا عریضہ منسلک کر کے یہ تحریر فرمایا کہ ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہٰذا کی چند سطروں سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے استقلال کی کارروائی پر اپنے دستخط کر دئے۔"

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸) کا واقعہ ہے کہ اس زمانہ کے گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن نے ایک بار ان سے دریافت کیا "کیا آپ کے خیال میں کوئی ایسا موزوں شخص ہے جس کو حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب دیا جائے" اس کے جواب میں علامہ اقبال نے مولوی میر حسن کا نام تجویز کیا جو اس وقت مرے کالج سیالکوٹ میں استاد تھے۔ گورنر نے کہا "میں نے ان کا نام آج پہلی بار آپ کی زبان سے سنا ہے۔ کیا مولوی صاحب نے کوئی کتاب بھی لکھی ہے" علامہ اقبال نے جواب دیا "ان کی لکھی ہوئی تصنیف تو نہیں۔ البتہ ان کی ایک زندہ تصنیف ضرور موجود ہے" گورنر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ زندہ تصنیف کیا ہے" علامہ اقبال نے کہا "میں ان کی زندہ تصنیف ہوں، وہ میرے محترم استاد ہیں" گورنر اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور جلد ہی ایک سادہ تقریب میں مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دے دیا گیا۔

عقل کا استعمال

ایک صاحب پرنٹنگ پریس کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے دہلی کے ایک سفارت خانہ کو اپنے کام سے اتنا گرویدہ بنالیا کہ لمبے عرصہ تک اس سفارت خانہ نے اپنا چھپائی کا کام ان کے سوا کسی دوسرے پریس کو نہیں دیا۔

کوئی شخص جب پریس میں چھپنے کے لئے کتاب دیتا ہے تو اصل کتاب چھپنے سے پہلے پریس اس کو اس کا پروف دکھاتا ہے۔ پروف عام طور پر معمولی ڈھنگ سے بڑے بڑے کاغذ پر نکالے جاتے ہیں۔ اور منتشر اوراق کی صورت میں ناشر کو دے دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ پروف اصل چھپی ہوئی کتاب کا نہایت ناقص نمونہ ہوتے ہیں۔ ان سے چھپائی کی صحت اور غلطی تو معلوم کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کتاب چھپنے کے بعد کیسی ہوگی۔

مذکورہ پریس کے مالک کو پہلی بار سفارت خانہ سے ایک کتاب چھاپنے کو ملی تو انھوں نے پروف پیش کرنے کا نیا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے تمام اوراق باقاعدہ پریس میں چھاپ کر نکالے ان کو عام طریقہ کے خلاف دونوں طرف چھاپا۔ اس طرح پوری کتاب کا ہر فارم اچھے کاغذ پر چھاپ کر اس کو کتاب کی طرح موڑا اور اس کی جلد بندی کرا کے پوری کتاب کا ایک پیشگی نمونہ تیار کر دیا۔ انھوں نے پروف کے بجائے یہ کتاب سفارت خانہ کے سامنے پیش کی۔ سفارت خانہ کے ذمہ دار اس باقاعدگی کو دیکھ بہت خوش ہوئے اور اپنا چھپائی کا تمام آڈر ان کے حوالے کر دیا۔

چند سال کے بعد ایسا ہوا کہ کسی دوسرے پریس نے سفارت خانہ والوں سے کہا کہ جس پریس سے آپ چھپواتے ہیں وہ آپ سے زیادہ دام چارج کرتا ہے۔ آپ ہم کو اپنی فرمائش دیں، ہم کم نرخ پر ویسی ہی کتاب چھاپ کر آپ کو دیں گے۔ سفارت خانہ والے اس کے کہنے میں آگئے اور آزمائشی طور پر ایک کتاب کی چھپائی کا کام اس کے حوالے کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جب پریس کی طرف سے کتاب کے پروف آئے تو وہ عام قاعدہ کے مطابق معمولی کاغذ کے ایک پلندے کی صورت میں تھے۔ نیز زیادہ اہتمام نہ کرنے کی وجہ سے چھپائی بھی ویسی ہی تھی جیسی اصل کتاب کی ہوتی ہے۔ یہ پروف جب سفارت خانہ کے ذمہ دار کے سامنے آئے تو وہ ان کو دیکھ بگڑ گیا۔ وہ سمجھا کہ کتاب کی چھپائی کا معیار بھی یہی ہوگا۔ اس نے اس کو نااہل سمجھ کر اس کو دیا ہوا آڈر منسوخ کر دیا اور دوبارہ سابقہ پریس سے فرمائش کی کہ وہ اس کا کام کرے۔ اگر آپ کے اندر کوئی جوہر ہے تو اس کی قیمت بہرحال آپ کو مل کر رہے گی۔

جتنا دینا اتنا پانا

مسٹر جیت سنگھ لانبہ (پیدائش ۱۹۳۱) عکسی حافظہ (Photographic Memory) کے مالک ہیں۔ کسی چیز کو چند بار پڑھ لیں تو وہ ان کو یاد ہو جاتی ہے۔ ۱۲ جون ۱۹۸۳ کو وہ ہمارے دفتر میں آئے تو الرسالہ کے کئی مضمون انھوں نے لفظ بلفظ زبانی سنا دئے۔

مسٹر لانبہ وزارت قانون میں ہیں اور دہلی میں کرتی نگر میں رہتے ہیں۔ وہ اقبال کے شیدائی ہیں۔ اقبالیات کے موضوع سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ اقبال کے ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہیں۔ اور اسی طرح ان کی زندگی کے حالات بھی۔

مسٹر جیت سنگھ لانبہ مئی ۱۹۸۳ میں پاکستان گئے۔ وہاں اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ اس سلسلے میں ان کی ملاقات امیر حسین صاحب (لاہور) سے ہوئی۔ انھیں بھی اقبال کے اشعار کثرت سے یاد ہیں۔ انھوں نے مسٹر لانبہ کو چیلنج کیا اور کہا کہ اگر تم ثابت کر دو کہ تم کو مجھ سے زیادہ اقبال کے اشعار یاد ہیں تو میں اپنی ہار مان لوں گا اور تم کو پانچ ہزار روپے انعام دوں گا۔ مسٹر لانبہ نے کہا:

میں پچھلے دس سال سے شمع اقبال پر پروانہ کی طرح رقص کر رہا ہوں۔ تم مجھ سے زیادہ اقبال کا کلام اسی وقت پیش کر سکتے ہو جب کہ تم نے پروانہ بن کر شمع اقبال پر مجھ سے زیادہ رقص کیا ہو۔ چنانچہ مسٹر جیت سنگھ لانبہ مقابلہ میں جیت گئے۔ امیر حسین صاحب اقبال کی جس نظم کا کوئی مصرعہ پڑھتے مسٹر لانبہ مسلسل اس کے آگے کے اشعار سنانا شروع کر دیتے۔ اس کے برعکس جب مسٹر لانبہ نے اقبال کا کوئی مصرعہ پڑھا تو وہ اس کے آگے زیادہ نہ سنا سکے۔

اقبالیات کے مقابلہ میں سرجیت سنگھ لانبہ جیت گئے اور امیر حسین لاہوری ہار گئے۔

کسی میدان میں کامیابی کی سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ اس میدان میں آدمی اپنے آپ کو وقف کر دے۔ زندگی کا ہر معاملہ گویا ایک شمع ہے۔ اور اس معاملہ میں وہی شخص سب سے زیادہ آگے بڑھے گا جو سب سے زیادہ اس شمع کے لئے تڑپا ہو، جس نے سب سے زیادہ اس شمع کے لئے رقص کیا ہو۔

زندگی لین دین کا سودا ہے۔ یہاں دینے والا پاتا ہے۔ اور اتنا ہی پاتا ہے جتنا اس نے دیا ہو۔ یہاں نہ دئے بغیر پانا ممکن ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کم دے کر زیادہ کا حصہ دار بن جائے۔

ایمان والے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے جب مکہ کے حالات سخت ہوگئے تو آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ چلے گئے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ مکہ سے جو لوگ آئے تھے وہ مدینہ میں بالکل اجنبی تھے۔ چنانچہ ان کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ مکہ کے مسلمانوں (مہاجرین) اور مدینہ کے مسلمانوں (انصار) کے درمیان مواخاۃ قائم کی گئی۔ یعنی مکہ سے آنے والے ہر شخص کو مدینہ میں رہنے والے کسی شخص کا بھائی بنا دیا گیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک مہاجر تھے۔ ان کی مواخاۃ حضرت سعد بن ربیع انصاری سے ہوئی۔ سعد بن ربیع مدینہ میں اس وقت کے لحاظ سے ایک مالدار شخص تھے۔ انھوں نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنے مہاجر دینی بھائی کو واقعی بھائی کی طرح قبول کر لیا۔

حضرت سعد بن ربیع انصاری نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میرے پاس جو مال ہے وہ سب میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ میں اس کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ اور میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ دونوں میں سے جو حصہ تم کو زیادہ اچھا معلوم ہو اس کو تم لے لو (واستحلفك ان تاخذ خير الحصتين)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے انصاری بھائی کی زبان سے یہ سنا تو انھوں نے ان کو دعا دی اور اس کے بعد کہا کہ تمہارا جذبہ بہت مبارک ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی جزائے خیر دے۔ مگر میں ایک ایسا شخص ہوں جس کو تجارت کرنا آتا ہے۔ اس لئے تم میرے لئے صرف یہ کرو کہ مجھ کو بازار کا راستہ بتا دو (انی رجل له حظ فی التجارة فدلنی الی السوق)

حضرت سعد بن ربیع انصاری کے لئے موقع تھا کہ وہ اپنے مال کا زیادہ حصہ کسی نہ کسی تدبیر سے اپنے لئے مخصوص کر لیتے اور کچھ حصہ اپنے مہاجر بھائی کو دے دیتے۔ اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایسا کر سکتے تھے کہ ان کے انصاری بھائی نے جب اپنا نصف مال انھیں پیش کر دیا تو وہ فوراً اس کو لے لیتے۔ مگر دونوں نے وہ کیا جو ان کا ایمان اور تعلق باللہ ان سے تقاضا کر رہا تھا۔

انصاری مسلمان نے اپنے مال کا نصف حصہ مہاجر مسلمان کو پیش کر دیا۔ دوسری طرف مہاجر مسلمان نے اپنے انصاری بھائی کو دعا دیتے ہوئے اپنی محنت پر بھروسہ کیا۔ ایک کا جذبۂ ایمان ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا اور دوسرے کا خود اعتمادی کی صورت میں۔

احسن تقویم

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ (التین) میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو خدا نے احسن تقویم (بہترین ساخت) پر پیدا کیا ہے۔ مگر اس کے بعد خدائی نقشہ کے خلاف چلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب سے نچلے مقام پر جا گرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کیا ہے اور دنیا میں اس کا امتحان کس اعتبار سے لیا جا رہا ہے۔ انسان اپنی پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے جنت کا شہری ہے۔ وہ خدا کا وہی مطلوب انسان ہے جس کو وہ اپنی خصوصی نعمتوں کی دنیا میں بسانا چاہتا ہے۔ انسان عملاً وہی ہے جو اس کو ہونا چاہئے۔

پھر انسان کا امتحان کیا ہے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ دنیا میں آزادانہ ماحول پاکر وہ بگڑ نہ جائے۔ وہ اپنے آپ کو اسی حال میں بچاکر رکھے جس حال میں خدا نے اس کو ابتداءً پیدا کیا تھا۔ وہ اپنے شعور کو خدا کے تخلیقی نقشہ کا چوکیدار بنا لے۔

جو لوگ ایسا کریں کہ خدا نے جس شخصیت کے ساتھ انھیں پیدا کیا تھا اسی شخصیت کو لئے ہوئے وہ خدا تک پہنچیں، وہ خدا کی جنت کے باشندے قرار دئے جائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا کی بنائی ہوئی شخصیت کو محفوظ نہ رکھ سکیں وہ جنت میں بسنے کیلئے نااہل ٹھہریں گے۔ وہ کائناتی کوڑا خانہ میں پھینک دئے جائیں گے۔

مثال کے طور پر خدا کی تخلیق کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے انسان کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب) اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی تخلیقی اسکیم میں دوعملی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دو دل والا انسان خدا کی پسند کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اب جو شخص ایسا کرے کہ اپنے ذہن میں متضاد افکار کو جمع کرے۔ مثلاً وہ ایک خدا کی بڑائی کا اقرار کرے اور اسی کے ساتھ وہ انسان کی بڑائی میں گم ہو۔ وہ ایسی زندگی گزارے جس میں اپنوں کے لئے کچھ ہو اور غیروں کے لئے کچھ۔ جہاں مفاد کا لالچ یا دباؤ کی مجبوری ہو وہاں وہ ایک رویہ اختیار کرے، اور جہاں مفاد یا دباؤ کا پہلو نہ ہو وہاں وہ بالکل دوسرا انسان بن جائے۔

جس آدمی نے اپنے فکر و عمل کے لئے اس قسم کے دو معیار بنا رکھے ہوں وہ گویا احسن تقویم پر قائم نہیں۔ وہ خدا کی امانت کا نگہبان نہ بن سکا۔ اس نے خدا کی دی ہوئی شخصیت کو داغدار کر لیا۔ ایسا آدمی قرآن کے الفاظ میں اسفل سافلین میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے آپ کو دوعملی اور تضاد فکری سے بچاتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو، وہ گویا خدا کے یہاں وہی "انسان" لے کر پہنچا جو خدا نے اپنے منصوبہ کے تحت اسے دیا تھا۔ ایسا آدمی جنت کے باغوں میں داخل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ خدا کے یہ ابدی باغ ایسے ہی لوگوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔

کائناتی نشانیاں

عن ابن عباس قال اتت قریش الیهود فقالوا بم جاءکم موسٰی قالوا عصاہ و یدہ بیضاء للنظرین واتوا النصاری فقالوا کیف کان عیسٰی. قالوا کان یبرئ الاکمہ والابرص ویحیی الموتٰی فاتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا ادع اللہ ان یجعل لنا الصفا ذھباً فدعا ربہ فنزلت ھذہ الآیۃ ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار لاٰیات لاولی الالباب فلیتفکروا فیھا۔

تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۳۸

حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ قریش یہود کے پاس آئے اور پوچھا کہ موسٰی تمہارے پاس کیا معجزہ لے کر آئے انھوں نے کہا کہ اپنا عصا اور اپنا ہاتھ جو دیکھنے والوں کو چمک دار نظر آتا تھا۔ پھر قریش نصاریٰ کے پاس آئے اور پوچھا کہ عیسٰی کا معاملہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے اور مردہ کو زندہ کرتے تھے۔ پھر قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آپ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونا بنا دے۔ پھر آپ نے اپنے رب سے دعا کی تو یہ آیت اتری: "بے شک آسمانوں اور زمینوں کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں" پس سوال کرنے والوں کو چاہئے کہ اس میں غور کریں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد نزلت علیّ اللیلۃ آیۃ ویل لمن قرأھا ولم یتفکر فیھا ان فی خلق السماوات والارض (الخ)

البقرہ ۱۶۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج کی رات میرے اوپر ایک ایسی آیت اتری ہے کہ خرابی ہے اس کی جو اس کو پڑھے اور اس میں غور نہ کرے۔ وہ آیت یہ ہے: بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور پانی میں جس کو اللہ نے اوپر سے اتارا پھر اس سے زمین کو موت کے بعد زندہ کر دیا اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید

رہتا ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

عن ابی ذر قال ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما طائر یقلب جناحیہ فی الھواء الا وھو یذکر لنا منہ علما
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۴۰۴)

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور آپ کا حال یہ تھا کہ اگر ایک چڑیا بھی فضا میں اپنے پر ہلاتی تھی تو اس سے آپ ہم کو کسی علم کی یاد دہانی کراتے تھے۔

قال الدارانی انی لاخرج من منزلی فما یقع بصری علیٰ شیٔ الا رأیت للہ علیّ فیہ نعمۃ ولی فیہ عبرۃ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت دارانی کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر بھی میری نگاہ پڑتی ہے۔ مجھے اس میں خدا کی کوئی نعمت نظر آتی ہے اور اس میں میرے لئے کوئی عبرت ہوتی ہے۔

عن جابر رضی اللہ عنہ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال، یا ایہا الناس ان للہ سرایا من الملائکۃ تحل وتقف علیٰ مجالس الذکر فی الارض فارتعوا فی ریاض الجنۃ۔ قالوا واین ریاض الجنۃ، قال مجالس الذکر۔ فاغدوا وروحوا فی ذکر اللہ واذکروہ بانفسکم۔ من کان یحب ان یعلم منزلتہ عند اللہ فلینظر کیف منزلۃ اللہ عندہ فان اللہ ینزل العبد منہ حیث انزلہ من نفسہ (البیہقی)

حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، اللہ کے لئے فرشتوں کی جماعت ہے جو زمین پر ہونے والی ذکر کی مجلسوں میں آتی ہے اور ٹھہرتی ہے۔ لہٰذا تم جنت کے باغوں میں چرو۔ لوگوں نے کہا کہ جنت کے باغ کہاں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ذکر کی مجلسیں ہیں لہٰذا تم اللہ کی یاد میں صبح کرو یا اللہ کی یاد میں شام کرو۔ اور اللہ کو اپنے جی میں یاد کرو۔ جس آدمی کو پسند ہو کہ اللہ کے پاس اپنے مرتبہ کو جانے اس کو چاہئے کہ یہ دیکھے کہ اللہ کا مرتبہ اس کے پاس کیا ہے۔ کیونکہ اللہ بندہ کو اپنے یہاں وہی درجہ دیتا ہے جو درجہ بندہ نے اپنے یہاں اللہ کو دیا ہے۔

دو امکانات کے درمیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا فرماتے تو اکثر اس قسم کے الفاظ فرماتے : یا مقلِّبَ القلوبِ ثبت قلبی علیٰ دینك (اے دلوں کے پھیرنے والے، میرے دل کو اپنے دین پر جما دے) حضرت عائشہ نے ایک روز سنا تو کہا : اے خدا کے رسول ! آپ یہ دعا بہت کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے فرمایا :

ہر آدمی کا دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلی کے درمیان ہوتا ہے۔ جب وہ اس کو سیدھا کرنا چاہتا ہے تو سیدھا کر دیتا ہے اور جب وہ اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتا ہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے ۔ (لیس من قلب الا وھو بین اصبعین من اصابع الرّحمٰن، اذا شاء ان یقیمہ اقامہ و ان شاء یزیغہ ازاغہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص گمراہی کے خطرہ سے خالی نہیں۔ ہر آدمی کو مسلسل اپنے ایمان کی حفاظت کرنی ہے۔ ہر آن اللہ سے یہ توفیق مانگنی چاہئے کہ وہ اس کو پھسلنے سے بچائے۔ جس لمحہ اللہ کی توفیق آدمی کا ساتھ چھوڑ دے گی اسی لمحہ وہ گمراہی کی وادی میں بھٹک جائے گا۔ آدمی ہر آن ہدایت اور گمراہی کے درمیان ہے اور صرف اللہ کی مدد ہی اس کو ہدایت پر قائم رکھ سکتی ہے۔

زبان اور دل سب سے اچھے بھی ہیں اور سب سے خراب بھی

لقمان حکیم ایک حبشی غلام تھے۔ ان کے آقا نے ایک روز ان سے کہا کہ ایک بکری ذبح کرو اور اس میں سے دو بہترین گوشت کے ٹکڑے نکالو۔ لقمان نے بکری ذبح کی اور زبان اور دل نکال کر آقا کے سامنے پیش کیا۔ کچھ دن کے بعد آقا نے دوبارہ کہا کہ ایک بکری ذبح کرو اور اس میں سے دو سب سے زیادہ خراب گوشت کے ٹکڑے نکالو۔ لقمان نے بکری ذبح کی اور دوبارہ زبان اور دل نکال کر آقا کے سامنے رکھ دیا۔ آقا نے کہا میں نے تم سے دو سب سے اچھے ٹکڑے نکالنے کو کہا تو تم نے زبان اور دل نکالے اور جب میں نے تم سے دو سب سے خراب ٹکڑے نکالنے کو کہا تب بھی تم نے زبان اور دل نکالے۔ ایسا کیوں۔ لقمان حکیم نے جواب دیا: اگر یہ دونوں درست ہوں تو ان سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اگر یہ دونوں بگڑ جائیں تو ان سے زیادہ خراب کوئی چیز نہیں (انّہ لیس من شئ اطیب منھما اذا طابا و لا اخبث منھما اذا خبثا)

پیغمبر کی اطاعت ہر حال میں

حضرت مغیرہ بن شعبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں فلاں

شخص کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پہلے جاکر اس کو دیکھ لو۔ وہ گئے اور لڑکی کے والدین سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ والدین کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ ان کی لڑکی ایک غیر شخص کے سامنے آئے اور وہ اس کو دیکھے۔ لڑکی اس وقت گھر کے اندر موجود تھی، اور پردہ کے پیچھے سے یہ باتیں سُن رہی تھی۔ اس نے بلند آواز سے کہا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے تو تم آکر مجھ کو دیکھ لو۔ اور اگر آپ نے حکم نہیں دیا ہے تو میں تم کو خدا کی قسم دلاتی ہوں کہ ہرگز ایسا مت کرنا (سنن ابن ماجہ، باب النکاح)

کلمۂ اسلام کی حقیقت اخلاص اور تقویٰ ہے

حضرت عثمان بن عفان کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ جو بندہ بھی اس کو واقعی اپنے دل سے کہے وہ آگ پر حرام ہو جائے گا۔ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ میں تم کو بتاؤں کہ وہ کلمہ کیا ہے۔ وہ اخلاص کا کلمہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر لازم کیا تھا۔ وہ تقویٰ کا کلمہ ہے جس کی تلقین اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کو موت کے وقت کی تھی۔ وہ اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (اخرج احمد عن عثمان بن عفان قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: انی لاعلم کلمۃ لا یقولھا عبد حقا من قلبہ الاحرم علی النار۔ قال عمر بن الخطاب انا احدثک ماھی۔ ھی کلمۃ الاخلاص التی الزمھا اللہ تعالیٰ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ وھی کلمۃ التقویٰ التی الاص علیھا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمہ ابا طالب عند الموت شھادۃ ان لا الہ الا اللہ)

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی غیبی حقیقتوں کو دیکھنے لگے

حضرت مالک بن انس کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے پوچھا کہ اے معاذ، تم نے کیسے صبح کی (کیف اصبحت یا معاذ) انھوں نے کہا کہ میں نے اللہ پر ایمان کے ساتھ صبح کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہر قول کا ایک مصداق ہوتا ہے اور ہر قول کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ پھر جو کچھ تم کہتے ہو اس کا مصداق کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول میں نے کبھی کوئی ایسی صبح نہیں کی جس میں مجھے یہ خیال نہ لگا ہوا ہو کہ اب میں شام نہ کرسکوں گا۔ اور کبھی میں نے کوئی ایسی شام نہیں کی جس میں مجھے یہ خیال نہ ہو کہ میں صبح نہ کرسکوں گا۔ اور میں نے کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جس میں مجھے یہ خیال نہ ہو کہ میں دوسرا قدم نہ اٹھاسکوں گا۔ اور گویا کہ میں گھٹنوں کے بل گری ہوئی ان تمام امتوں کو دیکھ

رہا ہوں جن کو اپنے اعمال نامہ کی طرف بلایا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ ان کا پیغمبر ہے۔ اور ان کے ساتھ وہ بت ہیں جن کو وہ خدا کے سوا پوجتی تھیں۔ اور گویا کہ میں اہل دوزخ کی سزا کو اور اہل جنت کے ثواب کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم معرفت کو پہنچ گئے، اب اسی پر جمے رہو، (عرفت فالزم، حلیۃ الاولیا لابی نعیم، جلد اوّل)

قرآن نصیحت کے لئے ہے نہ کہ محض تلاوت کے لئے

امام احمد نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ ان کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ رات کو قرآن پڑھتے ہیں اور رات بھر میں سارا قرآن ایک یا دو بار پڑھ ڈالتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان لوگوں نے پڑھا اور انھوں نے نہیں پڑھا۔ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساری رات کھڑی رہتی۔ آپ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورۃ النساء پڑھتے۔ جب بھی آپ کسی ایسی آیت سے گذرتے جس میں اللہ سے ڈرایا گیا ہے تو آپ ضرور اللہ سے دعا کرتے اور پناہ مانگتے۔ اور جب بھی آپ کسی ایسی آیت سے گذرتے جس میں بشارت ہو تو آپ ضرور اللہ سے دعا کرتے اور اس میں رغبت ظاہر کرتے (اخرج احمد عن عائشۃ رضی اللہ عنہا انہا ذکر لہا ان ناساً یقرؤن القرآن فی اللیل مرۃ او مرتین فقالت اولئك قرؤا ولم یقرؤا كنت اقوم مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ التمام فكان یقرأ بالبقرۃ وآل عمران والنساء فلایمر بآیۃ فیہا تخویف الا دعا اللہ واستعاذ ولا یمر بآیۃ فیہا استبشار الا دعا اللہ ورغب الیہ)

دنیا کی تکلیفوں پر صبر کرنے سے آخرت کے گناہ معاف ہوتے ہیں

حضرت ابو بکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی من یعمل سوء یجز بہ (جو شخص کوئی برائی کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا) اور کہا کہ اب ہمارے لئے بھلائی کی کیا صورت ہے۔ جو برائی بھی ہم نے کی ہے اس کی سزا ہم کو ملے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو بکر، خدا تمھیں معاف کرے۔ کیا تم بیمار نہیں ہوتے۔ کیا تم کو تھکن نہیں ہوتی۔ کیا تم غمگین نہیں ہوتے۔ کیا تم کو مصیبت نہیں پیش آتی۔ کیا تم کو ٹھوکر نہیں لگتی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ یہ سب تو پیش آتا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ گناہوں کا بدلہ دنیا میں دیا جاتا ہے (فھی ماتجزون بہ فی الدنیا، کنز العمال، جلد اول)

چھوٹوں کے جنازہ میں بھی بڑوں کو شرکت کرنا چاہیے

مدینہ میں ایک کالے رنگ کی باؤلی سی عورت تھی۔ وہ مسجد کا کوڑا صاف کیا کرتی تھی۔ اس کا انتقال ہوا تو چند لوگوں نے اس کی تدفین کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر نہ دی۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو مجھ کو اس کی اطلاع دیا کرو۔ اور آپ نے بعد کو اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

ایک سفر

حلقۃ الرسالہ کی دعوت پر میں ۱۶ نومبر ۱۹۸۲ کی شام کو حیدر آباد سے بھوپال پہنچا اور ۱۹ نومبر کی شام کو دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔

۱۶ نومبر کو جب کہ اے پی ایکسپریس مجھے لئے ہوئے تیزی سے بھوپال کی طرف بڑھ رہی تھی، میں اپنے ملک کے بارہ میں شدید غم کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں جس ڈبہ میں تھا اس میں تمام پڑھے لکھے لوگ تھے اور انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔ شیشہ بند ڈبہ میں ہم باہر کے شور سے محفوظ تھے۔ مگر اندر کے مسافر اتنے زور زور سے باتیں کر رہے تھے کہ دوسرے کیبن کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھیں۔ مثلاً ایک بار یہ آواز میرے کان میں آئی:

You are a senior officer

(آپ ایک سینئر افسر ہیں) ایک مرد اور عورت اپنے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ تھے۔ ان کے خوش پوش بچے مسلسل شور برپا کئے ہوئے تھے اور اپنے کیبن سے نکل کر باہر دوڑتے تھے مگر ان کے ماں باپ کو میں نے کبھی منع کرتے نہیں سنا۔ "ایر کنڈیشنڈ کار" میں ہم مشینی شور سے محفوظ تھے۔ مگر انسانی شور کا یہ حال تھا کہ میرے لئے پڑھنا لکھنا مشکل ہو گیا۔

مجھے ۳۰ اگست ۱۹۸۲ کا واقعہ یاد آیا جب کہ میں مالٹا سے پیرس جا رہا تھا۔ ہوائی جہاز میں مجھے ملی ہوئی سیٹ پر دو فرانسیسی بچے بیٹھے ہوئے تھے جو مالٹا میں چھٹیاں گذار کر اپنے وطن فرانس واپس جا رہے تھے۔ یہ بچے جو بھائی بہن تھے اکثر آپس میں باتیں کرتے تھے مگر قریب ہونے کے باوجود ایک بار بھی ان کا کوئی جملہ مجھے سنائی نہیں دیا۔ میں نے جب بھی ان سے کوئی سوال کیا تو انھوں نے نہایت آہستگی اور تہذیب کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

جس ملک میں اونچے پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال ہو اس کے بارہ میں کس طرح کوئی اچھی امید قائم کی جا سکتی ہے۔

بھوپال میں پہلا پروگرام ۱۷ نومبر کو ۱۱ بجے دن میں ہوا۔ یہ پروگرام صدر منزل میں بھوپال یونیورسٹی کے تحت تھا۔ جناب عزیز قریشی (چیئر مین مدھیہ پردیش اسٹیٹ فنشریز ڈولپمنٹ کارپوریشن) اور ڈاکٹر آر سی شکلا (وائس چانسلر بھوپال یونی ورسٹی) بحیثیت صدر اور چیف گیسٹ ڈائس پر موجود تھے۔ ڈاکٹر مسز عارفہ سیمین (ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف عربک بھوپال یونیورسٹی) نے اجتماع کی کارروائی چلائی۔ مقررہ

عنوان کے مطابق میں نے "ریلیجن اینڈ کلچر" کے بارہ میں تقریر کی۔ سرکاری عہدیدار اور غیر مسلم حضرات قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے، اسی دن شام کو دارالعلوم تاج المساجد کے طلبہ کے سامنے علم اور تعلیم کے موضوع پر خطاب کیا۔

۷ انومبر کی شام کو مغرب کے بعد اخبار ایاز کے دفتر میں اجتماع تھا۔ کافی بڑی تعداد جمع تھی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سکریٹری جناب کشا بھاؤ ٹھاکرے (پیدائش ۱۹۲۲) بھی اجتماع میں موجود تھے۔ جن سنگھ اور آر ایس ایس سے تعلق رکھنے والے مدھیہ پردیش کے ممتاز افراد تقریباً سب کے سب جمع تھے۔ جناب کشا بھاؤ ٹھاکرے میری تقریر شروع سے آخر تک غور سے سنتے رہے۔ ان سے اظہار خیال کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے اپنی تقریر میں نہایت کھلے لفظوں میں میری تقریر کے بارہ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کی تقریر کے بعض حصے ان کے اپنے الفاظ میں ٹیپ سے لے کر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

شری کشا بھاؤ ٹھاکرے کی تقریر

آدرنیہ مولانا صاحب، آج اس کاریہ کرم میں جو بھاشنر ہمارے سامنے ہوا اس سے ہم کو بڑی خوشی ہوئی۔ میں اردو جانتا نہیں لیکن ہمارے ساتھی سارنگ جی صاحب الرسالہ پڑھتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں کہ بھائی یہ تو بڑا امانسک میگزین ہے۔ اور آج اس میگزین کے سمپادک مہودے سے تفصیل سے بات سننے کو ملی۔

واستو میں آج ساری دنیا میں ہر جگہ جھگڑے کی بات سنائی دیتی ہے۔ گھر گھر میں کی بات سنائی دیتی ہے۔ پر ایسے واتاورن میں جب اس پرکار کی تقریر سننے کو ملتی ہے تو آدمی کو پر درشن ہوتا ہے۔ آدمی کے جلے ہوئے زخم میں جب کوئی تیل لگاتا ہے تو ایک پرکار کا آنند آتا ہے، اسی پرکار کا آنند آج آیا۔ واستو میں مولانا صاحب نے جو کہا وہ تو جتنا سنتے جاؤ اتنا ہی آنند آئے گا۔ اس پرکار سننے کو بہت کم ملتا ہے لیکن جتنا بھی سنو کم ہے۔ جتنا انھوں نے کہا اس میں سے تھوڑا بھی حصہ ہم اپنی زندگی میں اتار لیں تو بہت بڑا کام ہے۔ آج اس پرکار کے سنکار دینے والے بہت کم ہیں۔ آج ہمیں اس پرکار کے ویکتیوں کا بھاشنر سننے کو ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ میں اس سے بہت خوش ہوں کہ مولانا صاحب نے ہمارے بیچ میں اپنا سمے بتایا میں اس کا بہت آبھاری ہوں اور میں چاہوں گا کہ ہمیں بار بار یہ بات سننے کو ملے۔

۱۸ نومبر کی شام کو ٹی ٹی نگر کی مسجد میں نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں زیادہ تر

سروس کرنے والے لوگ شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے آخرت کے بارہ میں تقریر کی۔ اسی دن ایک اور اجتماع ایک صاحب کے مکان پر ہوا۔ اس اجتماع میں میں نے اپنے حالیہ سفر (ایشیا یورپ اور افریقہ) سے متعلق اپنے تاثرات اور واقعات بیان کئے۔

۱۹ نومبر کی شام کو مسجد قدسیہ بیگم میں نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ افراد کی اچھی تعداد اکٹھا ہو گئی تھی۔ کچھ غیر مسلم حضرات بھی شریک تھے۔ میں نے اسلام کی تعلیمات کے موضوع پر تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ بعد کو لوگوں نے غیر معمولی تاثرات کا اظہار کیا۔

بھوپال کی تقریریں شاید الرسالہ میں شائع نہ ہو سکیں۔ تاہم ان سب کا ٹیپ بھوپال والوں کے پاس موجود ہے۔ تمام تقریریں ٹیپ کی مدد سے دوبارہ سنی جا سکتی ہیں۔

بھوپال کا سنجیدہ طبقہ اہتمام کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ایک صاحب جو گورنمنٹ میں سکریٹری کے عہدہ پر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ اس نے میری لڑکی کو الحاد سے بچایا ہے۔ اس خاتون نے انگریزی سے ایم اے کیا ہے اور آج کل وہ ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں وہ ایک مدت تک روسیوں کے ساتھ رہی ہیں اور روسی زبان بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔

یہ خاتون کمیونسٹ لٹریچر پڑھ کر مذہب سے بیزار ہو گئی تھیں۔ ان کے والدین نے ان کو اسلامی لٹریچر پڑھانے کی کوشش کی مگر انھوں نے دل چسپی نہ لی۔ اس قسم کی کتابوں کو دیکھ وہ الگ رکھ دیتی تھیں۔ اس کے بعد ان کو الرسالہ پڑھنے کے لئے دیا گیا۔ اس سے انھیں دل چسپی ہوئی۔ اب وہ الرسالہ کو باقاعدہ طور پر پڑھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے والد سے الرسالہ کے بارے میں اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ مجھ کو اپیل کرتا ہے۔

This appeals to me

۱۸ نومبر کو ایک ممتاز شخصیت کے مکان پر خصوصی نشست ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک تھے۔ ایک صاحب نے کہا: برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک مذہب کا دور تھا۔ مگر مذہب کے دور میں انسان کچھ ترقی نہ کر سکا۔ انسان کو جو کچھ ملا ہے سائنس کے دور میں ملا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات ایک تبدیلی کے ساتھ درست ہے۔ قدیم زمانہ میں غلبہ مذہب کا نہیں بلکہ مشرکانہ مذہب کا تھا۔ شرک تمام چیزوں کو معبود کا درجہ دے کر تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ توحید کا انقلاب آیا تو اس نے چیزوں کو معبود کے مقام سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد انسان نے اشیاء کی تحقیق شروع کی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ انقلاب آیا جس کو سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

ایک آیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ــــــــ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا گمان ہے کہ وہ قرآن پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔ حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انھیں بھٹکا کر بہت دور کر دینا چاہتا ہے۔ (النساء ۶۰)

کچھ لوگ اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ: "یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو۔ اور وہ نظام عدالت جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لئے لے جانا ایمان کے منافی ہے۔ خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔" اس تشریح کے بعد فوراً یہ لوگ دوسرا نتیجہ یہ نکال لیتے ہیں کہ مسلمان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مشرکانہ اور کافرانہ نظام حاکمیت کو توڑے اور اسلام کی بنیاد پر حاکمیت کا نظام قائم کرے تاکہ اس کے لئے اپنے معاملات میں خدائی قانون کے مطابق فیصلہ لینا ممکن ہو سکے۔

اس قسم کے "انقلابی" نظریہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قرآن کے ایک سادہ اور عام حکم کو غلط طور پر سیاسی معنی پہنانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے انفرادی دینی تقاضوں کو بیان کر رہی ہے نہ کہ مذکورہ معنی میں اجتماعی انقلاب کا سیاسی سبق دے رہی ہے۔ ہندستان کے پس منظر میں اس آیت کو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

آج ہر جگہ یہ صورت حال ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آپسی جھگڑے برپا ہیں۔ کوئی بستی اور کوئی محلہ اس قسم کے باہمی جھگڑوں سے خالی نہیں ہے۔ ان جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے مسلمانوں کا طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک پہلی فرصت میں اپنے جھگڑے کو ملک کی عدالت میں لے جاتا ہے جس کو وہ اپنے عقیدے کے مطابق کافر اور مشرک عدالت سمجھتا ہے۔ مگر اس سے بے پرواہ ہو کر ہر ایک انھیں عدالت کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اور اس میں اپنے وقت اور اپنے مال کا بہترین حصہ خرچ کر رہا ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت اسی روش کے خلاف مسلمانوں کو تنبیہ کر رہی ہے۔ اس میں ان لوگوں پر نکیر ہے جو خدا کی کتاب کے آگے نہیں جھکتے البتہ طاقت کے آگے جھک جاتے ہیں خواہ وہ طاغوت ہی کیوں نہ ہو۔

October 1983

AL-RISALA

Islamic Monthly

Submission to God
is the only religion
for both
Man and the Universe.

Published by The Islamic Centre, Delhi

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ـــــ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ـــــ الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱ - تذکیر القرآن جلد اوّل ہدیہ ۵۰/-

۲ - الاسلام ۱۵/-

۳ - مذہب اور جدید چیلنج ۲۰/-

۴ - ظہور اسلام ۲۰/-

۵ - احیاء اسلام ۱۲/-

۶ - پیغمبر انقلاب ۲۰/-

۷ - دین کیا ہے ۲/-

۸ - قرآن کا مطلوب انسان ۵/-

۹ - تجدید دین ۳/-

۱۰ - اسلام دین فطرت ۳/-

۱۱ - تعمیر ملت ۳/-

۱۲ - تاریخ کا سبق ۳/-

۱۳ - مذہب اور سائنس ۵/-

۱۴ - عقلیات اسلام ۳/-

۱۵ - فسادات کا مسئلہ ۲/-

۱۶ - انسان اپنے آپ کو پہچان ۱/-

۱۷ - تعارف اسلام ۲/۵۰

۱۸ - اسلام پندرھویں صدی میں ۲/-

۱۹ - راہیں بند نہیں ۳/-

۲۰ - ایمانی طاقت ۳/-

۲۱ - اتحاد ملت ۳/-

۲۲ - سبق آموز واقعات ۳/-

۲۳ - زلزلۂ قیامت ۴/-

۲۴ - حقیقت کی تلاش ۳/-

۲۵ - پیغمبر اسلام ۲/-

۲۶ - منزل کی طرف ۶/-

۲۷ - حقیقت حج (زیر طبع)

۲۸ - Mohammad The Ideal Character 3/-

تعارفی سٹ

۲۹ - سچا راستہ ۱/-

۳۰ - دینی تعلیم ۲/-

۳۱ - حیات طیبہ ۲/۵۰

۳۲ - باغ جنت ۲/-

۳۳ - نار جہنم ۲/-

مکتبہ الرسالہ □ جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی ۶

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

A.W
29.9.83

عقل مند آدمی کرنے سے پہلے سوچتا ہے
اور بیوقوف آدمی کرنے کے بعد ـــــــ

اکتوبر ۱۹۸۳ ☐ قیمت فی پرچہ ـ تین روپے ☐ شمارہ ۸۳

29-6-

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

اکتوبر ۱۹۸۳
شمارہ ۸۳

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

AL-RISALA

Islamic Monthly

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کے انگریزی اڈیشن کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہوگا۔ نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ انگریزی الرسالہ کے ٹائٹل کا نمونہ زیر نظر شمارہ کے آخری صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

دوست کی خاطر

اگر آپ کسی سفر پر جانے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچیں اور وہاں اپنے دوستوں سے ملنے میں بہت زیادہ دیر لگا دیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی پرواز کھو دیں۔ آپ ملاقات کی سیٹ پر لمبی بات چیت میں مشغول ہوں اور ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت آجائے اور وہ آپ کو لئے بغیر اڑ جائے۔ لیکن اگر آپ کا "دوست" ملک کا حکمراں ہو تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔

ہندستان کی حکمراں پارٹی کے دو ممبران پارلیمنٹ مسٹر ارن نہرو اور مسٹر اودے سنگھ راؤ گائیکواڑ کیوبا گئے۔ وہاں ان کو کیوبا کی سالانہ تقریبات میں شرکت کرنا تھا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ اگست ۱۹۸۳) کی رپورٹ کے مطابق تقریبات کی تکمیل کے بعد انھوں نے چاہا کہ کیوبا کے صدر ڈاکٹر فیڈل کیسٹرو (Dr. Fidel Castro) سے ملاقات کریں۔ انھوں نے صدر کے دفتر میں اپنی درخواست بھجوائی۔ دو دن کے انتظار کے بعد انھیں جواب ملا کہ صدر نے آپ دونوں کو آج رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ مگر ایم پی صاحبان نے محسوس کیا کہ وہ صدر کی اس عنایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کیوں کہ اسی دن شام کو ۵ بجے ان کا واپسی کا رزرویشن تھا۔ انھوں نے صدر کے دفتر میں معذرت کا پیغام بھیج دیا اور اپنے پروگرام کے مطابق ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

وہ لوگ ہوانا ایرپورٹ پر تھے کہ اچانک ڈاکٹر کیسٹرو برآمد ہوئے۔ وہ اپنے "انڈین فرینڈس" سے ملنے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچے تھے۔ انھوں نے دونوں ہندستانی ایم پی سے پرجوش ملاقات کی اور وی آئی پی لاونج میں بیٹھ کر ان سے بے تکلف باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر کیسٹرو کے مترجم نے محسوس کیا کہ ایم پی صاحبان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ معزز صدر کی بات لمبی ہوتی جا رہی ہے اور گھڑی کے مطابق ہماری جہاز کی اڑان کا وقت ہو گیا ہے۔ مترجم نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ مطمئن رہیں آپ کا جہاز اس وقت تک اڑان نہیں کرے گا جب تک ڈاکٹر کیسٹرو اس کو گرین سگنل نہ دے دیں:

Your plane will not take off until Dr. Castro gives the green signal.

ہوائی اڈہ کے ذمہ داروں کے علم میں اگر یہ بات آجائے کہ ملک کا حکمراں ہوائی اڈہ کے انتظار گاہ میں اپنے دوست مسافر سے بات کر رہا ہے تو وہ خود ہی ہوائی جہاز کو اس کے سوار ہونے تک روکے

رہیں گے۔ اس کے بعد حکمراں کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ باقاعدہ طور پر اس کے لئے ہدایت نامہ جاری کرے۔

یہ معاملہ جس کا تجربہ ہندستان کے ایم پی صاحبان کو ایک ملک کے حکمراں کے بارے میں ہوا، یہی زیادہ بڑے پیمانے پر کائنات کے حکمراں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگر آپ مالک کائنات کے کام میں لگے ہوئے ہوں۔ اگر زمین و آسمان کے بادشاہ سے آپ کی ملاقات جاری ہو تو آپ کا معاملہ عام معاملہ نہیں رہتا بلکہ خاص معاملہ بن جاتا ہے۔ خدا میں مصروف ہونے کی وجہ سے جو کام آپ بطور خود نہ کر سکے وہ خدا کی دوسری مخلوقات آپ کی طرف سے انجام دے دیں گی۔ جہاں عام لوگوں کے کام بگڑتے ہیں وہاں آپ کے کام بن جائیں گے۔ جب لوگ مواقع کھو دیتے ہیں اس وقت مواقع خود انتظار کریں گے کہ آپ آئیں اور ان کو استعمال کریں۔

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ درمیان میں نماز کا وقت آگیا۔ لوگوں کی رائے ہوئی کہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ اگلے اسٹیشن پر ٹرین کھڑی ہوئی تو پوری جماعت پلیٹ فارم پر اتر گئی۔ کسی نے کہا کہ یہاں ٹرین صرف دو منٹ رکتی ہے۔ آپ لوگ نماز پڑھتے رہیں گے اور گاڑی چلی جائے گی۔ قافلہ کے امیر نے کہا کہ ہم اللہ کا کام کرنے جا رہے ہیں اور گاڑی بھی اللہ کی ہے۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہم کو لئے بغیر آگے چلی جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوگوں نے پورے اطمینان کے ساتھ پلیٹ فارم پر با جماعت نماز ادا کی۔ گاڑی کے انجن نے صرف اس وقت سیٹی دی جب کہ وہ لوگ نماز سے فارغ ہو کر اپنے ڈبہ میں واپس آچکے تھے۔

ایک ملک کے صدر کے دوستوں کے لئے اگر ہوائی جہاز رک سکتا ہے تو ہمیں تعجب نہیں کرنا چاہئے اگر خدا کے دوستوں کی خاطر زمین و آسمان کی گردشیں رک جائیں۔ بشرطیکہ زمین پر یہ واقعہ رونما ہو کہ خدا کے کچھ بندے خدا کو اپنا دوست اور اپنا کارساز بنالیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کیس کو خدا کا کیس نہیں بنایا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں قومی جذبات کے تحت کر رہے ہیں نہ کہ ربّانی جذبات کے تحت۔ ان کی تحریکیں اور ان کے لیڈروں کی سرگرمیاں بتاتی ہیں کہ ان کا کیس ابھی تک صرف مادی مفادات اور قومی مسائل کا کیس ہے۔ وہ خدا کے لئے نہیں بلکہ غیر خدا کے لئے سرگرم ہیں۔ ایسی حالت میں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قوموں سے بچھڑ جائیں۔ ان کا "جہاز" ان کو ساتھ لئے بغیر اڑ جائے۔

فطرت کی خلاف ورزی

خنزیر کا لفظ اکثر زبانوں میں برا مفہوم رکھتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خنزیر عام طور پر گندگی کھاتا ہے۔ اس بنا پر اس کے نام کے ساتھ گندگی کا تصوّر وابستہ ہوگیا۔ انگریزی میں کہتے ہیں:

Pig turns man into a pig.

یعنی سور (کا گوشت) آدمی کو بھی سور بنا دیتا ہے۔ ویبسٹرڈکشنری میں لفظ پگ (Pig) کا چوتھا مفہوم حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔

a person regarded as acting or looking like a pig., a greedy or a filthy person. (Clloq.)

یعنی سور جیسا آدمی، لالچی اور گندہ آدمی۔ فرانسیسی میں خنزیر کو کوشوں (couchon) کہتے ہیں۔ یہ لفظ فرانسیسی زبان میں پگ سے بھی زیادہ برے معنی رکھتا ہے۔

خنزیر کو گندہ خوراک سے بچانے کے لئے موجودہ زمانہ میں اعلیٰ قسم کے بڑے بڑے فارم بنائے گئے ہیں۔ پگ کیپنگ (Pig-keeping) اب ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ پگ فارموں میں ان کے لئے خاص طور پر صاف ستھری غذاؤں کا انتظام کیا جاتا ہے اور دوسری سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔

تاہم خنزیر کے فارم مغربی دنیا میں اب تنقید کا موضوع بن رہے ہیں۔ لندن کے اخبار گارجین (۲۹ مئی ۱۹۸۳) میں دو کالم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ کیا خنزیر ختم ہونے والے ہیں:

Are pigs doomed ?

مضمون نگار (Ralph Whitlock) نے دکھایا ہے کہ مغرب میں خنزیر کے جدید فارم اب دن بدن ناقابل برداشت ہوتے جارہے ہیں کیونکہ خنزیر مضمون نگار کے الفاظ میں انسان کا مدّمقابل (Competitor) ہے۔ یعنی وہ وہی خوراک کھاتا ہے جو انسان کھاتا ہے۔ خنزیر نہ گھاس کھاتا ہے اور نہ گوشت۔ اس کو غلّہ کی بنی ہوئی چیزیں (ڈبل روٹی وغیرہ) کھلانی پڑتی ہیں۔ مزید یہ کہ خنزیر بہت پیٹو جانور ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر زیادہ غذا کھاتا ہے۔ چند خنزیر اگر کسی بیکری میں داخل ہو جائیں تو وہ وہاں کی تمام ڈبل روٹی اور پنیر کھا کر ختم کر دیں گے۔

موجودہ زمانہ میں خنزیر کی خوراک میں کفایت کی خاص کوشش کی جارہی ہے۔ خنزیر کے فارموں میں کمپیوٹروں کے ذریعہ ان کی خوراک پر کنٹرول کیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ کھا سکیں۔ مگر ان ساری کوششوں کے بعد بھی خنزیر کا یہ حال ہے کہ اس کے لاشہ میں ایک پونڈ کا اضافہ کرنے کے لئے اس کو ۵ پونڈ خوراک کھلانی پڑتی ہے،

Despite all modern aids to economic production, it still takes about 5 pounds of pig food to produce one pound of weight increase in the pig's carcase.

مضمون نگار کے الفاظ میں یہ خنزیر کی بنیادی کمزوری (Fundamental Weakness) ہے۔ بکری اور گائے گھاس کو گوشت میں تبدیل کرتے ہیں۔ گویا جس چیز کو انسانی معدہ براہ راست ہضم نہیں کرسکتا اس کو خود کھاکر دودھ اور گوشت کی صورت دیتے ہیں اور ہمارے لئے کھانے کے قابل بناتے ہیں۔ مگر خنزیر کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ وہ خود انسان کی غذا (ڈبل روٹی وغیرہ) کھاتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ۵ پونڈ انسانی غذا کھاکر صرف ایک پونڈ گوشت انسان کو واپس کرتا ہے۔ خنزیر صرف یہ کرتا ہے کہ سستی خوراک کو مہنگی خوراک بنادے:

The pig can only translate a cheap food into an expensive one

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ آبادی کا انفجار ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایٹمی جنگ سے بھی زیادہ بڑا خطرہ ہے:

The population explosion is a far greater threat than that of nuclear war.
tnan that of nuclear war.

زمین پر انسانی آبادی ہندسی نسبت (Geometrical Progression) سے بڑھ رہی ہے۔ ماہرین کے اندازہ کے مطابق ۲۰۱۵ میں دنیا کی موجودہ آبادی دگنا ہوجائے گی۔ ایسی حالت میں خنزیر کا مستقبل، مضمون نگار کے نزدیک، اکیسویں صدی میں یہ نظر آتا ہے کہ ان کی بہت تھوڑی تعداد کو چھاچھ اور ٹکڑوں کی خوراک مل سکے گی۔ اور بقیہ تمام خنزیر غذائی اشیاء کی قلت کے سبب دوبارہ گندگی کھانے والے جانور (Scavenger) بن کر رہ جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ خنزیر یا تو گندگی کھاتا ہے یا انسانی خوراک۔ خنزیر کو خدا نے اس لئے بنایا تھا کہ وہ گندگی کو اپنی خوراک بناکر "صفائی کرم چاری" کا کام انجام دے۔ مگر انسان نے اس کو اپنی خوراک بنالیا اور اس کی خاطر جدید طرز کے بڑے بڑے فارم بنائے۔ قدرت کے نظام میں یہ مداخلت صرف اس قیمت پر ہوئی کہ انسان اپنی خوراک کا زیادہ حصہ اس کو کھلاکر اس سے اپنے لئے کم خوراک حاصل کرے۔

خدا نے اپنی دنیا کا جو نظام بنایا ہے وہ حد درجہ حکمت پر مبنی ہے۔ اس میں مختلف پہلوؤں کی جامع رعایت ہے۔ انسان کے لئے واحد درست راستہ یہ ہے کہ وہ قدرت کے نظام کی پیروی کرے۔ جب بھی وہ اس نظام کے بدلنے کی کوشش کرے گا تو وہ صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اس کے بعد ماحول میں کوئی نئی خرابی پیدا ہوجائے۔

جہاد کے نام پر

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں روہیل کھنڈ (شمالی ہند) میں روہیلہ خاندان کے نواب رحمت خاں کی حکومت تھی۔ یہ افغانی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ہوش سے زیادہ جوش کے مالک تھے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ان کی مخالفت ہوگئی۔ کمپنی نے اودھ (لکھنو) کے نواب شجاع الدولہ کو نواب رحمت خاں سے لڑادیا۔ اس جنگ میں نواب شجاع الدولہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد حاصل تھی چنانچہ ان کو کامیابی ہوئی اور ۱۷۷۴ میں میرن پور کٹرہ کی جنگ میں نواب رحمت خاں مارے گئے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نواب شجاع الدولہ کی حکومت اودھ اور روہیل کھنڈ (لکھنؤ سے لے کر بریلی) تک قائم ہوگئی۔ تاہم یہ حکومت صرف ۲۷ سال باقی رہی۔ ۱۸۰۱ء میں ادائیگی قرض کے نام پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے روہیل کھنڈ کو براہ راست اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اس زمانہ میں ایک مفتی محمد عیوض بدایونی تھے جو بریلی میں افتاء کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کا تقرر نواب رحمت خاں کے زمانہ میں ہوا تھا۔ تاہم بعد کے زمانہ میں بھی وہ بدستور اپنے عہدہ پر باقی رہے۔ طویل خاندانی روایت کی وجہ سے عوام کے اندر ان کو بڑا ادب واحترام حاصل تھا۔ عوام کے علاوہ حکومت کے حلقے بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ اس دوطرفہ مقبولیت کو اگر وہ حکمت کے ساتھ استعمال کرتے تو وہ کوئی بڑا دینی کام کرسکتے تھے۔ مگر اس کو انھوں نے بے معنیٰ تصادم میں ضائع کر دیا۔

۱۸۱۴ کا واقعہ ہے جب کہ روہیل کھنڈ میں انگریزی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ انھوں نے نظم ونسق کو مضبوط بنانے کے لئے ایک اقدام کیا۔ انھوں نے ایک قانون پاس کیا جو "چوکیداری ٹیکس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت بڑے بڑے شہروں میں پولیس کی تنظیم قائم کی جائے اور اس خرچ کو چوکیداری ٹیکس وصول کرکے پورا کیا جائے۔

چوکیداری ٹیکس کا قانون روہیل کھنڈ کے علاقہ کے دوسرے مقامات پر کسی احتجاج یا مزاحمت کے بغیر نافذ ہوگیا۔ لیکن بریلی میں صورت حال برعکس تھی۔ بریلی نوابی دور سے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں سابق نواب رحمت خاں کے بچے ہوئے افراد خاندان موجود تھے۔ انھوں نے چوکیداری ٹیکس کو بہانہ بنایا اور اس کے نام پر انگریزی حکومت کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس معاملہ میں مفتی محمد عیوض نے ان کا پورا ساتھ دیا۔

اب سیاست اور مذہب دونوں ایک ہوگئے۔ مفتی محمد عیوض نے فتویٰ دیا کہ چوکیداری ٹیکس

سراسر ناجائز ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے اوپر جزیہ لگانے کے ہم معنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے کے مسلم عوام اس ٹیکس کے خلاف ہو گئے۔ خاص طور پر افغانی پٹھان بڑی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جو پہلے سے انگریزوں سے بگڑے ہوئے تھے، کیونکہ انگریزوں نے ان کی افغان حکومت کو اس علاقے سے ختم کیا تھا۔

مفتی محمد عیوض کے فتوے کے بعد مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات ابھر آئے۔ شہر بریلی میں زبردست ہڑتال کی گئی۔

مسٹر ڈمبلٹن اس وقت یہاں ضلع مجسٹریٹ تھے۔ مسٹر ڈمبلٹن نے چوکیداری ٹیکس کی وصولی کے لیے ۱۶ اپریل ۱۸۱۶ء کی قطعی تاریخ مقرر کر دی اور اس کا اعلان کرا دیا۔ جب یہ تاریخ آئی تو بریلی کے مسلم عوام بڑی تعداد میں مفتی محمد عیوض کے مکان کے سامنے جمع ہو گئے۔ مفتی صاحب نے اس مجمع کی قیادت سنبھال لی۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز مجسٹریٹ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی طرف آ رہا ہے۔ انھوں نے عوام کو ہدایت کی کہ انگریز مجسٹریٹ کو آگے بڑھنے سے روکیں اور اس کو یہاں نہ آنے دیں۔ اس کے بعد جو ہونے والا تھا وہی ہوا۔ انگریز مجسٹریٹ نے بھی آگے بڑھنے پر اصرار کیا جس کی وجہ سے انگریزی پولیس اور مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے درمیان تصادم ہو گیا۔ اس کا نقصان مفتی محمد عیوض اور ان کے حامیوں کو پہنچا کیوں کہ ان کے پاس لاٹھی ڈنڈے کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا جب کہ انگریز پولیس بندوقوں سے مسلح تھی۔ اس نے مجمع پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں بہت سے افراد ہلاک ہو گئے اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔

تاہم مفتی محمد عیوض نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے حسینی باغ (بریلی) میں مسلمانوں کو جمع کیا اور یہاں پر جوش تقریر کرتے ہوئے جہاد کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی حکومت سے اسلام کو خطرہ ہے۔ اس لئے اس سے لڑنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اب اطراف کے علاقوں سے بھی لوگ آنے لگے اور چند دن کے اندر تقریباً پانچ ہزار روہیلہ پٹھان تلواروں اور آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مفتی محمد عیوض کی سواری میں جمع ہو گئے۔

انگریزوں نے مصالحت دکھائی اور گفت و شنید سے مسئلہ کو حل کرنا چاہا۔ مگر مفتی محمد عیوض صاحب جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف بریلی، رامپور، پیلی بھیت، بجنور، بدایوں، شاہجہاں پور تک کے پٹھان جہاد کا اعلان سن کر آتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً ۱۵ ہزار ہو گئی۔

مفتی محمد عیوض کے حوصلے اب بہت بڑھ گئے۔ انھوں نے صلح کے لئے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے مندرجہ ذیل چار شرطیں پیش کیں۔

۱ چوکیداری ٹیکس کو منسوخ کیا جائے۔

۲ بریلی کے انگریز کوتوال کو ہمارے حوالے کیا جائے تاکہ ہم اس کے اوپر شرعی سزا نافذ کریں۔

۳ پولیس فائرنگ میں ہلاک ہونے والوں کے وارثین کو معقول معاوضہ دیا جائے۔

۴ چوکیداری ٹیکس کے تمام مظاہرین کی عام معافی کا اعلان کیا جائے۔

انگریز حکومت تمام شرطوں کو مان سکتی تھی۔ مگر وہ دوسری شرط کو کسی قیمت پر نہیں مان سکتی تھی۔ دوسری طرف مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ گفت وشنید کے دوران بھی وہ پر امن نہ رہے۔ عین اس زمانہ میں ان میں سے کچھ لوگوں نے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کولیسٹر کے لڑکے کو قتل کر دیا۔ بالآخر انگریز سپاہیوں کی بڑی تعداد نے ۱۸ اپریل ۱۸۱۶ کو مفتی محمد عیوض کے حامیوں پر حملہ کر دیا۔ سخت جنگ ہوئی مگر انگریزی بندوقوں کے مقابلہ میں روہیلے افغانوں کے روایتی ہتھیاروں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سو روہیلے جان سے مارے گئے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔

اس کے بعد روہیلے افغانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگے۔ مفتی محمد عیوض کا تیاری کے بغیر جہاد ایک ہی دن کے مقابلہ میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مفتی محمد عیوض بریلی چھوڑ کر رامپور چلے گئے جہاں صرف ایک سال میں ان کا انتقال ہو گیا —— چوکیداری ٹیکس کو برداشت نہ کرنے والا بالآخر ملت کو اس سے بہت زیادہ بڑی بربادی کے حوالے کر کے اس دنیا سے چلا گیا۔

اس قسم کی بے معنی لڑائیاں جو ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ملت کے اندر جاری ہیں وہ ہرگز جہاد نہیں ہیں۔ یہ جہاد کے نام پر اپنے جان ومال کو ضائع کرنا ہے۔

جہاد دراصل اللہ کی راہ میں کوشش کرنا ہے۔ اور اللہ کا کام دعوت الی اللہ ہے۔ اہل ایمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی تمام ممکن قوتوں کو دعوت الی اللہ کے میدان میں لگائیں۔ وہ دوسری قوموں کو ہدایت خداوندی کے راستہ پر لانے کی کوشش کریں۔ یہی اہل ایمان کا اصل جہاد ہے۔

مسلمانوں کو اس اصل جہاد کا صحیح احساس نہیں۔ اگر ان کو اس کا احساس ہو تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے کو اپنے لئے حرام سمجھ لیں۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی غیر متعلق باتوں میں الجھنے سے داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ختم ہوتی ہے اور معتدل فضا کے بغیر کسی کو کوئی دعوت نہیں دی جا سکتی۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ چھوٹی چھوٹی ناخوشگواریوں کو برداشت کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ یقینی طور پر خدا کے نزدیک مجرم ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مدعو اقوام سے لڑ پڑنا اور اس کو جہاد بتانا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں ان کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ یہ یقینی طور پر نفسانیت ہے نہ کہ خدائی جہاد۔

دوبارہ زمین پر

۲۸ فروری ۱۹۸۲ کو مجھ پر ایک انوکھا تجربہ گزرا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں اپنے جسم سے جدا ہو کر دوسری دنیا میں چلا گیا تھا۔ پھر دوبارہ میں زمین پر واپس آیا۔ یہ تجربہ ایسا انوکھا تجربہ تھا جس کو انسانی لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس کی ظاہری کہانی کو کسی حد تک ضرور بیان کیا جا سکتا ہے۔

نئی دہلی (کرزن روڈ) پر راقم الحروف کا ماہانہ درس قرآن ہوتا ہے۔ اس کا سلسلہ اولاً ۲۹ جون ۱۹۸۰ کو شروع ہوا تھا۔ یہ درس پابندی کے ساتھ جاری ہے اور اس کا وقت ہر مہینہ کے آخری اتوار کو بعد نماز مغرب ہے۔

۲۸ فروری کو اسی قسم کے درس کا دن تھا۔ میں حسب معمول اپنے گھر سے کرزن روڈ گیا۔ اور مغرب بعد قرآن کا درس دیا۔ یہ درس وہی تھا جو بعد کو تفصیلی صورت میں تحریر ہو کر احیاء اسلام نامی کتاب میں "احیاء اسلام" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس روز دہلی میں بارش ہوئی تھی۔ سڑکوں پر جگہ جگہ پانی تھا۔ رات کے تقریباً ۹ بجے تھے۔ میں حسب معمول درس قرآن سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ساتھیوں نے روکا کہ آج رات کو یہیں رہ جائیں۔ اور صبح کو یہاں سے جائیں۔ آپ کے گھر پر ٹیلی فون سے مطلع کر دیا جائے گا۔ مگر میں بارش کی پروا کئے بغیر ان سے معذرت کرکے نکل پڑا۔ سڑک پر پہنچا تو کوئی سواری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں آگے چلتا رہا کہ جہاں کوئی سواری ملے گی اس کو پکڑ لوں گا۔ مگر اتفاق سے کوئی سواری دکھائی نہ دی۔ اتوار اور بارش کی وجہ سے سڑکوں پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میں اس وقت تنہا تھا۔ کرزن روڈ سے گزر کر میں کناٹ پلیس کے علاقہ میں آیا۔ اس کے بعد پیدل چلتے ہوئے اس سڑک پر پہنچا جس کو منٹو روڈ کہا جاتا ہے۔ میں ہلکی بارش میں بھیگتا ہوا برابر چل رہا تھا۔ اس وقت طبیعت میں نامعلوم طور پر ایک عجیب سرور تھا۔ یہ سفر میرے لئے ایک قسم کا روحانی سفر بن گیا جس نے موسم کی نامساعدت کو میرے لئے غیر اہم بنا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں خدا کے فیضان میں نہاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔ تنہائی کے باوجود مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی عظیم قوت میرے ساتھ ہے۔ کوئی اپنی خصوصی رحمتوں کے ساتھ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے

ہے۔ مجھے اس وقت نہ تکان کا احساس تھا اور نہ بھیگنے کا۔ مجھ کو نہ رات کا سناٹا ستا رہا تھا اور نہ تنہا پیدل سفر کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مجھے نامعلوم طور پر کسی خاص منزل کی طرف کھینچے چلا جا رہا ہے۔

میں چلتے چلتے ریلوے پل اور اجمیری گیٹ کے درمیان پہنچا۔ یہاں میرے بائیں طرف بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ اس کھمبے کے نچلے حصہ میں بائیں طرف بجلی کے تاروں کا وہ مشترکہ خانہ تھا جس کو جنکشن باکس (Junction Box) کہا جاتا ہے۔ جنکشن باکس کا ڈھکن غائب تھا اور وہ بالکل کھلا ہوا تھا۔ اگرچہ سڑک پوری خالی تھی۔ مگر میں اپنی عادت کے مطابق بالکل کنارے پر چل رہا تھا۔ بجلی کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس کے بائیں طرف مجھے پانی نظر آیا۔ میں نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ بارش کی وجہ سے سڑک پر جگہ جگہ اس قسم کا معمولی پانی تھا اور میں برابر ان سے گزر رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ ایک دو انچ سے زیادہ گہرا نہیں ہوگا اور تیزی سے چلتے ہوئے اس پانی پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ مگر وہ کمر برابر گہرا گڑھا تھا۔ اچانک میں اس میں گر پڑا۔ اب میرا جسم گڑھے کے اندر تھا اور میرا دایاں ہاتھ جنکشن باکس میں۔

فی الفور بجلی نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ پکڑ ہتھیلی اور کلائی کے درمیان تھی۔ ایک لمحہ میں میرا سارا جسم بالکل بے حرکت ہو گیا۔ میرا دایاں ہاتھ بجلی کے تاروں کے گچھے پر تھا۔ اور بقیہ جسم بے حس و حرکت ہو کر پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گویا کہ میں بجلی کے سمندر میں نہا رہا تھا۔ ایسی حالت میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یا تو فوراً مر جاتا ہے یا گھبراہٹ میں کچھ چیخیں نکال کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ مگر بجلی کے حادثات کی تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ جس وقت مجھے بجلی پکڑے ہوئے تھی اس وقت بھی میں ہوش میں تھا۔ بظاہر اگرچہ میں مر چکا تھا مگر میرا ذہن اب بھی پوری طرح حاضر تھا۔ میں تمام باتوں سے اسی طرح باخبر تھا جس طرح میں عام حالت میں باخبر رہتا۔ شاید یہ کوئی مطلوب منزل تھی۔ شاید میں وہیں پہنچ گیا تھا جس کی طرف ہنکا کر مجھ کو لایا جا رہا تھا۔

یہ حالت میرے خیال کے مطابق پانچ منٹ سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ یہ ذہن اور جسم کی علاحدگی کا ایک لمحہ تھا۔ میں اپنے جسم سے اوپر اٹھ کر واقعات کو دیکھ رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کرنٹ کا ایک بے حد تیز رفتار دھارا ہے جو میرے جسم کے اندر موجیں مار رہا ہے۔ میرے بھائی بجلی کے انجینئر ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی یہ بات مجھے یاد تھی کہ اگر میں اپنے دوسرے

ہاتھ کو اٹھا کر زور سے پہلے ہاتھ پر ماروں تو وہ چھوٹ جائے گا۔ مگر اس وقت میں ایسا کرنے پر قادر نہ تھا۔ کیونکہ سارے جسم کی طرح اس وقت میرا دوسرا ہاتھ بھی بالکل بے حرکت تھا۔

میرا ذہن اس وقت بالکل معتدل حالت میں تھا اور میں کسی گھبراہٹ کے بغیر مختلف قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ اب میں موت کے بالکل آخری کنارے پر پہنچ چکا ہوں۔ شاید اگلے چند لمحے کے اندر میں موجودہ دنیا سے گزر کر دوسری دنیا میں داخل ہو جاؤں گا۔ اگرچہ میں آخرت کو نہیں دیکھ رہا تھا مگر یہ احساس مجھ پر ضرور طاری تھا کہ میرے اور آخرت کے درمیان اب ایک قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلامی مرکز کے پہلے اجتماع (بھوپال، ۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲) کا اعلان الرسالہ میں شائع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس وقت میرے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ اعلان کے مطابق بہت سے اللہ کے بندے مذکورہ تاریخ کو بھوپال آئیں گے۔ اور میری موت کی خبر سن کر واپس چلے جائیں گے۔ یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ میں نے قرآن کی ایک تذکیری تفسیر شروع کی تھی، اب وہ شاید ہمیشہ کے لئے ناتمام رہ جائے گی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے ایک مشن شروع کیا تھا مگر میں اس مشن کی تکمیل سے پہلے اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔ یہ یاد بھی آتی تھی کہ اس وقت میری جیب میں ایسا کوئی کاغذ نہیں جس میں میرا نام و پتہ لکھا ہوا ہو، اور یہ علاقہ سب غیر مسلموں کا ہے، وہ لوگ کیسے مجھے پہچانیں گے کہ میں کون ہوں۔ پھر اپنی بے بسی کی طرف خیال جاتا تھا کہ انسان کس قدر بے بس ہے، اس وقت بھی میں پورے شعور کے ساتھ زندہ موجود تھا۔ مگر میرے جسم کے اوپر سے میرا کنٹرول بالکل ختم ہو چکا تھا۔

تاہم سارے جسم میں ایک استثناء تھا۔ اور وہ زبان کا تھا۔ میرا جسم اگرچہ پورا کا پورا بے حرکت تھا۔ مگر زبان حیرت انگیز طور پر حرکت میں تھی۔ وہ برابر بالکل معتدل انداز میں یا اللہ، یا اللہ کہے جا رہی تھی۔ میری زبان اس وقت یا اللہ کہہ رہی تھی اور میرا ذہن بے بسی کے ساتھ یہ سوچ رہا تھا کہ اب میں کس طرح اس سے بچ سکتا ہوں۔

مگر ۵ منٹ گذرے تھے کہ اچانک نا معلوم طور پر بجلی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرا ہاتھ تاروں سے الگ ہو کر جنکشن باکس کے باہر آ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا اب تک میں کسی اور عالم میں تھا، اب دوبارہ اپنی سابقہ دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو پانی کے گڑھے

سے باہر نکالا اور قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ کلائی سے لیکر ہتھیلی تک گہرا جل چکا تھا۔ مگر میرا دل حیرت انگیز طور پر اس وقت بھی بے حد پرسکون تھا۔

اتنے میں کچھ مقامی غیر مسلم صاحبان وہاں آگئے۔ انہوں نے مجھ کو اٹھایا اور سہارا دے کر مجھ کو قریب کے مکان میں لے گئے۔ اس وقت حال یہ تھا کہ میرے تمام کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک میں پانی سے تر تھا اور میرے جسم سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اب میں پیدل چل کر گھر پہنچنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میرے گھر پر ٹیلیفون کر کے مطلع کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ یہاں ہم میں سے کسی کے پاس ٹیلیفون نہیں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ میرے لئے کوئی سواری بلا دیں۔ وہ لوگ اس کے لئے آمادہ ہو گئے اور ڈھونڈھ کر کہیں سے ایک سائیکل رکشا لے آئے۔ میں اس پر تنہا سوار ہو کر اپنے گھر آگیا۔ وہ لوگ رکشہ کا کرایہ دینے لگے۔ میں نے منع کیا کہ اس کی ضرورت نہیں، میں خود ادا کر دوں گا۔

میں گھر پہنچا تو میرے سارے کپڑے پانی میں تر تھے اور مجھے کپکپی ہو رہی تھی۔ فوری طور پر کپڑا بدلنا ضروری تھا مگر الکٹرک برن اور فریکچر کی وجہ سے میرا دایاں ہاتھ سیدھا لٹک رہا تھا اور میں اس کو اٹھانے پر قادر نہ تھا۔ چنانچہ اوپر کا کوٹ تو کسی طرح سالم اتار اگیا اور بقیہ کپڑے قینچی سے کاٹ کر میرے جسم سے الگ کئے گئے۔ ایک بنیان اور ایک سوئٹر کٹا ہوا اب بھی میری الماری میں بطور یادگار موجود ہے۔

میرے لڑکے ثانی اثنین خان نے ٹیلیفون کر کے جناب اطہر صدیقی صاحب اور جناب محمد شمیم صاحب کو صورت حال کی خبر دی۔ وہ لوگ فوراً آگئے۔ اور رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے مجھے ھمدرد نرسنگ ہوم (نئی دہلی) پہنچا دیا گیا۔ وہاں اگرچہ مجھے ایک خصوصی کمرہ نمبر ۶ دیا گیا تھا، تاہم نرسنگ ہوم کے صدر حکیم عبد الحمید صاحب نے نرسنگ ہوم کے انتظامی انچارج سے یہ کہدیا تھا کہ " مولانا جب تک چاہیں یہاں رہیں، ان سے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔ " یہ بات انتظامی افسر نے آخری دن اس وقت بتائی جبکہ ہمارا آدمی حساب دینے کے لئے ان کے دفتر میں گیا۔

یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو نہ کبھی میرے ساتھ گزرا اور نہ کسی اور کے بارہ میں اب تک سننے یا پڑھنے میں آیا۔ بجلی کی مکمل گرفت میں آنے کے باوجود زندہ رہنا۔ جسم اور روح کا الگ ہو کر پھر مل جانا۔ حادثہ کے دوران جسم کے مکمل طور پر بے حرکت ہو جانے کے باوجود ذہن کا مکمل طور پر

حاضر رہنا، پھر نہایت پرسکون رہ کر یااللہ یااللہ کرتے رہنا اس بات کی علامت ہے کہ یہ عام معنوں میں محض ایک حادثہ نہ تھا بلکہ ایک تجربہ تھا۔ گویا کہ انسان کی کامل بے اختیاری کو مجھے اپنی آنکھوں سے دکھایا گیا۔ میں نے انسان کی اس ہستی کو دریافت کیا جو مادی قوانین کے پرے ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے گویا اس خدا کو براہ راست دیکھا جو قادر مطلق ہے۔ بجلی کا سوئچ دنیا میں خواہ بند نہ ہو مگر وہ اوپر سے اس کو بند کرسکتا ہے۔ شاید بجلی کے حادثات کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اتنے کامل طور پر بجلی کی گرفت میں آجانے کے باوجود میں موت سے بچ کر نکل آیا۔ اس دوران مجھ کو جو لطیف تجربات ہوئے اس کے اعتبار سے دیکھئے تو گویا کہ میں روحانی دنیا میں جاکر مادی دنیا میں واپس آگیا۔ میں آسمان کے اوپر پہنچ کر دوبارہ زمین کی طرف لوٹ آیا۔ میں نے انسان کے فانی وجود کے اندر ایک باقی وجود کا تجربہ کیا۔

۲۸ فروری کی شام سے لیکر ۵ مارچ ۱۹۸۲ کی شام تک میں ہمدرد نرسنگ ہوم میں رہا۔ اسپتال کی زندگی کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میرے گھر والوں کے لئے بھی یہ نئی افتاد تھی۔ میرے لڑکے ثانی اثنین خان کا پہلے دن یہ حال تھا کہ وہ میرے کمرہ کے تخت پر ساری رات سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ٹھنڈ کے باوجود بستر پر لیٹنے کی نوبت نہیں آئی۔

اسپتال خواہ کتنا اچھا اور صاف ستھرا ہو، بہر حال وہ مریضوں اور آفت زدہ لوگوں کی دنیا ہے۔ میں اپنے علحدہ کمرے میں اگرچہ دوسرے مریضوں سے بالکل دور تھا۔ مگر خود یہ تصور میرے لئے وحشت ناک تھا کہ " میں اسپتال میں ہوں " یہاں کے زمانۂ قیام میں مشکل سے کوئی دن ایسا گزرا ہوگا جب کہ میں نے شوق سے کچھ کھایا پیا ہو۔ جناب رام رتن کپلا (KAPSONS) ازراہ عنایت روزانہ گائے کا خالص دودھ اور تازہ گھی اہتمام کے ساتھ بھیجتے تھے۔ مگر ان کو بھی استعمال کرنے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

نرسنگ ہوم میں روزانہ کئی ڈاکٹر مجھ کو دیکھنے آتے تھے۔ صبح وشام دوائیں کھلائی جاتی تھیں۔ اور دونوں وقت زخم کی صفائی اور ڈریسنگ ہوتی تھی۔ مگر تمام تر توجہ کے باوجود یہاں کے علاج سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر عزیز (ایف آر سی ایس) نے گریفٹنگ کا مشورہ دیا مگر میں اس کے لئے راضی نہ ہوا۔ ڈریسنگ سے صرف یہ ہوا کہ زخم کے مردہ خلیات (Dead Cells) نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آئی کہ زخم اتنا گہرا ہوگیا کہ اندر کی رگیں نظر آنے لگیں۔

میری انگلیاں بڑی حد تک سن ہو چکی تھیں ۔ اعصاب کی نسیں جل گئی تھیں جس کا یہ نتیجہ تھا کہ دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اور اس سے ملی ہوئی شہادت کی انگلی قلم پکڑنے کی طاقت کھو چکی تھیں ۔ میں قلم ہاتھ میں لے کر لکھنے کی کوشش کرتا تو انگلیوں کی پکڑ اتنی کمزور رہتی کہ قلم ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتا۔ اپنا یہ حال دیکھ کر اکثر میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکل پڑتے اور زبان پر یہ الفاظ آجاتے۔

"یہ انگلیاں کیا دوبارہ قلم نہ پکڑ سکیں گی"

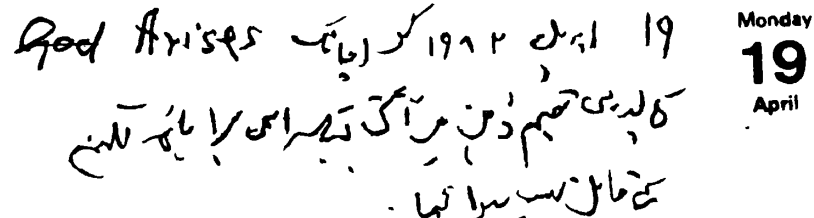
اسی درمیان میں مسٹر جان محمد بٹ (انگریز نو مسلم) انگلینڈ سے آئے اور ۲ مارچ کی شام کو مجھ سے نرسنگ ہوم میں ملے ۔ انہوں نے مجھے ایک قلم ہدیۃً پیش کیا جو وہ انگلینڈ سے خرید کر میرے لئے لائے تھے ۔ قلم کے بارہ میں انہیں میرے ذوق کا علم تھا ۔ انہوں نے لندن میں میری پسند کا قلم تلاش کیا مگر وہاں ان کو نہیں ملا ۔ پھر انہوں نے اکسفورڈ سے ایک قلم خریدا ۔ یہ مانٹ بلانک (Mont Blanc) تھا جو جرمن کمپنی تیار کرتی ہے ۔

اس وقت مسٹر محمد اطہر صدیقی نرسنگ ہوم میں میرے کمرہ میں موجود تھے ۔ انہوں نے جان محمد صاحب سے اچانک ایک سوال کیا ۔ "یہ قلم آپ نے وہاں کس روز خریدا" انہوں نے بتایا کہ سنیچر کے روز ۔ اس کے بعد اطہر صدیقی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا : دیکھئے ، یہ حادثہ آپ کو اتوار کی شام کو دہلی میں پیش آیا ۔ اور اس سے ایک دن پہلے سنیچر کو خدا آپ کے لئے انگلینڈ میں قلم خرید وا رہا تھا ۔ یہ اس بات کا شگون ہے کہ علم خداوندی میں یہ مقدر ہے کہ آپ کی انگلیاں دوبارہ ٹھیک ہوں ۔ اور وہ دوبارہ اسی طرح قلم پکڑیں جس طرح وہ پہلے قلم پکڑتی تھیں ۔

یہ بات یقینی طور پر میرے لئے بہت خوش کن تھی ۔ مگر اس وقت میری انگلیوں ، خاص طور پر انگوٹھے کی حالت ایسی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ موصوف شاید میری تسلی کی خاطر ایسا کہہ رہے ہیں ۔ اس زمانہ میں میرا حال یہ تھا کہ میں کسی کو کوئی چیز ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھتا اور اس کے انگوٹھے کی پکڑ پر نگاہ جاتی تو اس کے اوپر مجھ کو عجیب قسم کا رشک آتا ۔ اس کی خوش قسمتی اور اپنی بے بسی کو سوچ کر دل کی عجیب حالت ہو جاتی ۔

اسی دوران ایک روز ایسا ہوا کہ اچانک مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا ۔ ایک لمحہ کے اندر ایک کتاب (God Arises) کی پوری تھیم میرے ذہن میں آگئی ۔ جبکہ ابھی میرا ہاتھ لکھنے کے قابل نہیں ہوا تھا ۔ یہ تجربہ میں نے اپنی ڈائری کے صفحہ ۴۵ پر اپنے اسی ہاتھ سے لکھا ۔ اس

تحریر کا عکس یہاں دیا جا رہا ہے ۔ اس کو دیکھئے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی انسانی تحریر نہ ہو بلکہ کوئی چڑیا کاغذ پر چلی ہو اور اس کے چلنے سے کاغذ پر نشانات بن گئے ہوں :



ایسے وقت میں ایک نئی کتاب کی تفہیم ذہن میں آنا گویا خدائی اشارہ تھا کہ ابھی میری مدت کار ختم نہیں ہوئی ۔ ابھی مجھ کو مزید لکھنے کی توفیق ملے گی ۔

میں ۲۸ فروری ۱۹۸۲ کی شام کو ہمدرد نرسنگ ہوم (نئی دہلی) میں داخل ہوا اور ۵ مارچ ۱۹۸۲ کی شام کو وہاں سے ڈسچارج ہو کر واپس اپنے مکان پر آیا ۔ وہاں اکسرے کے ذریعہ معلوم ہوا کہ میرے داہنے شانہ پر فریکچر ہے ۔ گڑھے میں میں اسی کے بل گرا تھا ۔ ہمدرد نرسنگ ہوم میں میری کیفیت یہ تھی کہ میرا داہنا ہاتھ شانے سے لیکر انگلیوں تک تقریباً بیکار ہو رہا تھا ۔ میں اس ہاتھ سے اپنا کمربند بھی نہیں باندھ سکتا تھا اور نہ کرتا پہن سکتا تھا ۔ نماز بھی بستر پر لیٹے لیٹے پڑھتا تھا ۔ ہمدرد نرسنگ ہوم میں روزانہ میرے فریکچر پر اور ہاتھ کے زخم پر پٹی کی جاتی تھی اور اینٹی بایوٹک دوائیں کھلائی جاتی تھیں ، اسی حال میں صبح و شام گزر رہے تھے ۔

ایک روز ایسا ہوا کہ عیادت کی غرض سے آنے والے لوگ نرسنگ ہوم میں میرے کمرہ میں جمع تھے ۔ کسی نے کہا کہ آپ کا یہ حادثہ حکومت کی غفلت سے ہوا ہے ۔ سڑک کے محکمہ نے سڑک کے کنارے گڑھا کھودا اور اس کو بھرے بغیر چھوڑ دیا ۔ بجلی کے محکمہ نے بجلی کے کھمبے کے جنکشن باکس پر ڈھکن نہیں لگایا ۔ آپ حکومت میں اپنے لئے معاوضہ کی درخواست دیدیں ۔ حکومت میں بعض بڑے عہدیدار آپ کے قدردان ہیں اور آپ کی تحریریں نہایت پابندی سے پڑھتے ہیں ۔ وہ آپ کی سفارش کر دیں گے اور آپ کے لئے معقول رقم منظور ہو جائے گی ۔ میں اس وقت چپ رہا ۔ جب وہ لوگ چلے گئے اور مجھے تنہائی ہوئی تو میں نے سوچا کہ اس قسم کی تجویز پیش کرنے والے شاید اس بات سے مایوس ہو چکے ہیں کہ میرا ہاتھ دوبارہ پہلی حالت کی طرف واپس آئے ۔ اس لئے وہ اس طرح کی تجویز پیش کر رہے ہیں ۔ مگر کیا میں بھی اس کو تسلیم کر کے معاوضہ کی درخواست پیش کر دوں ۔ یہ سوچتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے ۔ اور میں نے کہا کہ خدایا اگر وہ لوگ ایک کرور

روپیہ بھی دیں تو مجھے منظور نہیں ہے۔ مجھے تو اپنی وہ انگلیاں چاہئیں جن سے میں دوبارہ قلم پکڑوں اور آپ کے دین کی خدمت کروں۔ انسان کی دی ہوئی کوئی بھی رقم میرے اس ہاتھ کی قیمت نہیں ہو سکتی جو آپ نے مجھے دیا تھا۔

ہمدرد نرسنگ ہوم میں ایک ڈاکٹر عبد القدوس صاحب تھے۔ وہ کافی تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے ایک روز انگریزی کی یہ مثل سنائی:

Burns never return

یعنی جلا ہوا کبھی نہیں لوٹتا۔ ان ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ میرے ہاتھ کی انگلیوں (خاص طور پر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی) کے اعصاب جل چکے ہیں اور اب وہ دوبارہ بننے والے نہیں۔ اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ اب بھی اگر میں قلم کا کام جاری رکھنا چاہتا ہوں تو بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق شروع کر دوں۔ ایک نوجوان ڈاکٹر اتنے مہربان تھے کہ وہ قلم اور کاغذ لے کر آتے اور مجھ سے بائیں ہاتھ سے لکھواتے۔ مگر اس وقت میرے جذبات کیا تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہیں دنوں میں نے اپنی ڈائری میں اپنے کمزور ہاتھوں سے یہ الفاظ لکھے "انشاء اللہ مجھے پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملہ میں اس قسم کے تمام اندازوں کو غلط ثابت کرے گا۔ یہ عبارت میں اپنے گھر پر ۷ مارچ ۱۹۸۲ کو لکھ رہا ہوں جب کہ قلم ابھی انگلیوں کی پوری گرفت میں نہیں ہے۔"

نرسنگ ہوم کے علاج سے تقریباً مایوس ہو کر میں ۵ مارچ ۱۹۸۲ کی شام کو اپنے گھر واپس آگیا۔ اب ڈریسنگ اور اینٹی بایوٹک دواؤں کا وہی سلسلہ گھر پر جاری تھا جو اس سے پہلے نرسنگ ہوم میں چل رہا تھا۔ ڈاکٹر اختر صدیقی از راہ عنایت خود میرے گھر پر آکر ڈریسنگ کرتے رہے۔ تاہم ڈریسنگ سے صرف یہ ہو رہا تھا کہ زخم کے مردہ خلیات نکل رہے تھے اور زخم زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آتا جا رہا تھا۔ حتی کہ ایک روز جب پٹی کھولی گئی اور صفائی کی گئی تو وتر (Tendon) صاف دکھائی دینے لگا۔ اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ گرم گرم آنسوؤں نے آنکھوں سے نکل کر بتایا کہ اس کیفیت کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ موجود نہیں ہیں۔

گھر آنے کے بعد ۶ مارچ کی شام کو میرے کمرہ کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو میرے بڑے لڑکے ظفر الاسلام خاں لندن سے بول رہے تھے۔ انہوں نے میرا حال دریافت کیا تو میں نے کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں کوئی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ کہتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ظفر الاسلام خاں کو پریشانی سے بچانے کے لئے اگرچہ میں یہ الفاظ بول رہا تھا مگر

حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اگرچہ اب بھی میں خدا سے بہتر امید لگائے ہوئے تھا مگر عملی صورت حال یہ تھی کہ بظاہر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ میری انگلیاں دوبارہ اس قابل ہو جائیں گی کہ وہ پہلے کی طرح کام کر سکیں۔

میری ڈائری میں ۱۰ مارچ ۱۹۸۲ کی تاریخ کے ساتھ حسب ذیل الفاظ درج ہیں۔

"بجلی کے حادثہ کو آج ۱۰ دن ہو گئے۔ مگر کلائی پر ابھی تک گہرا زخم ہے اور میری انگلیاں ابھی بڑی حد تک سن ہیں اور کمزور ہیں۔ وہ قلم پکڑنے کے قابل نہیں (یہ سطریں ۱۰ مارچ کی صبح کو میں خود بمشکل لکھ رہا ہوں)

۱۰ مارچ کی شام کو طبیعت پر بڑا اثر تھا" کیا میری انگلیاں اب دوبارہ پہلے کی طرح قلم پکڑنے کے قابل نہ ہوں گی۔" وہ انگلیاں جن سے میں فیضان خداوندی کو کاغذ پر مرتسم کرتا تھا، کیا اب پھر متحرک نہ ہوں گی۔ رات کو نماز عشاء کے بعد میں نے دعا کی کہ خدایا صبح تک کوئی ایسی واضح علامت ظاہر کر دے جس سے مجھے اعتماد ہو جائے کہ میری انگلیاں دوبارہ پہلے کی طرح درست ہو جائیں گی چنانچہ رات کو دو خواب دیکھے۔ پہلا خواب جس کی تفصیل اچھی طرح یاد نہیں یہ تھا کہ میرے ہاتھ کو پوری طرح درست ہونے میں ۴۰ دن لگیں گے۔ یہ خواب اگرچہ پوری طرح یاد نہیں تاہم "۴۰ دن" کا لفظ بخوبی یاد ہے۔

دوسرا خواب بہت صاف تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ یہ کہ میں کنوئیں پر ہوں اور پانی سے بھرا ہوا گھڑا دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر نکال رہا ہوں۔ کنواں کافی بڑا اور پرانا سا ہے۔ اس کے دونوں طرف تھونی گاڑ کر اس کے اوپر ایک لمبی لکڑی رکھی ہوئی ہے۔ اس لکڑی کے بیچ میں ایک پہیہ ہے۔ اس پہیہ کے اوپر سے رسی ڈال کر ڈول کنوئیں میں ڈالی جاتی ہے۔ ڈول کافی وزنی ہے۔ اس لیے میں اس کو مشکل سے کھینچ رہا ہوں۔ مگر یہ مشکل ڈول کے غیر معمولی طور پر بڑا ہونے کی وجہ سے ہے، ورنہ میرے ہاتھ کی پکڑنے میں کوئی کمی نہیں۔ میرا ہاتھ اس کو اسی طرح پکڑے ہوئے ہے جس طرح حادثہ سے پہلے تندرستی کی حالت میں پکڑتا ۔ انگلیوں میں یا کلائی میں کسی قسم کی کمزوری کا احساس نہیں۔ اس کے دو دن بعد پھر خواب دیکھا کہ ہاتھ میں جہاں زخم تھا وہ بالکل چکنا تقریباً پہلے کی طرح ہو گیا ہے۔ البتہ دو لال دھاریاں داہنی بائیں نظر آتی ہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۸۲ کو صاحبزادہ حسن صاحب (مراد آباد) میرے یہاں آئے اور زخم کو دیکھنے کے بعد میری ڈائری میں حسب ذیل سطریں لکھیں:

"۲۰ مارچ کو میں نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ کے جلے ہوئے حصہ کو دیکھا وہ ہتھیلی سے لیکر کلائی تک تقریباً دو انچ چوڑا اور تین انچ لمبا سرخ گوشت کا لوتھڑا سا تھا۔ بظاہر یہ قابل قیاس نظر نہیں آتا کہ (خواب کے مطابق) ۴۰ دن میں وہ اپنی پہلی حالت کی طرح صاف ہو جائے گا۔"

نرسنگ ہوم میں اگرچہ میری حالت بہتر نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہاں سے میں اس لئے چلا آیا کہ گھر پر رہ کر کچھ کام کر سکوں گا۔ چنانچہ اسی حال میں الرسالہ کے کام میں لگ گیا۔ کبھی قلم کو شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے درمیان پکڑ کر لکھتا۔ کبھی اپنی لڑکی فریدہ خانم سے املا کراتا۔ میری ڈائری میں ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ کی تاریخ کے ساتھ حسب ذیل سطریں درج ہیں:

آج صبح کو مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا۔ میں تذکیر القرآن میں سورۂ یونس (آیات ۲۵-۲۷) کی تشریح لکھ رہا تھا۔ الکٹرک برن کی وجہ سے میری کلائی زخمی ہے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں تقریباً ۷۵ فی صد سن ہیں۔ ہاتھ اتنا کمزور ہے کہ قلم پکڑنے میں نہیں آتا۔ تاہم اسی حالت میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ عین اس وقت مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گزرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خدا کو اپنے فرشتوں سے یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں کہ:

"ذرا میرے بندے کو دیکھو ....."

بے اختیار دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں اپنے گھر پر اسی حال میں تھا اور روزانہ دو وقت باقاعدہ ڈریسنگ ہوتی تھی، تاہم سارا معاملہ بالکل غیر یقینی نظر آتا تھا۔ جب پٹی کھولی جاتی تو کافی لمبا چوڑا اور گہرا زخم میری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے بھرے گا۔ زخم کی صورت اتنی بھیانک تھی کہ اس کے کھلنے کے وقت میں بیوی بچوں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ۲ اپریل ۱۹۸۲ کو میں نے اپنا ایک وصیت نامہ لکھ دیا جو میری ڈائری کے صفحہ ۵۹-۶۱ پر درج ہے۔

ہمدرد نرسنگ ہوم کے ڈاکٹروں نے گریفٹنگ کا مشورہ دیا تھا۔ میرے لڑکے ثانی اثنین خان نے حادثہ کے بعد اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ثانی اثنین کا کہنا بھی یہی تھا کہ گرافٹنگ ضروری ہے۔ مگر مجھے آپریشن کے تصور سے دحشت تھی۔ اس لئے میں راضی نہ ہوا۔ میں اسی خیال میں رہا کہ دوا اور ڈریسنگ سے زخم مندمل ہو جائے۔ مگر یہ امید پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ بعض ہمدرد اصرار کر کے مجھے ولنگڈن اسپتال لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر آر بکھندانی نے خصوصی طور پر دیکھا اور شدت سے یہ مشورہ دیا آپ صفدر جنگ اسپتال میں داخل ہو جائیں

اور اپنے زخم کی گرافٹنگ کرائیں۔ بصورت دیگر، یہ زخم ایسا ہی پڑا رہے گا۔ اور اگر سالوں کے بعد قدرتی طور پر ٹھیک ہوا تو آپ کا ہاتھ مستقل طور پر ٹیڑھا ہو چکا ہوگا۔ انہوں نے صفدر جنگ اسپتال میں برن اور پلاسٹک سرجری کے انچارج ڈاکٹر جے ایل گپتا کے نام ایک ذاتی خط لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ آپ فوراً ان سے ملیں۔

اگلے دن میں اس خط کو لے کر صفدر جنگ اسپتال پہنچا اور وہاں ڈاکٹر جے ایل گپتا سے ملا۔ وہ اس فن میں ہندستان کے مشہور اکسپرٹ ہیں۔ انہوں نے زخم کو کھول کر دیکھا تو فوراً پہلا جملہ یہ کہا کہ آپ نے بہت دیر کر دی:

You are too late.

انہوں نے کہا کہ آپ کو حادثہ کے بعد فوراً ہمارے یہاں آنا چاہئے تھا۔ تاہم انہوں نے پوری ہمدردی کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنی پوری کوشش کریں گے۔ آپ ہمارے اسپتال میں داخلہ لے لیں۔ انہوں نے اسپتال کا ایک خصوصی کمرہ میرے لئے کھلوا دیا اور میں ۱۵ اپریل ۱۹۸۲ کو یہاں آ گیا۔

صفدر جنگ اسپتال میں زخم کی گریفٹنگ سے پہلے کچھ طبی ضابطے پورے کرنے ضروری تھے۔ چنانچہ اس کے مطابق میرے پورے جسمانی نظام کا معائنہ ہوا۔ یہ کام کئی دنوں تک ہوتا رہا۔ مگر ڈاکٹر حیرت میں تھے کہ اتنے بڑے حادثہ کے باوجود میرے جسم کی ہر چیز نارمل تھی۔ خون کی کئی طریقوں سے جانچ کی گئی۔ مگر سب رپورٹیں نارمل آئیں۔ شکر اور البومن کے بارہ میں رپورٹ بالکل اطمینان بخش تھی۔ کئی ایکسرے لئے گئے مگر سب نارمل نکلے۔ مثال کے طور پر جنرل ولیس میسانک پالی کلینک کی ریڈیولاجکل رپورٹ (۱۳ اپریل ۱۹۸۲) میں میرے ایکسرے کے بارہ میں یہ الفاظ درج تھے:

Cardiac size is normal. Both hila are normal. No paranchymatous lesion of lungs present. Costotphrenic angles are clear.

کئی "ماہرین" نے میرے بارہ میں یہ بات بھی کہی تھی کہ بجلی کا شاک پورے جسمانی نظام کو متاثر کر دیتا ہے۔ اس لئے آپ اچھے ہونے کے بعد بھی کئی سال تک اپنا کام صحیح طور پر کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ مگر خدا کے فضل سے مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا اور خدا نے صرف "چالیس دن" میں میرا تمام معاملہ درست کر دیا۔ اسپتال میں اور اسپتال کے باہر ڈاکٹروں کی سخت ہدایت تھی کہ میں اپنا دایاں ہاتھ اتنا اٹھائے رکھوں کہ وہ سر کے برابر یا اس سے اوپر رہے۔ میں نے اس ہدایت کی تھوڑے دنوں پابندی کی۔ اور پھر اس کو چھوڑ دیا۔ خدا کے فضل سے پھر بھی میرے

ہاتھ میں کوئی خرابی نہیں آئی۔ صفدر جنگ اسپتال میں مجھے کافی سکون تھا۔ بس یہی ایک چیز دحشت ناک تھی کہ دائیں ہاتھ کو رات دن سر کے برابر اٹھائے رکھنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر اگر کبھی دیکھ لیتے کہ میرا ہاتھ نیچے ہے تو فوراً کہتے "اس طرح آپ کا ہاتھ ہمیشہ کے لئے خراب ہوجائے گا۔"

صفدر جنگ اسپتال میں آتے ہی یہاں کے ڈاکٹروں نے پہلا کام یہ کیا کہ اینٹی بائیوٹک دوائیں سب کی سب بند کردیں۔ انہوں نے کہا کہ اس میں اینٹی بائیوٹک دواؤں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی تو صرف ڈریسنگ کرنی ہے اور اس کے بعد اسکن گریفٹنگ۔ چنانچہ چند دن تک ڈریسنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب ان کے خیال کے مطابق زخم تیار ہوگیا تو ۱۰ اپریل ۱۹۸۲ کو مجھے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنائے گئے اور آپریشن ٹیبل پر لٹا کر میرے منھ پر ایک آلہ رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے جس واقعہ کی خبر ہے وہ یہ کہ میں نے اپنے آپ کو دوبارہ اپنے کمرہ میں پایا۔ "میرا آپریشن کب ہوگا"، میں نے پوچھا "وہ تو ہو بھی گیا"، جواب دینے والے نے جواب دیا۔ آپریشن تھیٹر میں میرا زخم کھرچ کر صاف کیا گیا۔ میرے دوسرے ہاتھ کے بازو سے تقریباً پانچ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا چمڑا (پتلا کاغذ جیسا) کاٹ کر نکالا گیا۔ اس کو میرے زخم پر رکھ کر سلا گیا۔ اس کے بعد دونوں جگہ پٹی کی گئی۔ مگر مجھے کسی چیز کی کچھ خبر نہیں ہوئی۔ میں نے اس پورے واقعہ کو اس وقت جانا جب کہ وہ انجام پا چکا تھا۔ یہ سب کمال تھا جدید سرجری کی اس دریافت کا جس کو عمل تخدیر (Anaesthesia) کہا جاتا ہے۔

گریفٹنگ کے بعد مجھے کچھ دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲۶ اپریل کو میری پٹی کھول دی گئی اور مجھے اجازت دیدی گئی کہ میں گھر جا سکتا ہوں۔ اسی گریفٹنگ میں خدا نے میرے حادثہ کا علاج رکھا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر گپتا کا کہنا یہ تھا کہ آپ کو ٹھیک ہونے میں ابھی تین سال لگیں گے۔ نیز انہوں نے کئی ورزشیں بتائیں اور کہا کہ اگر آپ نے یہ ورزشیں نہ کیں تو پھر کبھی آپ کا ہاتھ ٹھیک نہ ہو سکے گا۔ مگر میں نے کوئی ورزش نہیں کی اور خدا کے فضل سے صرف چند مہینہ میں میرا ہاتھ ہر اعتبار سے بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ شانہ کے فریکچر کے اعتبار سے بھی اور ہاتھ کے الکٹرک برن کے لحاظ سے بھی۔ اب میں خدا کے فضل سے اپنے تمام کام معمول کے مطابق کرلیتا ہوں۔ ہاتھ پر صرف ایک انچ لمبا اور آدھا انچ چوڑا گریفٹنگ کا نشان ہے۔ اب اپنا ہاتھ مجھے تقریباً ویسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسا کہ میں نے ۱ مارچ ۱۹۸۲ کو خواب میں دیکھا تھا۔

خواب کے مطابق ابتداءً میں نے سمجھا تھا کہ "۴۰ دن" میں میرا ہاتھ صحیح ہو جائے گا۔ مگر بعد کو سمجھ میں آیا کہ اس سے مراد آغاز صحت تھا نہ کہ تکمیل صحت۔ حادثہ کے ٹھیک چالیسویں دن میری کلائی کی اسکن گریفٹنگ ہوئی۔ اور اسکن گریفٹنگ ہی وہ عمل تھا جس کے بعد میرا بھیانک زخم بھرا اور دھیرے دھیرے ہاتھ بالکل صحیح ہو گیا۔ خواب بالکل درست تھا، البتہ جب میں نے اس کی تعبیر کی تو مدت کے تعین میں تھوڑی سی غلطی کر دی۔

بجلی کا لگنا کتنا خطرناک ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۶ جون ۱۹۸۳ کو ایک بس مظفر پور (بہار) کی ایک سڑک سے گزر رہی تھی۔ ایک جگہ سڑک پر بجلی کا ایک تار لٹک رہا تھا جس میں بجلی کا کرنٹ موجود تھا۔ یہ تار بس سے چھو گیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ فوراً پوری بس میں بجلی دوڑ گئی۔ چالیس مسافر اسی وقت بجلی لگنے سے مر گئے۔ دوسرے بارہ آدمی جزئی طور پر جل گئے اور بے ہوش حالت میں اسپتال پہنچائے گئے (ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی ۷ جون ۱۹۸۳)

مجھے بھی اسی بجلی سے سابقہ پیش آیا۔ جو مذکورہ بس کے مسافروں کو پیش آیا تھا مگر یہ خدائی معجزہ ہے کہ میں حیرت انگیز طور پر اس سے بچ گیا۔ اور میرا پورا جسم اس کے اثرات سے محفوظ رہا۔ اس پر میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

عجیب اتفاق کہ جس زمانہ میں یہ حادثہ پیش آیا اسی زمانہ میں میرے دو پروگرام پیشگی طور پر مقرر ہو چکے تھے ایک، اسلامی مرکز کا پہلا اجتماع، ۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲ کو بھوپال میں۔ دوسرا، دورے کا پروگرام اپریل ۱۹۸۲ کے آخری ہفتہ، بمبئی میں

ان دونوں پروگراموں کا اعلان ماہنامہ الرسالہ میں دیا جا چکا تھا۔ مگر مذکورہ حادثہ نے سارے معاملہ کو درہم برہم کر دیا۔ چنانچہ بمبئی کے دورہ کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں منتظمین کو معذرت کا خط لکھ دیا گیا۔ البتہ بھوپال کا اجتماع کافی مشورہ کے بعد باقی رکھا گیا۔ مگر عین انہیں دنوں میں صفدر جنگ اسپتال میں داخل تھا۔ اس لئے پہلے دن کی کارروائی میں شریک نہ ہو سکا۔ البتہ دوسرے دن کی کارروائی میں شرکت کی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ رات کو گرینڈ ٹرنک اکسپریس سے روانہ ہو کر ۱۸ اپریل کی صبح کو بھوپال پہنچا اور پھر اسی دن شام کو دوبارہ گرینڈ ٹرنک اکسپرس سے سوار ہو کر ۱۹ اپریل کی صبح کو دہلی آ گیا۔ جاتے ہوئے میں صفدر جنگ اسپتال کے بستر سے اٹھ کر اسٹیشن گیا تھا اور دوبارہ واپسی

میں اسٹیشن سے آکر اسپتال کے بستر پر لیٹ گیا۔

بھوپال کے اجتماع میں پہلے دن میری دو تقریریں مولانا محسن عثمانی ندوی نے پڑھ کر سنائیں۔ یہ دونوں تقریریں میں نے کچھ املا کرائی تھیں اور کچھ خود اپنے زخمی ہاتھ سے لکھی تھیں۔ لکھنے کی صورت یہ تھی کہ میں قلم کو شہادت کی انگلی اور درمیان کی انگلی کے درمیان پکڑ کر لکھتا تھا۔ کیونکہ انگوٹھا اس وقت قلم پکڑنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔

یہ ماجرا جو میرے ساتھ گزرا اس کا شاید سب سے زیادہ خاص پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے مجھ کو مادہ (Matter) اور ذہن (Mind) کا فرق بتایا گیا۔ میں نے اس کے دوران مادہ کی فنا پذیری کو دیکھا اور اس کے مقابلہ میں ذہن کے غیر فنا پذیر ہونے کا تجربہ کیا۔ عین اس وقت جبکہ بجلی کے طاقتور کرنٹ کی زد میں آکر میرا جسم پوری طرح مردہ ہو چکا تھا، میرا ذہن پوری طرح زندہ تھا۔ میں نے ذاتی تجربہ کے ذریعہ شعوری طور پر یہ جانا کہ فنا کے قوانین صرف انسان کے مادی جسم پر وارد ہوتے ہیں، وہ اس کے ذہن یا روح پر وارد نہیں ہوتے۔ یہ گویا فانی کے اندر باقی کو دیکھنا تھا۔ طبیعی دنیا کے ماورا ایک غیر طبیعی دنیا کا مشاہدہ کرنا تھا۔ مخلوق کی سطح کے وجود کے درمیان خدائی سطح کے وجود کا عرفان حاصل کرنا تھا۔

یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ کو میں دہلی سے حیدر آباد جا رہا تھا۔ پالم ایرپورٹ پر پہنچا تو وہاں اسکن سرجری کے مذکورہ ماہر ڈاکٹر جے ایل گپتا بھی موجود تھے۔ وہ اب صفدر جنگ اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ چنڈی گڑھ جا رہے تھے۔

ڈاکٹر گپتا مجھ کو دیکھتے ہی فوراً پہچان گئے۔ اور میرا حال پوچھنے لگے۔ میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب، آپ نے کہا تھا مجھ کو ٹھیک ہونے میں کم از کم تین سال لگیں گے۔ مگر میں تو خدا کے فضل سے تین مہینہ میں بالکل اچھا ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگے اور کہا اچھا کسی دن اسپتال آئیے۔ پھر بات بدل کر اپنے ساتھی کی طرف مخاطب ہوئے اور ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا :

He is a member of Parliament,
very close to the Prime Minister.

(یہ ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں اور وزیر اعظم سے ان کے بہت قریبی تعلقات ہیں)

ڈاکٹر گپتا کا مذکورہ بیان خلط مبحث کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ میں نہ پارلیمنٹ کا ممبر ہوں اور نہ وزیر اعظم ہند سے میرا قریبی تعلق ہے۔ قصہ صرف یہ ہے کہ نائب صدر جمہوریہ ہند

جناب محمد ہدایت اللہ صاحب ماہنامہ الرسالہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میں صفدر جنگ اسپتال میں ہوں تو انہوں نے ڈاکٹر گپتا کے نام ایک خط بھوایا اور پھر سکریٹری سے ٹیلی فون کرایا جس میں میری خیریت پوچھی گئی تھی اور ڈاکٹر گپتا سے کہا گیا تھا کہ نائب صدر جمہوریہ ہند مجھ کو دیکھنے کے لئے اسپتال آنا چاہتے ہیں۔ یہ اصل واقعہ تھا جو گڈمڈ ہو کر ان کے ذہن میں یوں بن گیا کہ میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوں اور وزیر اعظم ہند کا بہت قریبی آدمی ہوں ــــــ معلوم دنیا کے بارہ میں انسان کے اندازے اتنے غلط ہوتے ہیں۔ پھر غیر معلوم دنیا کے بارہ میں اس کے اندازے اگر غلط ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

صفدر جنگ اسپتال کے اندر میں تین ہفتہ رہا۔ یہاں میں نے اپنے ساتھ اپنے لڑکے ثانی اثنین خان کو رکھا تھا وہ ڈاکٹری کی کئی کتابیں لائے تاکہ فارغ اوقات میں اپنا مطالعہ جاری رکھ سکیں۔

انہیں میں سے ایک کتاب پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) کی تھی جس کا نام پیتھالوجی (A Textbook of Pathology) ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میری چمڑے کی قلم بندی (Skin Grafting) ہونے والی ہے تو میں نے اس موضوع پر کچھ معلومات حاصل کرنا چاہا۔ اس سلسلہ میں مذکورہ کتاب کا متعلقہ باب اسپتال ہی میں پڑھ ڈالا۔

مصنف نے بتایا تھا کہ انسانی جسم میں اگر ایسا خون داخل کیا جائے جو آدمی کے اپنے بلڈ گروپ کا نہ ہو تو جسم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً ضد جسم (Antibodies) پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ خون باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلے یا کٹے ہوئے حصۂ جسم پر قلم بندی ہوتی ہے۔ اس کی محفوظ صورت یہ ہے کہ خود اپنے جسم کی کھال لے کر مقام ماؤف پر لگادی جائے۔ اس کو آٹو گریفٹنگ کہتے ہیں۔ اب اگر کسی مقام پر کھال کی قلم بندی (Skin Grafting) کرنی ہے اور وہاں کسی غیر متعلق جسم کی کھال لے کر لگادی گئی تو وہ چند دن ٹھیک رہے گی۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر جسم اس کی اجنبیت کو پہچان لے گا۔ خون کا دوران اس مقام پر رک جائے گا کھال کا مذکورہ ٹکڑا کالا ہو جائے گا اور بالآخر الگ ہو کر گر جائے گا۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے کتاب کے مصنف نے ایک عجیب جملہ لکھا تھا۔ اس نے لکھا کہ خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی:

Self will not accept not-self

یہ جملہ پڑھ کر معاً مجھے خیال آیا کہ جب چھوٹے سلف کا یہ حال ہے کہ وہ غیر سلف کو قبول نہیں کرتا تو

بڑا سلف کیوں کر غیر سلف کو قبول کرے گا۔ مخلوق کی نفاست اپنے غیر ہم جنس کو قبول نہیں کرتی پھر پاک اور برتر خالق کس طرح اپنے غیر ہم جنس کو قبول کرنے پر راضی ہو جائے گا۔

ایک واقعہ اس معاملہ کی بہت اچھی وضاحت کرتا ہے۔ جولائی ۱۹۸۲ میں ایک شخص رات کے وقت لندن کے بکنگھم پیلس میں گھسا اور ملکہ الزبتھ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا۔ ملکہ الزبتھ اس وقت اپنے سونے کے کمرہ میں اکیلی تھیں۔ انہیں خطرہ لاحق ہوا۔ کیونکہ نووارد کے ہاتھ میں لوہے کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ ملکہ نے گھنٹی بجا کر حفاظتی دستہ کو بلانا چاہا مگر کسی وجہ سے گھنٹی نہیں بجی۔ اب ملکہ نے حاضر دماغی سے کام لیا اور نووارد سے سخت کلامی کرنے کے بجائے اس کو سگرٹ پیش کیا اور اس کو تفریحی باتوں میں مشغول رکھا۔ یہاں تک کہ حفاظتی عملہ کے لوگ آ گئے اور آدمی گرفتار کر لیا گیا۔

یہ خبر جب لندن کے اخباروں میں چھپی تو عوام نے سوال کرنا شروع کیا کہ ملکہ الزبتھ اپنی خواب گاہ میں تنہا کیوں تھیں۔ ملکہ کے شوہر جناب فلپ اس وقت کہاں تھے:

Where was Philip

بالآخر انکشاف ہوا کہ جناب فلپ نیند میں خراٹے لیتے ہیں۔ چونکہ ملکہ کو خراٹے کی آواز پسند نہیں، اس لئے ان کے شوہر فلپ رات کے وقت علحدہ کمرہ میں سلائے جاتے ہیں۔ ان کو ملکہ کی خواب گاہ میں سونے کی اجازت نہیں۔ گرافٹنگ کا معاملہ اگر یہ بتا رہا تھا کہ نیچر کس طرح غیر سلف کو قبول نہیں کرتی تو یہ دوسرا واقعہ بتاتا ہے کہ شعور کے نزدیک کس طرح غیر سلف ناقابل قبول رہتا ہے۔

کتاب پیتھالوجی کا مذکورہ جملہ (سلف غیر سلف کو قبول نہیں کرتا) میرے لئے زمانۂ علالت کی ایک دلچسپ دریافت تھی۔ جب میں اس کو مذکورہ بالا واقعہ کے ساتھ ملا کر دیکھتا ہوں جو اس کو پانے کا سبب بنا تو اس دنیوی واقعہ میں مجھے ایک اخروی حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کچھ لمحات کے لئے خدا کے یہاں چلا گیا تھا اور وہاں سے اس کے بندوں کے لئے اس کا یہ پیغام لے کر لوٹا کہ ـــــ سلف غیر سلف کو قبول نہیں کرے گا۔ جس کو خدا کے پڑوس میں رہنے کی تمنا ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات کو اختیار کرے، وہ اپنے آپ کو خدائی مزاج کے مطابق بنائے۔ ورنہ آخرت میں اس کو خدا کی دوری ملے گی نہ کہ خدا کا پڑوس۔

معرفت

ہندستان کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن سے کسی نے کہا کہ سائنس دانوں نے جو چیزیں دریافت کی ہیں ان میں ان کا اپنا کوئی خاص کارنامہ نہیں۔ یہ دریافتیں زیادہ تر اتفاقات کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر رمن نے جواب دیا: ہاں ، مگر ایسا اتفاق صرف سائنس داں کو پیش آتا ہے۔

دریافت دراصل ذہنی ترکیز (Concentration of Mind) کی قیمت ہے۔ جب آدمی کسی خاص موضوع پر اپنے ذہن کو پوری طرح لگا دیتا ہے تو اس موضوع کے بارہ میں اس کو خاص بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ سوتے جاگتے ہر وقت اس کا ذہن اسی کے اندر مشغول رہتا ہے۔ اس موضوع کی دنیا سے اس کا بے حد قریب فکری رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔

سائنسی دریافتیں اکثر اسی قسم کے ترکیز فکر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب ایک آدمی کسی چیز سے اتنا زیادہ اپنے کو متعلق کر لیتا ہے تو اس چیز کے بارہ میں اس کو خاص پہچان حاصل ہو جاتی ہے۔ ذرا سا اشارہ دیکھتے ہی وہ اس کی پوری بات کو پکڑ لیتا ہے۔ دریافت اکثر حالات میں جزء سے کل تک پہنچنے کا دوسرا نام ہوتی ہے، اور اس قسم کا پہنچنا ہمیشہ اسی کے لئے ممکن ہوتا ہے جو پہلے سے اس موضوع میں لگا ہوا ہو اور اس کی بابت پوری آگہی رکھتا ہو۔

یہ بات جو سائنسی معرفت کے لئے صحیح ہے یہی دینی معرفت کے لئے بھی درست ہے۔ خدا بھی آدمی کے لئے ایک دریافت ہے۔ مگر یہ دریافت صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے۔ جس نے اپنے آپ کو خدا میں شامل کر رکھا ہو۔

جب آدمی اپنا ذہن خدا میں لگائے ہوئے ہو۔ وہ خدا کی نظر سے دیکھتا ہو اور خدا کے کان سے سنتا ہو۔ وہ دوسری تمام باتوں سے اپنی توجہ ہٹا کر خدا کی طرف مائل ہو گیا ہو، جب کوئی شخص اس قسم کی زندگی گزارے تو اس کو بار بار وہ اتفاقات پیش آتے ہیں جن کو معرفت کہا جاتا ہے۔ دنیا کی چیزوں کا مشاہدہ، انسانی تاریخ کا مطالعہ، اپنے حالات پر غور و فکر ہر چیز میں اس کا ذہن، بار بار حقیقت اعلیٰ کی طرف منتقل ہوتا ہے، وہ بار بار ربانی تجلیات کو پاتا رہتا ہے۔ خدا کی معرفت خدا میں جینے کی نقد قیمت ہے۔ یہ قیمت اسی کو ملے گی جو خدا میں جی رہا ہو۔ جو کسی اور چیز میں جئے وہ خدا کی معرفت کا رزق کبھی نہیں پا سکتا۔

جنت بھی اور جہنم بھی

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان العبد لیتکلم بالکلمۃ من رضوان اللہ لا یلقی لھا بالا یرفع اللہ بھا درجات وان العبد لیتکلم بالکلمۃ من سخط اللہ لا یلقی لھا بالا یھوی بھا فی النار ابعد ما بین المشرق والمغرب۔

(متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ اللہ کی رضا میں ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اللہ اس کی وجہ سے اس کے درجے بہت بڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے وہ ایسی آگ میں ڈال دیا جاتا ہے جس کا فاصلہ مشرق و مغرب سے زیادہ ہو۔

وہ کون سی بات ہے جو کہنے میں تو بظاہر صرف ایک معمولی بات ہوتی ہے مگر اخروی نتیجہ کے اعتبار سے وہ اتنی سنگین ہوتی ہے کہ آدمی کو یا تو جنت میں پہنچا دیتی ہے یا جہنم میں۔ یہ بات وہ ہے جب کہ آدمی صرف اللہ کی خاطر ایک شخص کے بارہ میں حق کا کلمہ کہے۔ یا اللہ سے بے خوف ہونے کی وجہ سے کسی کے بارہ میں ناحق بات بولے۔

زندگی میں بار بار ایسے نازک مواقع آتے ہیں جب کہ آدمی کی زبان سے نکلا ہوا جملہ دوسرے شخص کے لئے نہایت اہم بن جاتا ہے۔ کبھی ایک جملہ کسی کی واقعی حیثیت کا اعتراف کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا جملہ اس کی حیثیت پر پردہ ڈالنے والا۔ کبھی ایک جملہ دوسرے کی عزت کو بچانے والا ہوتا ہے اور دوسرا جملہ اس کو بے عزت کر دینے والا۔ کبھی ایک جملہ حسد میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور کبھی ایک جملہ خیر خواہی میں نہایا ہوا۔

ایسے مواقع پر خدا سے ڈرنے والا آدمی اپنے منھ سے وہ ذمہ دارانہ لفظ نکالے گا جو خدا کو خوش کرنے والا ہو اور اس بنا پر وہ خدا کی جنت کا مستحق بن جائے گا۔ اور جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ ایسے غیر ذمہ دارانہ الفاظ بولے گا جس میں اس کا اپنا نفس لذت پا رہا ہو اور اس کی وجہ سے وہ جہنم کی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

تاریخ کا نوشتہ

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷ کو تہران کے قصر گلستاں میں ایک بے حد شاندار جشن منایا گیا۔ یہ سابق شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی تھی۔ اس موقع پر جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا اس کے اخراجات کی مقدار اربوں روپے تک پہنچتی ہے۔ اس زمانے میں راقم الحروف نے "شاہ ایران کی تاج پوشی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں جشن کی مسرفانہ تفصیلات دیتے ہوئے آخر میں لکھا تھا۔

"یہ شاہ قسم کے لوگ بھی حالات سے کتنا بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ عوامی انقلاب کے آتش فشاں پہاڑ کے اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے اس آتش فشاں کو کچھ اور چنگاریاں حاصل ہو جائیں۔ اگر یہ لوگ دانشمند ہوتے تو ان جھوٹے مظاہروں میں سرمایہ خرچ کرنے کے بجائے وہ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے خرچ کرتے۔ اس طرح اگرچہ ان کے اصلی عیش اور اقتدار میں کمی نہ ہوتی مگر عوام کو خوش کر کے وہ اپنی شہنشاہیت کی عمر کو ضرور طویل کر سکتے تھے۔ عجیب بات ہے۔ اس دنیا میں حقیقی فکر آخرت تو نایاب ہے ہی، دانش مندانہ قسم کی دنیا پرستی بھی نایاب ہے۔ زیادہ تر لوگ بے سوچے سمجھے زندگی گذارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی بے شعوری کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں اس وقت انھیں ہوش آتا ہے۔ مگر اس وقت کا ہوش آنا کچھ کام نہیں دیتا" (مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی ۳ نومبر ۱۹۶۷)

مذکورہ تحریر کے تقریباً ساڑھے گیارہ سال بعد فروری ۱۹۷۹ میں یہ واقعہ ہوا کہ رضا شاہ پہلوی کو اپنا اقتدار اور اپنا تمام جاہ وحشمت چھوڑ کر ایران سے جانا پڑا۔ وہ نہایت مایوسی اور ناکامی کی حالت میں ایک مغربی اسپتال میں مر گئے۔

اس کے بعد ایران میں آیت اللہ خمینی کا دور شروع ہوا۔ فروری ۱۹۷۹ میں جب آیت اللہ خمینی چارٹرڈ ہوائی جہاز کے ذریعہ پیرس سے تہران پہنچے اور سارا ایران خمینی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ خمینی اسلام کے نام پر ایران میں برسر اقتدار آئے تھے۔ ساری دنیائے اسلام میں اس بات پر خوشی منائی گئی کہ آیت اللہ خمینی نے ایران میں اسلامی نظام قائم کر دیا ہے۔

تاہم اس معاملہ میں بھی راقم الحروف کی رائے عام لوگوں سے بالکل مختلف رہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جدید حکمراں بھی بالآخر وہی ثابت ہوں گے جو ان سے پہلے کے حکمراں۔

اتفاق کا نتیجہ

حماسہ کے معنی عربی زبان میں شجاعت وحمیت کے ہیں۔ شجاعت وحمیت قدیم عربی شاعری کے خاص موضوعات ہوتے تھے۔ چنانچہ قدیم عربی شاعری کے جو منتخبات تیار کئے گئے ہیں ان کو الحماسہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں عربی ادب کے کتب خانہ میں تقریباً نصف درجن کی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔

سب سے مشہور حماسہ ابو تمام الطائی کا ہے جو سب سے پہلے تیار ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ابو تمام الطائی (م ۲۲۰ ھ) ایک بار خراسان گیا ہوا تھا۔ جب وہاں سے واپس ہوا تو راستہ میں شدید برفباری شروع ہو گئی۔ چنانچہ وہ ھمدان میں اپنے ایک دوست ابوالوفا ربن سلمہ کے یہاں ٹھہر گیا۔ ابو فار کا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں قدیم عرب شعراء کا کلام بہت بڑی مقدار میں موجود تھا۔ یہ کتب خانہ اس نے ابو تمام کے لئے کھول دیا۔ چنانچہ ابو تمام نے جاڑے کا پورا موسم انہیں کتابوں کے مطالعہ میں گزار دیا۔

اس مطالعہ کے بعد ابو تمام الطائی نے جاہلی دور اور آغاز اسلام کے شعراء کے کلام کا ایک انتخاب (دیوان الحماسہ) تیار کیا جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ انتخاب اتنا جامع اور اتنا نفیس تھا کہ اس کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد اسی انداز پر بہت سے منتخبات تیار کئے گئے۔ ابو تمام کا حماسہ ادب عربی کے نصاب کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ادب عربی کی یہ کتاب محض اتفاق (صدفہ) کے نتیجہ میں تیار ہوئی۔

تاریخ کے بہت سے اہم واقعات محض اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ظہور میں آئے۔ مگر اس قسم کے اتفاق سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو پہلے سے کچھ ضروری شرطوں کو پورا کر چکے ہوں۔ مثال کے طور پر ابو تمام الطائی اگر عربی زبان کا ماہر نہ ہوتا اور اس کو شعر فہمی کا عمدہ ذوق نہ ہوتا تو مذکورہ اتفاق پیدا ہونے کے باوجود وہ کتاب الحماسہ تیار نہیں کر سکتا تھا۔ ابو تمام اگرچہ خود بھی شاعر تھا۔ مگر اس کے اشعار سے زیادہ اس کا انتخاب مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شعر گوئی کے مقابلہ میں شعر فہمی کی صلاحیت اس میں زیادہ تھی۔ چنانچہ تبریزی نے اس کے بارہ میں کہا ہے:

ان ابا تمام فی حماسته اشعر منه فی شعره (شرح حماسة ابی تمام، المقدمة)

ذمہ دار کون

انیسویں صدی کے وسط کا واقعہ ہے۔ فرانس کے ایک مسیحی مسٹر لیون روش نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ امیر عبدالقادر الجزائری کے یہاں آیا اور امیر کے ہاتھ پر اسلام لایا۔ اس کے بعد امیر عبدالقادر الجزائری نے اس کو قربت دی۔ اس کو اپنا مشیر خاص بنالیا۔ کئی مہمات میں اس کو بھیجا۔ اسی طرح اس کو جزیرہ عرب بھیجا جہاں اس نے حج ادا کیا۔

لیون روش کی شادی الجزائر کی ایک مسلمان خاتون سے ہوئی۔ دونوں تقریباً ۱۰سال تک ایک ساتھ رہے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ فرانس کی فوجیں الجزائر میں داخل ہوگئیں۔ جنگ کے بعد بالآخر فرانس کو امیر عبدالقادر الجزائری پر فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح کے بعد لیون روش فرانسیسی جنرل الدوک دومال سے مل گیا اور کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ میں نے اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ مسیحیت اختیار کر لی ہے۔

یہ واقعہ لیون روش کی مسلمان بیوی کے لئے بہت اندوہناک تھا۔ اس نے کہا کہ اسلام نے اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی کردی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تیرے جیسا سانپ زندہ رہے اور لوگ مجھ کو تیری وجہ سے غیرت دلائیں۔ چنانچہ اس نے خنجر لے کر لیون کو قتل کر ڈالا (الثقافۃ العربیۃ، طرابلس دسمبر ۱۹۸۲)

اس طرح کے ارتداد کے واقعات کو عام طور پر اس معنی میں لیا جاتا ہے کہ متعلقہ شخص محض منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اور اپنا کام پورا کرکے اسلام سے نکل گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے واقعات بھی ہوں۔ مگر اس نظریہ کو ارتداد کے تمام واقعات پر چسپاں کرنا صحیح نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام قبول کرنے والے زیادہ تر وہ ہیں جو کسی تبلیغی جدوجہد کے نتیجہ میں مسلمان نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ میں نے بہت سے نومسلموں سے بات کرکے یہ اندازہ کیا ہے کہ ان کے اسلام کا سبب کوئی گہرا فکری انقلاب نہیں ہوتا۔ یہ اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو پہلے سے مذہب کے معاملہ میں متشدد اور متعصب نہیں ہوتے۔ وہ کسی وقتی اور معمولی پسندیدگی کی بنا پر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ اب اگر ان کو خوش قسمتی سے موافق حالات مل گئے تو وہ دھیرے دھیرے اسلام میں پختہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا ابتدائی معمولی

تاثر بالآخر گہرے اسلامی تاثر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر جن کو اسلام کے بعد اچھے حالات نہ ملیں ان کا اسلام کمزور رہوتا رہتا ہے۔ وہ ان کے شعور کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے کمزور اسلام کے ساتھ زندگی گزارتے رہے ہیں اور کچھ لوگ دوبارہ اپنے سابق معاشرہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ وہ جس طرح ایک معمولی سبب کے پیش آنے سے اسلام میں داخل ہوئے تھے اسی طرح دوسرا معمولی سبب پیش آنے سے اسلام کے باہر چلے جاتے ہیں۔

ایک نومسلم کا مسلم معاشرہ میں جذب ہونا مسلم معاشرہ کی ذمہ داری ہے، مگر مسلم معاشرہ یہاں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نومسلم اپنے نئے ہم مذہبوں کے درمیان ایک قسم کا اجنبی بن جاتا ہے۔ یہ اجنبیت کبھی کبھی اپنی انتہا پر پہنچ کر وہ صورت اختیار کر لیتی ہے جس کو ہم " ارتداد " کہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انداد کے اکثر واقعات دشمنان اسلام کی " سازش " سے زیادہ مسلمانوں کی غفلت کا نتیجہ ہیں۔ یہ غفلت خاص طور پر تین قسم کی ہے۔

۱۔ دعوت و تبلیغ کا کام ہمارے یہاں اس نہج پر نہیں ہو رہا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر گہرا فکری انقلاب پیدا کرے۔ آدمی شعوری تبدیلی کے بغیر کسی سطحی یا عارضی سبب سے اسلام قبول کر لیتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا اسلام بہت زیادہ دیر پا نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ایک نومسلم جب اسلام قبول کرتا ہے تو وہ ایک بالکل مختلف معاشرہ سے نکل کر اسلام میں آتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو اسلام میں پختہ کرنے کے لئے اس کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ مگر مسلمانوں کے یہاں ایسے لوگوں کی ذہنی اور فکری تربیت کا کوئی سامان موجود نہیں۔ یہ تربیت تمام تر مسلمانوں کی ذمہ داری ہے مگر اس کے لئے انہوں نے اب تک کچھ نہیں کیا۔

۳۔ تیسرا مسئلہ معاشرہ کا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد نومسلم ایک طرف اپنے معاشرہ سے کٹ جاتا ہے۔ دوسری طرف مسلم معاشرہ بھی اس کو بھرپور طور پر قبول نہیں کرتا۔ یہ دوطرفہ اجنبیت اس مخلوق کے لئے یقیناً ناقابل برداشت ہے جس کی تعریف سماجی حیوان Social Animal سے کی گئی ہے۔

اس طرح کے مختلف اسباب اکثر نومسلموں کے اندر چھپی ہوئی بے چینی بن کر موجود رہتے ہیں، وہ مسلسل عدم اطمینان کا شکار رہتے ہیں اور کوئی بڑا واقعہ پیش آنے کی صورت میں اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

معیاری خاتون

روی البخاری ومسلم ان علیا سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: خیر نسائہا مریم بنت عمران وخیر نسائہا خدیجۃ بنت خویلد

بخاری ومسلم نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ان کی سب سے بہتر خاتون مریم بنت عمران تھیں۔ اور ان کی سب سے بہتر خاتون خدیجہ بنت خویلد ہیں۔

فتح الباری میں طیبی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ الضمیر الاول راجع الی الامۃ التی کانت فیہا مریم والثانی الی ہذہ الامۃ۔ یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مریم امت یہود کی سب سے بہتر خاتون تھیں اور حضرت خدیجہ امت مسلمہ کی سب سے بہتر خاتون ہیں۔

یہ افضلیت کیوں تھی، اس پر مندرجہ ذیل دو احادیث سے روشنی پڑتی ہے:

روی البخاری ومسلم عن عائشۃ انہا قالت، ماغرت علی نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا علی خدیجۃ، وانی لم ادرکہا، قالت: وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا ذبح الشاۃ فیقول ارسلوا بہا الی اصدقاء خدیجۃ، قالت فاغضبتہ یوما فقلت خدیجۃ: فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی قد رزقت حبہا

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں مجھے خدیجہ کے سوا کسی کے اوپر غیرت نہیں آئی۔ حالانکہ میں نے ان کا زمانہ نہیں پایا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بکری ذبح کرتے تو فرماتے کہ اس میں سے خدیجہ کی دوستوں کو بھیج دو۔ وہ کہتی ہیں کہ ایک روز مجھے اس پر غصہ آگیا اور میں نے کہا خدیجہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدیجہ کی محبت مجھے پلا دی گئی ہے۔

روی احمد والطبرانی من طریق مسروق عن عائشۃ قالت، کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یکاد یخرج من البیت حتی یذکر خدیجۃ فیحسن الثناء علیہا فذکرہا یوما من الایام فاخذتنی الغیرۃ فقلت ہل کانت الا عجوزا قد ابدلک اللہ خیرا منہا۔ فغضب ثم قال لا واللہ ما ابدلنی اللہ خیرا منہا۔ آمنت اذ کفر الناس وصدقتنی

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجہ کی تعریف کئے بغیر گھر سے نہ نکلتے تھے۔ ایک روز آپ نے خدیجہ کا ذکر فرمایا تو مجھے غیرت آگئی۔ میں نے کہا وہ ایک بڑھیا ہی تو تھیں اور اللہ نے اس کے بدلے آپ کو زیادہ بہتر دیدیا ہے۔ آپ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا۔ خدا کی قسم نہیں، خدا نے مجھے خدیجہ سے بہتر نہیں دیا۔ وہ

اذکذبنی الناس و واستنی بمالہا اذحرمنی الناس
ورزقنی اللہ منہا الولد دون غیرہا من النساء

ایمان لائیں جب کہ لوگوں نے انکار کیا۔ انہوں نے میری تصدیق کی جب کہ لوگوں نے مجھے جھٹلا دیا۔
انہوں نے اپنے مال سے میری مدد کی جب کہ لوگوں نے مجھے محروم کیا۔ اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی جو دوسری بیویوں سے نہ دی۔

حضرت مریم اور حضرت خدیجہ کو تاریخ کی معیاری خواتین کی حیثیت کیوں حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہمہ تن اللہ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں ملا دیا۔

یہود کے آخری زمانہ میں ایک ایسی خاتون درکار تھیں جو حضرت مسیح جیسے معجزاتی پیغمبر کی ماں بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ تھا کہ وہ قوم یہود کے آخری پیغمبر کو باپ کے بغیر پیدا کرے۔ اس مقصد کے لئے ایسی خاتون درکار تھیں جن کی عصمت اور پاکبازی اتنی مسلّم ہو کہ کسی کو ان کے بارہ میں ادنیٰ شبہہ کی گنجائش نہ رہے۔ حضرت مریم نے اپنی غیر معمولی زندگی سے اس کا ثبوت دیا۔ اس لئے وہ حضرت مسیح کی ماں بنائے جانے کے لئے چن لی گئیں۔

اسی طرح آخری رسول کے حالات کے اعتبار سے ان کو ایسی خاتون کی ضرورت تھی جو اپنی زندگی اور اپنا اثاثہ پوری طرح پیغمبر کے حوالے کر دیں اور کبھی کسی بات پر شکایت نہ کریں۔ حضرت خدیجہ کے امتیازی اوصاف کی بنا پر خدا نے ان کو اس خدمت خاص کے لئے چن لیا۔ انہوں نے اپنی زندگی، اپنا اثاثہ، اپنا آرام و راحت، سب کچھ پیغمبر خدا کے لئے وقف کر دیا۔ سخت ترین مصائب کے باوجود کبھی اف نہ کیا۔ ان کی انہیں خصوصیات نے انہیں خدا کی نظر میں اس قابل بنایا کہ وہ پیغمبر آخر الزماں کی رفیقۂ حیات بنیں۔

اسلام کے مشن کے لئے ہر دور میں ایسی عورتوں اور ایسے مردوں کی ضرورت ہوتی ہے جو موجودہ امتحانی دنیا میں زیر عمل لائے جانے والے خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کریں۔ جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے حد صبر آزما عمل ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن میں خدا کی مدد کرنا کہا گیا ہے۔ پھر جس کو خدا اپنا مددگار ہونے کا اعزاز بخشے اس کے فضل و کمال کا کیا ٹھکانا۔

کمپوٹر کا لطیفہ

اقوام متحدہ کی کارروائی پر ایک کتاب چھپی ہے جس میں ایک دل چسپ واقعہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ میں نہایت اعلیٰ قسم کے کمپوٹر لگائے گئے ہیں جو خود کار ترجمان کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور کسی مقرر کی تقریر کا فوراً ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔ سامعین میں سے جو شخص مقرر کی زبان نہ جانتا ہو وہ کمپوٹر سے جڑے ہوئے آلہ کو اپنے کان سے لگا کر غیر زبان کی تقریر کو اپنی زبان میں سننے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مقرر نے اپنی تقریر میں بائبل کا ایک اقتباس پڑھا۔ یہ اقتباس انگریزی اڈیشن کے مطابق یہ تھا:

The spirit is willing but the flesh is weak.

اس جملہ کا مفہوم ہے: روح مستعد ہے پر جسم کمزور ہے۔ مگر کمپوٹر نے اس کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا تو اس کو یوں کر دیا: شراب اچھی ہے مگر گوشت خراب ہے۔ انگریزی میں کمپوٹر کے ترجمہ کو ان لفظوں میں بتایا گیا ہے:

The wine is good but the meat is bad.

یہ غلطی کیوں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمپوٹر کی نام نہاد ذہانت محض مشینی ذہانت ہوتی ہے۔ وہ صرف ایک بتائی ہوئی بات کا اعادہ کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاضیاتی نوعیت کی باتوں کی ترجمانی میں کمپوٹر کامیاب رہتا ہے۔ مگر جہاں شعور کے استعمال کی ضرورت ہو اور ایک سے زیادہ امکانی چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے وہاں وہ صحیح جواب پیش کرنے میں اکثر ناکام ہو جاتا ہے۔ ہر زبان میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے کئی معنیٰ آتے ہیں اور استعمال سے معانی بدلتے رہتے ہیں۔ آدمی کے سامنے جب ایسا مضمون آتا ہے تو وہ اپنی ذہانت سے جان لیتا ہے کہ کسی خاص موقع پر کس لفظ کے کیا معنیٰ ہیں۔ مگر کمپوٹر چونکہ اس قسم کی انسانی ذہانت سے خالی ہوتا ہے، وہ فیصلہ نہیں کر پاتا اور کچھ کا کچھ ترجمہ کر دیتا ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا فقرہ میں کمپوٹر نے اسپرٹ کو شراب کے معنی میں لے لیا اور ولنگ کو خوش گوار کے معنی میں۔ اسی طرح اس نے فلش کو گوشت کے معنی میں لیا اور ویک کو ناقص کے معنی میں۔ ان الفاظ کے یہ معانی بھی آتے ہیں۔ مگر مذکورہ فقرہ میں یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں ہیں۔

اس قسم کی غلطی صرف کمپوٹر ہی کی خصوصیت نہیں۔ انسان بھی اس قسم کی بھیانک غلطیاں کرتا ہے۔ مزید یہ کہ کمپوٹر اپنی غلطی کی بنیاد پر کوئی "تحریک" نہیں چلا سکتا۔ جب کہ انسان اس خوش قسمتی کا مالک ہے کہ اپنی غلطی کو ایک عظیم انقلابی تحریک کی حیثیت دے سکے۔

جنت میں مکان

انا زعیم ببیت فی ربض الجنة لمن ترك المراء وان كان محقا وببیت فی وسط الجنة لمن ترك الكذب وان كان مازحا وببیت فی اعلی الجنة لمن حسن خلقه (الحدیث)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت کے کنارے ایک گھر کی ذمہ داری لیتا ہوں اس شخص کے لئے جو جھگڑے کو چھوڑ دے خواہ وہ حق پر ہو۔ اور جنت کے بیچ میں ایک گھر کی اس شخص کے لئے جو جھوٹ کو ترک کر دے خواہ وہ مذاق کر رہا ہو۔ اور جنت کے اعلیٰ درجہ میں ایک گھر اس شخص کے لئے جس کا اخلاق اچھا ہو۔

دو آدمی میں جھگڑا ہو تو دیکھنے کا ایک پہلو یہ ہے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر دونوں اپنے موقف پر اڑے رہیں تو جھگڑا بڑھتا ہے۔ جان و مال کی تباہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ سے ڈرنے والے کو یک طرفہ طور پر جھگڑے سے الگ ہو جانا چاہئے۔ ایسا کرنے کے لئے اپنے نفس کو کچلنا ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بہت بڑا اجر ہے۔

ہنسی مذاق کے وقت اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سنجیدگی کو بھول جاتا ہے اور جھوٹ بولنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ مگر جنتی انسان وہ ہے جو سچ اور جھوٹ کے معاملہ میں اتنا حساس ہو کہ غفلت کے اوقات میں بھی اس کی زبان جھوٹ بولنے سے بچی رہے۔

حسن اخلاق دراصل حسن ایمان کا نتیجہ ہے۔ جس شخص کا ایمان اس کو خدا سے ڈرنے والا بنا دے وہ بندوں کے معاملہ میں اس کو بے حد محتاط بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان کسی کی بے آبروئی کے لئے نہیں کھلتی۔ اس کا ہاتھ کسی کو تکلیف دینے کے لئے نہیں اٹھتا۔ اس کے پاؤں کسی کی بدخواہی کے لئے نہیں چلتے۔ یہی حسن اخلاق ہے اور یہ حسن اخلاق جس کے اندر پیدا ہو جائے وہ یقیناً جنت میں اعلیٰ مقام پاتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے آدمی کو اعلیٰ جنت اسی طرح ملتی ہے جس طرح اعلیٰ بیج سے اعلیٰ پھل والا درخت۔

حیدر آباد کا سفر

حیدر آباد کا پہلا سفر میں نے ۱۹۴۸ کے شروع میں کیا تھا۔ یہ سفر میرے بڑے بھائی کے کاروبار کے تحت تھا۔ اس وقت ہندستان آزاد ہو چکا تھا۔ مگر ابھی پولس ایکشن (ستمبر ۱۹۴۸) کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور "حضور نظام" کی کم از کم ظاہری شان وشوکت بدستور باقی تھی۔

اس چند روزہ قیام میں ایک روز کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ میں شہر کی کسی شاہراہ پر چل رہا تھا۔ اچانک پولس کی وردی میں بہت سے لوگ ظاہر ہوئے اور سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہو کر سیٹیاں بجانے لگے۔ وہ شاہراہ پر چلتے ہوئے آدمیوں اور سواریوں کو کنارے کی سڑکوں اور گلیوں میں ڈھکیل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں پوری شاہراہ خالی ہو گئی۔ اس کے بعد ہمارے سامنے سے تین موٹر کاریں گزریں۔ درمیان کی کار میں "حضور نظام" بیٹھے ہوئے تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا شاہی معمول ہے۔ نواب حیدر آباد جب اپنے محل سے کسی دوسرے مقام پر جاتے ہیں تو اس وقت پوری سڑک ان کے لئے خالی کر دی جاتی ہے۔ نواب حیدر آباد اگر اپنے اس انجام کو جانتے جو ان کے اور ان کے وارثوں کے ساتھ چند سال بعد پیش آنے والا تھا۔ تو اس قسم کی چیزیں ان کو فرضی تماشا معلوم ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی صرف اپنے آج کو جانتا ہے، اسے اپنے کل کی خبر نہیں۔ یہ سب سے بڑا فریب ہے جس میں ہر آدمی مبتلا ہے، خواہ وہ کوئی چھوٹا آدمی ہو یا کوئی بڑا آدمی۔

میرا دوسرا سفر نومبر ۱۹۶۷ میں ہوا۔ یہ سفر حیدر آباد میں جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع میں شرکت کے لئے تھا۔ اس سفر کی مفصل روداد اسی زمانہ میں میں نے لکھی تھی اور وہ الجمعیۃ ویکلی (یکم دسمبر ۱۹۶۷) کے صفحات میں شائع ہوئی تھی۔

حیدر آباد کے لئے میرا تیسرا سفر فروری ۱۹۸۱ میں دینی تعلیمی کانفرنس کی دعوت پر ہوا۔ دینی تعلیمی کانفرنس کی کارروائی میں شرکت کے علاوہ میں نے جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع میں بھی شرکت کی جو انہیں دنوں شہر کے باہر وادیٔ ھدیٰ میں ہو رہا تھا۔ آخر میں شہر کے تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ کے چند اجتماعات ہوئے جن میں مجھ کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ تاہم اس سفر کی کوئی تفصیلی روداد بروقت مرتب نہ کی جاسکی۔

حیدرآباد کا چوتھا سفر (۱۲-۱۵ نومبر ۱۹۸۲) تھا جو حلقہ الرسالہ (اسلامی مرکز حیدرآباد) کی دعوت پر ہوا۔ اس سفر کی روداد اگلے صفحات میں دی جارہی ہے۔

حیدرآباد کے لئے میرا پانچواں سفر مدرسہ سراج العلوم، محبوب نگر، حیدرآباد کی دعوت پر ہوا۔ اور چھٹا سفر مئی ۱۹۸۳ میں ہوا۔ یہ مقامی اسلامی مرکز کے بعض انتظامی امور کے تحت تھا

۱۲ نومبر ۱۹۸۲ کو حیدرآباد جانے کے لئے میں پالم ایرپورٹ پہنچا تو وہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں اندر سیکوریٹی چک میں داخل ہوا تو میرے پاس صرف ایک مختصر سا بیگ تھا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ میرے پاس کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔ میں نے اپنا بیگ میز پر رکھتے ہوئے انسپکٹر سے کہا، "کیا اس کو کھولنا ہوگا"۔ میز کے دوسرے طرف ایک سردار جی کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرا جملہ سن کر بڑے تیکھے انداز میں کہا:

Why not

(کیوں نہیں) چنانچہ میں نے فوراً اپنا بیگ کھول دیا۔

سردار جی نے میرا بیگ الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں صرف ایک جوڑا کپڑا تھا اور تذکیر القرآن کی چار جلدیں۔ انہوں نے ایک جلد اٹھائی اور اس کو کھول کر کہا "یہ قرآن ہے"۔ میں نے کہا ہاں۔ وہ اردو جانتے تھے۔ چنانچہ وہ اس کا ترجمہ پڑھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا کہ میں قرآن کا ترجمہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کا ترجمہ میرے پاس موجود نہیں۔ میں نے کہا کہ اب تو میں حیدرآباد جارہا ہوں۔ انشاء اللہ واپسی کے بعد میں آپ کو قرآن کا ترجمہ فراہم کردوں گا۔ میں نے ان کو "حیات طیبہ" کا ایک نسخہ دیا۔ جس میں قرآن کی منتخب آیتوں کے ترجمے مختلف عنوانات کے تحت جمع کئے گئے ہیں۔

ان کا پتہ لے کر میں آگے بڑھا تو میرے ذہن میں یہ سوال تھا کہ کیا وجہ تھی کہ وہی شخص جو چند لمحہ پہلے مجھ سے خشک اور بیزار لہجہ میں بول رہا تھا، وہی چند لمحہ بعد شوق اور دلچسپی کے انداز میں بات کرنے لگا۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ پہلے میں اس کے لئے "حامل بیگ" تھا، بعد کو میں اس کے لئے "حامل قرآن" بن گیا۔ "بیگ" لے کر جو لوگ ہوائی اڈہ میں داخل ہوتے ہیں ان میں ہائی جیکر ہوتے ہیں جو بم لیکر چلتے ہیں۔ ان میں اسمگلر ہوتے ہیں جو خلاف قانون چیزیں لئے ہوتے ہیں۔ ان میں حکومتوں کے باغی ہوتے ہیں جو حکومتوں کا تختہ الٹنے کا

منصوبہ لے کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاتے ہیں۔ جب میں چیک کرنے والے آدمی کے سامنے حامل بیگ کے روپ میں تھا تو گویا میں ہائی جیکر، اسمگلر۔ اور قانون کے باغی کے روپ میں تھا۔ جب میں حامل قرآن کے روپ میں اس کے سامنے آیا تو میں اس کی نظر میں مذکورہ گروہ سے الگ ہو گیا۔ اب میں ایک ایسا انسان تھا جو خدا کی سچی کتاب اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔

یہ واقعہ علامتی طور پر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صورت حال کو بتا رہا ہے۔ ابھی تک وہ دنیا کے سامنے "حامل بیگ" بنے ہوئے ہیں اس لئے دنیا ان سے بیزار ہے۔ اگر وہ حامل قرآن کے روپ میں لوگوں کے سامنے آجائیں تو وہ دنیا والوں کے لئے دلچسپی اور محبت کا موضوع بن جائیں گے، بشرطیکہ قرآن کی خود ساختہ تشریحات سے انہوں نے قرآن کی تصویر لوگوں کی نظر میں بگاڑ نہ دی ہو۔

حیدرآباد کی آبادی لگ بھگ ۳۲ لاکھ ہے۔ اس میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً چالیس فیصد ہے۔ اکثر شہروں کی طرح حیدرآباد بھی دو حیدرآباد کا نام ہے۔ ایک پرانا حیدرآباد اور دوسرا نیا حیدرآباد ــــ پرانے حیدرآباد میں گھنی آبادی ہے۔ غریب اور جاہل طبقہ بھی اسی علاقہ میں بستا ہے۔ اس کے برعکس نئے حیدرآباد میں کھلے مکانات ہیں۔ یہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ اور خوش حال طبقہ رہتا ہے۔

حیدرآباد میں اکثر فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، مگر یہ تمام جھگڑے پرانے حیدرآباد میں ہوتے ہیں۔ نئے حیدرآباد میں آج تک کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا نہیں ہوا۔ اسی طرح کی تقسیم دوسرے شہروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں میں سب سے زیادہ دخل سماجی حالات کا ہے۔ جو لوگ فسادات کے نام پر "مظلوم مسلمانوں" کے لفظی حامی بنے ہوئے ہیں۔ انہیں مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے محنت کرنا چاہئے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کو درست کر کے زیادہ بہتر طور پر فسادات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد کی کچھ انفرادی خصوصیات ہیں جو ہندستان کے کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حیدرآباد میں کم از کم علاقائی سطح پر مسلمانوں کی ایک صحافت ہے۔ یہاں اردو کے کئی اخبارات نکلتے ہیں جو یہاں کے مسلمانوں میں عام طور پر پڑھے

جاتے ہیں۔ آپ شام کی ایک خبر کو اگلی صبح تک یہاں کے مسلمانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ جب کہ ہندستان کے دوسرے شہروں میں یہ چیز مقابلۃً بہت کم پائی جاتی ہے۔ جدید صحافتی معیار کے اعتبار سے تو مسلمان ساری دنیا میں بے حد پیچھے ہیں۔ مگر صحافت بطور عمومی اطلاع نامہ کے بھی اب تک ان کے یہاں بہت کم استعمال ہو سکی ہے۔

نظام کی حکومت کے زمانہ میں جب کسی کو مستقل جاگیر دی جاتی تو اس پر لکھا جاتا تھا "تاقیام شمس وقمر" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے سابق مسلم حکمرانوں کی نفسیات کیا تھی۔ انگریزوں کی ہندستان میں آمد کے زمانہ میں حیدرآباد کے مسلم نواب نے جو کردار ادا کیا وہ بھی اکثر مورخین کے نزدیک قابل تنقید رہا ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کی ریاستوں میں حیدرآباد جس طرح سب سے بڑی ریاست تھی اسی طرح اس نے تمام ریاستوں میں سب سے زیادہ کام بھی کئے ہیں۔

نواب کے زمانہ میں ریاست کے فنڈ سے ہندو اور مسلم رعایا کو یکساں طور پر امداد دی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح اس دور میں مختلف قسم کے اسلامی کام بھی بہت بڑے پیمانے پر انجام پائے۔ مثلاً شعبۂ امور مذہبی کا قیام، جس کے تحت افراد اور اداروں کو مستقل امداد دی جاتی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے نام سے اردو یونیورسٹی کا قیام، دار الترجمہ جس کے تحت بہت بڑے پیمانے پر دوسری زبانوں کی علمی کتابیں اردو زبان میں منتقل کی گئیں۔ دار المعارف جس نے کثیر تعداد میں قیمتی عربی کتابوں کو تلاش کر کے شائع کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حیدرآباد کی ان اسلامی خدمات کا اعتراف لوگوں نے دل کھول کر کیا ہے۔ مجھے بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ تاہم ایک سوال اب بھی جواب طلب ہے۔ وہ یہ کہ اتنی بڑی بڑی کوششیں مستقبل کے اعتبار سے بے نتیجہ کیوں ہو گئیں۔

اس سوال کا جواب صرف ایک ہے۔ یہ کہ سب کام حقیقتاً قومی کام تھے نہ کہ اسلامی کام۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمام کام اسلام کے نام پر انجام دئے گئے۔ مگر اس سے اصل حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی مسلم قوم جب بھی کوئی کام کرے گی وہ اسلام ہی کے نام پر کرے گی۔ خواہ وہ کام شخصی اور قومی محرکات کے تحت کیوں نہ وجود میں آیا ہو۔

قومی محرک کے تحت کیا ہوا کام خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر انجام پائے کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ مسلمان اگر قومی محرک کے تحت کام کریں تو انہیں یقینی طور پر صرف ایک ہی

انجام کا انتظار کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ ان کا کام حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کا مصداق بن کر رہ جائے۔ انہیں ان کی قربانیوں کا کوئی نتیجہ نہ ملے۔

اس کے برعکس حقیقی اسلامی محرک کے تحت کیا ہوا کام ہمیشہ نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ اسلامی محرک عین اپنے اندرونی تقاضے کے تحت آدمی کو نتیجہ خیز رخ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ مثلاً، قدیم حیدرآباد کی اسلامی سرگرمیاں اگر صحیح اسلامی محرک کے تحت ہوتیں تو لازمی طور پر اس کا یہ نتیجہ نکلتا کہ اس کے عمل کا رخ دعوت الی اللہ اور فکر آخرت کی طرف ہوتا۔ اور یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جن کا نتیجہ خیز ہونا بالکل یقینی ہے۔ دعوت الی اللہ کا کام اسلام کی توسیع کر کے اس کو مستقل طاقت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر حیدرآباد میں آخرت پسندی کا ذہن ہوتا تو "قاسم رضوی" جیسی تحریکیں کبھی نہ پنپتیں جن کا نقصان اتنا زیادہ ہے کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں۔

۱۹۶۷ میں جب میں حیدرآباد گیا تھا تو وہاں ایک اندوہناک منظر یہ نظر آیا کہ رکشا کھینچنے والے بیشتر مسلمان تھے۔ جہاں تک یاد ہے اس زمانہ میں ۲۵ ہزار رکشا کھینچنے والے تھے جن میں تقریباً بیس ہزار مسلمان تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ریاست کے زمانہ میں مسلمان زیادہ تر ملازمت کرتے تھے۔ جب ریاست ختم ہوئی تو اس کے بہت سے شعبے بھی ختم ہو گئے۔ چنانچہ بہت بڑی تعداد میں مسلمان بے روزگار ہو گئے۔ ان میں تعلیم بہت کم تھی، تجارت میں وہ تقریباً نہیں کے برابر تھے۔ اب ان کے لئے جو کام رہ گیا تھا وہ جسمانی محنت کا کام تھا جس میں رکشا چلانا بھی شامل تھا۔

مگر اب پندرہ سال بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب حیدرآباد کے مسلمانوں میں تعلیم بہت بڑھ چکی ہے۔ تجارتوں میں بھی وہ کافی داخل ہو چکے ہیں۔ بہت سے خاندانوں کے افراد خلیجی ممالک میں ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے معاشی نقصان کی تلافی کر لی ہے۔ تاہم یہاں بھی میرے جیسے آدمی کے لئے بہت زیادہ خوشی کا موقع نہیں۔ کیونکہ دوسرے مقامات کی طرح، یہاں کے مسلمانوں کی آمدنی کا بڑا حصہ صرف دو مدوں میں ضائع ہو رہا ہے نمائشی اخراجات اور آپس کے جھگڑے۔

حیدرآباد میں میرا قیام چار دن رہا۔ ان چار دنوں میں عام ملاقاتوں اور گفتگو کے علاوہ جو باضابطہ پروگرام ہوئے، ان کی تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے:

حیدرآباد میں پروگرام کی تفصیل

۱۲ نومبر ۱۹۸۲ مسجد سلیمہ خاتون میں خطاب ، قبل نماز جمعہ
پریس کانفرنس ، ۳ بجے شام
معززین شہر اور دانش وروں سے خطاب ، عزیز باغ ، نور خاں بازار
۱۳ نومبر خطاب ، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ ، ناملی اسٹیشن روڈ
خطاب ، مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ ، قدیم باغ عام
علمار کرام سے خطاب ، مسجد اعظم پورہ
۱۴ نومبر خطاب ، خواجہ کا چلہ (قرآن و سیرت سوسائٹی) مغل پورہ
درس قرآن ، مسجد صحیفہ ، اعظم پورہ
خطاب ، مدینہ ٹکنیکل کالج ، نام پلی
خطاب ، نرسا پور ، حیدرآباد
۱۵ نومبر درس قرآن ، مسجد عامرہ ، عابد روڈ
خواتین سے خطاب ، مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ
خطاب ، جامع مسجد مشیرآباد

حیدرآباد میں ماہنامہ الرسالہ کے ذریعہ ہمارے مشن کا ، کافی تعارف ہو چکا ہے ۔ تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر واقف ہے ۔ چنانچہ مقامی اخبارات میں جب میری آمد کا اعلان کیا گیا تو غیر معمولی طور پر بڑی تعداد میں لوگ میری تقریروں کو سننے کے لئے جمع ہوتے رہے ۔ چار دن کی تقریروں میں جو جگہ بھی اجتماع کے لئے مقرر کی گئی وہ کثرت تعداد کی وجہ سے ناکافی ثابت ہوئی ۔ دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ حیدرآباد کے تعلیم یافتہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے کسی اجتماع میں دیکھے نہیں گئے ۔

حیدرآباد سے واپسی کے بعد وہاں سے جو خطوط ہمارے دفتر کو موصول ہوئے ، ان میں سے ایک خط کے چند فقرے یہ ہیں —— " مولانا وحید الدین خان صاحب کے حیدرآباد کے حالیہ دورہ کے موقع پر یہاں کے مسلمانوں نے مولانا کو بڑے شوق اور ذوق سے سنا اور بہت پسند کیا ۔ لوگوں کے فکر نے ایک نئی کروٹ لی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہو گا کہ اہل علم اور خواص کا اتنا بڑا مجمع کسی فرد واحد کو سننے کے لئے جمع ہوا ہو ۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء "

میری تقریروں اور ملاقاتوں کی رپورٹیں مقامی اخبارات میں روزانہ شائع ہوتی رہیں۔ یک بڑے اخبار کا نمائندہ مستقل طور پر میرے ساتھ تھا تاکہ میری تمام مصروفیات کو ،، کور ،، رسکے۔ لوگوں نے کثرت سے ہمارے مشن کو سنا اور پڑھا۔ چنانچہ چار دن تک یہاں کے تعلیم افتہ طبقہ میں عام طور پر اس کا چرچا ہوتا رہا۔

دہلی سے میں اپنے ساتھ کتابوں کا ایک بنڈل (۲۵ کیلو) لے گیا تھا۔ یہ کتابیں پہلے ی دن ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد ٹیلی فون کر کے دہلی سے فوری طور پر مزید دگنا تعداد میں کتابیں منگائی ئیں۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ رات کو دہلی میں الرسالہ کے دفتر کو ٹیلی فون کیا گیا۔ انہوں نے اتوں رات پیک کر کے صبح سویرے کے ہوائی جہاز سے کتابیں روانہ کیں اور ٹیلی فون کے ریعہ اس کا رسید نمبر ہم کو بتا دیا۔ اس نمبر پر حیدرآباد میں اگلے دن صبح کو کتابیں حاصل کر لی گئیں۔ بنانچہ دوسرے دن اجتماع میں اسٹال پر تمام کتابیں دوبارہ موجود تھیں۔

اب بھی وہی صورت ہوئی جو پچھلے دن پیش آئی تھی۔ یعنی تمام کتابیں ،، ہاٹ کیک ،، ں طرح بک گئیں۔ اب رات کے وقت دوبارہ ٹیلی فون کیا گیا اور دوبارہ مذکورہ طریقہ پر دہلی کے دفتر سے کتابیں روانہ کی گئیں۔ اور اگلی صبح کو اسی طرح حیدرآباد کے ہوائی اڈہ پر وصول کر لی ئیں۔ مگر اس بار بھی تمام کتابیں ایک ہی دن میں فروخت ہو گئیں۔ چونکہ لوگوں کا اشتیاق برابر جاری تھا اس لئے اب یہ کیا گیا کہ مقامی طور پر حیدرآباد میں جن لوگوں کے پاس الرسالہ کے پرانے پرچے یا مکتبہ الرسالہ کی چھپی ہوئی کتابوں کے ذخیرے تھے ان کو ان کے گھروں پر جا کر حاصل کیا گیا۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کے اوراق پھٹے ہوئے تھے۔ ٹائٹل پر لوگوں نے اپنا نام وغیرہ لکھ رکھا تھا۔ مگر ان کا بھی یہ حال ہوا کہ جب ان کو اجتماع کے موقع پر اسٹال پر رکھا گیا تو لوگوں نے پوری قیمت پر انہیں خرید لیا۔ مجموعی طور پر ایک سو کیلو وزن سے زیادہ کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

۱۵ نومبر کی شام کو نواب اکبر علی خاں (سابق گورنر یوپی) نے اپنے یہاں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کو جمع کیا۔ اس موقع پر ان لوگوں سے تقریباً ایک گھنٹہ کی ملاقات رہی جناب اکبر علی خاں نے مولانا محمد علی کی زندگی اور کام سے متعلق اپنی ایک کتاب مجھے ہدیہ کی۔ یہ کتاب انہوں نے حال میں شائع کی ہے۔ اس مناسبت سے میں نے اپنی مختصر گفتگو میں بتایا کہ ہمارا مشن کیا ہے۔ آپ اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں محمد علی نے اپنا سفر ختم کیا

نا وہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا ہے۔

میں نے مولانا محمد علی کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کرتے ہوئے کہا کہ آخر عمر میں مولانا مد علی اپنی سیاست سے مایوس ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ یورپ جاکر اسلام کی تبلیغ کا ام کریں۔ وہ یقیناً اس کام کے اہل تھے۔ مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ اپنے ارادہ کی تکمیل سے پہلے وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ میں نے کہا کہ تبلیغ و دعوت کا کام جس کو مولانا محمد علی نے آخر عمر میں کرنا یا ہا تھا۔ یہی دراصل کرنے کا اصل کام ہے۔ ہم امت کو اسی خاص کام کے لئے اٹھانا چاہتے یں۔ اور اسی مقصد کے لئے ہم نے اسلامی مرکز قائم کیا ہے۔

۱۲ نومبر کو ۳ بجے شام کے وقت حمایت نگر کے ایک ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اردو، نگریزی اور تلگو اخبارات کے نمائندے شریک ہوئے۔ پہلے میں نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر یر نظر شمارہ میں الگ سے شائع کی جارہی ہے۔ تقریر کے بعد اخباری نمائندوں نے سوالات کئے ن کے جوابات دئے گئے۔

اگلی صبح کو سب اخبارات میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی۔ لوگوں کے بیان کے مطابق سب سے عمدہ اور جامع رپورٹ روزنامہ آندھرا پربھا (تلگو) کی تھی۔ اس تلگو اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر پی این سوامی دوبارہ انٹرویو لینے کے لئے میری قیام گاہ (حمایت نگر) پر آئے۔ انگریزی اخبار (دکن کرانیکل) میں پریس کانفرنس کی جو رپورٹ چھپی تھی اس کی نقل یہاں درج کی جارہی ہے۔

ISLAMIC SCHOLAR IN CITY

Hyderabad, Nov. 13, 1982.

Maulana Wahiduddin Khan, an eminent Islamic scholar, regretted that a powerful 'opinion-building' media like the Press had resorted to sensational news-mongering that was more like an 'inverted pyramid'-where news rested on the smallest sensational part. The Maulana, who is also the Editor of AL-RISALA-a religious monthly magazine - told newsmen yesterday that instead of clashing with the Government, the media should strive for changing the personality of an individual and the society. Such collective efforts would compel Governments to work for the good of its people whether they liked it or not, he declared. He urged people not to resort to revolutions and break traditions. Maulana Wahiduddin Khan is on a four-day mission to the city, propagating the 'true tenets' of Islam. The Islamic method of change, he says is evolutionary rather than revolutionary.

Deccan Chronicle (Hyderabad), Sunday, November 14, 1982.

پریس کانفرنس سے خطاب

(حیدرآباد ۱۲ نومبر ۱۹۸۲)

ہماری یہ پریس کانفرنس معروف معنوں میں کوئی پریس کانفرنس نہیں ہے۔ پریس کانفرنس ام طور پر عوامی اشوز پر ہوتی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پاس اس قسم کا کوئی اشو موجود یں۔ یہ دراصل ایک قسم کی صحافتی ملاقات ہے۔ اسلامی مرکز کے تعمیری مشن کے تحت ہم ہر طبقہ کے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ہمارے ساتھیوں کو خیال ہوا کہ یہاں کی صحافی برادری تک ی اسے پہنچایا جائے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں صحافت گویا عوام کی آنکھ ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں۔ وہ ام کا دماغ ہے جس سے وہ سوچتے ہیں۔

صحافت ہمارے ملک میں اگرچہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں، تاہم اصولی طور پر صحافت موجودہ زمانہ ا سب سے بڑی قوت ہے۔ مغربی ملکوں میں صحافت کا یہ حال ہے کہ وہ حکومت کے متوازی ایک ستقل قوت بن چکی ہے۔ ان ملکوں میں صحافت اگر کسی صدر حکومت یا وزیر اعظم کی مخالف ہو جائے وہ اس کی مخالفت کو نظر انداز کر کے نہیں رہ سکتا۔ مغرب میں صحافت کی قوت کی ایک مثال سابق مدر امریکہ مسٹر رچرڈ نکسن کے سیاسی زوال (۱۹۷۴) کی صورت میں ہم دیکھ چکے ہیں۔

مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ صحافت کی قوت ابھی تک صحیح رخ پر استعمال نہیں ہو سکی ہے۔ یہ قوت اگرچہ آج پوری طرح انسان کے ہاتھ میں آچکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کو انسان کی اصلاح کے لئے موثر طور پر کام میں نہ لایا جاسکا۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے:

میں جس ہوائی جہاز پر دہلی سے حیدرآباد آیا ہوں، فرض کیجئے کہ وہ اسرائیل یا امریکہ کا جہاز تا اور میں اس کو ہائی جیک کر کے حیدرآباد میں اتارتا اور پھر میری پریس کانفرنس کا اعلان کیا اتا تو یقیناً موجودہ کانفرنس سے بہت زیادہ بڑی کانفرنس کا منظر یہاں دکھائی دیتا۔ حتی کہ بیرونی ملکوں کے اخباری نمائندے تیزی سے روانہ ہو کر دہلی سے حیدرآباد پہنچتے تاکہ اس کانفرنس کو Cover کر سکیں۔ الانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہائی جیکنگ سے زیادہ بے فائدہ کام اور کوئی نہیں۔ مگر آج اسی ا نام صحافت ہے۔ حقیقت کی دنیا میں جو چیز بالکل غیر اہم ہے، وہ پریس کی دنیا میں سب سے زیادہ ہم بن جاتی ہے۔ کیوں، اس لئے کہ اس کے اندر وہ چیز ہے جس کو اخباری اصطلاح میں نیوز ویلو (News Valu) کہا جاتا ہے۔

حال میں ایک سفر کے دوران میرا کچھ وقت یوگنڈا کے ہوائی اڈہ انٹے بی پر گزرا۔ اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ۱۹۷۶ میں فلسطینیوں نے اسرائیل کا ایک ہوائی جہاز ہائی جیک کرکے اتارا تھا۔ چند دن تک یہ واقعہ اخبارات کے صفحہ اوّل کی سرخیوں میں جگہ پاتا رہا۔ اور اس کے بعد فلسطینیوں کو اس کی جو قیمت دینی پڑی وہ آپ سب کو معلوم ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جدید صحافت میں کس طرح ایسا ہو رہا ہے کہ ایک چیز جو حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے قیمت ہو وہ اخبار کے صفحہ میں بہت زیادہ باقیمت بنا کر دکھائی جانے لگے۔

ہم صحافت سے کیا چاہتے ہیں، ایک لفظ میں یہ کہ صحافت حقیقی قیمت (Real Value) کو اہمیت دے نہ کہ اخباری قیمت (News Value) کو۔ ریل ویلو کو اہمیت دینے سے آدمی کے اندر حقیقت پسندی آتی ہے اور حقیقت پسندی تمام انسانی خوبیوں کی اصل ہے۔ اس کے برعکس نیوز ویلو کو اہمیت دینے سے غیر سنجیدگی (Insincerity) پیدا ہوتی ہے۔ اور غیر سنجیدگی بلاشبہ تمام انسانی خرابیوں کی جڑ ہے۔

اسلام جو سنجیدہ اور تعمیری سماج بنانا چاہتا ہے، اس میں صحافت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ مگر موجودہ حالت میں صحافت اس مقصد کے بالکل برعکس سمت میں جا رہی ہے۔ اسلام حقیقی چیزوں کو اہمیت دینے والا مزاج بنانا چاہتا ہے اور موجودہ زمانہ میں صحافت کا کمال یہ بن گیا ہے کہ وہ غیر حقیقی چیزوں کو سب سے زیادہ نمایاں کرے۔

ایک سفر میں میری ملاقات کناڈا کے ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کہ اسلام کا مطلب کیا ہے۔ میں نے جواب دیا:

Islam means realism

اسلام نام ہے حقیقت پسندی کا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کی سائنس ہے اور اس سائنس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ دنیا میں حقیقت پسند بن کر رہو۔ ہر معاملہ میں وہ رویہ اختیار کرو جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو۔ حقیقت پسندانہ رویہ زندگی کی تمام کامیابیوں کا راز ہے۔ اور حقیقت پسندی سے انحراف تمام ناکامیوں کا واحد سب سے بڑا سبب ہے۔

موجودہ زمانہ میں دو خاص بڑے بڑے شعبے ہیں۔ جو زندگی کی صورت گری کرتے ہیں۔ یہ

دونوں شعبے ہیں ــــــ سائنس اور جرنلزم ۔ سائنس کا تعلق زیادہ تر طبیعی دنیا سے ہے اور جرنلزم کا تعلق زیادہ تر انسانی دنیا سے ۔ سائنس اگر کائناتی واقعات کا مطالعہ کرتی ہے تو جرنلزم انسانی واقعات کا۔ مگر عجیب بات ہے کہ دونوں میں سخت تضاد ہے ۔

سائنس مکمل طور پر ریلزم (حقیقت پسندی) کے اصول پر قائم ہے ۔ سائنس اس حقیقت واقعہ کو مان کر چلتی ہے کہ ہمارے باہر ایک دنیا ہے جو کامل طور پر خود اپنے محکم قوانین پر قائم ہے ۔ مثلاً پانی کا ایک قانون ہے ۔ خشکی کا ایک قانون ہے ۔ فضا کا ایک قانون ہے ۔ پانی کے قانون سے مطابقت کرنے میں وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کا نام پانی کا جہاز ہے ۔ زمین کے قوانین سے مطابقت کا نتیجہ موٹر کار ہے اور فضا کے قانون سے مطابقت کا نتیجہ ہوائی جہاز ۔ سائنس کی ہر کامیابی دراصل خارجی دنیا سے اسی مطابقتِ کامل کا دوسرا نام ہے ۔

مگر جرنلزم (بالفاظ دیگر انسانی دنیا) میں یہ معاملہ بالکل الٹا ہو جاتا ہے ۔ میں نے جرنلزم پر ایک کتاب پڑھی ۔ اس کے ایک باب میں دکھایا گیا تھا کہ اخبار نویس جب خبر مرتب کرتا ہے تو اس کی ترتیب کے وقت اس کے سامنے کیا اصول ہوتا ہے ۔ اس اصول کو بتانے کے لئے جرنلزم میں ایک خاص اصطلاح ہے جس کا نام ہے (Inverted Pyramid) یعنی الٹا اہرام ۔ مثال کے طور پر شہر میں ایک عمارت بنتی ہے جس کی ۲۱ منزلیں ہیں ۔ اب اخبار نویس اس کی خبر بنائے گا تو اس کی خبر کا پہلا جملہ ہوگا ــــــ "۲۱ منزلہ عمارت تیار "، ظاہر ہے عمارت کی ۲۱ ویں منزل سب سے آخر میں بنی ۔ پہلے منصوبہ بنایا گیا ۔ پھر زمین تیار کی گئی ۔ بنیاد کھودی گئی ۔ نیچے سے تعمیر کرتے کرتے آخر میں اوپر کی منزل کھڑی ہوئی ۔ مگر اخباری ترتیب میں سب سے پہلے جو چیز دکھائی دی وہ عمارت کی ۲۱ ویں منزل تھی ۔

گویا سائنس میں اگر ریل ویلو (حقیقی قدر) کی اہمیت ہے تو جرنلزم میں نیوز ویلو (اخباری قدر) کی۔ ہماری زندگی کے دو اہم ترین شعبوں میں اس تضاد نے ہماری زندگی کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم سائنس میں جس اصول کو اپنا کر کامیابی حاصل کرتے ہیں، زندگی میں اس کے برعکس اصول پر عمل کرتے ہیں ۔ اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ سائنس میں ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے، زندگی میں ہم وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے ۔ سائنس کے ذریعہ ہم ایک اعلیٰ درجہ کا منصوبہ بند شہر بنا لیتے ہیں مگر اسی شہر کے اندر اعلیٰ درجہ کی منصوبہ بند زندگی نہیں بنا پاتے ۔ سائنس کے ذریعہ ہم ایسی مشینیں بنا لیتے ہیں جو فنی صحت (Technical Perfection) کی حد تک درست کام کرتی ہیں ۔ مگر انسان کو ایسا نہیں بنا

پاتے کہ وہ ٹکنکل پرفکشن کی حد تک صحیح صحیح اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگے ۔

اخبار کے صفحات میں سب سے زیادہ وہی چیز فلیش کرتی ہے جس کے اندر سب سے زیادہ نیوز ویلو ہو۔ سب سے زیادہ کامیاب پریس کانفرنس وہ ہوتی ہے جو کسی بڑے عوامی اشو پر بلائی گئی ہو۔ ہم اس صورت حال کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ طبیعی علوم کی دنیا میں جو حقیقت پسندانہ نقطہ نظر اختیار کیا جاتا ہے وہی حقیقت پسندانہ نقطہ نظر انسانی دنیا میں بھی اختیار کیا جائے ۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق قرآن اسی طرز زندگی کا ہدایت نامہ ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو دین ساری کائنات کا دین ہے اسی دین کو انسان بھی اختیار کرے (افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السماوات والارض طوعا وکرھا) قرآن اور کائنات میں وہی نسبت ہے جو سائنس میں تھیوری (نظریہ) اور ڈماسٹریشن (مظاہرہ) کی ہوتی ہے۔ کائنات خدا کے جس دین پر عملاً چل رہی ہے، قرآن اسی دین کا لٹرل اسٹیٹمنٹ (لفظی بیان) ہے ۔

قرآن خدا کے وجود کی خبر دیتا ہے اور کائنات اپنی اعلیٰ ڈزائن کے ساتھ تصدیق کرتی ہے کہ یقیناً یہ خبر صحیح ہے۔ قرآن انسان سے کہتا ہے کہ خدا کے آگے جھک جاؤ اور درخت کا سایہ زمین پر پڑ کر اور پتھر پہاڑ کے اوپر سے نیچے گر کر تمثیلی روپ میں کہتا ہے کہ یہی طریقہ صحیح ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ خدا کے حکم کا پابند بنے اور کائنات کی ہر چیز قدرت کے قانون کی مکمل پابندی کر کے اعلان کرتی ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ اس دنیا میں ممکن نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اپنی تعمیر اس طرح کرو کہ دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور سورج اور چاند اور تمام اجرام سماوی اپنے اپنے مدار میں گھوم کر بتاتے ہیں کہ یہ مطالبہ کس قدر درست ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے جہاں آدمی کو اپنے کئے کا انجام پانا ہے۔ اور کائنات اپنی حد درجہ معنویت کے ساتھ گواہی دیتی ہے کہ زندگی کا خاتمہ اسی موجودہ دنیا پر نہیں ہو سکتا، ضروری ہے کہ ایک اور دنیا آئے جہاں حق حق کی صورت میں اور باطل باطل کی صورت میں اپنی واقعی جگہ پا سکے ۔

اسلامی مرکز دہلی کا آغاز ۱۹۷۰ میں ہوا۔ یہ ایک خالص تعمیری مرکز ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اسلام کو زندگی کی سائنس کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ انسان کو بھی اسی حقیقت پسندی کے دین پر قائم کر دے جس حقیقت پسندی کے دین پر ساری کائنات قائم ہے۔ ایک لفظ میں، ہم سائنس کو جرنلزم بنا دینا چاہتے ہیں اور جرنلزم کو سائنس ۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

October 1983

AL-RISALA

Islamic Monthly

Submission to God
is the only religion
for both
Man and the Universe.

Published by The Islamic Centre, Delhi

Regd R N No 28822/76
Regd D(DN) No 532

October 1983
Issue No. 83

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول ہدیہ	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	20/-
ظہور اسلام	20/-
احیاء اسلام	12/-
پیغمبر انقلاب	20/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	1/-
تعارف اسلام	2/50
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-

اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
منزل کی طرف	6/-
حقیقت حج	1/-
اسلامی دعوت	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

ENGLISH PUBLICATIONS

The Way to find God	3/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	4/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/
Mohammad : The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ □ جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی ۶

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

جب آدمی کا ماضی اور حال لُٹ چکا ہو
اُس وقت بھی اُس کا مستقبل محفوظ رہتا ہے

نومبر ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۸۴

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

نومبر ۱۹۸۳
شمارہ ۸۴

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

نماز

قرآن میں ہدایت دی گئی ہے کہ نماز قائم کرو، بے شک نماز فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے (اقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر) ابن ابی حاتم نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

من لم تنھہ صلوٰتہ عن الفحشاء والمنکر فلا صلوٰۃ لہٗ — جس کی نماز اس کو فحشاء اور منکر سے نہ روکے تو اس کی نماز نماز نہیں۔

نماز کیا ہے، نماز اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ آدمی ایک ایسے خدا کے سامنے زندگی گزار رہا ہے جس کو آدمی اگرچہ نہیں دیکھتا، مگر خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ جو آدمی مسجد سے یہ سبق لے کر لوٹے، کیا وہ باہر آکر خدا سے غافل زندگی گزار سکے گا۔ نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے۔ جو آدمی اس اقرار میں سچا ہو کیسے ممکن ہے کہ نماز کے بعد وہ اپنی بڑائی کا جھنڈا اٹھانے میں مصروف ہو جائے۔ نماز میں آدمی جو کچھ پڑھتا ہے وہ خدا کے سامنے اس بات کا عہد ہوتا ہے کہ وہ خدائی احکام کا پابند بن کر زندگی بسر کرے گا۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ باھر نکل کر وہ لوگوں کے درمیان سرکش اور باغی کی طرح رہنے لگے۔ نماز کے افعال اس بات کا اظہار ہیں کہ آدمی کا سینہ خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہے۔ پھر کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ آدمی مسجد میں تو خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہونے کا دعویٰ کرے اور جب باہر نکلے تو اس طرح رہنے لگے جیسے کہ اس کے سینے میں نہ خدا کا خوف ہے اور نہ خدا کی محبت۔

نماز اگر حقیقی روح کے ساتھ پڑھی جائے تو یقیناً وہ فحشاء اور منکر سے روکنے والی بن جائے گی۔ لیکن اگر نماز حقیقی روح سے خالی ہو تو وہ محض ایک رسم ہوگی جس کا آدمی کی اصل زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ بظاہر نماز ہوگی مگر حقیقۃً وہ نماز نہ ہوگی۔ کیوں کہ وہ آدمی کو فحشاء اور منکر سے روکنے والی نہ بن سکی۔

یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ ــــــ باپ کو کھڑا دیکھ کر بھی جو بیٹا لیٹا رہے اس کے اندر باپ کا ادب نہیں۔ بہن کو فاقہ میں دیکھ کر جس بھائی کی مٹھی نہ کھلے وہ بھائی بھائی نہیں۔ دوست کی موت کی خبر جس کا قہقہہ بند نہ کرے اس کی دوستی دوستی نہیں۔

کلیسا کی مثال

گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) اٹلی کا بہت بڑا سائنس داں تھا۔ اس نے پہلی بار دور بین تیار کی اور علم الافلاک میں بہت سی اہم چیزیں دریافت کیں۔ ساڑھے تین سو سال پہلے اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "دو بڑے نظام ہائے عالم پر گفتگو"، اس کتاب میں گلیلیو نے زمین اور شمسی نظام کے مسئلہ پر بحث کی۔ اس نے کوپرنیکس کے اس نظریہ کی تائید کی کہ زمین چپٹی نہیں ہے بلکہ گول ہے اور یہ کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھوم رہا ہے بلکہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔

رومی کلیسا نے اس نظریہ کو مسیحی عقائد کے خلاف قرار دیا۔ کتاب مقدس (تورات اور انجیل) میں اگرچہ یہ مسئلہ درج نہ تھا۔ تاہم مسیحی بزرگوں نے بطور خود اپنے عقیدہ کی جو تفصیلات مرتب کیں ان میں انھوں نے اس نظریہ کو درج کر دیا۔ کلیسا یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ کتاب کے متن کی طرح اس کے حواشی بھی مقدس ہیں جو اس کے بزرگوں نے لکھ رکھے ہیں، اس لئے اس نے ان حواشی کو عین دین سمجھا اور اس نے گلیلیو کو بے دین قرار دے دیا۔ اس زمانہ میں کلیسا کو مسیحی دنیا پر زبردست اقتدار حاصل تھا۔ حتیٰ کہ یورپ کے کئی ملکوں (اسپین، اٹلی وغیرہ) میں اس کی متوازی مذہبی عدالتیں قائم تھیں۔ ان عدالتوں کے ذریعہ کلیسا براہ راست خود اپنے اختیار سے ہر قسم کی سزائیں دے سکتا تھا۔

جب گلیلیو نے اپنی غلطی نہیں مانی تو اس کا مقدمہ رومی کلیسا کی مذہبی عدالت میں پیش ہوا۔ اور اس نے اس کو عمر قید کی سزا دے دی۔ اس کے بعد دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک کے لئے اٹلی میں علمی تحقیق کا کام رک گیا ———— خدائی متن کے ساتھ بزرگوں کی تشریحات کو مقدس سمجھنے کا یہ بھیانک انجام تھا جو اٹلی کو بھگتنا پڑا۔

کلیسا نے اپنے دائرہ اختیار میں کچھ اہل علم کا خاتمہ کر دیا۔ مگر خود علم کا خاتمہ کر دینا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ کلیسا کا دائرہ اختیار بہرحال محدود تھا۔ جب کہ علم کائناتی بنیادوں پر قائم ہے، علم وہ چیز ہے جس کی جڑیں سارے زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ کلیسا کے مخالفانہ رویہ کے باوجود علم بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آگئی کہ علم کو عمومی بالادستی حاصل ہو گئی۔ کلیسا کا اختیار ماضی کا افسانہ بن کر رہ گیا۔

اب کلیسا کے لئے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ نئی صورت حال کو تسلیم کرے۔ جس گلیلیو کو وہ اپنے یہاں مرتد اور قابل سزا کے خانہ میں لکھے ہوئے تھا وہ باہر کی پوری علمی

دنیا میں ہیرو کا مقام حاصل کر چکا تھا۔ یہ واقعہ اب کلیسا کی تاریخ میں ایک شرمناک واقعہ بن گیا۔ وہ کلیسا کی غیر علمی روش کے لئے ایک علامتی مثال کی حیثیت رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ جو چیز پہلے گلیلیو کا مسئلہ تھی وہ اب خود کلیسا کا مسئلہ بن گئی۔ کیوں کہ گلیلیو کی علمی حیثیت کا اعتراف کئے بغیر کلیسا اپنے اعتماد کو بحال نہیں کرسکتا تھا۔

۱۹۸۰ میں کلیسا نے اس مسئلہ پر نظرثانی کے لئے آٹھ افراد پر مشتمل ایک خصوصی کمیشن مقرر کیا۔ اس کے ارکان میں مورخ، ریاضی داں اور مسیحی علمار شامل تھے۔ کمیشن طویل غور و خوض اور بحث و مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ علم نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور اس معاملہ میں یقینی طور پر گلیلیو حق پر تھا۔

اس کے بعد مئی ۱۹۸۳ میں ویٹیکن میں ایک خاص اجلاس ہوا جس میں مورخین، مسیحی علمار اور سائنس دانوں کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ پوپ جان پال ثانی خود بھی اس تاریخی اجتماع میں موجود تھے۔ پوپ نے تمام لوگوں کے سامنے اس معاملہ میں کلیسا کی غلطی کا اعتراف کیا اور گلیلیو کے برسرحق ہونے کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا:

> The Church's experience, during the Galileo affair and after it, has led to a more mature attitude and to a more accurate grasp of the authority proper to her.

گلیلیو کے زمانہ میں اور اس کے بعد کلیسا کے تجربہ نے اس کو زیادہ پختہ نقطہ نظر اور اختیار کے زیادہ صحیح ادراک تک پہنچایا ہے جو اس کے لئے مناسب ہے (گارجین ۲۹ مئی ۱۹۸۳)

یہ تضاد کیوں

کلیسا نے کیوں سترہویں صدی عیسوی میں گلیلیو کا انکار کیا تھا اور بیسویں صدی میں کیوں اس نے گلیلیو کا اقرار کر لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں گلیلیو کی شخصیت ایک متنازعہ (Controversial) شخصیت تھی۔ جب کہ بیسویں صدی عیسوی میں وہ ایک تسلیم شدہ (Established) شخصیت بن چکی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ کلیسا کا ایک اور شخصیت کے ساتھ پیش آیا۔ یہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے۔ مسیحی کلیسا نے ساتویں صدی عیسوی میں حضرت محمد کا انکار کیا۔ اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ ساتویں صدی میں حضرت محمد کی شخصیت ایک متنازعہ شخصیت تھی۔ اب دوبارہ یہ ہوا ہے کہ بیسویں صدی میں پہنچ کر حضرت محمد کی شخصیت ایک ثابت شدہ شخصیت بن چکی ہے۔ آج علم اور تاریخ کے

اتنے شواہد آپ کی نبوت کی تصدیق پر جمع ہو چکے ہیں کہ اب باعتبار حقیقت کسی کے لئے اس پر شبہ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی (تقابل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر موریس بوکیل کی مندرجہ ذیل کتاب ـــــ بائبل، قرآن اور سائنس :

(The Bible. The Quran, and Science)

پھر کیا وجہ ہے کہ جن اسباب کی بنا پر کلیسا نے گلیلیو کو مان لیا، انھیں اسباب کی موجودگی میں وہ حضرت محمد کو نہیں مانتا۔ وہ بدستور آپ کو بناوٹی نبی (False Prophet) کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ وہ فرق ہے جو باعتبار نوعیت دونوں شخصیتوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ گلیلیو کو ماننا صرف ایک فنی غلطی کا اعتراف ہے۔ جب کہ حضرت محمد کو ماننا اپنے پورے وجود کی نفی کے ہم معنی ہے۔

گلیلیو ایک فلکیات داں تھا۔ اس کا کیس فلکیاتی علم کا کیس تھا۔ جب کہ حضرت محمد ایک پیغمبر تھے اور آپ کا کیس خدا کی پیغمبری کا کیس۔ یہ فرق دونوں کے معاملہ کو نوعی طور پر ایک کو دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ گلیلیو کو ماننا صرف ایک علمی سچائی (Scientific truth) کو ماننا ہے۔ اس کے برعکس حضرت محمد کو ماننا ایک مذہبی سچائی (Religious truth) کو ماننا۔ گلیلیو کو ماننا کلیسا کے لئے ایک ایسے خارجی واقعہ کو ماننا تھا جس سے اس کے اپنے اوپر کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ اس کا اپنا مخصوص ڈھانچہ اس کے بعد بھی بدستور برقرار رہتا تھا۔ اس کے برعکس حضرت محمد کو ماننا ایک ایسے واقعہ کو ماننا تھا جس کا براہ راست تعلق اس کے اپنے ڈھانچہ سے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد کو مانتے ہی پاپائیت اپنے وجود کا جواز کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد کلیسا کا پورا محل اچانک زمین پر گر پڑتا ہے۔

حضرت محمد نے توحید کی تعلیم دی جب کہ موجودہ کلیسا کا سارا ڈھانچہ تثلیث کے عقیدہ پر قائم ہے۔ حضرت محمد نے حضرت مسیح کو خدا کا پیغمبر بتایا جب کہ کلیسا حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اپنا مذہبی قلعہ تعمیر کئے ہوئے ہے۔ حضرت محمد نے ذاتی عمل کو نجات کی بنیاد قرار دیا، جب کہ کلیسا کا سارا مذہبی ڈھانچہ کفارہ کے عقیدہ پر قائم ہے، وغیرہ۔ ایسی حالت میں کلیسا کیسے حضرت محمد کو مان لے۔

گلیلیو کا اقرار کرنے کے بعد بھی کلیسا کی حیثیت بدستور باقی رہتی تھی۔ جب کہ حضرت محمد کا اقرار کلیسا کے لئے خود اپنے انکار کے ہم معنیٰ ہے۔ اور بلاشبہ دنیا میں ایسے لوگ سب سے زیادہ کم پائے جاتے ہیں جو اس قسم کی جرأت کا ثبوت دے سکیں۔ کلیسا صرف اپنی نفی کی قیمت پر حضرت محمد کو مان سکتا ہے۔ اور اس دنیا میں کون ہے جو اپنی نفی کی قیمت پر کسی سچائی کو ماننے کے لئے تیار ہو جائے۔

مسلمانوں کا مسئلہ

۱۵ مئی ۱۹۸۳ کو میں مراد آباد میں تھا۔ وہاں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک کا موضوع تھا، دینی تقاضے۔ اور دوسری کا موضوع تھا، تعمیر ملت۔ تعمیر ملت کے موضوع پر جب تقریر ختم ہوئی تو ایک صاحب اٹھے جو نہایت سنجیدہ اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے دو سوالات کئے۔

پہلا یہ کہ آپ نے تعمیر ملت کے موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ سب اسباب کی باتیں ہیں مگر مراد آباد کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ مراد آباد کے فساد (۱۹۸۰) کے آخری مرحلہ میں مسلمان اس طرح گھر گئے کہ ان کے سامنے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ انھوں نے سوچا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ دعا کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے مل کر دعا کی اور اس کے بعد اچانک صورت حال بدل گئی اور شہر میں امن قائم ہوگیا۔ دوسرا سوال یہ کہ اگر سارا معاملہ اسباب کا ہے تو اس میں مسلمان اور غیر مسلمان سب برابر ہیں، پھر مسلمان کا وہ امتیاز کیا ہے جو خیر امت کی حیثیت سے انھیں دیا گیا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون عام (الرعد ۱۱) سے ہے اور آپ نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون اضطرار (النمل ۶۲) سے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ جب ایسے حالات میں گھر جائے جہاں بظاہر اس کے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو اور وہ دل سے خدا کو پکارے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے (یونس ۲۳-۲۲) مگر جیسا کہ قرآن میں صراحت ہے، حالت اضطرار میں مدد کا تعلق ہر ایک سے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ کسی اضطراری واقعہ سے عمومی قانون اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے جو بات کہی وہ فساد سے پہلے کی ہے۔ اور آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ فساد کے بعد کی ہے۔ فساد کے بعد جب ہنگامی حالت پیدا ہو چکی ہو، اس وقت کیا کرنا ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ مگر فساد ہونے سے پہلے حالات کو معتدل رکھنے کے لئے کیا کیا جائے، یہ بالکل مختلف مسئلہ ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں برداشت کو کھو دیا ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی عدم برداشت کا مزاج تمام فسادات کا اصل سبب ہے۔ جب تک کہ اس مزاج کو دور نہ کیا جائے، کسی بھی دوسری تدبیر سے فسادات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان پچھلے ۲۵ سال

سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اقلیتی کردار دینے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ یہ لڑائی حکومت اور حکمراں پارٹی سے تھی۔ بالآخر ۱۹۸۲ میں ان کو نئے ایکٹ کے تحت اقلیتی کردار دے دیا گیا۔ مگر مسلمانوں کی لڑائی بدستور جاری ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اس لڑائی کا نشانہ نئی دہلی تھا، اب اس لڑائی کا نشانہ خود ان کا مسلمان وائس چانسلر ہے

اس سے پہلے ہندستان کے بیشتر مسلمانوں نے تقسیم ملک کی مانگ کی۔ اس مانگ کے لئے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ مشترک ہندستان میں ملک کا اکثریتی فرقہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ اس مطالبہ کے مطابق ان کو پاکستان دے دیا گیا۔ مگر ان کے شکایتی ذہن نے اپنی شکایت کے لئے نیا نشانہ تلاش کر لیا۔ اب مشرقی پاکستان کو یہ شکایت ہوگئی کہ مغربی پاکستان اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ دوبارہ خود اپنے درمیان ایک بھیانک لڑائی ہوئی جو اس پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ تاہم ۱۹۸۳ کے واقعات بتاتے ہیں کہ اصل مسئلہ بدستور باقی ہے۔ اب سندھ کے مسلمانوں کو پنجاب کے مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ یہ لڑائی جاری ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں جا کر ختم ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہر بات میں ان کا بے برداشت ہوجانا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو ختم نہ کریں، ان کے لئے زمین تنگ رہے گی، خواہ وہ ایک ملک کا معاملہ ہو یا دوسرے ملک کا۔

دوسرے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمان اپنے تقرر کے اعتبار سے بلاشبہ خیر امت ہیں اور اس حیثیت سے ان کے ساتھ خدا کا ایک امتیازی معاملہ ہے۔ خدا نے مسلمانوں کے لئے اپنی ایک خصوصی مدد مقدر کی ہے جو اس نے دوسروں کے لئے مقدر نہیں کی۔ مگر اس خصوصی مدد کا استحقاق خیر امت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری انجام دینے پر ہے نہ کہ صرف کسی مسلم نسل سے متعلق ہونے کی بنا پر۔

یہ ذمہ داری دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ دعوت و تبلیغ سے مراد مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام نہیں ہے۔ بلکہ غیر مسلموں تک خدا کا سچا دین پہنچانا ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح بھی ایک کرنے کا کام ہے اور اس کو ضرور کیا جانا چاہئے۔ مگر غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کا وعدہ کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام کرنے سے پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ وعدہ صرف اس وقت پورا ہوگا جب کہ غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے اور اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اتمام حجت کی حد تک پہنچایا جائے۔

بے آمیز حق

ایک ہے عوام کی رعایت کرنا۔ اور دوسرا ہے خدا کی رعایت کرنا۔ جو تحریک عوامی جذبات کی رعایت کرے وہ بہت جلد اپنے ماحول میں عزت اور مقبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ اس کا سفر آسانیوں کے جلو میں طے ہوتا ہے۔ دوسری تحریک وہ ہے جو خدا کی مرضی کا لحاظ کر کے اٹھے۔ اس کو اپنے ماحول میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی قسم کی تحریک میں عوام اپنے جذبات سے ہم آہنگی پاکر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کی تحریکیں ان کے مانوس ذہنی ڈھانچہ کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے مسلمات پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے وہ اس کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی دعوت کو ہمارے مزاج کے موافق بناؤ۔ اور داعی جب ان کے مطالبہ کو پورا نہیں کرتا تو وہ اس کے سخت ترین دشمن بن کر اس کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہی دوسری صورت تھی جو مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئی۔ آپ خالص توحید کے داعی تھے۔ مگر خالص توحید قریش کے لئے قابل قبول نہ ہو سکی۔ کیوں کہ اس سے ان کے بزرگوں پر زد پڑتی تھی۔ اس میں ان کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ بدلنا پڑتا تھا۔ اس میں ان کو ایک ایسی چیز کی طرف اقدام کرنا تھا جس میں انھیں اپنی تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر دینا پڑے۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ مصالحت کا انداز اختیار کریں۔ اپنی بات کو اس انداز سے پیش کریں کہ ہماری بات سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو (ہود ۱۲، بنی اسرائیل ۷۳، یونس ۱۵)

ان حالات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بے آمیز حق کا داعی بننا مشکل ترین کام تھا۔ بشری تقاضے کے تحت یہ خیال آپ کے دل میں آسکتا تھا کہ مخاطب کے ساتھ کچھ مصلحت اور رعایت کا انداز اختیار کیا جائے۔ مگر خدا کا حکم تھا کہ ذرا بھی ان کی رعایت نہ کی جائے۔ صرف حق کی رعایت کی جائے اور خدا کے دین کو پوری طرح بے آمیز صورت میں پیش کیا جائے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں یہ حدیث آئی ہے۔

قال ابوبکر سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما شیبک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیبتنی ہود واخواتہا

حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کس چیز نے آپ کو بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا، مجھ کو ہود اور اس کے مثل سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔

اپنے لئے کچھ دوسروں کے لئے کچھ

سر رچرڈ ڈابسن (Sir Richard Dobson) انگلستان کے ایک کامیاب صنعت کار ہیں وہ ۲۱ سال تک برٹش، امیریکن، ٹوبیکو (British American Tobacco) کے اعلیٰ ذمہ دار رہے ہیں۔ وہ ایک سال تک برٹش لیلینڈ (British Leyland) کے چیئرمین رہے ہیں۔ یہ فرم دومنزلہ بس بنانے کے لئے بہت مشہور ہے۔

سر رچرڈ ڈابسن آج کل لندن کے ایک خاص علاقہ، رچمنڈ (Richmond) میں مارچ منٹ روڈ (Marchmont Road) پر رہتے ہیں۔ یہ لندن کی ایک نہایت پرسکون سڑک ہے اور صرف کروڑ پتی قسم کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔

حال میں ایسا ہوا کہ رچمنڈ علاقہ کی ایک سڑک خراب ہوگئی۔ اور اس پر ازسرنو تعمیر کا کام چھیڑنا پڑا۔ اس سڑک پر لندن کی بس نمبر ۶۵ چلتی تھی۔ چونکہ یہ سڑک تعمیری کام کی وجہ سے ناقابل استعمال ہو رہی تھی اس لئے عارضی طور پر اس کی روٹ بدل دی گئی اور کچھ دنوں کے لئے اس کو مارچ منٹ روڈ سے لے جایا جانے لگا۔

سر رچرڈ ڈابسن اگرچہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتے ہیں تاہم اپنے مکان کے سامنے کی سڑک سے دھواں نکالنے والی بس کا گذرنا انھیں پسند نہیں آیا۔ گارجین (۱۷ اگست ۱۹۸۳) نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے لندن کے اخبار میں اپنا ایک احتجاجی خط چھپوایا جس میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ تنہا بس کے ڈیزل ایندھن کی بو ہی توہین آمیز اور صحت کے لئے خطرناک ہے:

The smell of the diesel fuel alone is an affront and a health hazard.

سر رچرڈ ڈابسن سگریٹ اور بس کے تاجر ہیں۔ یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو دھواں نکال کر فضا خراب کرتی ہیں۔ وہ ساری زندگی دھوئیں کا کاروبار کرتے رہے۔ یہ دھواں جب تک دوسروں کے گھر میں پہنچ رہا تھا انھیں اس کی خرابی کا احساس نہیں ہوا۔ مگر ایک بار جب اتفاق سے وہ ان کے اپنے گھر کے اندر پہنچ گیا تو وہ چیخ اٹھے۔

ہر آدمی اپنے لئے کچھ چاہتا ہے اور دوسرے کے لئے کچھ، اور بلاشبہہ یہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

اداکاری

رشی کپور ایک مشہور فلم ایکٹر ہے۔ لنس آئی (Lens Eye) نے ایک صحافتی ملاقات میں رشی کپور سے پوچھا کہ کیا آپ اپنے موجودہ پیشہ سے مطمئن ہیں۔ اس کے جواب میں فلم ایکٹر نے کہا:

I can't say I'm satisfied. I'm fed up of being the lover boy. And everyone thinks that wretched instrument— the guitar –is a part of my body. I'm tired of being only a dancing-singing-jumping-smiling puppet.

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں مطمئن ہوں۔ عاشق کا کردار ادا کرتے کرتے میری طبیعت بھر گئی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کم بخت باجا —— ستار —— میرے جسم کا ایک حصہ ہے۔ میں اس سے اکتا گیا ہوں کہ میں صرف ناچنے، گانے، اچھلنے اور مسکرانے کی کٹھ پتلی بنا رہوں۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۵ جون ۱۹۸۳)

رشی کپور کے الفاظ اپنی برادری کے تمام لوگوں کے دل کے ترجمان ہیں۔ فلمی کردار سراسر ایک مصنوعی کردار ہے جو دوسرے شخص کی ہدایت کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا کٹھ پتلی جیسا کردار انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ انسان ایک خود فکر مخلوق ہے۔ اس کا اندرون تقاضا کرتا ہے کہ وہ خود سوچے اور اپنے ارادہ کے تحت عمل کرے۔ مگر فلمی کردار اس شرط کو پورا نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ فلم کے اسٹیج پر کام کرنے والے لوگ اندر سے ہمیشہ اپنے بارہ میں غیر مطمئن رہتے ہیں۔

ایسی حالت میں جو لوگ فلم دیکھتے ہیں اور اس سے خوش ہوتے ہیں، وہ صرف اپنے سطحی ذوق کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اسٹیج پر جو شخص محبت کا کردار ادا کر رہا ہے وہ اندر سے بیزاری کی نفسیات لئے ہوئے ہے۔ جو شخص خوشی کا چہرہ بنا کر ان کے سامنے آیا ہے اس کے سینہ میں صرف ایک اداس دل چھپا ہوا ہے جس کو دیکھنے والے اس کو قابل رشک نظروں سے دیکھ رہے ہیں وہ خود اپنے بارہ میں بالکل غیر مطمئن ہے۔ اگر وہ ان باتوں کو جان لیں تو وہ سینما بینی سے بیزار ہو جائیں جس کو وہ تفریح سمجھ کر دیکھتے ہیں۔

اعلان

الرسالہ کے انگریزی اڈیشن کی تیاریاں جاری ہیں۔ اس کو ہر اعتبار سے معیاری بنانے کی کوششیں کی جاری ہیں۔ انشاء اللہ اس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۸۴ میں شائع ہوگا۔

منیجر الرسالہ

حقیقت کی دریافت میں ناکامی

کارل مارکس (۸۳-۱۸۱۸) فطرت سے غیر معمولی صلاحیت لے کر پیدا ہوا۔ جرمنی کی اعلے تعلیم گاہوں میں اس نے ڈاکٹریٹ تک تعلیم حاصل کی۔ وہ آٹھ زبانیں جانتا تھا: یونانی، اطالوی، اسپینی، جرمن، انگریزی، فرانسیسی، ڈچ، فریشین۔ آخر عمر میں اس نے روسی زبان سیکھنا شروع کیا۔ مگر تکمیل سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ ساری عمر پڑھتا رہا۔ تاریخ، اقتصادیات اور فلسفہ سے لیکر ادب اور مذہب تک کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس پر اس نے کافی مطالعہ نہ کیا ہو۔ اس نے لائبریریاں کی لائبریریاں اپنے ذہن میں اتار ڈالیں۔

مارکس کا یقین تھا کہ اس کی غیر معمولی ذہانت اور اس کے بے پناہ مطالعہ نے اس کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ زندگی کے راز کو منکشف کر سکے۔ مارکس کے رفیق خاص فریڈرش انگلس نے جہاں ہیگل پر تنقید کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"اگرچہ ہیگل اپنے وقت کا ایک بہت بڑا انسائیکلو پیڈیائی ذہن رکھنے والا آدمی تھا۔ تاہم وہ ایک محدود انسان تھا۔ اس کی محدودیت کی پہلی وجہ اس کی اپنی معلومات کی کمی تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے زمانے کا علم اور اس وقت کے نظریات بھی محدود تھے، اس کے علاوہ ایک تیسرا سبب بھی تھا، وہ یہ کہ ہیگل ایک عینیت پسند (Idealist) شخص تھا۔ یعنی وہ مادے کے بجائے تصور کو اصل حقیقت سمجھتا تھا" [1]

انگلس نے لکھا ہے کہ ان اسباب کی بنا پر ہیگل کی تفصیلات سب کی سب غلط ہو کر رہ گئیں [1] اور حقیقت کی دریافت میں وہ ناکام رہا۔

انگلس کی یہ بات جو اس نے ہیگل کے بارے میں لکھی ہے، یہی خود مارکس پر بھی پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کے قانون کو اگرچہ تاریخ کا فیصلہ قرار دیتا ہے مگر اس کے باوجود اس کا کہنا ہے کہ اس قانون کو معلوم کرکے اسے استعمال کرنا خود انسان کا اپنا کام ہے۔ اس لیے عملاً اس کے یہاں بھی قانون ساز خود انسان ہی بن جاتا ہے۔ مارکس جب کہتا ہے کہ زندگی کا قانون خود زندگی کے اندر موجود ہے اس کو خارج میں کہیں سے برآمد کرنے کی ضرورت نہیں تو دراصل وہ اپنے آپ کو ان فلسفیوں

---

[1] مارکس انگلس سلکٹڈ ورکس جلد دوم (ماسکو ۱۹۴۹) صفحہ ۱۲۲

سے الگ کرنا چاہتا ہے جو انسان کو ایک خود فکر مخلوق مان کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اپنا قانون ساز آپ ہے۔ اس کے برعکس مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ جس طرح لوہے اور پتھر کے لئے الگ سے کوئی قانون بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اپنا قانون اپنے ساتھ رکھتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان بھی ایک قانون میں جکڑا ہوا ہے جس کو بنانا نہیں بلکہ دریافت کرنا ہے۔ مگر اس چھپے ہوئے قانون کو دریافت کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا کام جب وہ خود انسان کے سپرد کرتا ہے تو ظاہری اختلاف کے باوجود وہ اپنے آپ کو انھیں فلسفیوں کے گروہ میں شامل کر دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان خود اپنے لئے قانون بنا سکتا ہے۔ اس لئے وہ تنقید جو قسم اوّل کے فلسفیوں پر چسپاں ہوتی ہے ٹھیک وہی تنقید خود مارکس پر بھی چسپاں ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

انگلز نے اپنے اس تجزیے میں ہیگل کی ناکامی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کا علم محدود تھا کیونکہ ایک شخص خواہ کتنا ہی وسیع مطالعہ رکھتا ہو مگر بہرحال وہ محدود ہی رہے گا۔ دوسرے یہ کہ تحصیل علم کے لئے اس کو جو زمانہ ملا وہ بھی ایسا زمانہ تھا جو اسے زیادہ معلومات نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود چونکہ ایک خاص طرز فکر رکھتا تھا اس لئے زیادہ وسیع ذہن کے ساتھ نتائج اخذ کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔ اگر انگلز کی اس تشریح کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ صرف ہیگل بلکہ تمام فلسفیوں کے نظریات کی تردید ہو جاتی ہے حتیٰ کہ خود مارکس کے فلسفہ کی بھی جس کو انگلس حقیقت کا صحیح ترین ترجمان مانتا ہے۔

پہلی چیز انسان کا اپنا علم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قانون دریافت کرنے کے لئے جس وسیع علم کی ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں انسان کا علم ہمیشہ محدود رہے گا۔ زندگی کے قانون کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام انسانوں کے لئے ہے جو روئے زمین پر بستے ہیں۔ کیا کوئی انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے تمام انسانوں کے جذبات کو پڑھا ہے اور ان کی ضروریات کو معلوم کر لیا ہے۔ آدمی بسا اوقات خود اپنے بارے میں کسی قطعی اور صحیح فیصلہ تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر وہ ان کروڑوں انسانوں کے بارے میں کیا جان سکتا ہے جن کی اس نے شکل تک نہیں دیکھی، جن کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ زندگی کا مسئلہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس طرح کسی مشین کا ایک پرزہ درست کرنے کے لئے اس کے تمام پرزوں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے اسی طرح انسانی زندگی کے کسی ایک جزء کے لئے بھی وہی شخص قانون بنا سکتا ہے جو پوری زندگی کے مسائل پر عبور حاصل کر چکا ہو۔ کیا انسان اپنی موجودہ عمر اور موجودہ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ ایک شخص جو بیک وقت دو خیالات پر غور نہیں

کرسکتا۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کروڑوں انسانوں کے لئے قانون بنا سکتا ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔ ذہنی صلاحیتیں تو درکنار کیا چند سال کی یہ محدود عمر کسی کے لئے کافی ہوسکتی ہے کہ وہ زندگی کے مسائل کا جامعیت اور تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرسکے۔

مارکس کی زندگی کے آخری ۲۵ سال اس طرح گذرے ہیں کہ لندن میں برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں صبح کو وہ سب سے پہلے داخل ہوتا تھا اور شام کو سب سے آخر میں نکلتا تھا۔ مگر اس غیر معمولی جانفشانی کے باوجود اپنی عمر میں وہ اپنی کتاب "سرمایہ"، کی صرف ایک جلد شائع کر سکا اور بقیہ جلدیں مکمل کرنے سے پہلے ایک روز اپنے مطالعہ کے کمرہ میں آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا انتقال کرگیا۔ اس کی یہ مشہور کتاب جو "محنت کش طبقہ کی بائبل"، کہی جاتی ہے اس کی دوسری اور تیسری جلدیں جن کا مسودہ وہ ناتمام حالت میں چھوڑ گیا تھا اس کو انگلز اور کاٹسکی نے بعد کو مکمل کیا اور اس میں بہت دنوں تک کاٹ چھانٹ ہوتی رہی۔ پھر مارکس نے اپنی بہترین کوشش صرف کرنے کے بعد جو ناتمام حاصل مطالعہ چھوڑا ہے اس کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں زیادہ تر صرف سرمایہ دارانہ اقتصادیات کی تشریح کی گئی ہے۔ مگر موجودہ نظام کو توڑ کر سوشلسٹ اقتصادیات کی تنظیم کس طرح ہوگی، اس پر توجہ دینے کا اسے بہت کم موقع ملا۔ مارکس کی تحریروں میں کہیں بھی اس نظام کی تفصیل نہیں ملتی جو سرمایہ داری نظام کے بعد آئے گا۔ حقیقت یہ کہ انسان کو جو صلاحیتیں دی گئی ہیں اور اس کو دنیا میں کام کرنے کے لئے جتنا وقت ملتا ہے اس کے تحت کوئی بھی انسان خواہ وہ کتنا ہی قابل ہو یہ کام نہیں کرسکتا۔ انسان کے لئے قانون بنانا انسان کے بس سے باہر ہے۔

دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ آج جو قانون بنتا ہے وہ کل نافذ ہوتا ہے۔ مگر انسان کو کل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ آدمی کی معلومات صرف ماضی اور حال کے واقعات تک محدود ہیں۔ جب کہ اسے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔ مثال کے طور پر مارکسزم کا سارا انحصار ماضی کے تجزیے پر ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہے اور یہی دیکھ سکتی ہے کہ جو کچھ آج ہے وہ کیوں کر وجود میں آیا اور اس کی نشوونما کس طرح ہوئی اور پھر اس تجزیے کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ مارکس اور اس کے متبعین کو اس طریقے کے مکمل ہونے پر اس قدر اصرار ہے گویا انھوں نے "آخری سچائی" کو پالیا ہے۔ حالانکہ مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ جس طرح تمام موجودات عمل ارتقار کے ذریعے وجود میں آتی ہیں اسی طرح انسانی سماج میں بھی ارتقائی عمل ہو رہا ہے اور پھر ڈارون کے نظریہ کے برعکس اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ارتقار کا یہ سفر لازمی طور پر تدریج اور تسلسل کے ساتھ نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس میں اچانک خلاف توقع تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہ نظریہ

خود اس بات کی تردید کر رہا ہے کہ کوئی شخص مستقبل کے بارے میں جان سکتا ہے۔ جب انسانی سماج کسی لگے بندھے ارتقائی نظریے کے مطابق سفر نہیں کر رہا ہے بلکہ بعض اوقات بالکل اچانک اس میں غیر متوقع تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں تو آئندہ کے بارے میں کوئی اصول کس طرح طے کیا جا سکتا ہے۔ پھر کس طرح یقین کیا جائے کہ ماضی کے بارے میں کسی شخص کا تجزیہ لازمی طور پر مستقبل کی بھی صحیح تشریح کرتا ہے۔ جو کچھ وجود میں آچکا ہے ان کے بارے میں کوئی سرپھرا سب کچھ جانتے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ مگر جو کچھ ابھی سرے سے وجود میں نہیں آیا ان کو کون جان سکتا ہے جب کہ مارکسی فلسفے کے مطابق ان کے لئے کوئی لگا بندھا اصول بھی نہیں ہے۔ جب کہ اکثر اوقات اندازے کے خلاف بھی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

اب تیسری حیثیت سے دیکھیے۔ انگلز کے خیال میں ہیگل اس لئے حقیقت تک نہ پہنچ سکا کہ وہ "عینیت پسند" تھا۔ ٹھیک یہی بات خود مارکس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ اس لئے حقیقت تک نہیں پہنچ سکا کہ وہ "مادیت پسند" تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ بالکل تجریدی انداز میں حقائق کا مطالعہ کر سکے۔ ہر شخص کے کچھ مخصوص رجحانات ہوتے ہیں اور آدمی مجبور ہے کہ وہ جب بھی مسائل حیات کا مطالعہ کرے تو ان رجحانات سے مغلوب ہو جائے۔ اس طرح ہر آدمی کا مطالعہ جانبدار مطالعہ بن جاتا ہے اور اس کے فیصلے زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں، اس میں ایک فرد کے ذوق کی تسکین ہو سکتی ہے مگر مجموعی طور پر پورے معاشرے کے لئے وہ بالکل ناقابل قبول ہوتے ہیں۔

انسان کی ذاتی کیفیات کس طرح اس کے طرز فکر پر غالب ہو جاتی ہیں اس کی ایک دل چسپ مثال یہ ہے کہ مارکس کی کتاب "سرمایہ" کی پہلی جلد شائع ہو کر جب انگلز کے ہاتھ میں گئی تو اس نے اس کے پہلے دو ابواب پر جن میں جنس اور زر کا تجزیہ ہے اور جو تمام کتاب میں سب سے زیادہ صبر آزما اوراق سمجھے جاتے ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے مارکس کو لکھا:

"کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ ابواب اتنے لمبے ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں پر منقسم ہوتے اور ان کو زیادہ عام فہم بنا دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ جس زمانہ میں یہ ابواب لکھے جا رہے تھے، تمہیں سرطان کے پھوڑوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ تمہارے پھوڑوں کا وہی عذاب ان ابواب میں مقید ہو گیا ہے اور وہی کرب دیوان میں بھی بس گئی ہے۔"

مارکس نے اس تنقید کی تصدیق کرتے ہوئے جواب دیا:

"مجھے اس کا افسوس نہیں ہے بلکہ خوش ہوں کہ سرطان کے پھوڑوں کا عذاب ان میں محفوظ ہے کیونکہ میری یہ کتاب سرمایہ داروں کے طبقے میں جب جائے گی تو اس عذاب کا مزہ وہ بھی چکھ سکیں گے"

یہ صحیح ہے کہ ایک سرطان زدہ مصنف کی تحریر کو جو شخص پڑھے گا وہ اس کے اندر پھوڑوں کا تعفن اور ان کا کرب محسوس کر سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ تحریر کی خوبی نہیں بلکہ اس کا نقص ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تحریر ایک شخص کی ذہنی حالت کی ترجمان ہے نہ کہ حقیقت کی ترجمان۔

الہامی ہدایت

حقیقت یہ ہے کہ مادی دنیا اور انسانی دنیا دونوں کا دین ایک ہے۔ اور وہ قانون قدرت کی پیروی ہے۔ ایک ہی خالق نے دونوں کو پیدا کیا ہے اور وہی ہے جس نے دونوں کے لئے قانون عمل مقرر کیا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ مادی دنیا اپنا قانون اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ مادی دنیا کا قانون عمل خود اس کے اندر اس طرح پیوست ہوتی ہے کہ وہ لازمی طور پر اسی کے تحت عمل کرتی ہے۔ وہ کسی طرح اس سے باہر نہیں جا سکتی۔ مگر انسان ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو وہ کرنا چاہے۔ اور وہ نہیں کرتا جو وہ کرنا نہ چاہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان، دوسری چیزوں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا قانون اس کے ساتھ ہو۔ انسان کو اپنا قانون عمل علیحدہ سے دریافت کرنا ہے۔

مگر انسان جب بطور خود اپنا قانون عمل دریافت کرنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو دریافت نہیں کر سکتا۔ انسان کی محدودیتیں (Limitations) فیصلہ کن طور پر اس کی راہ میں حائل ہیں۔

انسان کی یہی وہ کمی ہے جو اس کی زندگی کی تعمیر کے لئے "خدائی الہام" کو ضروری ثابت کرتی ہے۔ انسان جس قانون عمل کا حاجت مند ہے جب وہ اس کو دریافت نہیں کر سکتا تو اس کے بعد دوسری ممکن صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اس کو اس کے خالق کی طرف سے دی جائے۔ جو چیز دوسری مخلوقات کو اندرونی طور پر ملی ہوئی ہے وہ انسان کو بیرونی ذریعہ سے فراہم کی جائے۔

یہ بیرونی ذریعہ وہی ہے جس کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ انسان کی علمی محدودیت اس کو بیرونی ہدایت کا محتاج ثابت کرتی ہے۔ اور پیغمبر کی ہدایت کا عین انسانی طلب کے مطابق ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہی وہ بیرونی ہدایت ہے جس کی اسے ناگزیر طور پر ضرورت تھی

علم کافی نہیں

"پچاس سونے والے بہہ گئے ——" یہ خبر ایک مرتبہ اخبار میں چھپی۔ خبر میں ایک مقام پر بارش اور طوفان کی تفصیلات بتائی گئی تھیں اور اس میں کہا گیا تھا کہ پانی ریلوے لائن کے اوپر تک پہنچ گیا اور پچاس سونے والے بہہ گئے۔

خبر کچھ عجیب سی تھی۔ ذہن نے جاننا چاہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ انگریزی اخبار دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اصل میں خبر تھی "پچاس سلیپر بہہ گئے"۔ یہی لفظ اردو اخبار میں ترجمہ کی غلطی سے "سونے والے" بن گیا۔ سلیپر (Sleeper) کے لفظی معنی بے شک سونے والے کے بھی ہیں۔ مگر اس خبر میں ظاہر ہے کہ یہ لفظ ریلوے لائن میں استعمال ہونے والے اس لکڑی کے کندے کے لئے تھا جس کے اوپر لوہے کی پٹریاں بچھائی جاتی ہیں نہ کہ سونے والے آدمی کے لئے۔

اس قسم کی غلطیاں کتنی ہی بار آپ کے سامنے آئی ہوں گی ان غلطیوں کا سبب ہمیشہ علم کی کمی ہوتا ہے۔ اور ان سے بچنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ آدمی علم حاصل کر لے۔ مگر غلطیوں کی ایک اور قسم، اس سے زیادہ سنگین قسم ہے جس کا تعلق علم سے نہیں معرفت سے ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کے لئے صرف صاحب علم ہونا کافی نہیں بلکہ حقیقت آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو شخص معرفت کی دولت سے محروم ہو وہ محض علم کی بدولت ان غلطیوں سے مامون نہیں رہ سکتا۔

معرفت کیا چیز ہے اور علم اور معرفت میں کیا فرق ہے، یہ ایک نہایت نازک سوال ہے۔ اجمالی طور پر ہم میں سے ہر شخص اس فرق کو سمجھتا ہے، مگر متعین تعریف کرنی ہو تو کسی ایک تعریف پر سب کا اتفاق حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تاہم سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم کا مطلب ہے جاننا اور معرفت کا مطلب ہے پہچاننا۔ معرفت علم کی روشنی ہے۔ آنکھ اور روشنی میں جو نسبت ہے وہی نسبت علم اور معرفت میں ہے۔ اگر سرے سے روشنی نہ ہو تو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر روشنی موجود ہو مگر کم ہو تو اسی کے بقدر کم دکھائی دے گا جتنا روشنی میں کمی ہے۔ اس اعتبار سے معرفت حاصل ہونے اور معرفت حاصل نہ ہونے کے ہزار درجے بن جاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ کیڑے مکوڑے (Insects) ہماری ایک جانی بوجھی حقیقت ہیں۔ یہ نہایت کثرت سے انڈے بچے کرتے ہیں اور ان کے اندر بڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بھڑ کو اگر مسلسل زندہ رہنے اور نشو ونما پانے کا موقع ملے تو وہ شیر کی مانند جسامت حاصل

کر سکتی ہے۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے کیڑوں کی ہزاروں صورتیں اگر شیر اور بھیڑئیے کی طرح بڑی ہو کر چلنا پھرنا شروع کر دیں تو زمین پر انسان کے لئے زندگی گزارنا کس قدر مشکل ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیڑے مکوڑے اس قسم کے پھیپھڑے نہیں رکھتے جیسے کہ آدمی رکھتا ہے۔ وہ خاص طرح کی ہوائی نالیوں (Air Tubes) کے ذریعہ سانس لیتے ہیں۔ جب کیڑے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی یہ سانس کی نالیاں ان کے بڑھتے ہوئے جسم کی نسبت سے نہیں بڑھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا، زیادہ بڑا نہیں ہونے پاتا۔ بڑھنے پر یہ حد بندی ان کو شیر اور بھیڑئیے کی جسامت حاصل کرنے سے روکے رہتی ہے۔ اگر یہ قدرتی روک موجود نہ ہوتا تو زمین پر انسان کے لئے قیام کرنا ناممکن ہوجاتا۔

اگر دل کے اندر ایمان کی معرفت موجود ہو تو یہ واقعہ خدا کے وجود پر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے، وہ اس کے لئے خدا کی گواہی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عیسائی عالم کریسی مارلین (Cressy Morrison) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عالم فطرت کا یہ نظم ونسق (Economy) ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی اعلیٰ ذہن کام کر رہا ہے، کیوں کہ:

Only infinite wisdom could have foreseen and prepared with such astute husbandry.

یعنی صرف لامحدود عقل اتنے زیرک انتظام کو پیشگی تصور میں لاسکتی تھی اور اس کا اہتمام کر سکتی تھی (ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۰ء)

مگر معرفت سے محروم ذہن کے لئے یہی واقعہ بالکل برعکس مفہوم کا حامل بن گیا۔ جولین ہکسلے (J. Huxley) اس زمانے کا بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں ارتقاء کے ذیل میں مذکورہ بالا واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور کیڑے مکوڑے کے فرق کو سمجھنے کے لئے کسی ارادۂ الٰہی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیڑے اور انسان دونوں ہی بعض سادہ اور ابتدائی جرثومۂ حیات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ انسان کو مخصوص اسباب سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع ملا۔ اس لئے وہ ذہن ودماغ رکھنے والی ہستی بن گیا۔ اور کیڑے مکوڑوں کو بعض مانع اسباب نے یہ مواقع فراہم نہیں کئے، اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ لکھتا ہے:

"کیا چیز تھی جس نے کیڑوں کو ترقی کرنے سے روک دیا۔ اس کا جواب کیڑوں کے سانس لینے کے طریقے (Breathing Mechanism) میں چھپا ہوا ہے۔ زمینی کیڑوں نے سانس لینے کے لئے ہوائی ٹیوب کا طریقہ اپنایا ہے جس کو حیاتیاتی اصطلاح میں (Trachene) کہتے ہیں۔ اندر جاکر اس نالی کی نہایت چھوٹی چھوٹی شاخیں ہوجاتی ہیں جن کو صرف خوردبین کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے۔۔۔ یہی

نالیاں گیسوں کو جسم کے اندر نسیج (Tissues) تک لے جاتی ہیں اور واپس لاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسان اور دیگر جانداروں میں دہرا طریقہ پایا جاتا ہے۔ یعنی گیسیں پھیپھڑے سے ہو کر خون کی نالیوں تک پہنچتی ہیں۔ گیسوں کے نفوذ و انتشار کا قانون کچھ ایسا ہے کہ نالیوں کے ذریعہ سانس لینا چھوٹے کیڑوں کے لئے تو بہت آسان رہتا ہے۔ مگر جسامت کے بڑھنے کے ساتھ وہ مشکل ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ چوہیا کے بقدر جسامت حاصل کرنے سے پہلے ہی یہ نالی ناقابل استعمال ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا کبھی دوسرے ریڑھ دار جانوروں کے لحاظ سے اوسط درجہ کی جسامت بھی حاصل نہ کر سکا"[1]

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہی سبب اس بات کا بھی ہے کہ کوئی کیڑا کبھی ذہین نہیں بنا۔ ایک خاص جسامت میں محدود ہونے کی وجہ سے کیڑوں کو بہت کم اعصابی ریشے درکار ہوتے ہیں جبکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ اب چونکہ کیڑے اس درجہ کی جسامت تک نہیں پہونچتے، اس لئے وہ اعلیٰ ذہانت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

دیکھئے۔ ایک ہی واقعہ کا علم ایک شخص کے لئے کائنات میں ایک ذہین تخلیقی ارادے کی موجودگی کا ثبوت بن گیا اور اسی واقعہ سے دوسرے شخص نے یہ پہلو نکال لیا کہ موجودات کی توجیہہ کے لئے کسی تخلیقی ارادے کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کے بغیر ہم تمام موجودات کی توجیہہ کر سکتے ہیں۔ علم کی حد تک دونوں شخص یکساں ہیں۔ مگر معرفت کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔

۲۔ انجیل کا ایک فقرہ ہے:

"تم زمین کے نمک ہو۔ لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے۔"

متی ۵ : ۱۳

اس فقرے میں دراصل بنی اسرائیل کے آخری نبی نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم صاحب کتاب ہونے کی بنا پر اہل دنیا کے لئے روشنی کا ذریعہ تھے۔ تمہاری حیثیت ہادی اور رہنما کی تھی۔ مگر تم نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنا مقام کھو دیا اور اس طرح خود ہی اپنے کو اس کا مستحق بنا لیا کہ دوسروں سے تمہیں ذلیل کیا جائے۔

---

[1] *Man in the Modern World (1955) p. 14*

مگر اس قانون الٰہی کو نہ جاننے کی وجہ سے ایک امریکی ماہر کیمیا (Elmer W. Maurer) نے اس کی عجیب وغریب تاویل کی ہے۔ وہ ایک کیمیا داں ہے۔ اس لئے اس نے علم کیمیا کی روشنی میں اس کو دیکھا تو اس کا ذہن ایک اور ہی سمت میں چلا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ "تحقیق کے بعد میں اصل راز کو پا گیا؛"

" وہ یہ کہ رومی ارض مقدس کے رہنے والوں سے نمک بطور محصول وصول کرتے۔ اہل فلسطین کو نمک کی سب سے زیادہ یافت بحیرۂ مردار یا بحیرۂ نمک سے ہوتی۔ یہ محصول اتنے ظالمانہ تھے کہ لوگ نمک میں ریت کی آمیزش کرنے پر مجبور تھے۔ حکومت اس نمک کو پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں ڈال دیتی۔ جب نمک پانی میں گھل جاتا تو نمکین پانی اوپر سے نکال لیا جاتا اور ملاوٹی مادہ ناقابل تحلیل ہونے کی وجہ سے تہ نشیں ہو کر حوض میں رہ جاتا۔ اس طرح نمک نے اپنا ذائقہ کھو دیا تھا۔ وہ اب نمک باقی نہیں رہا تھا، وہ اسی قابل تھا کہ پاؤں کے نیچے روندا جائے۔"

وہ مزید لکھتا ہے:

"یہی ایک طریقہ نہیں تھا جس سے نمک اپنا ذائقہ کھو دیتا۔ بحیرۂ مردار (Dead Sea) کی سطح کا پانی دیگر اجزا کے ساتھ ۳۱ فی صد سوڈیم کلورائڈ، ۱۳ فی صد کیلشیم کلورائڈ اور ۴۸ فی صد میگنیشیم کلورائڈ رکھتا ہے۔ کیلشیم اور میگنیشیم کلورائڈ ہوا سے پانی جذب کرنے کی خاصیت رکھتے ہیں اور اس بنا پر جب نمک کے ساتھ شامل ہوتے ہیں تو اسے تحلیل کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ناخوشگوار آمیزہ تیار ہو جاتا ہے۔ رواج تھا کہ لوگ اس قسم کے نمک کے بڑے بڑے ذخائر ان گھروں میں محفوظ کر لیتے جن کا فرش مٹی کا ہوتا۔ بعض اوقات زمین کے ساتھ نمک کی جو تہیں بیٹھ جاتیں، وہ نمی کی وجہ سے خراب ہو جاتیں۔ چونکہ یہ ذخیرہ نمک ملا ہوا ہونے کی وجہ سے زرخیز زمینوں کے لئے مضر ہوتا تھا اس لئے کوئی شخص بھی اسے کھیت میں پھینکنے کی اجازت نہ دیتا، اس بنا پر اسے صرف گلیوں ہی میں پھینکا جاتا جہاں چلنے والے لوگ اسے اپنے پاؤں کے نیچے روندتے۔"

The Evidence of God in an Expanding Universe
Edited by John Clover Monsma (N.Y.1958) p.205

انجیل کے فقرے کی یہ توجیہہ ظاہر ہے کہ لال بجھکڑ کی روایتی کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ نہ تو بجائے خود صحیح ہے اور نہ وہ متعلقہ فقرے پر کسی طرح منطبق ہوتی۔ مگر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے ایسی بچکانہ غلطی کا ارتکاب صرف اس لئے کیا کہ اس نے سائنس کا علم تو حاصل کیا تھا مگر دین کی حقیقتوں سے وہ ناآشنا تھا۔ وہ اس نمک سے واقف تھا جو علم کیمیا میں زیر بحث آتا ہے۔

اور لیبارٹری میں جس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ "نمک" کی ایک اور قسم ہے جس سے دل و دماغ کو چاشنی حاصل ہوتی ہے۔ جس سے زندگی میں خدا پرستی کا ذائقہ پیدا ہوتا ہے "نمک" کا لفظ دیکھ کر اس کا ذہن کیمیائی نمک کی طرف چلا گیا اور اپنے معروف نمک کے مطابق اس نے اس کی ایک تشریح کر ڈالی

اس کے باوجود اس کیمیا داں کو اپنے تصور پر اس قدر یقین ہے کہ اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

" یہ صرف ایک نمونہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بائبل اپنی جزئی تفصیلات تک میں سائنسی طور پر بالکل صحیح ہے" (صفحہ ۳۰۵)

۳۔ ایک صاحب جو پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھتے ہیں، انھوں نے ریسرچ میں اپنے مقالہ کے لئے اسلام کے معاشی نظریات (The Economic Doctrines of Islam) کا عنوان لیا۔ ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اپنے مقالے کے ایک حصے کو پر کرنے کے لئے انھیں یہ معلوم کرنا تھا کہ اسلام نے پیدائش دولت کے کن وسائل کی طرف اپنے پیروؤں کو متوجہ کیا ہے۔ اس مقصد سے انھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں تو بالکل لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا کا معاملہ ہے۔ پیدائش دولت کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس کی طرف انھیں کتاب الٰہی میں "اشارہ" نہ مل گیا ہو۔

اس حیرت انگیز انکشاف کی بنیاد کیا تھی، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن میں موسیٰ اور فرعون کی کش مکش کے جو واقعات ہیں، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جب فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا:

فاوقد لی یا ھامان علی الطین فاجعل لی صرحا لعلی اطلع الیٰ الٰہ موسیٰ (قصص) اے ہامان! مٹی کے گارے کو جلا اور میرے لئے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں۔

اس آیت کو پڑھتے ہی موصوف اچھل پڑے۔ انھوں نے کہا، یہ تو ترابیاتی صنعت (Ceramic Industries) کی تعلیم ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس فقرے کا ترابیاتی صنعتوں کے قائم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو صرف فرعون کے تمرد کو بتا رہا ہے جو اس نے خدا کے نبی کے سامنے ظاہر کیا۔

اسی طرح جہاں کہیں کوئی ایک لفظ مل گیا، خواہ وہ جس سیاق میں بھی آیا ہو، انھوں نے فوراً

اس سے ایک معاشی مفہوم نکال لیا ——— ومامن دابة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه (انعام) ان کے نزدیک مرغبانی اور پرندپروری کی تعلیم دینے والی آیت تھی، واوحیٰ ربك الی النحل (نحل)، شہد کی مکھیاں پالنے اور شہد کی تجارت کرنے کے ہم معنیٰ تھا، ولباسھم فیھا حریر میں کرم پروری اور سلک انڈسٹری کی طرف اشارہ تھا، ویصنع الفلك (ہود) جہاز سازی کا کارخانہ قائم کرنے کا پیغام تھا، وحلوا اساور من فضة (دہر) میں زیورسازی کی صنعت کی ہمت افزائی کی گئی تھی۔ اسی طرح محض "سرسری فہرست بندی" میں انھوں نے ۰۰ اسے بھی زائد ایسی مصنوعات کا پتہ لگایا تھا جن کی طرف قرآن میں "اشارے" کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس جوش میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ قرآن سے جن صنعتی کاموں کی فہرست وہ بنا رہے ہیں، ان میں اصنام، تماثیل، خمر اور صوامع جیسی چیزیں بھی شامل ہیں۔

مختلف قسم کی صنعتوں کو قائم کرنے اور ان کو فروغ دینے کے بارے میں اس قرآنی استدلال کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کو عربی الفاظ کے معانی کا علم تو تھا مگر قرآن کی حکمت سے وہ آشنا نہیں تھے۔ اس لئے انھیں محسوس نہیں ہوا کہ جن آیات کے حوالے سے وہ اپنا استدلال کھڑا کر رہے ہیں، ان آیات کا صنعت و تجارت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ استدلال صریح طور پر قرآن کی روح کو مجروح کر رہا ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک مخصوص حلقہ میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے ایک پروفیسر نے اس کو عظیم تصنیف (Great Work) سے تعبیر کیا۔ اور کیمبرج یونیورسٹی کے انگریز پروفیسر (Mr Krenkow) نے لکھا:

The work is a diligent and scientific study.

یعنی یہ تصنیف محنت اور علمی مطالعہ کا ایک نمونہ ہے۔

۴۔ مشہور حدیث جبریل کا ایک فقرہ ہے:

الاحسان ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراك [1]

کئی سال پہلے کی بات ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے اس فقرہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا،

---

[1] یہی مفہوم بعض دوسری روایات میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

ان تخشی اللہ کانك تراہ (تم اللہ سے اس طرح ڈرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو) فتح الباری جلد اوّل۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں کسی قسم کی رویت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کی بندگی یہ سمجھ کر کی جائے کہ خدا جو علیم و بصیر ہے، وہ یقیناً ہم کو دیکھ رہا ہوگا۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگر تم اسے دیکھ نہیں رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

"جو لوگ حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں، انھوں نے خدا کو نہیں دیکھا، اگر وہ دیکھتے تو ایسا ترجمہ نہ کرتے" ——— یہ میرا جواب تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص خدا کا عینی مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کا مشاہدہ صرف آخرت میں ممکن ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بندہ جب خدا کی یاد اور اس سے خوف و محبت کے جذبات میں غرق ہوتا ہے تو اس پر شبہہ رویت کی سی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان محض ایک نظریاتی نسبت نہیں ہے بلکہ ایک گہرا فطری اور نفسیاتی ربط ہے۔ عام انسانوں میں یہ ربط چھپا رہتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دیتے ہیں، ان کا یہ ربط اسی طرح ابھر آتا ہے جیسے دوسری فطری صلاحیتیں نکاس کا راستہ پانے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور ایسا نہ ہو تو دبی پڑی رہتی ہیں۔ بندہ جب اپنے آپ کو بالکل خدا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تو خدا بھی اس کے انتہائی قریب آجاتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو امکانی ربط ہے وہ بالفعل قائم ہو جاتا ہے۔

اس وقت خدا کا تصور آدمی کی فکر و نظر میں اس طرح سما جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کو خدا کی یاد دلانے والی بن جاتی ہے۔ اس پر ایسے لمحات گزرتے ہیں جب خدا کے سوا اور کوئی چیز اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ وہ شوق و اشتیاق کے شدید جذبات کے ساتھ خدا کی طرف لپکنے لگتا ہے اس کو ایسی کیفیت سے بھری ہوئی دعائیں نصیب ہوتی ہیں جیسے کہ وہ عین اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہے۔ اس کو ایسے سجدے نصیب ہوتے ہیں جب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنا سر اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے اور اس کے آگے زمین پر پڑا ہوا ہے، اس کو ایسے اعمال کی توفیق ملتی ہے گویا کہ وہ عین خدا کے حضور میں ہے اور اس کی خوشنودی کے لئے سرگرم ہے ——— یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب بندگی اپنے انتہائی عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ اس وقت بندہ جسمانی اعتبار سے خدا سے دور ہونے کے باوجود، اپنے احساس کے اعتبار سے خدا کے قریب ہو جاتا ہے، نہ دیکھنے کے باوجود وہ خدا کو دیکھنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں عبادت کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔ پہلا اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بندے کے قلب و روح پر خدا کا خیال اس طرح چھا جائے کہ اس پر حضوری کی کیفیت طاری ہونے لگے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اس تصور کو جمائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اسی تصور کے تحت خدا کی عبادت کرے۔ اسی لئے حدیث کے پہلے ٹکڑے میں "رویت" کی نسبت بندے کی طرف کی گئی ہے اور دوسرے ٹکڑے میں رویت کی نسبت خدا کی طرف۔ اس اعتبار سے فقرے کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کیا ہے۔ انھوں نے اس حدیث میں عبادت کے دو "مراتب" مراد لئے ہیں۔ ایک "اعلیٰ" اور دوسرا اس سے "فروتر" مرتبہ۔ اعلیٰ یہ کہ بندہ ——— در مشاہدۂ معبود و حضور ذات اقدس وے مستغرق باشد" اور اس سے فروتر مرتبہ "آگاہ بودن است از نظر الٰہی و علم وے تعالیٰ بحال بندہ" اس کے بعد انھوں نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

احسان عبادت کردن است خدا تعالیٰ را چناں کہ گویا می بینی اورا، پس اگر نیستی تو بایں حال کہ گویا می بینی اورا، عبادت کن اورا بایں صفت کہ حاضر باشی ازیں کہ می بیند وے ترا دریں صورت

اشعۃ اللمعات، جلد اول، صفحہ ۲

احسان کا مطلب خدا کی عبادت اس طرح کرنا ہے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تمھاری یہ کیفیت نہ ہو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، تو تم اس طرح عبادت کرو کہ یہ خیال تمھارے ذہن میں موجود رہے کہ خدا تم کو عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

اشار فی الجواب الی حالتین: ارفعھما ان یغلب علیہ مشاھدۃ الحق بقلبہ حتی کانہ یراہ بعینہ والثانیۃ ان یستحضر ان الحق مطلع علیہ یریٰ کل ما یعمل

فتح الباری جلد اول، صفحہ ۱۱۱

"احسان کیا ہے" کے سوال کا جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے اس میں دو حالتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ ان میں بلند حالت یہ ہے کہ عابد کے دل پر مشاہدۂ حق کا اس قدر غلبہ ہو گویا کہ وہ اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ رہا ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس خیال کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے کہ خدا اس سے باخبر ہے اور وہ اس کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اوپر جو چند مثالیں میں نے دیں، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کے ساتھ معرفت کس قدر ضروری ہے۔ اگر معرفت یا دوسرے لفظوں میں اشیاء کی پہچان نہ پیدا ہوئی ہو اور آدمی کو ان حقیقتوں سے آشنا ہونے کا موقع نہ ملا ہو تو محض علم کافی نہیں ہو سکتا۔ ظاہری معلومات رکھنے کے باوجود آدمی

طرح طرح کی بے خبری میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے، مگر نہیں دیکھتا، وہ پڑھتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔

علم حقیقت میں وہی علم ہے جس کے ساتھ معرفت کی گہرائیاں شامل ہوں۔ جس نے "غم" کا لفظ ڈکشنری میں دیکھا ہو، مگر اس کو تڑپنا نصیب نہیں ہوا، وہ غم کا مطلب نہیں جانتا، ایسا شخص بس ترجمہ کرنے والی مشین ہے جو ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں دہرا دیتی ہے، مگر نہیں جانتی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ جس نے کتاب الٰہی میں لو انزلنا هٰذا القرآن علیٰ جبل لرأیته خاشعا متصدعا من خشیة الله پڑھا، مگر قرآن نے خود اس کے اوپر نازل ہو کر اس کے دل کے ٹکڑے نہیں کئے، وہ نہیں جانتا کہ اس آیت میں کون سی حقیقت بتائی گئی ہے۔ جس نے اسلام کے معاشی قوانین پر عبور حاصل کر لیا، مگر اس پر ابھی ایسا معاشی واقعہ نہیں گذرا کہ وہ ایک صاحب حاجت کو اپنی جیب کے پیسے دے اور دوسری طرف اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں والذین یؤتون ما آتوا وقلوبهم وجلة کی تفسیر جھلک رہی ہو، اس وقت تک وہ اسلام کی معاشیات سے بے خبر ہے۔ جس شخص نے نماز کے مسائل جان لئے مگر نماز سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی نہیں ہوئیں، نماز اس کے لئے خدا سے سرگوشی نہیں بنی، وہ ابھی نماز سے ناآشنا ہے۔ جس نے حدیث کی کتابیں ختم کر ڈالیں، مگر اس کے آنسوؤں نے کتاب کے اوراق نم نہیں کئے، وہ حدیث کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ جس کو دنیا نے اسلام کے مقرر کا خطاب دیا ہو، اس کی تقریر اس وقت تک اسلامی تقریر نہیں بنتی جب تک وہ خدا سے دعاؤں اور التجاؤں کے نتیجے میں نہ ابلی ہو۔ جس کو لوگ اسلام کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہوں، اس کی تصنیف اس وقت تک اسلامی تصنیف نہیں ہے جب تک اس پر یہ حالت نہ گزری ہو کہ وہ بے قرار ہو کر سجدے میں سر رکھ دے اور کہے کہ خدایا! تو میرا قلم بن جا جس سے میں لکھوں، تو میرا دماغ بن جا جس سے میں سوچوں۔

جاننے والو! جانو، کیوں کہ تم ابھی نہیں جانتے، پڑھنے والو! پڑھو، کیوں کہ تم نے ابھی نہیں پڑھا۔

اعلان

ماہنامہ الرسالہ کے پچھلے شمارے برائے فروخت دفتر الرسالہ میں موجود ہیں۔ شائقین طلب فرمائیں مکمل فائل کی قیمت ۲۶ روپیہ فی سال (بغیر کمیشن) ہوگی۔ جلد کی قیمت علیحدہ چارج کی جائے گی۔ متفرق شماروں پر کمیشن ۲۵ فی صد۔

منیجر الرسالہ

اسلام اور انسانی مسائل

اسلام کی تعلیمات کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ ایک خدا سے متعلق، اور دوسرا بندوں سے متعلق۔ پہلی قسم کی تعلیمات کو عبادات کہا جاسکتا ہے اور دوسری قسم کی تعلیمات کو معاملات۔

عبادات سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات ہیں وہ ناقابل تغیر ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کمی بیشی جائز نہیں جس چیز کو اسلام میں بدعت کہا گیا ہے (کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار) اس کا تعلق حقیقۃً انھیں اول الذکر حصۂ احکام سے ہے۔

مگر ثانی الذکر احکام (معاملات) کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔ اس شعبہ میں ہم کو صرف بنیادی احکام دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہر دور کے حالات کے مطابق ہم ان احکام کو منطبق کرتے رہیں۔ اجتہاد کا تعلق اسی دوسرے حصہ احکام سے ہے۔ اجتہاد حقیقۃً بدلے ہوئے دنیوی حالات میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا انطباق تلاش کرنے کا دوسرا نام ہے۔

دونوں قسم کی تعلیمات کا یہ فرق حدیث سے واضح ہے۔ چنانچہ عبادات سے متعلق احکام کے بارہ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ احدث فی امرنا ھذا ما لیس منا فھو رد (جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی نئی بات نکالے جو اس میں نہ ہو وہ قابل رد ہے۔)

دوسرے حصۂ احکام کی مختلف نوعیت تأبیر نخل کے واقعہ سے واضح ہے۔ پیغمبر اسلام ایک بار مدینہ کے باہر کھجوروں کے ایک باغ سے گذرے۔ وہاں کچھ لوگ درخت کے اوپر چڑھے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ ہم نر کو مادہ پر مار رہے ہیں۔ آپ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ چنانچہ وہ لوگ رک گئے۔ مگر یہ زرخیزی کا معاملہ تھا اور زرخیزی کے بغیر درختوں میں پھل نہیں آتے۔ چنانچہ اس سال کھجور کی پیداوار بہت کم ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ویسا ہی کرو جیسا تم پہلے کرتے تھے۔ کیوں کہ تم اپنے دنیوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ (انتم اعلم باموردنیاکم)

ان دونوں روایات سے واضح طور پر ثابت ہے کہ عبادات کے معاملہ میں کوئی اجتہاد نہیں ہے مگر جہاں تک معاملات کا تعلق ہے ان میں اجتہاد اور انطباق کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔

مجھے اس مقالہ میں اسلامی احکام کے صرف دوسرے حصہ کے بارے میں گفتگو کرنی ہے۔ تاہم اس دوسرے حصہ کے بھی دو الگ الگ پہلو ہیں۔ اس اعتبار سے زیر بحث موضوع کو دو حصوں میں تقسیم

کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسانی معاملات میں اسلام کے بنیادی نقطۂ نظر سے ہے۔ دوسرے حصہ کا تعلق اس بنیادی قانونی ڈھانچہ سے ہے جو اسلامی شریعت انسان کے مسائل کے حل کے لئے پیش کرتی ہے۔ یہاں میں اپنی گفتگو کو موضوع کے پہلے حصہ تک محدود رکھوں گا۔

قرآن میں ہے کہ حق اگر ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب میں فساد ہو جاتا (المومنون ۷۱)

تخلیق کے بارہ میں خدا کا منصوبہ ایک کامل منصوبہ ہے۔ انسان کے سوا بقیہ کائنات ٹھیک ٹھیک اسی خدائی منصوبہ پر چل رہی ہے۔ اس لئے بقیہ کائنات نہایت درست ہے، اس میں کہیں کوئی خرابی نہیں (الملک ۳) مگر انسان اپنے عمل کے لئے آزاد ہے۔ وہ حق کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی دنیا میں فساد برپا رہتا ہے۔ انسان کا بگاڑ دراصل انسان کی آزادی کی قیمت ہے۔

انسان کے مسائل کا حل اسلام کے نزدیک وہی ہے جو بقیہ کائنات کے مسائل کا حل ہے۔ انسان اپنی خواہش پر چلنے کے بجائے اسی حق پر چلے جس پر کائنات کی بقیہ تمام چیزیں چل رہی ہیں۔ ایسا کرتے ہی انسانی سماج میں وہی اصلاح اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی جو بقیہ کائنات میں بر وقت موجود ہے۔

حق پر چلنا کیا ہے اور خواہش پر چلنا کیا۔ اس کی ایک مثال لیجئے جو قرآن میں ہے: سورج کے لئے ممکن نہیں کہ وہ چاند سے ٹکرا جائے اور نہ رات ایسا کر سکتی ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے۔ ہر ایک اپنے مدار میں گردش کرتا ہے (یٰسین ۴۰)

خدا کے منصوبہ کے مطابق خدا کا قانون ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں چلے۔ اسی کے مطابق تمام فلکیاتی اجرام حرکت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس حق کا اطلاق انسان پر اس طرح ہوگا کہ آدمی اپنے اپنے دائرہ میں عمل کرے۔ اگر ہر آدمی ایسا کرے تو پورے سماج کا نظام درست رہے گا۔ اس کے برعکس اگر ہر آدمی اپنی خواہش پر چلنے لگے تو لوگوں میں ٹکراؤ ہوگا اور سوسائٹی میں اور بین اقوامی زندگی میں فساد برپا ہو جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ جب بیرونی سیاسی غلبہ سے آزاد ہوا تو ایک امریکی اپنے گھر سے باہر نکلا وہ سڑک پر آزادانہ طور پر چل رہا تھا۔ دوسرے راہ گیروں کا لحاظ کئے بغیر وہ اپنا ہاتھ زور زور سے ہلا رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس کا ہاتھ ایک راہ گیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔

راہ گیر نے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم اس طرح اپنا ہاتھ بے ڈھنگے طور پر ہلاتے ہوئے کیوں چل رہے ہو، امریکی نے جواب دیا کہ اب ہمارے ملک نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ آج میں

آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں اور جس طرح چاہوں چلوں۔ راہ گیر نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا:
جناب، آپ کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے۔

Your freedom ends where my nose begins

قرآن میں ارشاد ہوا ہے، تم ناپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو (الاعراف ۸۵)

اس آیت کے مطابق خدا کی بنائی ہوئی زمین ایک اصلاح یافتہ زمین ہے۔ یہاں ہر چیز درست طریقہ پر قائم ہے۔ ہر چیز عین وہی کر رہی ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ زمین کا یہ نظام انسان کے لئے اپنے معاملات کا معیار اور پیمانہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے عمل کو اسی قدرتی پیمانہ سے ناپے اور اس سے مطابق کرکے اپنے ہر عمل کو درست کرتا رہے۔ اگر انسان ایسا کرے گا تو اس کی سوسائٹی امن اور انصاف کی سوسائٹی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر وہ زمین میں رکھے ہوئے اس پیمانہ سے مطابقت نہیں کرے گا تو انسان کا سماج بگڑ جائے گا۔ وہ اصلاح کی دنیا میں فساد کی دنیا بنانے کے ہم معنی ہوگا۔

فطرت سے یہ مطابقت ہی ہماری تمام کامیابیوں کا راز ہے۔ موجودہ زمانہ کی ٹکنکل ترقیوں کو دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مگر یہ ٹکنکل ترقیاں کیا ہیں۔ وہ فطرت سے مطابقت کا دوسرا نام ہیں۔ یہی طریقہ ہم کو انسانی سماج کی اصلاح کے لئے بھی اختیار کرنا ہے۔ مادی ترقیاں فطرت سے مطابقت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسانی سوسائٹی بھی نیچر سے مطابقت ہی کے ذریعہ درست ہوگی۔ خدا کی اس دنیا میں اصلاح و ترقی کا ایک ہی یقینی طریقہ ہے، اور وہ فطرت سے مطابقت ہے۔ مادی دنیا کے لئے بھی اور انسانی دنیا کے لئے بھی۔

ستاروں اور سیاروں کی گردش میں جو نظم ہے وہی نظم کائنات کی تمام چیزوں میں کمال درجہ میں پایا جاتا ہے۔ اس دنیا کے تمام واقعات اتنے منظم طور پر ظہور میں آتے ہیں کہ ان کو پیشگی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کائنات کی ناقابل بیان حد تک حیرت انگیز تنظیم اتنی کامل ہے کہ وہ اپنی فطرت میں قابل پیشینگوئی بن گئی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات انتہائی حد تک مکمل ہے۔ اس میں ابدیت، معنویت اور حسن کمال طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ نقص یا کمی سے اتنا زیادہ خالی ہے کہ اس پر اربوں سال گذر گئے اور اس میں کسی نظر ثانی کی ضرورت پیدا نہیں ہوئی۔

موجودہ زمانے میں سائنس نے اس قانون فطرت کو بہت بڑے پیمانے پر انسانی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ مادی دنیا میں قوانین فطرت کا انطباق کیا گیا تو اس کے حیرت انگیز نتائج

برآمد ہوئے۔ دھات بجلی کی روشنی میں تبدیل ہوگئی۔ جامد مادہ حرکت بن کر دوڑنے لگا، مادہ شاندار تمدن میں ڈھل گیا وغیرہ ــــــــ مگر اسی اصول کو انسان خود اپنی زندگی میں اختیار کرنے کے لئے تیا نہیں۔ یہی تضاد انسان کے تمام مسائل کی جڑ ہے۔ انسان جس سائنس (علم فطرت) کو میکینکل دنیا میں کامیاب کے ساتھ استعمال کر رہا ہے اسی سائنس کو وہ انسانی دنیا میں استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ضرورت ہے کہ یہی آفاقی اصول انسانی زندگی میں بھی رائج ہوں۔ انسان بھی سوسائٹی کے اند اسی طرح عمل کرے کہ ہر ایک اپنے دائرہ میں رہے، کوئی شخص دوسرے کے دائرہ میں داخل نہ ہو انسان اپنی فطرت میں چھپے ہوئے تعمیری امکانات کو واقعہ بنائے۔ وہ اپنی زندگی کو اس طرح منظ کرے کہ وہ قابل پیشینگوئی کردار کا مالک بن جائے جس طرح بقیہ کائنات قابل پیشین گوئی کردار کی مالک بنی ہوئی ہے۔

..یہی انسان کا سب سے بڑا مقصود ہے اور یہی اصلاً تمام مذاہب کا خلاصہ ہے۔ پھر یہی اسلا کا خلاصہ بھی ہے جو آسمانی مذہب کا صحیح اور مستند اڈیشن ہے۔ اسلام حقیقۃً اس بات کی دعوت ہے کہ انسان اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے کائناتی نظام کو اپنا ماڈل بنائے۔ وہ اسی طرح زندگی گزا جس طرح بقیہ وسیع کائنات کے تمام اجزاء کا اپنا اپنا وظیفہ پورا کر رہے ہیں۔

طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اور وہ انتہائی لزوم کے سا اس پر قائم ہے۔ پروفیسر آئن رکسبرگ (لندن) کے الفاظ میں :

"کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجز میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں وہ کچھ اعداد پر مشتمل ہیں، جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۲م کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہ تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے حکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں و تناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں (سنڈے ٹائمس، لندن، ۴ دسمبر ۱۹۷۷)

یہ سائنس کی زبان میں وہی بات ہے جو قرآن کی زبان میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر ہر چیز کا الگ الگ اندازہ مقرر کیا (الفرقان ۲) قرآن میں دوسری جگہ ارشا ہوا ہے: کیا وہ خدا کے دین کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں حالانکہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اسی مطیع ہیں، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب کو آخر کار خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

جس چیز کو سائنس میں قانون قدرت کہا جاتا ہے اسی کا مذہبی نام دین ہے۔ اللہ کا جو دین عملاً زمین و آسمان کی تمام چیزوں پر قائم ہے۔ وہی دین انسان سے بھی مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بقیہ کائنات اس دین خدا پر جبر کے ذریعہ قائم ہے اور انسان کو یہ دین خود اپنے اختیار سے اپنے اوپر قائم کرنا ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

اور خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا۔ ہر ایک معین وقت پر چلتا ہے۔ اللہ معاملہ کی تدبیر کر رہا ہے اور وہ نشانیوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرو (الرعد ۲)

اس آیت میں تدبیر امر سے مراد کائنات کا خدائی نظام ہے۔ اور تفصیل آیات سے مراد وہ وحی ہے جو پیغمبروں پر اتری۔ خدا اپنے قانون کو بقیہ دنیا میں براہ راست اپنے نظام کے تحت عملاً قائم کئے ہوئے ہے۔ اسی قانون کو وہ پیغمبروں کے ذریعہ انسان کے پاس بھیجتا ہے تاکہ انسان اپنی آزاد مرضی سے اسی قانون الٰہی پر عمل کرے۔ گویا آسمانی کتاب (قرآن)، جس حقیقت ربانی کا لفظی بیان ہے، کائنات اسی کا عملی مظاہرہ ہے۔

یہی بات ہے جو حضرت مسیح کی زبان سے انجیل میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے: پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ، تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو (متی ۶: ۱۰)

اینٹون چیخوف (۱۹۰۴ - ۱۸۶۰) نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی دشمن نہیں، ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن بنتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں بارش برستی ہے تاکہ زمین پر فصل اگے، وہاں آدمی آگ برساتا ہے تاکہ فصلیں تباہ ہوں۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر طرف اصلاح کا منظر دکھائی دیتا ہے، وہاں انسان فساد اور بگاڑ پیدا کرتا ہے۔

دو دنیاؤں میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا پوری طرح خالق کے نقشہ کے مطابق چل رہی ہے، وہ ویسے ہی رہنے کے لئے مجبور ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ کی طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادے کے تحت ایک یا دوسرے راستے پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کے نقشہ کی پابند ہے۔ اس لئے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس انسان خدا کے نقشہ سے انحراف کرتا ہے۔ اس لئے اس کے سارے معاملات میں بگاڑ پایا جا رہا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ دراصل انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔

سائنس کیا ہے؟ سائنس قانون فطرت کا استعمال ہے۔ سائنس مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتی ہے۔ اسی طرح مذہب انسانی زندگی کو معیاری سماج میں تبدیل کرنے کا علم ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہب (اسلام) زندگی کی سائنس ہے۔ بقیہ چیزوں میں یہ سائنس مادہ کے جبری قانون کے تحت عمل کرتی ہے۔ اور انسان خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو اس قانون فطرت کا پابند بناتا ہے۔

سائنس کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع وہ ہے جس کو قدرت کی نقل کہتے ہیں۔ اس کا مقصد قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکینکل نقل کرنا ہے۔ اس سائنسی شاخ کا نام (Bionics) ہے۔ مثلاً کشتی مچھلی کی نقل ہے۔ ہوائی جہاز چڑیا کی نقل ہے۔ کیمرہ آنکھ کی میکینکل نقل ہے۔ کمپوٹر انسانی دماغ کی میکینکل نقل ہے وغیرہ وغیرہ۔ قدرت کے ماڈل کو ہم اپنی میکینکل دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ اسلام کا پیغام یہ ہے کہ قدرت کے اسی ماڈل کو انسانی زندگی کے نظام میں بھی منطبق کیا جائے۔ کائنات کا جو علم ہمیں جدید شہروں کی تعمیر کا فن بتاتا ہے وہی علم ہمیں سماجی تعمیر کے اصول بھی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی تنظیم کے لئے تمام ضروری ماڈل کائنات میں موجود ہیں۔ البتہ چوں کہ انسان کو عمل کی آزادی دی گئی ہے اور وہ اس امتحان کی حالت میں ہے کہ وہ اپنی آزادی کو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط۔ اس لئے یہ تمام ماڈل تمثیلی انداز میں قائم کئے گئے ہیں

یہاں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ تمثیل کو واقعہ کے روپ میں دیکھے۔ انسان کو یہ ثبوت دینا ہے کہ وہ کائنات میں خالق کے خاموش کلام کو سن سکتا ہے۔ وہ قدرت کے اشاروں کو الفاظ کا روپ دے سکتا ہے۔ وہ تمثیلی ماڈل کو سمجھ کر اپنی حقیقی زندگی میں عملاً استعمال کر سکتا ہے۔ انسان کو اپنے آزادانہ ارادہ کے تحت وہی کچھ کرنا ہے جو بقیہ چیزیں مجبورانہ نظام کے تحت کر رہی ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں کائناتی ماڈل کی ایک مثال وہ ہے جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ یعنی کائنات میں بے شمار اجرام (Bodies) ہیں۔ اور سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر سب اپنے اپنے مدار کا پابند ہو کر حرکت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے مقرر دائرہ سے باہر نہیں جاتا۔ اسی لئے ان کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا حتی کہ فلکیات داں کہتے ہیں کہ بعض اوقات ایک پورا کہکشانی نظام اپنے اربوں ستاروں کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دوسرے کہکشانی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اس سے گذر کر باہر نکل جاتا ہے بغیر اس کے کہ دونوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ ہو۔

یہ ایک ماڈل ہے جو بتاتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا سفر اس طرح جاری کرنا چاہئے کہ ایک اور دوسرے کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ نہ ہو۔ حتی کہ ایک قوم (انسانوں کا مجموعہ) دوسری قوم

سے ملے اور گذر جائے۔ مگر دونوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے ـــــــ ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون (الشعراء ۱۵۲)

۲ - اسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جو شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی شکل میں قائم ہے۔ شہد کی مکھیوں کے چھتہ میں نہایت کامیاب قسم کی ایک منظم اسٹیٹ ہوتی ہے۔ اس اسٹیٹ کا نظام ایک ملکہ مکھی کے تحت عمل کرتا ہے۔ تمام مکھیاں حد درجہ محنت اور نظم کے ساتھ اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگی رہتی ہیں۔ شہد کی مکھی کے چھتہ کے اندر نہایت معیاری قسم کی (Result-oriented) سرگرمیاں رات دن جاری رہتی ہیں۔

یہ ایک نمونہ ہے جو بتاتا ہے کہ انسانی سماج کی تنظیم کو کن اصولوں پر کام کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ تمام انسان ایک واحد نظام کے تابع ہوں۔ ایک خدا کی فرماں برداری میں ہر آدمی اور بحیثیت مجموعی پورا سماج اپنی اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح انجام دے۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (آل عمران ۱۰۳)

۳- اسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جو درخت کی صورت میں قائم ہے۔ انسان سانس لیتا ہے وہ ہر سانس میں ہوا سے آکسیجن لیتا ہے اور کاربن خارج کرتا ہے۔ اسی طرح درخت بھی سانس لیتے ہیں مگر ان کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ فضا سے کاربن لے کر آکسیجن خارج کرتے رہتے ہیں۔ اگر درخت بھی وہی کریں جو انسان کرتا ہے تو ساری فضا کاربن سے بھر جائے اور انسان کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔

یہ ماڈل انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کو دوسرے کی طرف سے شکایت پہنچے تو وہ اس کو برداشت کرے، وہ تلخ کلمہ سن کر میٹھے الفاظ میں اس کا جواب دے۔ وہ برے سلوک کا تجربہ کرنے کے بعد اچھے سلوک میں اس کا ردّعمل ظاہر کرے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں۔

اسی چیز کو پیغمبر اسلام نے دوسرے موقع پر ان لفظوں میں بیان فرمایا: تخلقوا باخلاق اللہ (خدا کی اخلاقیات کو اختیار کرو) خدا کی اخلاقیات وہی ہیں۔ جو اس نے اپنی مخلوقات کی دنیا میں عملاً قائم کر رکھا ہے۔ اسی خدائی اخلاقیات کو انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ جو اخلاقیات بقیہ دنیا میں خدا کے اپنے زور پر قائم ہیں، اسی اخلاقیات کو انسانی دنیا میں خود انسان کے اپنے ارادہ

سے قائم کرنا ہے۔ یہی خدا کا اتارا ہوا مذہب ہے اور یہی اسلام ہے اور اسی میں انسانیت کے تمام مسائل کا حل چھپا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکمت اور معنویت کا جو واقعہ وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے، وہی واقعہ انسان کو اپنی ذاتی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے۔ جو واقعہ خدا نے بقیہ دنیا میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے۔ اسی کو انسانی دنیا میں انسان کی سطح پر قائم کرنا ہے۔

کائناتی سطح پر جو چیز لوہا کی شکل میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز پتھر۔ یلی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز قابل پیشین گوئی کردار کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد (وعدہ پورا کرنا) کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر اچھے سلوک اور خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو"، کائنات میں کوئی چیز کسی دوسرے کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس طرح مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی نوعیت کی کارروائیوں سے وہ مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں (Recycle) اور (Decompose) کا اصول کارفرما ہے۔ فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لئے گیس میں تبدیل کر دئے جاتے ہیں۔ پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کی خرچ کی ہوئی دولت دوبارہ انسان کے لئے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے پھل کا تحفہ دے۔ کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار کام ہو رہے ہیں۔ ہر جز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔ گویہی چیز انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے، بغیر اس کے کہ دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔ اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی چیز

سانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔ کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان سے یہ ربانی اخلاقیات کیوں مطلوب ہیں، اور کیوں ایسا ہوا ہے کہ اس کے لئے خدا نے اپنی کتاب (قرآن) بھیجی اور کائنات میں بہت بڑے پیمانے پر اس کے عملی مظاہرہ کا انتظام کیا تاکہ آدمی خدا کی کتاب میں جس چیز کو پڑھے اس کو عملی نمونہ کی صورت میں اپنے سامنے ہر دیکھ لے اور اس پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔ اس کو سمجھنے کے لئے خدا کی اسکیم کو سمجھنا پڑے گا جس کی خاطر یہ ساری دنیا بنائی گئی ہے۔

خدا نے انسان کے لئے ایک ابدی جنت بنائی جو ہر قسم کی محدودیتوں اور کمیوں سے خالی ہے۔ جہاں انسان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ ہر قسم کے دکھ اور تکلیف سے آزاد ہو کر ہمیشہ ہمیش کے لئے زندگی گذارے۔ مذکورہ اخلاقیات دراصل اسی جنت کے باسیوں کی اخلاقیات ہیں، جو لوگ ان اعلیٰ اخلاقیات کا ثبوت دیں گے وہی اس قابل ٹھہریں گے کہ ان کو جنت کے اعلیٰ ماحول میں بسایا جائے۔

ہر انسان ایک بہتر دنیا کی تلاش میں ہے، ایک ایسی دنیا جہاں وہ اپنی کمیوں کی تلافی کر سکے جہاں وہ ہر قسم کی خوشیوں اور لذتوں کو ابدی طور پر حاصل کر سکے۔ یہ ہر انسان کا مطلوب ہے۔ مگر ہر انسان اپنے مطلوب کو غلط مقام پر تلاش کر رہا ہے۔ جو چیز موت کے بعد کی زندگی میں رکھی گئی ہے اس کو وہ موت سے پہلے کی زندگی میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ایک کسان اگر اپنے لئے کوئی فصل اگانا چاہتا ہے تو وہ کائنات کے انتظام سے مطابقت کر کے ہی ایسا کر سکتا ہے۔ ایک انجینئر اگر ایک کارخانہ بنانا چاہتا ہے تو وہ اپنے منصوبہ میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ وہ قوانین فطرت کو جان کر اسے استعمال کرے۔ ایسا ہی معاملہ انسانی زندگی کی تعمیر کا بھی ہے۔ انسان اگر اپنے لئے ایک پرمسرت اور کامیاب زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو وہ خدائی اسکیم سے مطابقت کر کے ہی اپنے لئے پا سکتا ہے۔ خدا کی اسکیم یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آدمی جنتی کردار کا ثبوت دے تاکہ اس کو مستقل طور پر جنت کی حسین اور لذیذ دنیا میں بسایا جائے۔ جو چیز آج ہے وہ کل نہیں مل سکتی۔ اور جو چیز کل ملنے والی ہے اس کو آج پانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔

نوٹ: یہ اس انگریزی مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو کرسچین اسلامک کانفرنس (بار بیڈوز) میں ۲ اپریل ۱۹۸۳ کو پڑھا گیا۔

ایک سفر

۱۹ دسمبر ۱۹۸۲ کی صبح کو میں ایئر انڈیا کے جہاز کے ذریعہ دہلی سے طرابلس کے لئے روانہ ہوا۔ پالم ایئرپورٹ پر ہم لوگ پہنچے تو سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری (مختار محمد الامشری) الوداع کہنے کے لئے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ موصوف پورے معنوں میں ایک عرب نوجوان ہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک ان سے دینی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ وہ ہندستان آنے سے پہلے میری عربی کتابیں پڑھ چکے تھے، اس لئے گفتگو کا بڑا حصہ انھیں کتابوں سے متعلق رہا۔

ساتھیوں سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو کچھ ہندستانی مسافر ملکی سیاست کے بارہ میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے جوش کے ساتھ کہا، دوچرن سنگھ، جگجیون رام، مرارجی ڈیسائی، کوئی بھی سیاست نہیں جانتا سیاست اندرا گاندھی جانتی ہے، وہ تو کہا جائے گی پاکستان کو" اسی قسم کی باتیں ناموں کی تبدیلی کے ساتھ آپ کو سرحد کی دوسری طرف بھی سننے کو ملیں گی۔ دونوں ملکوں میں دوسرے کی تخریب کا نام سیاست ہے۔ اپنی تعمیر کا نام سیاست ہے، اس کو دونوں میں سے کسی نے ابھی تک نہیں جانا۔

ہمارے جہاز کے بیشتر مسافر یورپ جا رہے تھے۔ ان کی اکثریت غالباً ان ہندستانیوں پر مشتمل تھی جو یورپ میں مقیم ہیں اور ایشیائی کھیل دیکھنے کے لئے ہندستان آئے تھے۔ ان کے چہرے بے فکری کی علامت بنے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بار بار قہقہے لگاتے تھے۔ میرے دل نے کہا: انسان کی بے خبری بھی کس قدر عجیب ہے۔ لوگ ہنس رہے ہیں حالانکہ بہت جلد وہ روئیں گے۔ لوگ بول رہے ہیں حالانکہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ان کے الفاظ ختم ہو جائیں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں حالانکہ بالآخر خندق کے سوا کوئی چیز نہیں جو لوگوں کا انتظار کر رہی ہو۔ یہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے مگر یہی وہ حقیقت ہے جس کا نہ کوئی جاننے والا ہے اور نہ کوئی اس کو بتانے والا۔

دہلی سے اڑان کے بعد جہاز تقریباً نو گھنٹے تک چلتا رہا، یہاں تک وہ ساڑھے سات ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر کے روم (اٹلی) پہنچا۔ اس درمیان میں جہاز کا اناؤنسر بار بار اعلان کرتا رہا ــــــ " اب ہم شام کے اوپر سے اڑ رہے ہیں۔ اب ہم یونان پہنچیں گے۔ اب ہم

ملی کی فضا میں داخل ہوگئے " زمینی سواری کے لئے بار بار راستے کی رکاوٹیں حائل ہوجاتی ہیں
تنا طویل سفر مسلسل جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ مگر خدا نے فضا کی صورت میں انسان کو ایسی
ملی سڑک دے دی ہے جہاں تمام رکاوٹوں سے بلند ہوکر انسان برابر اپنا سفر جاری رکھ سکتا
ہے۔ اس واضح نشانی کے باوجود بہت سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ " زمینی" رکاوٹوں میں
لجھے رہتے ہیں۔ ان میں یہ حوصلہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ " فضا " میں بلند ہوکر اپنی زندگی
کے سفر کے لئے بلا رکاوٹ میدان حاصل کرلیں۔

ہوائی جہاز میں مطالعہ کے لئے رسالے دئے جاتے ہیں جن کو اصطلاح میں اندرون
پرواز رسالہ (Inflight Magazine) کہا جاتا ہے۔ ایر انڈیا میں اس قسم کا دو ماہی انگریزی
میگزین مسافروں کو فراہم کیا جاتا ہے جس کا نام نمسکار ہے۔ اس کے شمارہ دسمبر ۸۲ جنوری ۸۳
بس فلم " گاندھی " پر ایک مضمون تھا۔ اس کے ساتھ بن کنگسلے (Ben Kingsley) کی کئی تصویریں
ہاتما گاندھی کے روپ میں تھیں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مذکورہ فلم میں گاندھی کا کردار ادا کیا ہے۔

یہ خوبصورت میگزین ہانگ کانگ میں ٹامسن پریس نے چھاپا ہے۔ جس جہاز (Boing 747)
میں ہم اڑ رہے وہ امریکہ کا بنا ہوا ہے۔ حتی کہ ملک کے باپو کی فلم بنانے کے لئے موزوں ترین
یکٹر اور ڈائرکٹر بھی مغرب میں ملے ہیں ـــــــ کیسی عجیب ہے ہندستان کی ترقی اور کیسی عجیب
ہے اس کی پس ماندگی۔

ایر انڈیا کے اس میگزین میں مسٹر آہوجہ کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے جو انھوں نے
فلم "گاندھی" کے فلم ساز (Sir Richard Attenborough) سے لیا تھا۔ سر رچرڈ آٹن برو نے جو
باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ کہانی بتاتے ہوئے اس کی ساری بات نہیں
ہی جاسکتی۔ فلم گاندھی میں مہاتما کی زندگی کے ابتدائی ۳۰ سال نہیں ہوں گے اور یقیناً فلم میں
کچھ ڈرامائی واقعات بھی ہوں گے:

> While telling a story you cannot relate everything. The first 30 years of the Mahatma's life will not be there, and the film must have some dramatic form.

فلم ساز تاریخ میں جو تصرف کرتا ہے وہی اکثر مورخ اور مفکر بھی کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ فلم ساز
بتا کر کرتا ہے اور مورخ اور مفکر بغیر بتائے ہوئے۔

انگریزی حکومت نے گجرات میں نمک بنانے کی صنعت کو سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ اس پر

گاندھی جی نے مشہور ڈانڈی مارچ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دو ہزار آدمیوں کو لے کر ساحل پر جائیں اور نمک بنا کر سرکاری حکم کی خلاف ورزی کریں۔ اس موقع ایک انگریز افسر نے کہا تھا:

Let him make his salt, Mr. Gandhi will have to find a great more than a pinch of salt to bring down the British Empire.

ان کو اپنا نمک بنانے دو۔ مسٹر گاندھی کو چٹکی بھر نمک سے بہت زیادہ بڑی چیز درکار ہوگی کہ وہ برطانی شہنشاہیت کو مغلوب کر سکیں۔

اسی طرح گاندھی جی نے جب چرخا چلایا تو ان کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر یہ گاندھی کی بہت گہری تدبیر تھی۔ سیاست کی ایک قسم یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں کوئی اتنا بڑا واقعہ کیا جائے کہ حریف غیر ضروری طور پر چوکنا ہو جائے اور اپنی بھرپور طاقت کو استعمال کرکے تحریک کو کچل ڈالے۔ دوسری سیاست یہ ہے کہ بظاہر بے ضرر اقدام سے آغاز کیا جائے جو حریف کو اتنا معمولی دکھائی دے کہ وہ اس کو نظر انداز کر دے۔ اس طرح تحریک کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ دھیرے دھیرے نفوذ کرتی رہے، یہاں تک کہ حریف کو اس کی ناقابل تسخیر طاقت کا اندازہ اس وقت ہو جب کہ معاملہ اس کے قابو سے باہر جا چکا ہو۔ ہندستان میں اولاً مسلم لیڈروں نے پہلی قسم کی سیاست چلائی اور وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے دوسرے قسم کی سیاست چلائی اور وہ کامیاب رہے۔ مہاتما گاندھی کا "چٹکی بھر نمک" بالآخر اتنا بڑا پہاڑ بن گیا جس کا بوجھ سنبھالنا برطانی سلطنت کو ناممکن دکھائی دینے لگا اور اس نے ہندستان کو آزاد کر دیا۔

دہلی سے طرابلس کے لئے میں ۱۹ دسمبر کی صبح کو چلا تھا اور اسی دن شام کو میں طرابلس پہنچ گیا۔ اس تقریباً ۹ ہزار کلومیٹر کے سفر کا آمد و رفت کا کرایہ ۱۳۶۵۸ روپیہ ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسے سفر کے لئے اتنی رقم درکار نہیں ہوتی تھی۔ مگر دوسری اس سے بڑی چیز جو درکار ہوتی تھی وہ وقت تھا۔ آج ایک شخص دہلی سے روانہ ہو کر ۱۲ گھنٹے کے اندر طرابلس پہنچ جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسے سفر کے لئے ۱۲ مہینے بھی یقینی نہیں تھے۔ مزید یہ کہ جانے والا اپنے متعلقین کو اس درمیان میں کوئی خبر نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس کے متعلقین کو اس کی خبر صرف اس وقت ہوتی تھی جب کہ وہ برسوں کے بعد اپنا سفر پورا کرکے دوبارہ اپنے وطن واپس آئے۔ جب کہ موجودہ زمانے کی امکانیات کا یہ حال ہے کہ یکم جنوری ۱۹۸۳ کو جب واپسی کے لئے میرا رزرویشن ہوا تو اسی دن ٹیلکس کے ذریعہ بھیجی ہوئی یہ خبر دہلی میں میرے دفتر کو پہنچ گئی کہ ۵ جنوری کی صبح

کو میں دہلی پہنچنے والا ہوں۔

ہوائی جہاز کیا ہے، قدرت کی نقل۔ ہوائی جہاز در اصل قدرتی چڑیا کی مشینی نقل ہے۔ قدرت نے ایک چڑیا کے ہوائی سفر کے لئے جو اصول مقرر کئے ہیں اسی کو انسان کے ہوائی سفر میں استعمال کرنے کا نام ہوائی جہاز ہے۔ انسان کا یہ تضاد بھی کیسا عجیب ہے کہ وہ اپنی دنیا کے سفر کے لئے قدرت کی نقل کرنے پر بخوشی آمادہ ہوجاتا ہے۔ مگر آخرت کے سفر کے لئے وہ قدرت کی نقل کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ مادی معاملات میں وہ جس معبود کا پرستار ہے۔ اسی معبود کی پرستاری روحانی اور اخلاقی معاملات میں اس کو منظور نہیں۔

طرابلس میں ہمارا قیام ہوٹل الکبیر (کمرہ نمبر ۴۰۸) میں تھا۔ جب میں اس کمرہ میں داخل ہوا تو یہ کمرہ مجھے بالکل اجنبی معلوم ہوا تھا۔ مگر دو ہفتے بعد ۴ جنوری ۱۹۸۳ کو جب میں اس کمرہ سے رخصت ہوکر نکلا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں اور کمرہ دونوں ایک دوسرے مانوس ہوچکے ہیں۔ یہی انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ وہ نئی چیز سے بھڑکتا ہے اور جس چیز سے زیادہ عرصہ تک وابستہ رہے اس کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ سچائی کو پانے کے لئے آدمی کا یہ مزاج اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ قدیم چیز کو محض انس کی بنا پر پکڑے رہتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی بے حقیقت ہو۔ وہ نئی چیز کو صرف عدم انس کی بنا پر اختیار نہیں کر پاتا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی سچائی ہو۔ حتیٰ کہ دلائل جب اس کے ذہن کو مفتوح کر لیتے ہیں اس وقت بھی وہ اقدام کرنے سے ہچکتا ہے۔ آدمی اکثر حالات میں اپنے مانوس گھروندوں کو حقیقی سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت وہ ہے جو دلیل سے ثابت ہو نہ کہ وہ جس سے مانوسیت کی بنا پر آدمی متعلق ہوجائے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۲ کی شام کو المجلس العالمی للدعوۃ الاسلامیۃ کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ تلاوت قرآن کے بعد ضروری کارروائی ہوئی۔ ۲۳ دسمبر کو مجلس کے قواعد وضوابط مقرر کئے گئے۔ پورا دن اس میں صرف ہوگیا۔ ۲۴ دسمبر کو دعوتی مسائل پر گفتگو شروع ہوئی۔

ایک عرب نوجوان (السائح علی حسین) نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مسائل کے بارہ میں تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا: مشکلات الدعوۃ الاسلامیۃ فی العالم المعاصر۔ آخر میں انھوں نے کہا: آپ کی یہ مجلس اپنے علم اور تجربہ کی بنا پر اس قابل ہے کہ وہ متعین کرے کہ ہم کہاں سے شروع کریں (ان مجلسکم ہذا لہو المؤہل لعلمہ وخبرتہ لان یحدد لنا من این نبدأ) اس سلسلے میں مختلف ممبروں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ آج

سب سے پہلا اور بنیادی کام جدید تقاضوں کے لحاظ سے اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کی اشاعت ہے۔ مجلس عالمی کے اس اجتماع میں تین زبانیں رائج تھیں ——— عربی، انگریزی، فرانسیسی۔ میں نے اپنے خیالات انگریزی زبان میں پیش کئے۔ مقابل کے صفحہ پر میری تقریر کا متن نقل کیا جا رہا ہے۔

بعض ممبروں کا خیال تھا کہ موجودہ مسلمان دنیا بھر میں کروروں کی تعداد میں دشمنان اسلام کے ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ پہلے ہم کو انھیں بچانے کی فکر کرنا چاہیے نہ یہ کہ ہم مسلمانوں کی تعداد بڑھانے میں لگ جائیں۔ میں نے کہا کہ دعوت اسلام کا مسئلہ مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ شہادت کی ذمہ داری ادا کرنے کا مسئلہ ہے۔ حضرت موسیٰ جب مصر میں تشریف لائے تو بنی اسرائیل پر وہاں کی قومی حکومت سخت مظالم کر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ نے ایک طرف بنی اسرائیل کو بچانے کی فکر کی، اسی کے ساتھ عین اسی وقت انھوں نے فرعون اور اس کی قوم کو حق کا پیغام دیا۔ سب سے اہم بات جو جاننے کی ہے وہ یہ کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان پر خاص طور پر ان کے علماء پر یہ لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ کسی بھی عذر کی بنا پر یہ ذمہ داری ان سے ساقط نہیں ہو سکتی۔

تاہم بحثوں اور گفتگوؤں میں لوگوں کا رخ دعوت سے زیادہ دفاع کی طرف رہا۔ آجکل پوری مسلم دنیا میں یہ حال ہے کہ "دشمنان اسلام"، کے پیدا کردہ مسائل سے لوگوں کے ذہن اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ وہ دعوت کے پہلو پر زیادہ سوچ نہیں پاتے۔ حریف کو مدعو کی نظر سے دیکھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ایک بار اس موضوع پر گفتگو تھی کہ جہاد سے مراد اصلاً جہاد دعوت ہے نہ کہ قتال۔ اس پر ایک صاحب (مبارک قسم اللہ زاید سوڈانی) بولتے ہوئے کافی جذباتی ہو گئے۔ ان کے نزدیک اس قسم کی باتیں قتال سے فرار کا فلسفیانہ بہانہ تھیں۔ تقریر کے دوران ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا: این سیفنا الذی اخفیناہ، این روح قتالنا الذی اہملناہ۔ یہ جملہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار رو پڑے اور آگے اپنی تقریر جاری نہ رکھ سکے۔

بعض لوگوں نے شدت کے ساتھ اس پہلو کی طرف زور دیا کہ ہم لوگ بات کرنے میں بہت آگے ہیں۔ مگر عمل کرنے میں اتنا ہی پیچھے ہیں۔ ایک صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ کہا: کلنا جید فی النظریۃ وکلنا عاجز فی التطبیق میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابھی خود "نظریہ" ہی واضح طور پر سامنے نہ آ سکا۔ اگر فی الواقع صحیح اور قابل عمل نظریہ لوگوں کے سامنے آجائے تو عمل

Mr. Chairman and the members of the World Council,

It is really a great pleasure to be with you Muslim brethren from all over the worl to discuss matters of Islamic Dawa. Islamic Dawa is, without doubt, the most impor tant issue upon which we can get together. I congratulate Brother Dr. M.A. Shari and the other authorities of Jamiat Al-Dawa on having provided us with this rar opportunity.

This international Islamic gathering symbolizes two great Islamic causes: firstly united effort and secondly, orientation in the right direction. We can only achiev success by united effort, and Dawa is the only direction in which we should organiz our struggle if it is to result in fruitful ends.

I pray God to be with you and bestow His help upon you, so that Islam may regai its former glory.

Now some words on the point of discussion. Brother Said Ali Hussain has rightl pointed out that the basic question is: from where to begin? The answer is: w should begin from literature. Producing literature is the principal task of Islami Dawa.

At this time, the field of Dawa is open all over the world. But Dawa literature in the real sense, exists nowhere. The most urgent need of our time is to prepar Islamic literature and to publish it in all the important languages. As our Japanes brother has pointed out, the lack of Islamic literature is the most acute problei of Islamic Dawa at present.

This is the same same method as was followed by the Islamic movement in th early period of its history. It is a well-known fact that the first revelation of th Quran was the verse, "Recite! Your Lord is the Most Bountiful One, who by th pen taught man what he did not know." (Quran, 96:3-4) This means that the teachin of God started through the pen, or in other words, through literature, which the product of the pen.

One might say that there is so much Islamic literature. That is true, but it is sti not sufficient. Either it is not prepared in contemporary style, or it is not mear as an introduction to Islam, but only as a defence of Islam.

Firstly, we need good and correct translations of Quran and Hadith in all the language of the world, just as the Christians' Holy Book is found in all the prevailing language of the world.

Then we need a set of books in which Islam is presented simply and scientificall

Also we need some journals and periodicals in which Dawa issues all over the worl are discussed regularly, and news concerning Islamic Dawa published.

So, the basic task ahead is to produce Dawa literature in every language. Islam Dawa started from here in the beginning, and it should start from here again.

Thank you.

کرنے والوں کی کمی نہ ہوگی۔

موجودہ ۳۶ رکنی عالمی کونسل میں دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک علی آبی   وہ جاپان سے آئے ہیں۔ وہ نومسلم ہیں۔ پہلے وہ سرکاری افسر تھے اب خود اپنا ایک قانونی ادارہ چلا رہے ہیں۔

علی آبی نے بتایا کہ ایک صاحب کسی عرب ملک کی طرف سے مبعوث ہوکر جاپان میں تبلیغ کے لئے آئے۔ تین سال تک وہ تبلیغ کرتے رہے۔ مگر کسی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ایک روز ایسا ہوا کہ انھوں نے کچھ جاپانیوں کے سامنے تقریر کی اور اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی۔ حدیث یہ تھی۔

عن ابی هریرة، قال جاء رجل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال یارسول الله من احق الناس بحسن صحابتی قال امك۔ قال ثم من قال امك۔ قال ثم من قال امك۔ قال ثم من قال ابوك (متفق علیه) اس سادہ گفتگو کا اتنا اثر ہوا کہ اسی مجلس میں دس جاپانی مسلمان ہوگئے۔ انھوں نے بتایا کہ جاپانی قوم بنیادی طور پر مادری محبت (Mother-loving) والی قوم ہے اس لئے یہ حدیث اس کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ مزید انھوں نے بتایا کہ جاپانی قوم حقیقت پسند اور سنجیدہ مزاج قوم ہے۔ اس کو عملی باتیں اور مختصر باتیں زیادہ پسند آتی ہیں۔ اس لئے جاپان میں تبلیغ کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بہت زیادہ موزوں ہیں۔ مگر جاپانی زبان میں احادیث کا ترجمہ موجود نہیں۔ صرف ایک کتاب چھاپی گئی ہے مگر اس میں نکاح وطلاق کے مسائل تک ساری چیزیں درج ہیں۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ مرحلہ میں اگر اخلاقی اور روحانی حدیثوں کا ایک مجموعہ صرف سادہ ترجمہ کے ساتھ جاپانی زبان میں چھاپا جائے تو وہ جاپانیوں پر تبلیغ کے لئے بہت موثر ہوگا۔

میں نے ان سے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جاپانی قوم دنیا کی سب سے زیادہ ذہین قوم ہے۔ انھوں نے کہا ایسا نہیں۔ البتہ جاپانی قوم بے حد محنتی قوم ہے۔ ایک جاپانی کارکن دفتر یا کارخانہ میں کام کر رہا ہے۔ اس کا مقررہ وقت ختم ہوجاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا تو وہ کام چھوڑ کر گھر جانا پسند نہیں کرے گا۔ وہ مزید دو گھنٹے محنت کرکے اپنا کام پورا کرے گا۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے جب میں سرکاری ملازم تھا تو اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ہفتہ میں اپنی دو دن کی چھٹی استعمال نہیں کی اور چھٹی کے دونوں دن دفتر جاکر اپنا کام مکمل کیا۔

علی آبی نے کہا ——— جاپانی لوگ بالقوہ مسلمان ہیں:

مگر ہمارے یہاں جو باہر کے مسلمان آرہے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے ہیں۔ مثلاً جاپانی کھانا کھاتے ہوئے بائیں ہاتھ کو استعمال کرتا ہے، اس پر یہ لوگ سخت اعتراض کرتے ہیں وغیرہ یہ چیز جاپانیوں کے عمومی اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ جاپانی بنیادی طور پر سادہ، حقیقت پسند اور الفاظ سے زیادہ معانی پر دھیان دینے والا ہوتا ہے۔ اس لئے فطری اسلام اس کو بہت زیادہ اپیل کرتا ہے۔ مگر امام اور واعظین جس اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں وہ جاپانیوں کے لئے قابل قبول نہ ہو سکے گا۔

۲۶ دسمبر ۱۹۸۲ کو ندوۃ السیرۃ النبویہ کے نام سے ایک اجتماع یہاں کی ایک بڑی مسجد میں ہوا جو جمعیۃ الدعوۃ کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس اجتماع میں سیرت کے مختلف پہلوؤں کے بارہ میں مقالات پڑھے گئے اور ان پر سوال وجواب ہوا۔ یہ سیرت کے عام جلسوں کے برعکس ایک خالص علمی اجتماع تھا۔ اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس میں شریک تھے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لوگوں نے زیادہ محنت کر کے مقالات نہیں لکھے۔ متعلقہ موضوع سے متعلق جس کے دماغ میں جو کچھ تھا اس کو اس نے لکھ لیا اور یہاں آکر پڑھ دیا۔ سیرت کے موضوع پر بے شمار کتابیں اور مقالات لکھے جا چکے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سیرت پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ مگر سیرت کے بقیہ پہلو اسی وقت کھولے جا سکتے ہیں جب کہ اس کے لئے کافی محنت کی جائے۔

یہاں دنیا بھر سے مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ تقریباً ہر جگہ کے لوگوں نے بتایا کہ غیر مسلموں میں دین کی اشاعت کے کافی امکانات ہیں۔ امریکہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ امریکہ کے لوگ بے حد غیر جانبدارانہ انداز سے چیزوں کو دیکھتے ہیں اور جب کسی چیز کو یک بیتے ہیں تو پھر اس کو چھوڑتے نہیں۔ یہ امریکی قوم کا مزاج ہے۔ اس سے امریکہ میں اگر اسلام پھیل جائے تو یہ بہت لئے بہت زیادہ تقویت کا باعث ہو۔ مگر ہر جگہ کے لوگوں کی یہ مشترک شکایت تھی کہ جدید ضرورت کے لحاظ سے ہمارے پاس اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔

امریکہ کے ایک نوجوان جو اس اجتماع میں شریک تھے، ان سے اکثر ملاقات ہوئی۔ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ ان کا ذہن دعوتی سے زیادہ قومی تھا۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ دوسری قوموں کو ظالم اور مسلمان کو مظلوم بتاتے ہیں۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ظالم ہیں اور دوسری قومیں مظلوم۔ دوسری قومیں ہم سے اگر ہماری دنیا چھین

رہی ہیں تو ہم دوسری قوموں سے ان کی آخرت چھین رہے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا دعوتی نقطۂ نظر ان کے ذہن میں کچھ زیادہ بیٹھ نہیں رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ایسا ہوا کہ جب وہ کوئی بات چھیڑتے تو اکثر میں مسکرا دیتا۔ ۲ جنوری ۱۹۸۳ کو امریکہ جانے کے لئے وہ مجھ سے رخصت ہوئے۔ چونکہ یہ طے ہوا تھا کہ اسی سال کے آخر تک دوسرا اجتماع کیا جائے۔ اس فیصلہ کے پس منظر میں انھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ اب میں کچھ دنوں کے بعد آپ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ سکوں گا:

It will be several months before I see your smiling face again

۲۵ دسمبر ۱۹۸۲ کو طرابلس ریڈیو سے میری ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ تقریر ۲۰ منٹ کی تھی۔ انھوں نے اگرچہ وقت کی تحدید نہیں کی تھی۔ تاہم میں نے ۲۰ منٹ میں اپنی تقریر ختم کر دی۔ ربیع الاول کی مناسبت سے میں نے سیرت پر کچھ خیالات پیش کئے۔ یہ تقریر زبانی تھی۔ اس لئے اس کا متن تحریری صورت میں ہمارے پاس برائے اشاعت موجود نہیں ہے۔

۳۰ دسمبر کو طرابلس ریڈیو پر میرا دوسرا پروگرام تھا۔ یہ سوال وجواب کی صورت میں تھا۔ انٹرویور سوالات کرتا رہا اور میں جوابات دیتا رہا۔ دوسرے عام سوالات کے علاوہ یہ سوال بھی تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کا کیا حال ہے، کیوں کہ ہم سنتے ہیں کہ وہاں اکثر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ ہندستان بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ایک برّاعظم کی مانند ہے۔ اس کی آبادی بھی بہت زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ ملک کی اکثریت ابھی تک جاہل ہے۔ ایسی حالت میں کبھی کبھی جھگڑے سے لڑائی کا ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ البتہ اہم بات یہ ہے کہ ان حالات کے باوجود ہندستان کے مسلمان برابر ترقی کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان اقتصادی اور تعلیمی سرگرمیوں میں واضح اضافہ ہوا ہے۔ نیز یہ کہ خود اکثریتی فرقہ میں قابل لحاظ تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ان میں سے ہزاروں افراد حالیہ برسوں میں اسلام قبول کر چکے ہیں۔

اس ضمن میں انٹرویور کا دوسرا سوال یہ تھا کہ ۱۹۸۳ میں آپ کے نزدیک کرنے کا اہم کام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی اسی سفر میں میں نے ریڈرز ڈائجسٹ (جولائی ۱۹۷۹) کا ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا: Islam on the March

اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام دوبارہ زندہ ہو رہا ہے اور نئی طاقت پکڑ رہا ہے۔ اسلام کے اس سفر کو ۱۹۸۳ میں ہمیں مزید شدت کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ موجودہ

نہ میں اسلامی دعوت کے زبردست امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ ان امکانات سے بھرپور فائدہ ناوہ سب سے اہم کام ہے جس پر ہمیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت
۔

عام عرب کتابی عربی سے ایک ہندستانی عالم سے کم واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے گفتگو دوران "بالقوۃ" کا لفظ استعمال کیا تو عرب انٹرویوراس کو سمجھ نہ سکا۔ اس کے بعد میں نے انگریزی Potential کہا تو وہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

طرابلس میں بڑی تعداد میں غیر عرب مسلمان مقیم ہیں۔ ان مسلمانوں کے کئی اجتماعات ہوئے یں میری تقریر ہوئی۔ لوگوں نے نہایت غور سے باتیں سنیں اور دینی جذبات کا اظہار کیا۔

میرٹھ کا فرقہ وارانہ فساد ابھی حال میں ہوا تھا اس لئے کچھ لوگوں نے میرٹھ کے مسلمانوں کا حال چا۔ میں نے کہا کہ میرٹھ کے مسلمان جس حال میں ہیں ٹھیک ہیں۔ آپ تو اپنی فکر کیجئے۔ کیونکہ ہر آدمی پر روز "میرٹھ" گذرنے والا ہے۔ موت اور موت کے بعد قیامت، یہ سب سے بڑا "میرٹھ" ۔ لوگ دوسروں کے "میرٹھ" کو جانتے ہیں۔ مگر اپنے "میرٹھ" کی کسی کو خبر نہیں۔

ہمارے جو رہنما بیرونی ملکوں میں جاتے ہیں اور وہاں سے کامیاب ہو کر لوٹتے ہیں وہ اکثر ملت کی بربادی کے نام پر یہ کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سامنے مسلمانوں کی مظلومیت بڑھا چڑھا کر بیان کریں۔ جذباتی انداز میں تقریریں کر کے لوگوں کو اکسائیں تو آپ کو کثرت ، ایسے لوگ ملیں گے جو پر جوش انداز میں آپ کا تعاون کریں۔ لیکن اگر آپ دعوت دین کے ے لوگوں کو ابھارنا چاہیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا آپ اسٹیچو کی بستی میں بول رہے ہیں جو نازک ین بات پر بھی سننے اور تڑپنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

یہ صورت حال تمام عالم اسلام میں ہے۔ آپ قوم کی بربادی کے نام پر لوگوں سے بڑا بڑا تعاون صل کر سکتے ہیں۔ مگر دین حق کی پیغام رسانی کے لئے کہئے تو ان کے اندر اس کام میں حصہ لینے کے لئے ئی جذبہ نہیں بھڑکتا۔ قومی مصائب کے لئے پرجوش ہونا اور دین کی دعوت کے معاملہ میں بے حس بنا ہنا اسلام نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان آج جس مذہب پر قائم ہیں وہ قومی مذہب ے نہ کہ خدائی مذہب۔ پھر قومی مذہب پر ہم کو وہ انعامات کیسے مل سکتے ہیں جو صرف خدائی مذہب اختیار رنے پر مقدر کئے گئے ہیں۔

۳۱ دسمبر کی شام کو ایک صاحب کے گھر پر نشست ہوئی۔ تعلیم یافتہ لوگ جمع تھے۔ میں نے

قرآن کے بارہ میں تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ قرآن کو کس طرح پڑھنا چاہئے۔ مختلف مثالیں دے کر میں نے واضح کیا کہ قرآن کا صرف پڑھنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کو صحیح ذہن کے ساتھ پڑھا جائے۔ اکثر لوگ قرآن کو اپنے خیالات کی تصدیق کے لئے پڑھتے ہیں۔ مگر قرآن کو وہی پائے گا جو قرآن کو اپنے خیالات کی تصحیح کے لئے پڑھے۔

مثلاً ایک غیر مسلم قوم سے آپ کو نفرت ہے اور آپ کے ذہن میں یہ بھرا ہوا ہے کہ اس سے "جہاد" کیا جائے۔ اب آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ کو قرآن میں صرف یہ لکھا ہوا نظر آئے گا کہ "کافروں سے لڑو" اس کے برعکس اگر آپ خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ان قوموں تک خدا کی دعوت پہنچاؤ۔ پہلا مطالعہ آپ کو دیگر اقوام سے بیزاری کا سبق دے گا اور دوسرا مطالعہ آپ کو دیگر اقوام سے محبت پر ابھارے گا۔ پہلے مطالعہ کے مطابق آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان حریف اور رقیب کا رشتہ قائم ہوگا اور دوسرے مطالعہ کے مطابق داعی اور مدعو کا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ——— یضل به کثیراً و یهدی به کثیراً

طرابلس میں بہت سے عرب نوجوانوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی ایک دو کی صورت میں اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کئی کئی نوجوان اکٹھے ملنے کے لئے آئے۔ میں نے ان لوگوں سے گفتگو میں خاص طور پر جس چیز پر زور دیا وہ یہ تھا کہ اسلام کا طریقہ کھلے ہوئے دائروں میں کام کرنے کا ہے نہ کہ بند دائروں میں سر ٹکرانے کا۔ عرب دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر نوجوانوں میں اسلام کے لئے کام کرنے کا جذبہ ابھرا ہے۔ مگر ان کی اکثریت اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہے اور حکمرانوں سے ٹکراؤ کو کام سمجھتی ہے۔ میں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میں اس قسم کی سیاست کو اسلامی سیاست نہیں سمجھتا۔ یہ یقینی طور پر اسلام سے انحراف ہے۔ اور مزید یہ کہ یہ اپنے وقت اور قوت کو ایسے میدان میں لگانا ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے مزید کہا کہ یہ بات میں کسی مصلحت کی بنا پر نہیں کہتا۔ بلکہ یہی میرا مستقل نظریہ ہے اور میں ۲۰ سال سے مسلسل تقریر اور تحریر کے ذریعے اسی کی اشاعت کر رہا ہوں۔

ہوٹل الکبیر میں ایک روز میری ملاقات ایک افغانی نوجوان سے ہوئی۔ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اب اس کے والدین سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں اور یہ نوجوان وہیں پر تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

اس نوجوان کا نام نجیب اللہ طیبی ہے۔ اس کی عمر ۱۹ سال ہے۔ وہ صرف انگریزی یا فرنچ بول سکتا ہے۔ اس خوبصورت افغانی نوجوان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی قوم اگر روسیوں سے لڑنے

کے لئے آپ کو افغانستان بلائے تو کیا آپ وہاں جاکر لڑنا پسند کریں گے۔ اس نے فوراً کہا ہاں۔ یں نے کہا کیا آپ کے والدین آپ کو افغانستان جانے کی اجازت دیں گے۔ جب کہ موجودہ حالات یں وہاں جانا گویا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے۔ اس نے جواب دیا، میں اپنے والدین کی جازت کے بغیر وہاں جاؤں گا۔

بات چیت کے دوران میں میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کی یہ جنگ قوم کے لئے ہے یا خدا کے لئے ہے۔ اس نے کہا دونوں کے لئے۔ اس کے بعد کچھ دیر سوچ کر بولا:

I was born in my country and I want to die in my country

میں اپنے ملک میں پیدا ہوا اور اپنے ملک ہی میں مرنا چاہتا ہوں۔

ایک روز میں ہوٹل کی کسی منزل پر لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو اس کے اندر سے کئی عورتیں برآمد ہوئیں۔ سب کی سب خالص مغربی لباس میں تھیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ مغرب کی خواتین ہیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک خاتون کی آواز کان میں آئی: مافش فائدہ (اس میں کچھ فائدہ نہیں) اس جملہ کو سن کر میں نے سمجھا کہ وہ عرب خواتین ہیں۔ اس قسم کی خواتین یہاں مصری یا لبنانی ہوتی ہیں جو کام کے تحت یہاں مقیم ہیں۔

ایک روز میں نے اپنے کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تو فلم "الرسالہ" آرہی تھی۔ یہ وہ مشہور فلم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بنائی گئی ہے۔ اسی طرح لیبیا کے مشہور مجاہد آزادی عمر مختار کی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا نام اسد الصحرا ہے۔ اسد الصحرا نہایت کامیاب فلم ہے۔ بلکہ فلموں کا شاہکار ہے۔ دوسری طرف "الرسالہ" ایک غیر موثر فلم نظر آئی۔ سیرت کا مطالعہ کرنے والے کو پیغمبر اسلام کی زندگی جتنی عظیم نظر آتی ہے، فلم کی تصویرکشی میں وہ بہت کم ہوگئی ہے۔ خالص فنی اعتبار سے غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ ہستی کہیں نظر نہیں آتی جو کہانی کی اصل ہیرو ہے۔ مخصوص اسباب سے چوں کہ فلم ساز نہ اس میں پیغمبر اسلام کی شخصیت کو پیش کرسکا ہے اور نہ آپ کی آواز کو، اس لئے فلم گویا بے فلم ہوکر رہ گئی ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ جو بات فلم الرسالہ میں جائز طور پر ہے وہی پوری تاریخ میں ناجائز طور پر پائی جاتی ہے۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک دنیا میں ہزاروں پیغمبر آئے۔ مگر انسانی تاریخ میں پیغمبروں اور ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں۔ انسان کی مدون تاریخ پیغمبروں کے ذکر سے خالی ہے۔ حتی کہ انسان نے موجودہ زمانہ میں عالم فطرت کی جو کہانی لکھی ہے

اس میں ہر چیز کا ذکر ہے مگر خدا کا کوئی ذکر نہیں ــــــــــ وہ کہانی بھی کیسی عجیب کہانی ہے جس سے اس کے ہیرو کو حذف کر دیا گیا ہو۔

یہاں نماز کے وقت ٹیلی وژن سے اذان نشر ہوتی ہے۔ایک روز میں نے مغرب کے قریب کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تو نہایت عمدہ عربی آواز میں اذان کی آواز آنے لگی۔ اذان کے وقت ٹیلی وژن اسکرین پر موذن کی تصویر نہیں آرہی تھی۔ بلکہ قدرت کے مختلف مناظر ایک کے بعد ایک دکھائے جارہے تھے۔

عمدہ تصویر میں چیزیں اصل سے زیادہ حسین نظر آتی ہیں۔ چنانچہ رنگین ٹیلی وژن پر فطرت کے مناظر عجیب پرکیف معلوم ہورہے تھے۔آبشار کا بہنا، سبزہ کا لہلہانا، دریا کی روانی، چڑیوں کا چہکنا، پہاڑ کی بلندی، پھولوں کی قطاریں، غرض مختلف قسم کے مناظر فطرت بے حد مسحور کن انداز میں سامنے آرہے تھے۔ اس کے بعد جب موذن نے کہا حی علی الفلاح (آؤ کامیابی کی طرف) تو ایسا معلوم ہوا جیسے جنت کی ایک جھلک دکھا کر کہا جارہا ہو کہ یہ ہے خدا پرستی کا بدلہ۔ خدا کے سچے پرستار بن جاؤ اور خدا کی حسین جنت میں اپنے لئے جگہ حاصل کرلو۔

۲۶ دسمبر کی دوپہر کو میجر جلود سے ملاقات تھی۔ قصر الشعب کے خصوصی کمرہ میں ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ انھوں نے عربی زبان میں ایک مفصل تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کا اصل کام دعوت اسلامی کا کام ہے۔اور ہم نے خالص دعوتی کام کے لئے یہ تنظیم قائم کی ہے۔ اس سے مقصود کوئی سیاست نہیں ہے۔وہاں سے واپسی میں کچھ تاخیر ہوئی۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں واپس پہنچا تو کمرہ کی چھوٹی میز میں ہدایتی بلب جل بجھ رہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ میرے نام کوئی پیغام استقبالیہ کے دفتر میں موجود ہے۔ میں نیچے گیا تو انھوں نے ایک نوٹ میرے حوالے کیا، اس میں لکھا تھا:

The Indian Ambassador has telephoned and wants to see you

(طرابلس میں ہندستان کے سفیر نے آپ کو ٹیلی فون کیا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں) اس بعد میں نے ٹیلی فون پر سفیر ہند (مسٹر ارجن اسرانی) سے بات کی۔ اگلے دن موصوف کی طرف سے دوسرا ٹیلی فون ملا کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر میرے لئے شام کے کھانے کا انتظام کر رہے ہیں۔تاہم یہاں میرے پروگرام کچھ اس قسم کے تھے کہ میں سفیر موصوف کے لئے مزید کوئی وقت نہ نکال سکا اور اس احساس کے ساتھ واپسی ہوگئی کہ میں موصوف کی دلچسپ باتیں سننے سے محروم رہا۔

دو عربوں سے باتیں کرتے ہوئے ایک بار میں نے نُضنج (پختگی) کا لفظ استعمال کیا۔ وہ مجھ

نہ سکے۔ بالآخر میں نے یہ لفظ کاغذ پر لکھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا اچھا ٔندگ۔ یہ لوگ نفیج کا تلفظ ندگ کرتے ہیں۔ تلفظ میں اس قسم کے فرق کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ غیرعرب کی بات عرب کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آتی اور اس طرح عرب کی بات غیر عرب سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

عربوں میں یہ عجیب ذوق نظر آتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے یہاں اسلامی الفاظ کے بجائے عام قسم کے معاشرتی الفاظ رائج ہو گئے ہیں۔ مثلاً جزاک اللہ کی جگہ شکراً، السلام علیکم کی جگہ صباح الخیر وغیرہ۔ موجودہ الفاظ بھی اگرچہ اچھے الفاظ ہیں۔ مگر اسلام کے دعائیہ الفاظ میں جو معنویت ہے وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہو سکتی۔

۴ جنوری کو واپس ہوتے ہوئے میں طرابلس کے ہوائی اڈہ (مطار) پر پہنچا تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہاں میں نے سمت قبلہ دریافت کی تو مجھے بتایا گیا کہ یہاں مسجد موجود ہے۔ آپ مسجد میں جا کر نماز ادا کر لیں۔ ہدایت کے مطابق میں آگے بڑھا تو ایک خوبصورت بورڈ پر "مسجد" لکھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوا تو وہاں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں مسجد کی تمام ضروریات کا انتظام تھا۔ وہاں کچھ لوگ پہلے سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی اطمینان سے نماز ادا کی اور اس کے بعد طرابلس سے روم جانے والا جہاز پکڑنے کے لئے باہر آیا۔

۵ جنوری ۱۹۸۳ کو میں دہلی واپس آیا۔ واپسی میں ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے بغل میں ایک مستشرق تھے، وہ روم سے ہندستان جانے کے لئے سوار ہوئے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں نے "ویجیٹیرین" مانگا۔ مذکورہ مستشرق نے بھی ویجیٹیرین کی فرمائش کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تو یورپ کے رہنے والے ہیں اور یورپ میں عام طور پر گوشت پسند کیا جاتا ہے۔ پھر آپ نے ویجیٹیرین کی فرمائش کیوں کی۔

Dr. J. Uacek, Oriental Department
Charles University,
Prague, Czechoslovakia.

انھوں نے کہا کہ میں انڈین کلچر پر ریسرچ کر رہا ہوں اور اس وقت اسی سلسلے میں ہندستان جا رہا ہوں۔ جب میں نے انڈین کلچر پر ریسرچ کا فیصلہ کیا تو اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی ارادہ کیا کہ میں اپنے آپ کو انڈین طریقہ کا عادی بناؤں اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اس کے قریب کروں تاکہ بخوبی طور پر اس کو سمجھ سکوں۔ چنانچہ اسی وقت سے میں گوشت چھوڑ کر سبزی کھانے لگا ہوں۔ چوں کہ ہمارے یہاں سبزی ملنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے اس لئے میری بیوی میرے گھر کے کمپاؤنڈ میں سبزی اگاتی ہیں اور میرے لئے الگ سے سبزی پکاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے سنسکرت زبان بھی سیکھی۔

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd R N No 28822/76
Regd D(DN) No 532

November 1983
Issue No. 84

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

جذبات سے مغلوب ہوکر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی ہوتا ہے
اور جذبات کو قابو میں رکھ کر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ کامیابی۔

دسمبر ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۸۵

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

دسمبر ۱۹۸۳
شمارہ ۸۵

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ٦

زرتعاون سالانہ ۳٦ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

الرسالہ (انگریزی)

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن انشاء اللہ جنوری ۱۹۸۴ میں شائع ہوگا۔ اس کی قیمت فی شمارہ ۳ روپیہ اور سالانہ ۳۶ روپیہ ہوگی۔ ایجنسی وغیرہ کے شرائط وہی ہوں گی جو اردو الرسالہ کی ہیں۔

انگریزی الرسالہ کی ترتیب وادارت کے لئے ایک لائق مسلم خاتون (محترمہ فریدہ خانم صاحبہ) کی مستقل خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ موصوفہ ہر اعتبار سے اس کام کے لئے موزوں ہیں۔

محترمہ فریدہ خانم صاحبہ نے بی اے انگلش آنرز سے کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے دو مضامین سے ایم اے کیا۔ پہلے انگلش میں اس کے بعد اسلامیات میں۔ اسلامیات میں ان کا نتیجہ فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔ اردو اور انگریزی کے علاوہ وہ عربی فارسی اور ہندی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتی ہیں۔ موصوفہ اس وقت دہلی کی ایک یونی ورسٹی میں اپنا ڈاکٹریٹ کا تھیسس تیار کر رہی ہیں، جس کا موضوع ہے ـــــ دور جدید کی اسلامی تحریکیں۔

موصوفہ انگریزی زبان کا اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ الرسالہ کے مقاصد سے انھیں گہری وابستگی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ پچھلے تقریباً دس سال سے اسلامی مشن کے میدان میں خاموش خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔

الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن زیادہ تر اردو الرسالہ یا ادارۂ الرسالہ کی اردو مطبوعات کے ترجمے پر مشتمل ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو ان اصحاب کے قلمی تعاون کی ضرورت ہے جو انگریزی تحریر پر بخوبی قدرت رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ الرسالہ یا ہماری دوسری اردو مطبوعات سے انگریزی ترجمے کر کے روانہ فرمائیں۔ ہم ایسے لوگوں کے انتہائی مشکور ہوں گے۔ جو اصحاب انگریزی ترجمے کے کام میں معاونت فرمائیں ان سے گزارش ہے کہ ہر ترجمہ، خواہ وہ الرسالہ سے لیا گیا ہو یا کسی کتاب سے، اس کا مکمل حوالہ ضرور درج کریں۔

منیجر الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

نماز کو دیکھ کر

ہنری دی کیسٹرو (Henry de Castro) ایک فرانسیسی افسر تھا۔ الجزائر میں فرانسیسی اقتدار کے زمانہ میں وہ ایک بڑے سرکاری عہدہ پر متعین ہو کر آیا۔

ہنری دی کیسٹرو ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ۳۰ عرب سوار بھی تھے جو اس کے ماتحت تھے اور ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اتنے میں عصر کا وقت آگیا۔ انھوں نے اپنے افسر سے کہا لقد حان موعد صلوٰۃ العصر (عصر کی نماز کا وقت آگیا) اور افسر کی اجازت کا انتظار کئے بغیر اپنے گھوڑے سے اتر گئے۔ اس کے بعد انھوں نے صحرا میں بلند آواز سے اذان دی اور صف باندھ کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔

فرانسیسی افسر کو یہ طرزِ عمل اپنی ہتک معلوم ہوا۔ تاہم وہ چپ رہا اور اپنا گھوڑا روک کر عربوں کی کارروائی دیکھتا رہا۔ صف بستہ نماز کا منظر اسے بے حد متاثر کر رہا تھا۔ جب وہ لوگ نماز پڑھ چکے تو اس نے ان لوگوں سے نماز کے متعلق سوالات شروع کر دئے۔ اور ان کے جوابات کو بغور سنتا رہا۔

ایک طرف عربوں کی جرأت دوسری طرف نماز باجماعت کا منظر، ان چیزوں نے اس کو شدید طور پر متاثر کیا۔ واپس آکر اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس نے قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پڑھا۔ عرب میں عرصہ تک سفر کر کے مسلمانوں کو دیکھا۔ اس کا تاثر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد اس نے اپنے اسلام پر فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا عربی ترجمہ مشہور مصری ادیب فتحی زغلول نے کیا۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور اس کا نام ہے ——

الاسلام : خواطر و سوانح

فرانسیسی افسر نے الجزائریوں کے عمل کو اولاً اکڑ کا معاملہ سمجھا تھا۔ اس لئے اس کے اندر بھی اکڑ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ مگر الجزائری جب گھوڑوں سے اتر کر رب العٰلمین کے آگے جھک گئے تو اس کو معلوم ہوا کہ الجزائریوں نے جو کچھ کیا وہ اکڑ کے لئے نہ تھا۔ بلکہ جھکنے کے لئے تھا۔ اب اس کی فطرت جاگ اٹھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے اندر بھی خدا کے آگے جھکاؤ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے دین میں داخل ہو گیا۔

مغربی قومیں

صلیبی لڑائیوں میں مسلمانوں نے یورپ پر فتح پائی۔ مگر اس کے بعد یورپ میں اسی طاقت سے اسلام کی اشاعت نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یورپی قوموں میں صلیبی جنگوں (کروسیڈس) کی تلخ یاد ہے صلیبی لڑائیوں میں یورپ کو اسلامی دنیا کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں یوروپی قوموں کے اندر اسلام کے خلاف نفرت اور تعصب پیدا ہو گیا۔ یہی صلیبی نفرت ہے جو یورپ میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی اشاعت میں مانع رہی۔

تاہم پچھلی صدیوں میں جب یورپ نو آبادیاتی طاقت بن کر ابھرا تو وہاں کی فضا بدل گئی۔ اب یورپ نے صلیبی شکست کا بدلہ مسلمانوں سے لے لیا تھا۔ کیونکہ مسلم دنیا کے بڑے حصہ پر یورپی قوموں کا براہ راست یا بالواسطہ اقتدار قائم ہو گیا۔

مفتوح کے اندر فریق ثانی کے لئے نفرت کے جذبات ہوتے ہیں۔ اس لئے مفتوح فریق ثانی کی کسی چیز کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس فاتح کی نفسیات میں بے نیازی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے فریق ثانی کی کسی چیز کو قبول کرنے میں کوئی نفسیاتی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس بنا پر جب نو آبادیاتی دور آیا تو یورپ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے زبردست امکانات پیدا ہو گئے۔ "مفتوح" یورپ میں اسلام کی اشاعت مشکل تھی، مگر "فاتح" یورپ میں اسلام کی اشاعت اتنی ہی آسان ہو چکی تھی۔

مگر اب یہاں ایک اور نفرت رکاوٹ بن گئی۔ پہلے جو چیز۔ یورپی قوموں کی طرف سے تھی وہی چیز اب خود مسلم قوموں کی طرف سے پیدا ہو گئی۔ نو آبادیاتی دور میں چونکہ یورپ نے مسلم قوموں کو سیاسی اور تہذیبی شکست دی تھی، اس لئے مسلمانوں کے اندر یورپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ یورپی قوموں کو مادی رقیب اور قومی حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے ان کو نفرت کی نظر سے دیکھا نہ کہ ہمدردی کی نظر سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نو آبادیاتی دور میں بھی یورپ کو خدا کے دین کا مخاطب نہ بنا سکے۔ مسلمانوں اور یورپی قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ماضی میں ایک سبب سے قائم نہ ہو سکا اور حال میں دوسرے سبب سے

مسجد کو دیکھ کر

مولانا محمد علی ہندستانی مسلمانوں کے انتہائی مشہور لیڈر تھے۔ ان کے زمانہ میں دہلی کے ایک مسلمان پینٹنگ کا کام کرتے تھے۔ وہ مختلف تصویریں بنا کر بیچتے تھے۔ یہی ان کا معاشی ذریعہ تھا۔

ایک بار انھوں نے ایک تصویر بنائی اور یہ تصویر مولانا محمد علی کے سامنے پیش کی تاکہ وہ اس کو خرید لیں۔ اس تصویر میں جامع مسجد دہلی کو دکھایا گیا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد کافی اونچائی پر ہے اس کی سیڑھیوں کا عام منظر گداگروں کی موجودگی ہے۔ چنانچہ انھوں نے جو تصویر بنائی اس میں مسجد کے ساتھ یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ اس کی سیڑھیوں پر ایک بھیک مانگنے والی عورت اپنے ایک بچہ کو لیے ہوئے کھڑی ہے۔

محمد علی نے تصویر دیکھی تو کہا کہ میں ایک شرط پر اس کو خرید لوں گا۔ وہ شرط یہ ہے کہ تم تصویر کے نیچے یہ جملہ لکھ دو کہ اس کے آبا و اجداد نے اسے بنایا تھا:

Her fathers built it

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بڑے بڑے مسلم لیڈر مختلف ملکوں میں اٹھے وہ کس چیز سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ وہ دراصل اپنے کھوئے ہوئے ماضی کے لیے بے چین تھے اور اس کو واپس لانے کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریکوں کو اگرچہ احیاء اسلام کا عنوان دیا۔ مگر ان کی تحریک کا نشانہ ان کا سیاسی ماضی تھا نہ کہ حقیقۃً احیاء اسلام

موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کی یہی نفسیات تھی جس کی وجہ سے وہ کوئی دور رس تعمیری کام نہ کر سکے۔ مثلاً دہلی میں "گذرے ہوئے دور" کی بنی ہوئی کم از کم ایک سو نہایت بڑی مسجدیں تھیں۔ جن میں سے اکثر نیم آباد یا غیر آباد پڑی ہوئی تھیں۔ ان مسجدوں میں اکثر کے پاس بڑی بڑی طحق زمینیں بھی تھیں۔ یہ لیڈر ان مسجدوں کو مرکز بنا کر زبردست دعوتی اور تعمیری کام کر سکتے تھے۔ مگر وہ مسلمانوں کے سیاسی ماضی کو واپس لانے کے لئے بے فائدہ قربانیاں دیتے رہے اور اس قسم کے تعمیری امکانات غیر استعمال شدہ پڑے رہ گئے۔

ایک مسلمان جو قومی ذہن رکھتا ہو وہ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کو دیکھ کر صرف اپنے سیاسی ماضی کو یاد کرے گا۔ مگر جو مسلمان دعوت و تبلیغ کا ذہن رکھتا ہو وہ جب اس قسم کی عمارتوں کو دیکھے گا تو اس کے اندر یہ جذبہ بھڑک اٹھے گا کہ یہاں دوسری قوموں تک خدا کے دین کا پیغام پہنچانے کا مرکز قائم کیا جائے۔

رسول خدا کا اسوہ

قدیم عرب میں کعب بن زُہیر ایک شاعر تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو کعب آپ کے مخالف ہو گئے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشعار لکھتے اور لوگوں کے درمیان ان کو پھیلاتے۔ ان اشعار میں نہایت برے انداز میں آپ کی ہجو اور تنقید ہوتی۔

جب مکہ فتح ہو گیا تو کعب بن زہیر کو اپنے لئے زمین تنگ دکھائی دینے لگی۔ ان کے بھائی بُجیر اسلام قبول کر چکے تھے۔ انھوں نے کعب سے کہا کہ مدینہ جاؤ اور اسلام قبول کر لو۔ اب اسی میں تمھارے لئے بھلائی ہے۔ کعب بن مالک کے خط کا ایک فقرہ یہ تھا کہ اگر تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہاں حاضر ہو جاؤ۔ کیوں کہ وہ کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو ان کے پاس تائب ہو کر آئے۔ (فان كانت لك من نفسك حاجة فطِر الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فانه لايقتل احداً جاءه تائباً، سيرة ابن هشام)

چنانچہ کعب بن زہیر مدینہ آئے۔ اگلے دن صبح سویرے وہ مسجد نبوی پہنچے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ختم کی تو انھوں نے آگے بڑھ کر آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو پہچانتے نہ تھے۔ کعب نے آپ سے کہا کہ میں کعب بن زہیر ہوں۔ میں تائب ہو کر اور مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ آپ سے امان مانگتا ہوں۔ کیا اس کو آپ میری طرف سے قبول کریں گے اور امان دے دیں گے۔

یہ سن کر مدینہ کا ایک مسلمان صف سے اٹھا اور جھپٹ کر کعب تک پہنچا۔ اور کہا کہ اے خدا کے رسول اس دشمن خدا کو میرے حوالے کیجئے تاکہ میں تلوار سے اس کی گردن مار دوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا: اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ وہ توبہ کر کے اور اپنی حرکت سے باز ہو کر آیا ہے (دعه عنك فانه قد جاء تائباً نازعاً عما كان عليه)

یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے۔ اس سے ناقدین اور مخالفین کے بارہ میں اسلام کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی تخریبی ہو اور وہ کتنا ہی تنقیدیں کر تا رہا ہو۔ اگر وہ اپنے فعل کو چھوڑ دے اور تائب ہو کر امن کی درخواست کرے تو اس کو ضرور امن دیا جائے گا۔ ماضی کے تخریبی عمل کی بنیاد پر اس کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اس کی توبہ ہی اس کے لئے سزا کا بدل بن جائے گی۔

اسلامی طریقہ

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بتوں کو توڑ دیا جائے۔ مثلاً مسند احمد کی ایک روایت حسب ذیل ہے:

عن ابی محمد الھذلی عن علی قال کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ فقال ایکم ینطلق الی المدینۃ فلا یدع بھا وثنا الا کسرہ ولا قبراً الا سواہ ولا صورۃ الا لطخھا

ابو محمد ہذلی علی بن ابی طالب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تھے۔ آپ نے کہا تم میں سے کون ہے جو مدینہ جائے اور وہاں کوئی بت نہ چھوڑے جس کو اس نے توڑ نہ دیا ہو۔ اور کوئی قبر نہ چھوڑے جس کو اس نے برابر نہ کر دیا ہو۔ اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جس کو اس نے مٹا نہ دیا ہو۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور طائف اور دوسرے مقامات کے بتوں اور مجسموں کو توڑا۔ مگر اس عمل کا تعلق صرف عرب سے تھا۔ عرب کو چونکہ خدا کے حکم کے مطابق شرک اور آثار شرک سے پاک کرنا تھا۔ اس لئے وہاں کے لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا۔ تاہم اس قسم کی تمام کارروائیاں فتح کے بعد ہوئیں، نہ کہ فتح سے پہلے

عرب کے علاوہ دوسرے مقامات کے لئے یہ اصول نہ تھا کہ وہاں کے بتوں اور مجسموں کو توڑا جائے۔ دوسرے ملکوں میں صرف تبلیغ کے اصول پر عمل کیا گیا اور سرکاری طور پر بتوں کو توڑنے کے بجائے اس کا انتظام کیا گیا کہ غیر مسلم اقوام مسلمان ہو جائیں اور اس کے بعد اپنے آپ ان کے بتوں کا خاتمہ ہو جائے

حضرت عمر بن خطاب کی خلافت کے زمانہ میں بہت سے عیسائی علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ مگر ان کے بتوں کو توڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمان ایسے مکان یا عبادت گاہ میں داخل ہونے سے بچتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تھے مگر اقتدار کے باوجود انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ ان کے بتوں کو توڑنے لگیں۔ ایک روایت میں آتا ہے:

قال عمر رضی اللہ عنہ انا لا ندخل کنائسکم من اجل التماثیل التی فیھا الصور (بخاری)

حضرت عمر نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمھارے عبادت خانوں میں اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں

تصویری مجسمے ہیں۔

۱۴ھ میں حضرت سعد بن وقاص کی سرکردگی میں مدائن فتح ہوا۔ مدائن قدیم ایرانی شہنشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔ یہیں ان کا مشہور قصر ابیض (سفید محل) تھا۔ آخری ایرانی حکمراں یزدجرد جب محل چھوڑکر بھاگا تو حضرت سعد بن وقاص مدائن کے فاتح کی حیثیت سے قصر ابیض میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کی زبان پر سورہ دخان کی آیات ۲۵ - ۲۸ تھیں۔

یہ جمعہ کا دن تھا۔ قصر ابیض میں جس جگہ شہنشاہ کا تخت ہوتا تھا وہاں منبر رکھا گیا آپ نے اس منبر پر کھڑے ہوکر خطبہ دیا اور جمعہ ادا کیا۔ یہ پہلا جمعہ تھا جو قدیم ایران کے دارالسلطنت میں ادا کیا گیا۔

فتح مدائن کے جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شاہی محل میں جتنی بھی تصویریں اور مجسمے تھے سب بدستور باقی رکھے گئے۔ حضرت سعد بن وقاص نے نہ ان کو توڑا اور نہ ان کو وہاں سے جدا کیا۔ اس سلسلے میں یہاں تاریخ کے دو حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

ثم انتهى الى ايوان كسرىٰ وصلى فيه صلوٰة الفتح و لا صلى جماعة فصلى ثمانية ركعات لا يفصل بينهن و اتخذه مسجداً وفيه تماثيل الجص رجال وخيل ولم يمتنع و لا المسلمون لذالك وتركوها على حالها (تاريخ الطبرى، جلد ۴) واتخذ سعد ايوان كسرىٰ مصلى ولم يغير ما فيه من التماثيل (الكامل فى التاريخ جلد ۲)

سعد بن ابی وقاص ایوان کسریٰ پہنچے۔ اور اس کے اندر فتح کی نماز پڑھی۔ اور جماعت نہیں کی۔ انھوں نے آٹھ رکعتیں پڑھیں، ان کے درمیان فصل نہیں کیا (ایک سلام سے آٹھ رکعتیں) اور اس کو مسجد بنایا حالانکہ اس میں انسان اور گھوڑے کے مجسمے موجود تھے۔ اور نہ سعد بن ابی وقاص نے اور نہ مسلمانوں نے اس سے تعرض کیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور سعد بن ابی وقاص نے کسریٰ کے ایوان کو مسجد بنایا اور اس میں جو مجسمے تھے ان میں کوئی تبدیلی نہ کی۔

صحابہ کرام نے جو کچھ کیا اس کی وجہ ان کا داعیانہ مزاج تھا۔ وہ اس قسم کے معاملات کو ہمیشہ دعوتی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا داعیانہ مزاج سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ جو چیز ان کے سامنے لاتا تھا وہ غیر مسلم اقوام کو دعوت حق کا مخاطب بنانا تھا۔ بقیہ تمام چیزیں ان کی نظر میں ثانوی تھیں۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام میں اتنی زبردست فکری قوت ہے کہ غیر مسلم اقوام اس کے آگے مسخر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور جب قومیں مسخر ہو جائیں تو بقیہ تمام مقاصد اپنے آپ حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد شرک بھی مٹ جاتا ہے اور شرک کے تمام آثار اور علامات بھی۔

شکایات

ہندستان کی آزادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ دیہات کے ایک آدمی شہر آئے اور اپنے ایک ملاقاتی کے یہاں مقیم ہوئے۔ ان کی ضیافت کے لئے گھر کے اندر سے خربوزہ بھیجا گیا۔ ایک بڑی پلیٹ میں خربوزہ کے ساتھ چھری رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے جب اس کو دیکھا تو سخت حیران ہوئے۔ انھوں نے کہا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خربوزہ اور چھری کا کیا جوڑ ہے۔ حتی کہ انھوں نے خربوزہ کھائے بغیر اسے لوٹا دیا۔

بعد کو ایک شخص نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خربوزہ کھانے کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سے دبا کر اس کو توڑا اور کھا گئے۔ پھر یہ چھری کس لئے۔ میں تو اسے ٹونا ٹوٹکا سمجھا، اس لئے میں نے اسے نہیں کھایا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ مذکورہ شخص کے ساتھ رات کو پیش آیا۔ رات کو جب ان کے سونے کے لئے بستر بچھایا گیا تو ان کے بستر پر ایک تکیہ بھی تھا۔ وہ رات بھر تکیہ کو دیکھتے رہے اور سو نہ سکے۔ بعد کو اس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ میں تو یہی سمجھا کہ اس کے اندر مال ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس "گٹھری" کی رکھوالی کروں یا سوؤں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے کے بارے میں شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ حتی کہ وہ اس کے خلاف سخت برہم ہو جاتا ہے۔ اپنے طور پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی شکایت اور برہمی بالکل بجا ہے۔ حالانکہ اس کی وجہ صرف اس کا ناقص علم ہوتا ہے۔ پوری صورت حال سے بے خبری کی بنا پر وہ بطور خود ایک رائے قائم کر لیتا ہے اور اس پر شدت سے قائم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اصل واقعہ کے اعتبار سے اس کی شکایت کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

اس برائی سے بچنے کی ترکیب قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب بھی کوئی بات سنو تو اس کی تحقیق کر لو۔ اگر آدمی واقعۃً سنجیدہ ہو تو وہ دو میں سے کوئی ایک رویہ اختیار کرے گا۔ یا تو سنی ہوئی بات کو بھلا دے گا اور اس کا کوئی چرچا نہیں کرے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ متعلقہ شخص سے اس کی تحقیق کرے گا۔ اور تحقیق کے بعد جو بات سامنے آئے گی اس کو مان لے گا۔ تحقیق کے بغیر شکایتوں کا چرچا کرنا جتنا غلط ہے اتنا ہی غلط یہ بھی ہے کہ تحقیق کے بعد بھی آدمی اپنی رائے پر قائم رہے۔ متعلقہ شخص کی تردید کے باوجود وہ اس کو مسلسل دہراتا رہے۔

تنقید

برطانیہ میں جون ۱۹۸۳ میں جنرل الکشن ہوا۔ اس الکشن میں کنسرویٹو پارٹی کامیاب ہوئی اور اس کی لیڈر کی حیثیت سے مسز مارگریٹ تھیچر دوبارہ برطانیہ کی وزیراعظم مقرر ہوئیں۔ اس کامیابی کے بعد مسز تھیچر نے پہلا کام یہ کیا کہ مسٹر فرانسس پم (Francis Pym) کو حکومت سے علٰحدہ کر دیا۔ مسٹر پم مسز تھیچر کی اپنی پارٹی کے لیڈر تھے اور مسز تھیچر کی کیبنٹ میں وزیر خارجہ کے عہدہ پر تھے۔

مسٹر پم ایک بہت اونچے خاندان کے فرد ہیں۔ ان کو حکومت میں اعلیٰ مناصب حاصل رہے ہیں۔ پھر مسز تھیچر نے کیوں ان کو کابینہ سے علٰحدہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ الکشن کے زمانہ میں ایک تقریر میں مسٹر پم نے ایک ایسی بات کہہ دی جو مسز تھیچر کو پسند نہیں آئی۔

مسٹر پم نے ایک انتخابی تقریر میں حزب اختلاف (اپوزیشن) کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی حکومت معیاری حکومت نہیں ہوتی۔ اس لئے اچھی حکومت قائم کرنے کے لئے مضبوط حزب اختلاف لازمی طور پر ضروری ہے جو اس کی اصلاح کرتی رہے:

A strong opposition is an indispensable ingredient of good government. (Because) no government is perfect.

مسٹر پم کا یہ بیان مسز تھیچر کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ انھوں نے فوراً مسٹر پم کو وزارت سے خارج کر دیا۔

انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتا۔ اس کمزوری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی اچھے ساتھیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

کوئی اعلیٰ کام اعلیٰ قابلیت کے ساتھیوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھیوں کو جوڑنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ ان کی تنقیدوں کو برداشت کیا جائے۔ کیوں کہ اعلیٰ ذہن کے لوگ اپنی ذہنی آزادی کو مقید کرکے نہیں رہ سکتے۔ اب اگر سربراہ وسیع ظرف کا آدمی ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کی فکری آزادی اور ان کے اختلاف کو برا نہیں مانے گا۔ اس طرح وہ ایسے تمام لوگوں کو اپنے ساتھ جوڑے رہے گا۔ اس کے برعکس اگر سربراہ تنگ ذہن کا آدمی ہے تو وہ ایسے لوگوں کی قدر نہ کر سکے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی جماعت تیسرے درجہ کے لوگوں کی ٹولی بن کر رہ جائے گی جو نہ کسی اعلیٰ کام کو کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ اس کو سمجھنے کی۔

کیسی عجیب محرومی

آپ کسی شخص کو ایک ڈالر دیں اور اس سے کہیں کہ آگے اسی قسم کے ایک کرور سکے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر تم تیزی سے جاؤ تو اس پورے ذخیرہ کو حاصل کر سکتے ہو۔ ایسا آدمی ڈالر دیکھ کر کیا کرے گا۔ وہ ایک کو بھول کر ایک کرور کی طرف دوڑ پڑے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ موجودہ دنیا آخرت کا تعارف ہے۔ یہاں آدمی ان نعمتوں اور لذتوں کی ابتدائی پہچان حاصل کرتا ہے جس کو خدا نے کامل طور پر آخرت میں مہیا کر رکھا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ آدمی جزء سے کل کو سمجھے۔ وہ قطرہ کو دیکھ کر سمندر کا اندازہ کرے۔

اگر آدمی کو دنیا کی صحیح معرفت حاصل ہو تو اس کے لئے دنیا مذکورہ ایک ڈالر کی مانند ہو جائے گی۔ وہ چھوٹی لذت کو چھوڑ کر بڑی لذت کی طرف بھاگے گا۔ وہ دنیا کو بھول کر آخرت کی طرف دوڑ پڑے گا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھے وہ موجودہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے گا۔ وہ آخرت کو بھول کر اسی دنیا کی چیزوں میں ہمہ تن مشغول ہو جائے گا۔

سورج اس لئے ہے کہ وہ آخرت کی روشنیوں سے بھری زندگی سے انسان کو متعارف کرے۔ مگر انسان سورج کو دیکھ کر یہ کرتا ہے کہ وہ خود سورج ہی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ پھولوں اور درختوں کا حسن اس لئے ہے کہ وہ آدمی کو آخرت کے حسن کی یاد دلائے۔ مگر انسان پھولوں اور درختوں کو آخری چیز سمجھ کر انھیں کے درمیان اپنی مستقل جنت بنانے لگتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس لئے ہیں کہ انسان کو ہمہ تن آخرت کا مشتاق بنا دیں مگر انسان انھیں لذتوں میں ایسا کھوتا ہے کہ اس کو آخرت کی یاد بھی نہیں آتی۔

جو شخص موجودہ دنیا کی دلفریبیوں میں گم ہو جائے اس نے اپنی آخرت کو کھو دیا۔ ایسا شخص آخرت میں پہنچے گا تو وہاں کی ابدی نعمتوں کو دیکھ کر اس کا یہ حال ہوگا گویا اس کا سینہ حسرت و یاس کا قبرستان بن چکا ہے۔ وہ کہے گا کہ میں بھی کیسا نادان تھا۔ میں نے چھوٹے عیش کی خاطر حقیقی عیش کو کھو دیا۔ میں نے چھوٹی لذت کے پیچھے حقیقی لذت گنوا دی۔ میں نے چھوٹی آزادی سے فریب کھا کر اپنے آپ کو حقیقی آزادی سے محروم کر لیا۔

دنیا کی حقیقت

مسٹر آر۔ این پانڈے (۲۵ سال) ہندستانی فوج میں سکنڈ لفٹننٹ تھے۔ وہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۳ کو جموں توی اکسپریس پر سوار ہوئے۔ ٹرین آگے بڑھی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر سوار ہو گئے ہیں۔ انھیں دراصل اتکل اکسپریس پر سوار ہونا چاہئے تھا۔ جب ادکھلا کا اسٹیشن آیا تو وہ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑے۔ ٹرین اس وقت پوری رفتار میں تھی۔ وہ پہیہ کے نیچے آگئے اور اسی وقت کٹ کر مر گئے (ہندستان ٹائمس ۱۳ نومبر ۱۹۸۳)

یہ واقعہ موجودہ دنیا میں انسان کی بے بسی کی ایک تصویر ہے۔ انسان ٹرین بناتا جب وہ اس پر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو لے کر دوڑتی ہے اور منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ مگر اسی ٹرین کے مقابلہ میں انسان اتنا کمزور ہے کہ اس کے پہیہ کے نیچے آنے کے بعد وہ اسی کی زد سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔

ایک کامیاب انسان ہے۔ وہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتا ہے جو اس کی خوش حال زندگی کی علامت ہے۔ اس کے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی ہوئی ہے جو اس کی شان میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ ایک کارخانہ کا مالک ہے جو اس کی دولت اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بے شمار ساتھی ہیں جو اس کی قوت وشوکت کا زندہ ثبوت ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آدمی کی دنیوی ترقی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ تمام چیزیں سمیٹ کر اوپر سے آدمی کے سر پر گرائی جائیں تو وہ اس کی بربادی کا ذریعہ بن جائیں گی۔ یہ گویا ایک بہت بڑا ملبہ ہوگا جو آدمی کے اوپر پٹک دیا گیا اور اس کے نیچے دب کر اس کا وجود فنا ہو گیا۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دنیوی ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا کی تمام ترقیاں اسی وقت تک ترقیاں نظر آتی ہیں جب تک وہ فریب کے روپ میں ہوں۔ جیسے ہی وہ اپنے اصلی روپ میں آئیں وہ صرف بربادی کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ یہ ترقیاں اپنے آخری انجام کے اعتبار سے کسی کے لئے قبرستان تو بن سکتی ہیں مگر وہ کسی کے لئے کامیابی کا شاندار محل نہیں بن سکتیں۔

لذتیں جنت میں لذت ہیں اور دنیا میں صرف فریب لذت۔ انسان کی غلطی یہ ہے کہ جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو وہ موجودہ دنیا ہی میں پانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یہاں بھی محروم رہتا ہے اور وہاں بھی۔

خدائی کارخانہ

سورج گویا قدرت کا ایک کارخانہ ہے جو مادہ کو روشنی میں تبدیل کرتا ہے۔ گائے ایک زندہ کارخانہ ہے جس میں گھاس داخل ہوتی ہے اور گوشت اور دودھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح درخت قدرت کا ایک کارخانہ ہے جس میں مٹی اور پانی اور گیس داخل ہوتے ہیں اور وہ پھول اور پھل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

یہ عمل جو سورج اور درخت اور جانور میں کامیابی کے ساتھ ہو رہا ہے، یہی عمل انسان سے بھی اس کے خالق کو مطلوب ہے۔ فرق یہ ہے کہ کائنات کی دوسری چیزوں میں تبدیلی کا عمل قانون قدرت کے تحت مجبورانہ طور پر انجام پاتا ہے۔ اور انسان میں تبدیلی کا یہ عمل خود انسان کے اپنے ارادہ کے تحت اختیارانہ طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ دوسری چیزوں میں تبدیلی مادی اعتبار سے ہو رہی ہے اور انسان کے اندر خدائی اعتبار سے۔

انسان سے اس کے پیدا کرنے والے کو یہ مطلوب ہے کہ وہ خارجی دنیا کے مشاہدات کو دلائل خداوندی میں تبدیل کرے۔ جو چیز اس کے اندر صرف بطور "معلومات" داخل ہوئی تھی اس کو اپنے ذہن میں "معرفت" کی صورت دے سکے۔ اس کو جب دنیا میں کوئی کامیابی حاصل ہو تو اس کو وہ تمام تر خدا کے خانہ میں ڈال دے۔ اس کو جب کوئی ناکامی ہو تو اس کے ذریعہ وہ عجز انسانی کی حقیقت کو دریافت کرے۔ اس کو جب کسی سے شکایت ہو تو اس کا اندرونی نظام اس کو معافی اور درگذر کی صورت میں تبدیل کر دے۔ وغیرہ

جو زمین اپنی مٹی کو درخت کی صورت میں تبدیل کرے اس کو زرخیز زمین کہا جاتا ہے۔ اور جو زمین اپنی مٹی کو درخت کی صورت میں تبدیل نہ کر سکے وہ بنجر زمین کہی جاتی ہے۔ یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے جو انسان اپنے اندرونی نظام کو اس طرح بیدار کرے کہ وہ خام چیزوں کو اعلیٰ چیزوں میں تبدیل کرنے لگے وہ مومن ہے اور جس انسان کا اندرونی کارخانہ ایسا کرنے میں ناکام رہے وہ کافر ہے۔

زرخیز زمین اور بنجر زمین میں جو فرق ہے وہی فرق مومن اور غیر مومن کے درمیان پایا جاتا ہے۔ زرخیز زمین کے حصہ میں شادابی آتی ہے اور بنجر زمین صرف اجاڑ پڑی رہتی ہے۔ اسی طرح مومن انسان کے لئے خدا کے یہاں ہمیشہ کی جنت ہے اور غیر مومن انسان کے لئے خدا کے یہاں ہمیشہ کی جہنم۔

سرسبز درخت

درخت جب بلند ہوکر فضا میں اپنی شاخیں پھیلاتا ہے اور ایک ہرے بھرے وجود کی صورت میں زمین پر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ دیکھنے والوں کی نظر میں کتنا حسین ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک کامل وجود ہے۔ اس نے وہ سب کچھ پا لیا ہے جو اسے پانا تھا، اس نے کائنات میں اپنے لئے وہ جگہ حاصل کرلی ہے جو اسے درکار تھی۔

اس کے برعکس انسان کو دیکھئے تو انسان ایک محروم اور ناکام وجود نظر آتا ہے۔ یہاں پائے ہوئے لوگ بھی اندر سے خالی ہیں۔ کامیاب لوگ بھی مستقل طور پر ناکامی کے احساس سے دوچار رہیں۔ انسان اس کائنات کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ وہ دوسری تمام چیزوں سے برتر اوصاف اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا دوسری انواع سے پیچھے ہونا کس قدر عجیب ہے۔

ایک درخت کا دوسرے درخت سے کوئی ٹکراؤ نہیں، جب کہ ایک انسان دوسرے انسان سے لڑتا ہے۔ جس درخت سے جس پھل کی امید کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اپنی شاخ پر وہی پھل نکالتا ہے۔ جب کہ انسان کا حال یہ ہے کہ اس سے جو امید کی جائے اس پر وہ پورا نہیں اترتا۔ درخت اپنے دشمن کو بھی سایہ دیتا ہے اور اپنے دوست کو بھی۔ جب کہ انسان اپنے دوست کے لئے کچھ ثابت ہوتا ہے اور غیر دوست کے لئے کچھ۔

اس فرق کا کوئی پر اسرار سبب نہیں۔ اس کا سبب دونوں کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ درخت اور دوسری چیزیں اپنے خالق کے نقشہ پر قائم ہیں۔ اس کے برعکس انسان اپنے خالق کے نقشہ پر قائم نہیں

یہ کائنات ایک مرکزی اور مجموعی نقشہ کے مطابق بنی ہے۔ یہاں امن وسکون اس مرکزی اور مجموعی نقشہ سے مطابقت کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کامیابی کائناتی منصوبہ سے ہم آہنگی کی قیمت ہے اور ناکامی اس سے ہم آہنگ نہ ہونے کی قیمت۔

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آتے ہیں وہ دراصل اسی خلا کو پر کرنے کے لئے آتے ہیں۔ پیغمبروں کی تعلیمات یہ بتاتی ہیں کہ انسان کس طرح اپنے آپ کو کائنات کی مجموعی اسکیم سے ہم آہنگ کرے۔ وہ کس اسلوب حیات کو اختیار کرے کہ وہ بھی خدا کی دنیا میں ایک "ہرا بھرا درخت" بن کر کھڑا ہو سکے۔

چڑیا اور انسان

سالم علی (عمر ۸۷ سال) چڑیوں کے مطالعہ کے سب بڑے ماہر ہیں۔ ابھی وہ صرف دس سال کے تھے کہ انھیں چڑیوں کے مطالعہ سے دلچسپی ہوگئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس طرح گذارا ہے کہ ہاتھ میں دوربین ہے۔ ایک کندھے سے کیمرہ لٹک رہا ہے اور دوسرے کندھے میں ایک بیگ ہے جس میں ضروری سامان رکھے ہوئے ہیں اور وہ بستی سے باہر چڑیوں کے مشاہدہ اور مطالعہ میں معروف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں جواہر لال نہرو سے بھی زیادہ سفر کئے۔ حتیٰ کہ لوگ انھیں چڑیا والا (Birdman) کہنے لگے۔ اس فن میں مہارت کی وجہ سے ان کو بہت سے ملکی اور غیر ملکی انعامات مل چکے ہیں۔

ہندستان میں دو ہزار سے زیادہ اقسام کی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ سالم علی نے ان کا مطالعہ کرکے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام *The Handbook of Indian Birds* ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۲۰ سال کے مطالعہ کے بعد لکھی۔

ایک اخبار کا نمائندہ بمبئی میں ان کے مکان پر ان سے ملا۔ اس نے سالم علی کو نہایت شریف اور مہذب انسان پایا۔ اس کا خیال ہے کہ سالم علی میں یہ غیر معمولی شرافت چڑیوں کے مطالعہ سے آئی ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ ستمبر ۱۹۸۳) میں لکھا کہ انسان کو زیادہ انسانیت والا بنانے کے لئے غالباً یہ تجویز کیا جانا چاہئے کہ چڑیوں کے مطالعہ کو داخل نصاب کر دیا جائے:

Perhaps a course in bird-watching should be recommended to make men more human.

دنیا میں بے شمار قسم کی چڑیاں اور جانور پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ کا انسان ان کے بارہ میں بہت کم جانتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں زمین پر پائے جانے والے مختلف جانوروں کا وسیع مطالعہ کیا گیا ہے اور ان سے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں۔ جانوروں کے طرز زندگی سے انسان کو باخبر کرنے کے لئے آج کل مختلف ذریعے کئے گئے ہیں۔ جانوروں کے کھلے پارک اور چڑیا گھر قائم کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ اب بہت سی یونیورسٹیوں میں جنگلی جانوروں کی زندگی کے مضامین باقاعدہ نصاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ جانوروں میں انسان کے لئے بہترین نمونے موجود ہیں۔ ہر جانور نہایت صحیح فطری زندگی گذارتا ہے۔ جب کہ انسان بار بار فطرت کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ انسان اگر جانوروں کی تقلید کرے تو یہی اس کی نجات کے لئے کافی ہو جائے۔

کتاب محفوظ

ایک کاتب صاحب کو ایک کتاب کا مسودہ کتابت کے لئے دیا گیا۔ اس مسودہ میں ایک جگہ محدث ابو دعاد کا نام تھا۔ کاتب صاحب ابو دعاد سے واقف نہ تھے۔ البتہ وہ ابوداؤد کو جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ابو دعاد کی جگہ ابوداؤد لکھ دیا۔ اسی طرح ایک مضمون میں ایک جگہ ہیلی کاپٹر کا لفظ تھا۔ کاتب صاحب اس کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اصل لفظ کی جگہ اہلی کا پیڑ لکھ دیا۔

اس قسم کی غلطیوں کی مثالیں بہت عام ہیں۔ ایک آدمی کسی مضمون کو پڑھ رہا ہے یا اس کو نقل کر رہا ہے۔ اس درمیان میں ایک ایسا جملہ آتا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا۔ چنانچہ اس کو وہ اپنے ذہن کے مطابق بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو کسی ذاتی غرض کے تحت اصل متن میں بالقصد تبدیلی کرتے ہیں اور اپنی طرف سے اس میں ایسی باتیں شامل کر دیتے ہیں جو اصل کتاب میں اس کے مصنف نے شامل نہ کی تھیں۔

پچھلی آسمانی کتابوں میں جو تحریفات ہوئی ہیں ان کی وجہ انسان کی یہی کمزوری ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو سات دنوں (ایام) میں پیدا کیا۔ یہی بات بائبل میں اس طرح ہے کہ ساتوں دن کی الگ الگ تفصیل ہے۔ ہر دن کی تخلیقات کا ذکر کرنے کے بعد اس میں یہ فقرہ ملتا ہے " اور شام ہوئی اور صبح ہوئی "۔ یہ فقرہ یقینی طور پر مذکورہ بالا ذہن کے تحت انسان کا اضافہ ہے۔ کسی بزرگ نے بطور خود بائبل کے جملہ کو مکمل کرنے کے لئے یہ الفاظ بڑھا دیئے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ گنجائش ہے کہ دن کو دور (Period) کے معنی میں لے سکیں۔ مگر بائبل میں مذکورہ فقرہ کے اضافہ نے اس کو دور کے معنی میں لینا ناممکن بنا دیا۔

بائبل میں اس طرح کی مثالیں بہت ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مثالیں نہایت بھونڈی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا نے یہ معجزہ دیا کہ وہ اپنا ہاتھ نکالیں تو وہ چمکنے لگے۔ مگر بائبل میں اس کا ذکر ہے تو وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا۔ اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا (خروج ۴:۶)۔ بائبل کے اس فقرہ میں "کوڑھ سے" یقینی طور پر بعد کے لوگوں کا تشریحی اضافہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے مطابق حضرت موسیٰ کے ہاتھ کا چمکنا خدائی سبب سے معلوم ہوتا ہے اور بائبل کے الفاظ کے مطابق مرض کے سبب سے۔

قرآن تمام آسمانی کتابوں میں واحد کتاب ہے جس میں کسی قسم کی تحریف نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان کتابوں کے حامل انسانوں پر ڈالی گئی تھی۔ اسی لئے قرآن میں ان کے لئے استحفاظ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی حفاظت چاہنا (بما استحفظوا من کتاب اللہ) اس کے برعکس قرآن کے بارہ میں حافظ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی حفاظت کرنے والا (انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون)

قرآن میں ایسے بہت سے مواقع تھے جہاں حاملین قرآن کے لئے گنجائش تھی کہ وہ اس میں مذکورہ بالا قسم کی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے عملاً ایسا کیا بھی مگر انھوں نے جو کچھ کیا وہ "حاشیہ" کی حد تک محدود رہا۔ "متن" میں وہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کرسکے۔ حاشیہ اور تفسیر میں چونکہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ تھے، اس لئے اس میں انھوں نے طرح طرح کی معصومانہ تبدیلیاں کر دیں۔ مگر جہاں تک متن کا تعلق ہے، اس کو خدا نے براہ راست اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا، اس لئے یہاں وہ کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے سے قاصر رہے۔

اس موقع پر وضاحت کے لئے ہم دو مثالیں دیتے ہیں۔ قرآن کی پہلی نزولی آیت ہے: اقرأ باسم ربك الذی خلق (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) اسی طرح دوسرے مقام پر ہے سنقرئك فلا تنسى (ہم تجھ کو پڑھا دیں گے پھر تو نہ بھولے گا) ان آیات میں اقرأ اور سنقرئ کے الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے کوئی کتاب یا کوئی لکھی ہوئی چیز رکھی گئی اور کہا گیا کہ اس کو پڑھو۔

یہ بات مسلمانوں کے عام عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ مسلمان ساری دنیا میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ امی تھے۔ گویا آیت کے یہ الفاظ اپنے ظاہر کے اعتبار سے مسلمانوں کے عقیدہ میں مانع ہیں اور مخالفین اسلام کو غیر ضروری طور پر یہ کہنے کا موقع دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی نہیں تھے بلکہ پڑھے لکھے تھے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ دوسری کتابوں کے متن کی طرح مسلمان قرآن کے ان الفاظ کو بدل دیں۔ یہ قرآن کے محفوظ کتاب ہونے کا ایک واضح داخلی ثبوت ہے۔ ورنہ اگر دوسری کتابوں کی طرح کا معاملہ ہوتا تو قرآن میں ہم کو اقرأ کی جگہ اُتْلُ یا تَلَفَّظْ لکھا ہوا ملتا۔ اسی طرح لکھنے والوں نے سنقرئك کے بجائے سنحفظك لکھ دیا ہوتا۔

اسی طرح ایک مثال سورہ قیامۃ کی ایک آیت وقیل من راق (اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک والا) ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان جب اس آیت کو پڑھتے ہیں تو وہ مَنْ پر وقف کرتے ہیں۔ یعنی مَنْ کے بعد کسی قدر رک کر راق کہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے والے اصحاب نے بیان کیا کہ آپ نے جب یہ آیت پڑھی تو آپ نے حرف مَنْ پر وقفہ کیا۔ ورنہ نحو و صرف کے فن کے اعتبار سے اس کی کوئی بھی وجہ نہیں ہے کہ یہاں یہ وقفہ کیوں کیا جائے۔ اگر قرآن کے ساتھ اس کے حاملین وہ معاملہ کر سکتے جو دوسری کتابوں کے ساتھ اس کے حاملین نے کیا تو لازماً ایسا ہوتا کہ یہ وقفہ باقی نہ رہتا۔ ایسی حالت میں مسلمان اس کو وقیل من راق پڑھتے نہ کہ وقیل من (سکتہ) راق۔

اسی طرح قرآن میں ہے: یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء (اے نبی جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو) یہ جملہ نحو و صرف کے عام قاعدہ کے خلاف ہے۔ اس میں واحد سے خطاب کر کے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ عام لکھنے اور بولنے والے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اگر قرآن کا وہ معاملہ ہوتا جو دوسری آسمانی کتابوں کا ہے تو یقینی طور پر ایسا ہوتا کہ کچھ مسلمان اس آیت کے الفاظ کو بدل کر اس طرح لکھ چکے ہوتے:

یا ایہا النبی اذا طلقت النساء، یا یا ایہا الرسل اذا طلقتم النساء۔

یہی معاملہ طرز تحریر کا ہے۔ عربی فن خطاطی نے بعد کے زمانہ میں بہت ترقی کی۔ جبکہ قرآن اس وقت لکھا گیا جب کہ فن خطاطی نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ چنانچہ قرآن کے طرز کتابت میں اور عام خطاطوں کے طرز کتابت میں بہت سے مقامات پر فرق ہے۔ مثلاً قرآن میں مالك کو ملٰك لکھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس طرز کتابت کی وجہ سے آیت کے دو تلفظ بن گئے ہیں۔ کوئی اس کو مالِكِ یوم الدین پڑھتا ہے اور کوئی اس کو مَلِكِ یوم الدین پڑھتا ہے۔ اس کے باوجود کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ آیت کا املا بدل کر اس کو مالك یوم الدین بنا دے۔

قرآن کے حاشیہ میں بعد کے لوگوں نے جو تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: انی جاعل فی الارض خلیفۃ (میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) بعد کے متعدد مفسرین نے اس آیت میں خلیفہ کے لفظ کو خلیفۃ اللہ کے ہم معنی بنا دیا اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کی کہ ـــــ خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ حالانکہ "اپنا" کا لفظ یہاں سراسر اضافہ ہے۔ ان حضرات نے حاشیہ میں تو اس قسم کے اضافے خوب کئے مگر متن میں اضافہ کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ اگر قرآن کے متن پر خدا کا پہرہ نہ ہوتا تو غالباً وہ آیت کے الفاظ کو ناکافی سمجھ کر اس کو اس طرح لکھ دیتے:

انی جاعل فی الارض خلیفتی یا انی جاعل فی الارض خلیفۃ منی

دوسری آسمانی کتابوں میں سے ہر کتاب میں یہ ہوا ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والے اپنے

طور پر جو کچھ چاہتے تھے وہ سب انھوں نے خدا کی کتاب میں کہیں نہ کہیں داخل کر دیا۔ مثال کے طور پر یوحنا کی موجودہ انجیل میں ہم کو یہ فقرہ ملتا ہے:

"دوسرے دن اس نے یسوع کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا، دیکھو یہ خدا کا برہ ہے جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کی بابت میں نے کہا تھا کہ ایک شخص میرے بعد آتا ہے جو مجھ سے مقدم ٹھہرا ہے کیونکہ وہ مجھ سے پہلے تھا" (یوحنا باب ۱)

انجیل یوحنا کا یہ فقرہ حضرت یحییٰ کی زبان سے حضرت مسیح کے بارہ میں ہے۔ حضرت یحییٰ کی یہ تقریر بقیہ تینوں انجیلوں میں بھی ہے مگر ان میں "جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے" موجود نہیں۔ یہ الفاظ یقینی طور پر بعد کو اصل تقریر میں اس لئے بڑھائے گئے تاکہ ان سے کفارہ کا عقیدہ نکالا جاسکے۔ بعد کے مسیحیوں کا پسندیدہ عقیدہ (کفارہ) کو انجیل سے ثابت کرنے کے لئے حضرت یحییٰ کی مذکورہ تقریر میں یہ جملہ بڑھا دیا گیا۔

یہی بات قرآن میں بھی ہو سکتی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے بہت سے انتہائی محبوب عقیدے بھی قرآن کے متن کے اندر موجود نہیں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا اور خدا کے یہاں آپ کا شفیع المذنبین ہونا مسلمانوں کے محبوب ترین عقائد ہیں۔ مگر قرآن میں کسی مقام پر وہ واضح طور پر موجود نہیں ہیں۔ مسلمان یہ تو کر سکے کہ اپنے ان عقائد کو بعض آیات سے بطریق استنباط نکالیں۔ مگر وہ ان کو متن قرآن میں داخل نہ کر سکے۔ اگر مسلمانوں کو متن میں تصرف کی قدرت حاصل ہوتی تو یقیناً آج ہم قرآن میں کوئی ایسی آیت پڑھتے جس کے الفاظ یہ ہوتے:

یا محمّد انت افضل الانبیاء و انت شفیع المذنبین یوم القیامۃ

یہ چند سادہ قسم کی داخلی مثالیں ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن آج بھی اسی ابتدائی حالت میں موجود ہے جس حالت میں اس کے پیغمبر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے زمانہ میں لکھوایا تھا۔ اس میں کسی قسم کا معمولی تغیر بھی نہ ہو سکا۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن جب واحد آسمانی کتاب ہے جس کا متن پوری طرح محفوظ ہے تو اسی کا حق ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کے لئے واحد رہنما کتاب بنے جو وحی الٰہی کو مانتے ہیں اور خدا کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ محفوظ اور غیر محفوظ دونوں قسم کی کتابوں کی موجودگی میں یقینی طور پر محفوظ کتاب کی پیروی کی جائے گی۔ نہ کہ غیر محفوظ اور تبدیل شدہ کتاب کی۔

بامقصد زندگی

انسان کا اعلیٰ ترین شرف کیا ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ ہے "بامقصد زندگی"۔ بامقصد زندگی انسانی ترقی کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی ایسا کام جس میں بظاہر کوئی غرض شامل ہو اس کو اختیار کرنے سے زندگی بامقصد ہو جائے گی۔ نہیں۔ بلکہ وہی زندگی حقیقۃً بامقصد زندگی ہے جس میں انسان اپنی اعلیٰ ترین حیثیت کو پالے، جس میں اسکی شخصیت اپنے امتیازی وصف کے ساتھ ظہور کر سکے۔

ایک جانور اپنی غذا کے لئے دوڑ رہا ہے، ایک چڑیا موسم کی تبدیلی کے وقت کسی دوسرے بہتر علاقے کی تلاش میں اڑان کر رہی ہے، ایک بھڑ مٹی کے گارے سے اپنا مکان بنانے میں مصروف ہے، ہرن کا ایک غول جنگل کے درندوں سے بچاؤ کے لئے تدبیر اختیار کر رہا ہے —— بظاہر یہ سب بامقصد عمل کی صورتیں ہیں، مگر بامقصد زندگی کا لفظ جب انسان کے لئے بولا جائے تو اس سے مراد اس قسم کی کوئی سرگرمی نہیں ہوتی۔ بلاشبہ انسان کو دنیا میں جو کچھ کرنا ہے اس میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے لئے کھانا، کپڑا، مکان اور دوسری ضروریات کا انتظام کرے، مگر یہ مقصدیت کی وہ سطح ہے جہاں انسان اور حیوان دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ جبکہ انسان کے اعتبار سے بامقصد زندگی صحیح معنوں میں وہ ہوگی جہاں وہ اپنے حقیقی شرف کے ساتھ نظر آرہا ہو۔ جب وہ مشترک حیوانیت آگے بڑھ کر ممتاز انسانیت کی شکل اختیار کرلے۔

دنیا میں دو طرح کی چیزیں ہیں۔ جاندار اور بے جان۔ ظاہر ہے کہ جاندار چیزوں کو بے جان اشیاء پر ایک برتری حاصل ہے۔ اب جاندار چیزوں کو دیکھئے تو ان کی تین قسمیں ملیں گی۔ نباتات، حیوانات اور انسان۔ جدید سائنس دانوں نے تحقیق سے معلوم کیا ہے کہ نباتات بھی ذی حیات اشیاء ہیں، ان کے اندر نمو، حرکت، تغذیہ، احساس اور اس طرح کی دوسری چیزیں پائی جاتی ہیں جو صرف ذی حیات اشیاء کی خصوصیات ہیں۔

مگر حیات کا زیادہ اعلیٰ نمونہ حیوانات اور انسان ہیں۔ انسان کو حیوانات پر کس پہلو سے تفوق حاصل ہے، اس کا جواب عرصہ سے دیا جاتا رہا ہے۔ اور بڑے بڑے اذہان اس پر کام کرتے رہے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے علمائے حیاتیات کا ذہن جہاں آکر ٹھہرا ہے وہ

یہ کہ انسان کی ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ تصوری فکر (Conceptual Thought) کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب کہ دیگر حیوانات اس سے محروم ہیں۔ انسان جب سوچتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ میں سوچ رہا ہوں۔ وہ اپنے عمل کا شعوری طور پر اپنے ذہن میں نقشہ بناتا ہے۔ وہ ارادی فکر کے ساتھ کام کرتا ہے، جب کہ دیگر حیوانات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بظاہر وہ بھی بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جو انسان کرتا ہے۔ مگر ان کا عمل سوچے سمجھے فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ محض جبلت کے تحت ہوتا ہے۔ ان کی خواہشیں زور کرتی ہیں۔ ان کی ضروریات ان سے تقاضا کرتی ہیں، ان کی طبیعت انہیں اکساتی ہے۔ اور اس طرح خارجی اثرات اور اندرونی دباؤ کے تحت وہ کوئی کام کرنے لگتا ہے۔

انسان کی اسی امتیازی خصوصیت میں اس بات کا جواب ہے کہ وہ کون سا کام ہے جو انسان کا اعلیٰ ترین مقصد قرار پا سکتا ہے۔ یہ مقصد وہی ہو سکتا ہے جو خواہشات کے دباؤ یا فوری ضروریات کے تقاضے کے تحت نہ بنا ہو بلکہ وہ سوچی سمجھی ہوئی ایک راہ ہو جس میں انسان کے امتیازی وصف کی شان پائی جائے، جس میں انسانی شخصیت کا اعلیٰ ترین پہلو جگمگا رہا ہو۔ جس میں انسان اپنی بلند ترین حیثیت میں پوری طرح نمایاں ہو گیا ہو۔

یہاں پہنچ کر جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو وہاں اس سلسلے میں ہم کو واضح رہنمائی ملتی ہے۔ قرآن میں انسانی زندگی کا مقصد ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین ۝	اور میں نے جن اور انسان صرف اس لئے بنائے ہیں کہ وہ میری عبادت کریں میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا کہ وہ مجھ کو کھلائیں
ذاریات ـــ آخر	اللہ ہی روزی دینے والا اور زور آور مضبوط ہے۔

ان آیات میں انسانی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ یہ مقصد ایسا ہے جس میں انسان کا امتیاز اپنی آخری شکل میں ظہور کرتا ہے۔ یہ مقصد انسان کو حیوانی سطح سے اتنا اوپر لے جاتا ہے کہ حیوانی زندگی کی کوئی آلائش اس کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا تم سے اپنے لئے روزی نہیں مانگتا۔ بلکہ وہ خود تمہاری روزی کا ذمہ دار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی عبادت زندگی کا ایسا مقصد ہے جو محض اندرونی خواہشات کے زور یا خارجی اثرات کے دباؤ سے نہیں بن جاتا۔ بلکہ وہ خالص فکر کے تحت وجود میں آتا ہے۔ آدمی اپنی ذات اور اپنے

ماحول سے بلند ہو کر سوچتا ہے جبھی وہ سمجھ سکتا ہے کہ کوئی بالاتر مقصد ہے جس کو اسے اپنی زندگی کا مرکز و محور بنانا چاہئے۔

اس مقصد کے لئے متحرک کرنے والی چیز یہ نہیں ہے کہ اپنی یا دوسرے کی مادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ اس میں نہ عابد کی اپنی خواہشات کی تکمیل رہنما ہوتی ہے اور نہ معبود کی خواہشات کی تکمیل۔ بلکہ یہ مقصدان سب سے بلندتر ایک نشانہ آدمی کو دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا نشانہ ہے جو نہ اندرونی تقاضے کے تحت وجود میں آتا اور نہ بیرونی دباؤ کے تحت۔ بلکہ وہ خالصۃً تصوری فکر کے تحت بنتا ہے۔

جب ایک شخص کاروبار کرتا ہے، روپیہ کماتا ہے، مکان تعمیر کرتا ہے، معیارزندگی بڑھانے میں اپنی قوتیں لگا دیتا ہے، عمدہ سواری، عمدہ مکان، عمدہ فرنیچر، عمدہ لباس، عمدہ دسترخوان کا اہتمام کرتا ہے تو بظاہر وہ ایک مقصد میں لگا ہوا ہے مگر ایسی زندگی کو بامقصد زندگی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ انسان کی امتیازی حیثیت اس طرح کے کسی مقصد میں پوری طرح نمایاں نہیں ہوتی۔ بظاہر اس طرح کی زندگی میں بھی آپ کا ارادی فکر کام کرتا ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس راہ میں جس چیز نے آپ کو ڈالا ہے وہ اپنے آخری تجزیے میں وہی داعیہ ہے جو ایک حیوان کو مختلف شکلوں میں متحرک کرتا ہے۔ یعنی خواہشات کا زور، ضروریات کا دباؤ، اندرونی تقاضوں کی تکمیل کا احساس۔ حقیقۃً اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو آپ کی معاشی زندگی میں آپ کی رہنمائی کر رہی ہو۔

آدمی جب شعور حاصل کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی کچھ مادی ضرورتیں ہیں جن کو حاصل کئے بغیر وہ زندگی نہیں گزار سکتا، اسے کھانے کی، کپڑے کی، مکان کی ضرورت ہے اسے ایسے قابل اعتماد ذریعۂ معاش کی ضرورت ہے جس سے آخر وقت تک وہ گزر سکے یہ چیز نظری طور پر اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو حاصل کرے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں جس کے پاس افراط کے ساتھ ہوتی ہیں اس کی عزت ہوتی ہے۔ وہ ہر قسم کی خوشیوں اور لذتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کی بات بلادلیل مان لی جاتی ہے، کوٹھی اور موٹر اور بینک بیلنس اس کو وہ سب کچھ دیدیتے ہیں جس کی کوئی شخص اس دنیا میں تمنا کر سکتا ہے، یہ حالات اور یہ مشاہدہ اسے اکساتا ہے کہ وہ صرف ضروری معاش کے حصول پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر کرے۔

بازاروں کی چہل پہل، دفتروں کی شان وشوکت اور بلڈنگوں کے پرکشش مناظر جن میں ہم انسان کو سرگرم دیکھتے ہیں، حقیقۃً وہاں ان کے سوچے سمجھے فکر نے ان کی رہنمائی نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کی ضرورتیں ان کی خواہشیں ان کی امنگیں اور دنیا میں باعزت اور سربلند جگہ حاصل کرنے کے بارہ میں ان کے حوصلوں نے ان کی رہنمائی کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کو وہ مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا جو انسانی شرف کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔

انسان کا اعلیٰ ترین شرف کوئی ایسا مقصد ہی ہو سکتا ہے جو حقیقۃً خالص غور وفکر کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہو۔ جو اندرونی خواہشوں اور ماحول کے دباؤ کے نتیجہ میں وقوع پذیر نہ ہوا ہو۔ یہ مقصد "خدا کی رضا جوئی" کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب آدمی خدا کی رضا کو اپنا مقصد بناتا ہے تو یہاں اس کے انسانی اوصاف پوری طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ ان تمام چیزوں سے بلند تر ایک مقصد ہے، جس میں کوئی حیوان مصروف ہے۔ اس مقصد کو اختیار کر کے انسان فی الواقع تمام حیوانات سے مختلف ہو جاتا ہے، یہ انسانی شرف کی آخری انتہا ہے۔

زندگی کا مقصد، ایک لفظ میں، زندگی کو بامعنی بنانے کی کوشش ہے۔ زندگی کو بامعنی بنانے کا منصوبہ ہمیشہ اس فرد کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے جس کی زندگی کو بامعنی بنانا مطلوب ہے۔ مثلاً بھیڑوں اور بکریوں کے گلہ کو بامعنی بنانا ہو، یا گایوں اور بھینسوں کو بامعنی بنانے کا سوال ہو تو اس کا منصوبہ حیوانی سطح پر بنے گا۔ جیسا کہ ہم عام طور پر اس قسم کے منصوبوں میں دیکھتے ہیں۔

مگر انسان کا مقصد متعین کرنا، بالفاظ دیگر، انسان کی ہستی کو بامعنی بنانا ایک انسانی منصوبہ ہے نہ کہ حیوانی منصوبہ۔ ایسے منصوبہ کو یقینی طور پر ایسا ہونا چاہئے جو انسان کی امتیازی حیثیت کے عین مطابق ہو۔ جو انسان کو اس کی اصل خصوصیت کے اعتبار سے ترقی اور کامیابی کے مقام کی طرف لے جانے والا ہو۔

خدا کا عابد بننا اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف کرنا ہے، اور اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف ہی انسان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

خدا پکار رہا ہے

درخت کیا ہے۔ درخت خدا کا ایک جادو ہے ۔ وہ ایک معجزاتی واقعہ ہے جو خدا اپنی خصوصی قدرت سے زمین پر ظاہر کرتا ہے۔ درخت اس بات کا اعلان ہے کہ کوئی ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اس کے لئے زندگی اور ہریالی کا ایک نیا امکان کھول دے، کوئی ہے جو خدا کے ساتھ ایک امید قائم کرے تاکہ خدا اس کی امید کو اس کے قیاس وگمان سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں اس کے حق میں پورا کردے۔

جب برسات کا موسم آتا ہے اور پانی سے لدے ہوئے بادل آسمان میں تیرنا شروع کرتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک فضاؤں میں ایک تبدیلی کا اعلان کرتی ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بارش کا پیغام لے کر ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں تو یہ سب دراصل خدا کے ایک مطلوب کا اظہار ہوتا ہے، یہ مطلوب کہ خدا اپنی زمین میں کچھ ہرے بھرے درخت اگانا چاہتا ہے۔ اس وقت جو کسان خدا کے اعلان کو سمجھ لے اور ایک بیج لے کر زمین میں ڈال دے تو اس کے فوراً بعد خدا کا جادو ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں خالی زمین تھی وہاں معجزاتی طور پر ایک سرسبز وشاداب کائنات نکل کر کھڑی ہو جاتی ہے جس کے سائے کے نیچے لوگ پناہ لیں۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جو لوگوں کے لئے رنگت اور خوشبو اور لذت کا ایک عظیم خدائی دسترخوان بن جائے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دین اور دعوت دین کا ہے۔ آج کی دنیا کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی آخری حد کو پہنچ چکی ہے ـــــ خدا کا نام لوگوں کے لئے ذاتی کاروبار کا

دان بن چکا ہے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کو صرف فساد اور بگاڑ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں لوگوں کے لئے لوٹ کا میدان بنی ہوئی ہیں۔ خدا کی دنیا ں انسان نے خود اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر بٹھا رکھا ہے۔ ظلم اور فساد اتنا بڑھ چکا ہے انسانی نسل پر دوبارہ وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو حضرت نوح نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے رہ میں کہے تھے: انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولايلدوا الا فاجرا كفارا (نوح ۲۷)

بگاڑ کی یہ انتہا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہو۔ وہ وقت آگیا ہے کہ بارہ زمین پر ایک طوفان نوح برپا ہو، تاکہ تمام برے لوگ اس میں غرق کر دئے جائیں ر تمام اچھے لوگ اس سے بچا کر اس آخری دنیا میں پہنچا دئے جائیں جو خدا کی مطلوب یا ہوگی، مثالی اور ابدی دنیا۔

مگر طوفان نوح سے پہلے اعلان نوح کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کی سب سے بڑی ورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے کچھ بندے اٹھیں اور اپنی صحیح ترین اور کامل ترین رت میں حق کا اعلان کر دیں۔ خدائی موسم اب آخری طور پر آچکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ کوئی کسان اپنا بیج لے کر زمین میں ڈال دے۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن خدا کا زائی کرشمہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ خدا کی نصرتیں اس بندہ کے اوپر آسمان کے دروازے اڑ کر ٹوٹ پڑیں گی تاکہ جو کچھ بندے کو کرنا ہے بندہ اسے انجام دیدے۔ اور تاکہ خدا کو و کرنا ہے خدا اس کو ظہور میں لے آئے۔

اعلان حق کا مطلب حق کو آخری حد تک مبرہن کر دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے و کچھ کل خدائی کی سطح پر کھولا جانے والا ہے اس کو آج بندگی کی سطح پر لوگوں کے لئے ل دیا جائے۔ اس کے بعد وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو پہچان کر اس ساتھ دیا تھا۔ اور وہ لوگ دوسری طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو نہیں پہچانا ر اپنے آپ کو اس کی سمت میں کھڑا نہیں کیا۔ جب یہ عمل پورا ہو جاتا ہے تو اس کے فوراً ر خدا کا آخری فیصلہ آجاتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ پہلا گروہ جنت کے زینہ پر ڑا ہوا تھا اور دوسرا گروہ جہنم کے زینہ پر۔ (۴ جون ۱۹۸۳)

منزل کی طرف

آج کے اس جلسے کا جو عنوان ہے وہ محض ایک عنوان نہیں ہے بلکہ یہ وقت کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ ہم ایک ایسے مسئلے پر سوچنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ساری دنیا کو درپیش ہے اور جس پر ہر جگہ غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پوری انسانیت کی طرف سے ایک سوال کیا گیا ہے اور ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے۔

پچھلی چند صدیوں کی تاریخ مذہب کے خلاف انسان کی بغاوت کی تاریخ ہے۔ قدیم ترین زمانے سے مذہب کو یہ حیثیت حاصل تھی کہ وہ فکر و عمل کے ہر میدان میں انسانی زندگی کی رہنمائی کرتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب اور سائنس کی ترقی کے بعد جب انسان تمدنی اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوا تو اسی کے ساتھ اس نے چاہا کہ ہر اس چیز سے علیٰحدگی اختیار کر لے جس کا تعلق ماضی سے ہو۔ چنانچہ اس نے مذہب کے پرانے راستے کو چھوڑ کر نئی خود ساختہ راہوں پر اپنا سفر شروع کر دیا۔ گاڑی کی تبدیلی کے ساتھ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کی سمت بھی نئی ہونی چاہیئے۔ لیکن پچھلے سو برس کے تجربے نے اس خیال کی غلطی واضح کر دی ہے۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اس قسم کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ بری طرح ناکام ثابت ہوئیں۔ اور اب انسان ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی پچھلی حالت کی طرف لوٹ جائے۔ انسانیت کا بھٹکا ہوا قافلہ دوبارہ اپنی صحیح منزل کی طرف واپس ہونے کے لئے بے چین ہے۔ مذہب جو ماضی میں انسان کا دستور العمل تھا وہ مستقبل میں پھر انسان کا دستور العمل بننے والا ہے۔

قانون کی ناکامی

پچھلے سماج میں مذہب جو کام کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ صدیوں کے دوران میں مختلف بزرگوں کی تعلیم و تلقین کی وجہ سے کچھ خاص تصورات لوگوں کے ذہنوں میں رچ بس گئے تھے۔ اور ان کے خلاف سوچنا یا عمل کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مذہب کی منسوخی[1] کے بعد جب یہ گرفت

[1] ایسا نہیں ہے کہ اس دوران میں مذہب کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہو۔ زندگی کے دھارے کے نیچے وہ ہمیشہ باقی رہا اور آج بھی باقی ہے۔ البتہ زندگی کی سرگرمیوں میں پہلے جو مقام اسے حاصل تھا وہ بعد کو اسے حاصل نہیں رہا۔

ڈھیلی ہو گئی تو اس کی جگہ لینے کے لئے اصلاحی قسم کے قوانین وجود میں آئے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کی اطاعت گزاری کی جگہ قانون کی حکمرانی نے لے لی۔ قانون اس متعین ضابطے کو کہتے ہیں جس کو کسی سماج میں لازمی طور پر قابل تسلیم قرار دیا گیا ہو اور جس کی خلاف ورزی پر آدمی کو سزا دی جا سکتی ہو۔ اس قسم کے قوانین ہر ملک میں نہایت وسیع پیمانے پر بنائے گئے۔ اس طرح گویا زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ریاست کی طرف سے حکماً یہ بتایا گیا کہ وہ صحیح ترین رویہ کیا ہے جسے آدمی کو اختیار کرنا چاہئے۔ مگر ان قوانین کا فائدہ صرف یہ ہوا ہے کہ جو برائی پہلے سیدھے طریقے سے ہوتی تھی وہ ہیر پھیر کے ذریعہ ہونے لگی۔ قانون نے صرف برائی کی شکلوں کو بدلا ہے اصل برائی کو روکنے میں وہ بالکل ناکام ثابت ہوا ہے۔

حکومت دیکھتی ہے کہ کاروباری لوگ چیزوں میں ملاوٹ کر رہے ہیں، ناجائز اسٹاک رکھتے ہیں اور مختلف طریقوں سے عام پبلک کو پریشان کرتے ہیں۔ اس کو روکنے کے لئے وہ ایک قانون بناتی ہے اور اس کے نفاذ کے لئے مارکٹنگ انسپکٹروں کی ایک فوج مقرر کر دیتی ہے جو قانون کی دفعات لے کر ایک ایک دکان کو جانچنا شروع کرتے ہیں۔ مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ دکاندار انھیں رشوت دے کر لوٹا دیتے ہیں۔ اب حکومت اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ کو حرکت میں لاتی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی صرف یہ نکلتا ہے کہ جو رشوت پہلے صرف مارکٹنگ انسپکٹر لے رہے تھے اس میں ایک اور محکمہ کے لوگ حصے دار بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جب بھی حکومت کے علم میں کوئی برائی آتی ہے تو وہ اس کے خلاف ایک قانون بنا دیتی ہے یا ایک آرڈر جاری کر دیتی ہے۔ مگر اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ چلنے والے اپنا راستہ بدل کر چلنے لگتے ہیں۔ اگر کسی چیز کی درآمد و برآمد پر پابندی لگائی جاتی ہے تو اسمگلنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ٹیکس بڑھائے جاتے ہیں تو جعلی حسابات کے رجسٹر تیار ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کی کمی کے پیش نظر اس کے خرچ کو مقرر حد میں رکھنے کے لئے اس پر کنٹرول کیا جاتا ہے تو بلیک مارکٹنگ اور جعلی پرمٹ کا کاروبار جاری ہو جاتا ہے۔ کسی کاروبار کو قومی ملکیت میں لیا جاتا ہے تو سرکاری افسر اس قدر لوٹ مچاتے ہیں کہ نفع کے بجائے اس میں حکومت کو گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طوفان بے تمیزی میں اگر کوئی پکڑ لیا جائے اور معاملہ عدالت تک پہنچنے کی نوبت آئے تو وہاں بھی غلط کارروائیاں اور جھوٹی شہادتیں اس کو بچانے کے لئے موجود ہیں۔

غرض قانون اور حقیقت کے درمیان ایک طرح کی آنکھ مچولی ہو رہی ہے جس

میں ناکامی تمام تر قانون کے حصے میں آئی ہے۔

مادی فلسفہ

دوسری چیز جو بہتر سماج کا خواب پورا کرنے کے سلسلے میں انسان کے سامنے تھی وہ مادی خوش حالی ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جب لوگوں کی آمدنیاں بڑھ جائیں گی جب لوگوں کو اپنی ضرورت کی چیزیں فراغت کے ساتھ حاصل ہونے لگیں گی تو وہ کس لئے بدعنوانی کریں گے۔ کس لئے دوسروں کو تکلیف دیں گے، مگر واقعات سے اس نظریے کی تردید ہوتی ہے بلا استثنار تمام ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہاں جس رفتار سے مادی ترقی میں اضافہ ہوا ہے اسی نسبت سے جرائم کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔ میں یہاں اختصار کے خیال سے صرف انٹرنیشنل کریمنل پولس کمیشن کی رپورٹ کا حوالہ دوں گا جس نے دنیا کے ۴۳ ملکوں کے اعداد وشمار جمع کر کے شائع کئے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق غریب ملکوں میں جرائم کا اوسط ان ملکوں سے بہت کم ہے جو خوش حال ہیں، اور جن کا معیار زندگی بہت بڑھا ہوا ہے۔ برطانیہ میں ۱۹۴۶ء میں اٹھارہ سال کا ایک لڑکا صرف دو پونڈ ساڑھے سات شلنگ فی ہفتہ کما سکتا تھا۔ لیکن آج پونے چھ پونڈ کما لیتا ہے اور ہوشیار قسم کے نوجوان سات آٹھ پونڈ سے بھی زیادہ کما لیتے ہیں۔ اور پھر انھیں یقین ہے کہ چند سال بعد جب وہ سن بلوغ کو پہنچیں گے تو وہ تیرہ پونڈ فی ہفتہ کی اوسط قومی آمدنی کے مستحق ہوں گے۔

روزگار کے یہ مواقع اور یہ معیار زندگی ہندوستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں لیکن مندرجہ بالا اعداد وشمار کے مطابق ۱۹۵۲ء میں ہندوستان میں ایک لاکھ آبادی کے درمیان قابل ذکر جرائم کی تعداد ۱۶۵ تھی۔ جب کہ برطانیہ میں اتنی ہی آبادی میں ۱۳۴۲ جرائم ریکارڈ کئے گئے۔ امریکہ جو تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے وہاں جرائم کی تعداد ایک لاکھ آبادی میں ۱۳۲۲ تھی (لیڈر ۱۸ فروری ۱۹۵۵ء) اور وہاں کے سب سے بڑے تجارتی شہر نیویارک کا تو یہ حال ہے کہ ہر ایک سکنڈ میں شدید جرم کا ایک واقعہ ہوتا ہے جرائم کی اس بڑھتی ہوئی رفتار نے ترقی یافتہ ملکوں میں زندگی کا سکون برہم کر دیا ہے۔ آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ اس کو اپنا مستقبل غیر یقینی نظر آتا ہے۔ کسی بینک کو نہیں معلوم کہ کب ڈاکوؤں کا ایک گروہ موٹروں اور مشین گنوں سے مسلح ہو کر اس کے اوپر حملہ کر دے گا۔ کسی خاتون کو نہیں معلوم کہ شام کے وقت جب وہ دفتر سے لوٹ رہی ہوگی تو وہ راستہ میں

اغوا کر لی جائے گی یا واپس اپنے گھر پہونچے گی۔ انگلینڈ میں قاتل کے لئے موت کی سزا کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی وبا کو دیکھ کر وہاں کے ایک مشہور اہل قلم اور سابق ممبر پارلمنٹ سر ایلن ہربرٹ نے مطالبہ کیا ہے کہ سزائے موت کو دوبارہ جاری کیا جائے۔ اور نہ صرف قاتل کو بلکہ چوروں، نقب زنوں اور عورت کی عصمت پر حملہ کرنے والوں کو بھی یہی سزا دی جائے۔

اوپر کی گفتگو سے جہاں مادی نظریات کی ناکامی ثابت ہوتی ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ ان کے اندر وہ کون سا بنیادی خلا ہے جس نے انھیں مکمل ناکامی سے دوچار کیا ہے۔ یہ خلا دراصل محرک کا خلا ہے۔ آپ ایک کارخانے کو صرف بجلی کا بٹن دبا کر حرکت میں لا سکتے ہیں۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اسی وقت کوئی کام کرتا ہے جب اس کے اپنے اندر اس کے کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہو۔ آج دنیا کے پاس زندگی گزارنے کے لئے بہتر قسم کے کاغذی نقشے ہیں اور اس کو عمل میں لانے کے لئے جدید ترین ساز و سامان موجود ہیں۔ مگر یہ سب کچھ صرف اس لئے بے کار پڑا ہوا ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

آج مجرمین کو پکڑنے کی ٹکنیک اتنی ترقی کر گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ملک میں جرم کر کے دوسرے مقام پر بھاگ جانے کی کوشش کرے تو اس کے سرحد پار کرنے سے پہلے ریڈیو فوٹو کے ذریعہ ساری دنیا میں اس کا حلیہ نشر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پولس کے افراد اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام نہیں دیتے، اس لئے جرم کی روک تھام کے یہ سارے مواقع بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ اقتصادیات اور اعداد و شمار کے ماہرین نہایت کامیاب طریقے پر "کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ فائدہ" حاصل کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر عملہ کے اندر لوٹ کھسوٹ کی ذہنیت کی وجہ سے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے وصول کی ہوئی رقم کم سے کم لوگوں کی جیبوں میں چلی جاتی ہے۔ حکومت کی تشکیل کے لئے نہایت وسیع قسم کے جمہوری طریقے دریافت کئے گئے ہیں۔ مگر لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کے غلط استعمال کی وجہ سے جمہوریت عملاً ایک تماشا بن کر رہ گئی ہے۔

ابھی حال میں (اپریل ۱۹۶۰ء) جنوبی کوریا کے الکشن کے بعد اعلان کیا گیا کہ صدارت کے انتخاب میں ڈاکٹر سنگمن ریہی کو ۹۰ فی صدی ووٹ ملے ہیں۔ مگر اعلان کے بعد جب عوام نے بغاوت کر دی اور ڈاکٹر ریہی کو اپنا صدارتی محل چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو معلوم ہوا کہ "۹۰ فی صدی" کی حقیقت اعداد

وشمار کے دھوکے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ سماجی اصلاح کے لئے مستقل محکمے قائم ہیں اور اس کے لئے ایسے ایسے قوانین بنائے گئے ہیں جو انسانی آرزوؤں کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ مگر عملاً یہ صرف ان لوگوں کے لئے لوٹ کھسوٹ کا ایک عنوان ہے جو اس کام پر مامور کئے گئے ہیں۔ آج عالمی اتحاد کے نہایت خوبصورت نظرئے کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں اور آپس میں تعلق قائم کرنا اتنا آسان ہوگیا ہے کہ آپ ٹیلی فون ریسیور اٹھاکر دنیا کے کسی بھی حصے کے آدمی سے بات کرسکتے ہیں اور ہوائی جہاز سے اڑ کر چند گھنٹے میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں۔ مگر انسان کے اپنے رویے کی وجہ سے یہ سارا سازوسامان ایک مصیبت ثابت ہورہا ہے۔ آج سائنس کی بہترین کوششیں صرف ایسے آلات تیار کرنے میں لگی ہوئی ہیں جو دم بھر میں زندہ انسانوں اور آباد شہروں کو ختم کردیں۔

ایک دوسرے کے خلاف شبہات کا یہ حال ہے کہ امریکہ کی اسٹریٹجک ایرکمانڈ کے تین ہزار ہوائی جہاز ہر وقت آسمان میں اڑتے رہتے ہیں تاکہ اپنے ملک کو اچانک حملے سے بچائیں۔ دوسری طرف روس کی سرحدوں پر ہزاروں آدمی نہایت قیمتی آلات اور دوربینیں لئے ہوئے رات دن یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ امریکہ کا کوئی جاسوس ہوائی جہاز ان کی سرحد کے اندر تو نہیں گھس آیا ہے۔

محرک کی ضرورت

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی بہتری کے لئے آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ کوئی قانونی ڈھانچہ یا مادی سازوسامان نہیں ہے بلکہ ایک ایسا نظریہ ہے جو ذمہ داری کا احساس پیدا کرے جو آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھارے کہ وہ اپنی اندرونی تحریک سے صحیح کام کرنے پر مجبور ہو اور غلط سمت میں جانے سے بچے۔ یہ کام صرف مذہب کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ چند سو برس پہلے بڑے جوش سے دعویٰ کیا گیا تھا کہ زندگی گزارنے کے سلسلے میں انسان کو مذہب کی ضرورت نہیں۔ مذہب حرام وحلال کے کچھ اصول دیتا ہے، وہ ہم اپنے قانون ساز ادارے کے ذریعہ حاصل کرسکتے ہیں۔ مذہب دوسری دنیا کی سزا سے ڈراتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو، اس کے لئے ہمارا عدالتی نظام اور ہماری جیلیں کافی ہیں۔ مذہب یہ ترغیب دلاتا ہے کہ ہمارے حکموں کو مانو تو تمہاری اگلی زندگی خوش گوار ہوگی۔ اس کے لئے بھی ہم کو موت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مادی ترقیوں کے ذریعہ ہم اسی دنیا کی زندگی کو جنت بنا سکتے ہیں۔ مگر یہ تمام امیدیں واقعات

کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوچکی ہیں۔ اور اب انسان دوبارہ اس مقام پر کھڑا ہے جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ لمبی مدت تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اب انسان کی سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ صرف کاغذی نقشے اور مادی ذرائع و وسائل کافی نہیں ہیں۔ اس کے سوا ایک اور چیز ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ وہ ہے خود انسان کا اپنا جذبہ۔ اس کے اندر ایک ایسا ارادہ جو اصلاحات کی خارجی کوششوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک ایسا محرک جو اندر سے آدمی کو عمل پر اکسائے، جو آدمی کو ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے پر مجبور کرے۔

یہی اندرونی محرک تمام اصلاحات کی جان ہے۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو ساری ترقیوں کے باوجود آپس میں اس قدر چھین جھپٹ ہوگی کہ زندگی سکون سے محروم ہو جائے گی اور بہترین قسم کے معاشی منصوبے صرف ٹھیکیداروں اور انجینئروں کے لئے لوٹ کھسوٹ کا موقع ثابت ہوں گے۔

مگر تمام نظریات میں صرف مذہب ہی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ آدمی کے اندر اس قسم کا اندرونی محرک پیدا کرسکے۔ انسانی قانون بدعنوانی سے روکنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کسی عدالت میں پیشی کا حوالہ دے سکتا ہے جس کے متعلق معلوم ہے کہ جھوٹے بیانات اور غلط شہادتوں کے ذریعہ بہت آسانی سے اس کو گمراہ کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ مذہب قادر مطلق کی عدالت میں حاضر ہونے سے ڈراتا ہے جس سے بچنا کسی حال میں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے انسانی ساخت کا نظام کبھی بھی کوئی بہتر سوسائٹی تعمیر نہیں کرسکتا۔ یہ صرف مذہب ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ لینن نے مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ "ہمارے نزدیک آسمان پر جنت تعمیر کرنے سے زیادہ اہم کام زمین پر جنت تعمیر کرنا ہے۔" مگر تجربے نے ثابت کر دیا کہ زمین پر وہی لوگ جنت تعمیر کرسکتے ہیں جو آسمان پر جنت تعمیر کرنے کا مقصد اپنے سامنے رکھتے ہوں۔ اور جن کے پیش نظر آسمان پر جنت کی تعمیر نہ ہو وہ زمین و آسمان دونوں جگہ صرف دوزخ کی تعمیر کریں گے۔

مذہب کے بارے میں یہ تصور محض ایک ذہنی اپج یا خوش عقیدگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت کو تسلیم کرنا ہے۔ پچھلی صدیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کروروں انسان اس امید میں نیکی کی راہ چلے ہیں کہ انھیں اس کا بدلہ آنے والی زندگی میں ملے گا۔ اور بے شمار لوگ محض اس خوف سے بدی سے بچتے رہے ہیں کہ کہیں ان کی بداعمالیاں انھیں عذابِ دائمی کے

حوالے نہ کردیں۔ مگر مادی دور میں اس قسم کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ آج اگر کوئی انسان بھلائی کی راہ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ بھی دراصل پرانے مذہبی تصورات ہی کا اثر ہے۔ ورنہ جہاں تک مادی تہذیب کا تعلق ہے وہ تو انسان کو خودغرض اور غیر ذمہ دار بنانے کے سوا اور کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔

اس صورت حال نے تمام دنیا کے سنجیدہ انسانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب یہ حقیقت لوگوں کی سمجھ میں آنے لگی ہے کہ اصل مسئلہ انسان کا ذہن بدلنا ہے نہ کہ قانون اور معیار زندگی کو بدلنا۔ خود ان ممالک جو مادیت کا گڑھ ہیں وہاں بھی ایسے لوگ اٹھ رہے ہیں جو بڑی شدت کے ساتھ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی ملکوں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں بار بار اس قسم کے فقرے دہرائے جارہے ہیں کہ "اگر نوع انسانی اپنی خیریت چاہتی ہے تو اس کو لازماً کلچر کے ایک روحانی استحکام کی طرف پلٹنا ہوگا۔" "اب اخلاقی انضباط کا دوبارہ حصول، اور روحانی نظام کی طرف واپسی انسانی بقا کے لئے ناگزیر شرط کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔" آج ایک نئی روحانی شیرازہ بندی کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعہ اخلاق اور کلچر کے درمیان وہ مرکزی تعلق بحال ہو جائے جو انسانی ارتقاء کی ہر سطح پر اور ہر دور میں موجود رہا ہے۔" (کرسٹوفر ڈاسن)۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو اصل ضرورت کا احساس ہو چکا ہے مگر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عام طور پر جن عملی شکلوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یا تو غلط ہیں یا ناقص ہیں۔

دیوار کی ضرورت

غلط شکل سے میری مراد وہ تجویزیں ہیں جو اس امید میں پیش کی جارہی ہیں کہ محض اخلاقی اپیلوں کے ذریعہ آدمی کے اندر اس قسم کا احساس پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علمبردار وہ لوگ ہیں جو مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتے مگر اخلاق کی ضرورت بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت ہو جائے کہ مذہب کی دیوار سے مدد لئے بغیر اخلاق کی چھت کھڑی ہو جائے۔ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اسی گروہ کی ایک مثال ہیں۔

۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔ ییک گُل یونیورسٹی میں سیاسیات کے استاد پروفیسر مائیکل بریچر نے ایک انٹرویو کے دوران ان سے سوال کیا۔ "کیا آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں گے کہ آپ

کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔" وزیر اعظم نے جواب دیا۔

" میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، وہ ہر فرد اور ہر سماجی گروپ کے لئے ضروری ہیں اور اگر وہ معیار باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی قابل قدر نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان معیاروں کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ ایک تو مذہبی طریقہ ہے۔ لیکن یہ اپنے تمام رسوم و تقریبات کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے۔"

ان فقروں میں پنڈت نہرو نے اپنے طبقے کے لوگوں کی نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ جو لوگ مذہب سے الگ رہ کر اخلاقی قدروں کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب کے سب بے یقینی میں مبتلا ہیں۔ وہ خود اپنے مقدمے کی کمزوری تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ایک چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر انہیں نہیں معلوم کہ وہ انسانوں سے اسے کس طرح منوائیں۔ انھیں اپنے خیالات کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ایک شخص کوئی بدعنوانی کرتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ اس میں اسے اپنی تمنائیں پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ اس کو اپنی ترقی اور کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس میں اسے عزت اور دولت پانے کی توقع ہوتی ہے۔ پھر آخر کس لئے وہ اسے چھوڑ دے گا۔ کیا محض اس لئے کہ کچھ لوگ اسے اخلاق اور انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیا محض کسی کے اندیشے کی خاطر کوئی شخص ایسا کرسکتا ہے کہ نفع کے بجائے نقصان کو اپنے لئے قبول کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انسانیت (مانوتا) کے نام پر لوگوں کو اخلاقیات کا پابند بنانا چاہتے ہیں وہ ہوا میں عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی عمارت کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

ایک مثال لیجیے۔ ہندوستانی ریلوں پر ہر بیس مسافروں میں سے ایک آدمی بلاٹکٹ سفر کرتا ہے اور اس طرح مرکزی خزانے کو تقریباً پانچ کرور روپے سالانہ کا مسلسل نقصان ہو رہا ہے۔ اس وبا کی روک تھام کے لئے ملک بھر میں بارہ ہزار سات سو اشخاص ملازم ہیں جن پر ہر سال دو کرور انیس لاکھ روپے صرف ہوتے ہیں۔ جب ہزاروں آدمیوں کا یہ عملہ

اور سالانہ سوا دو کرور روپیے کا خرچ بلاٹکٹ سفر کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوا تو حکومت نے ایک اخلاقی تدبیر سوچی۔ حکومت کی طرف سے ایک خاص پوسٹر چھپوا کر تمام اسٹیشنوں پر لگا دیا گیا۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔ Ticketless travel is a social evil یعنی بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے۔ مگر اس کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوا کہ کرایہ وصول نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کو جو کچھ نقصان ہو رہا تھا اس میں اس پروپگنڈے کے اخراجات کا مزید اضافہ ہو گیا۔ اصل صورت حال بدستور اپنی جگہ باقی رہی۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر بار بار کے تجربے میں قطعی طور پر ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ مگر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود ساری دنیا میں اخلاق کی اسی خیالی بنیاد پر تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ آج جو منصوبے بن رہے ہیں، جو سیاسی اور سماجی ڈھانچے کھڑے کیے جا رہے ہیں۔ وہ سب اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ افراد اور سرکاری عملہ اس کی تکمیل میں اپنا حصہ صحیح طور پر ادا کریں گے۔ اس کے بغیر کسی اسکیم کی کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر حالات پکار رہے ہیں کہ یہ امیدیں بالکل فرضی ہیں۔

اس کے لئے کالج کے طلبہ کی مثال کافی ہوگی۔ کالجوں میں جو لوگ پڑھتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ آج کے شہری اور کل کے سرکاری لوگ ہیں۔ ان کی زندگی میں ہم بیک وقت دونوں کردار دیکھ سکتے ہیں۔ ان طلبہ کو اخلاق اور تہذیب سکھانے کے لئے کروروں روپیے صرف کئے جا رہے ہیں مگر ان کا حال یہ ہے کہ سال بھر کھیل کود میں گزارتے ہیں اور جب امتحان آتا ہے تو پرنسپل کو پستول دکھا کر پرچہ آؤٹ کر لیتے ہیں۔ ان کی آزادی بلکہ آوارگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ناچ گانے کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے اگر انھیں رعایتی پاس نہ ملے تو وہ اس قدر ادھم مچاتے ہیں کہ پولس کو گولی چلانی پڑتی ہے اور سارے شہر میں کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔

کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بل پر ہمارے سیاسی لیڈروں نے بڑی بڑی اسکیمیں بنائی ہیں اور اس کے لئے اربوں روپے کے ٹیکس ملک کے اوپر لاد رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ سماج اور موجودہ سرکاری مشنری دونوں کسی قومی ذمہ داری کو اٹھانے کے بالکل نااہل ہو چکے ہیں۔ سڑکوں پر سے مین ہول کے ڈھکن کا غائب ہو جانا سماج کی طرف سے اس بات کا انتہائی اعلان ہے کہ وہ آپ کی کسی اسکیم کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں۔ سرکاری عملہ

کے اندر رشوت اور ناکردگی کی بڑھتی ہوئی وبا صاف بتارہی ہے کہ جن ہاتھوں سے کام لیا جانے والا ہے وہ ہاتھ مفلوج ہوچکے ہیں۔ آج کے انسان کے بارے میں کہاجاتا ہے کہ وہ صرف اس چیز کو مانتا ہے جس کی صداقت تجربے سے ثابت ہوگئی ہو۔ مگر یہی انسان ایک ایسے عمل پر اب تک اصرار کئے چلاجارہا ہے جس کو تجربہ رد کرچکا ہے اور جس کے حق میں نظری استدلال تو کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

عیسائیت

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی امیدوں کا مرکز مذہبی تعلیمات ہیں ان میں ایک تو عیسائیت کو ماننے والے ہیں جو بڑے زور شور کے ساتھ اپنے مذہب کو ان مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کررہے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں عیسائی مصنفین کی اچھی خاصی تعداد نے اسی قسم کے مضامین لکھنے کو اپنا مستقل موضوع بنالیا ہے۔ ان میں بعض چوٹی کے مفکرین بھی شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔ مثلاً سوئزرلینڈ سے ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نام ہے اخلاقی اسلحہ بندی (Moral Re-armament) اس کے بانی ڈاکٹر فرینک بک مین ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خداپرستی کے تحت اخلاقی قدروں کو رواج دیا جائے اور لوگوں کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ خاص طور پر ایمانداری، پاکیزگی، بے غرضی، باہمی خیرخواہی اور محبت کو پھیلایا جائے۔ اسی طرح امریکہ میں خاص اسی مقصد کیلئے ایک ادارہ (Research Centre in Creative Altruism) کے نام سے ۱۹۴۹ء سے قائم ہے جس کو ایک پبلک فنڈ سے پندرہ ہزار ڈالر سالانہ کی امداد ملتی ہے۔ اس ادارے کے ڈائرکٹر پروفیسر سوروکن (Sorokin) ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے پہلی بار اپنے تحقیق و مطالعہ کے نتائج پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت سب سے اہم کام انسان کے اندرون یا اس کے نفس کی اصلاح ہے۔ جس پر تمام تر خودغرضی کا تسلط ہوگیا ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ اس کے برعکس اس میں بے لوث محبت کے اس جذبے کو پیدا کیا جائے اور ابھارا جائے جو آفاقی ہو۔ فرد کی اصلاح کے بغیر جو انقلاب بھی لایا جائے گا وہ بالکل سطحی ہوگا اور ساری کوششیں رائگاں جائیں گی۔ موجودہ حالات کا علاج تجویز کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب (Crisis of our Age) میں لکھتے ہیں:

"انسان کی پوری ذہنیت اور اس کے جملہ رجحانات میں اس تبدیلی کی ضرورت ہے

جس کا رخ ان اصولوں کی طرف ہو جس کو پہاڑی کے وعظ[1] میں پیش کیا گیا تھا۔ جب اس قسم کی تبدیلی ایک خاص حد تک ہو چکی ہو گی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اس نہج پر سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں بآسانی تبدیلی ہو سکے۔ لیکن اس تبدیلی کے بغیر کتنی ہی سیاسی اور اقتصادی بہتری اور میکانکی نوعیت کی تعمیر کیوں نہ کی جائے اس سے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔"

ہندوازم

اس قسم کے مذہبی لوگوں میں دوسرا قابلِ ذکر گروہ جدید ہندو مفکرین کا ہے۔ سی راجگوپال اچاریہ نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔ *Hinduism: Doctrine and Way of Life* اس کتاب میں انہوں نے دکھایا ہے کہ آج کی دنیا کچھ روحانی تہذیبی بنیادوں کی طالب ہے اور وہ اخلاق اور کلچر جس کی جڑیں ویدانت میں اتری ہوئی ہیں، بلاشبہ اس ضرورت کو پوری کر سکتا ہے۔ "صنعتی انقلاب نے جو مسائل پیدا کئے ہیں عمل اور اخلاقی قدروں کے درمیان آج جو علیٰحدگی نظر آتی ہے، سوسائٹی کے خود غرض عناصر جس طرح قانون کے ذریعہ استحصال کی کوشش کر رہے ہیں اور سیاسی اور معاشی میدانوں میں اس کو ناجائز کامیابی کے لئے استعمال کرتے ہیں، متضاد مقاصد کے درمیان انسانی طاقت جس بری طرح ضائع ہو رہی ہے، ان تمام خرابیوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کو ایک ایسا مذہب پیش کیا جا سکتا ہے جو سائنس کا مخالف نہ ہو اور عملی زندگی اور ریاستی معاملات کو حق پرستی کی بنیاد پر تعمیر کر سکے۔ اور اس کے بعد خود ہی کہتے ہیں کہ Vedanta is the answer یعنی ویدانت اس سوال کا جواب ہے۔" واضح لفظوں میں" وہ لکھتے ہیں" دعویٰ یہ ہے کہ ایک اخلاقی کوڈ اور اقدار کا ایک نظام ہندو مفکرین نے مذہبی فلسفے سے

---

[1] پہاڑی کا وعظ حضرت مسیح علیہ السلام کی ایک خاص تقریر ہے جو انجیل کی پہلی کتاب میں پانچویں، چھٹے اور ساتویں باب میں درج ہے۔ اس میں نہایت مؤثر انداز میں خدا پرستی اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے راست بازی، رحم دلی، باہم صلح کرانا، صبر کرنا، حق کی روشنی پھیلانا، ناحق خون نہ کرنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، لوگوں کے حقوق ادا کرنا، عورت کی عصمت پر حملہ نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، زیادتی کا جواب نرمی سے دینا، ریا و نمائش سے بچنا، مال کی حرص نہ کرنا، اور عیب جوئی سے بچنا یہ اس کے چند خاص اجزاء ہیں۔

تیار کیا ہے جس کو ویدانت کہا جاتا ہے جو نہ صرف یہ کہ سائنس کے مطابق ہے بلکہ ایک بہتر اور مستحکم سماجی تنظیم کی نہایت عمدہ اور موزوں بنیاد بن سکتا ہے جس کی تمام دنیا کے بہترین لوگ تمنا رکھتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔"

ہندوازم موجودہ ترقی یافتہ سماج کی ضرورتوں کو کس طرح پورا کر سکتا ہے اس کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

بھاگودگیتا میں یہ بات نہایت واضح طریقے پر بیان کر دی گئی ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنا عمل سماجی ذمہ داریوں کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دے، نہ کہ منافع کی غرض سے، ہم کو اب سماجی اور اقتصادی مصلحین بتا رہے ہیں کہ اسٹیٹ اس بات کی نگرانی کرے گی کہ مرد اور عورت محض اپنے ذاتی مقاصد کے لئے کام نہ کریں۔ بلکہ اجتماعی مفاد کو بھی سامنے رکھیں۔ اور یہ بالکل وہی بات ہے جو بھاگودگیتا میں کہی گئی ہے .... اس میں نہایت واضح طریقے پر بار بار بتایا گیا ہے کہ تمام کام دیانت داری اور بے غرضی کے ساتھ اجتماعی بہبود (لوک سنگرہ) کے لئے کیا جائے نہ کہ شخصی تمناؤں کی تسکین کے لئے۔ درحقیقت گیتا نے تمام سوشلسٹ اصولوں کو نہایت عمدہ طریقے پر پیش کر دیا ہے۔ صفحات — ۲۲ - ۲۳

دونوں مذاہب پر تبصرہ

عیسائیت اور ہندوازم کی طرف سے جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کو میں بالکل بے بنیاد نہیں کہتا۔ مگر یقینی طور پر میں اس کو نہایت ناقص حل سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ انجیل اور وید میں اخلاق کے اعلیٰ اصول لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ مگر انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ محض اخلاقیات کی ایک فہرست نہیں ہے۔ اس قسم کی فہرست کا علم انسان کو بہت پہلے سے ہے اور اس سلسلے میں شاید ہم انسانی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے۔ آج انسان کو دراصل ایک ایسے محرک کی ضرورت ہے جو ان معلوم اخلاقیات پر عمل کرنے کے لئے ابھارتا ہو۔ وہ اس کے اندر ایسا مضبوط داعیہ پیدا کرے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کو وہ کرنے لگے اور اس لحاظ سے دونوں مذاہب تقریباً خالی ہیں۔

مگر یہ خالی ہونا اس نوعیت کا نہیں ہے جیسا کہ اوپر ہم نے "اخلاق کے نام پر اخلاق" پیدا کرنے والوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ مذاہب جس طرح اخلاق کے کچھ اصول بتاتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تعلیمات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو ان پر عمل نہیں کریگا

وہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر ایک برے انجام سے دوچار ہوگا۔ دونوں مذہبوں میں زندگی بعد موت کا تصور موجود ہے اور دونوں مرنے کے بعد کسی نہ کسی شکل میں اچھے یا بُرے انجام کی خبر دیتے ہیں۔ یہی دراصل وہ چیز ہے جو آدمی کو بدعنوانیوں سے روکنے والی ہے۔ یہ تصور وہاں بھی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جہاں کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ اس طرح ان مذاہب میں وہ قدر بنیادی طور پر موجود ہے جس کو اوپر ہم نے محرک عمل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت خود ان مذاہب کی تاریخ میں موجود ہے۔ سابق دور میں ان مذاہب کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنی تھی وہ اخلاقی اعتبار سے صریح طور پر موجودہ مادہ پرست سوسائٹی سے بہتر تھی۔ مگر ان مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کو صحیح شکل میں محفوظ نہیں رکھا اور ان کی تعلیمات اب جس شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں وہ اس قدر ناقص اور الجھی ہوئی ہیں کہ کسی وسیع اور پائدار اصلاح کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

عیسائیت کا حال یہ ہے کہ جس انجیل میں پہاڑی کا وعظ ہے اسی میں مسیحی مذہب کا یہ عقیدہ بھی درج ہے کہ نجات کے لئے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانا کافی ہے۔ اس نظرئے کے مطابق ساری دنیا خدا کے نزدیک سزا کے لائق ہے۔ کیونکہ سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم ہوگئے۔ اس لئے خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا اور اس کو سولی پر چڑھا کر" اس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا" جس کو مان کر دوسرے لوگ اپنے گناہ بخشوالیں۔ اب نجات کے لئے عمل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف "خدا کے بیٹے" کی اس حیثیت کو تسلیم کرنا کافی ہے۔ کیونکہ " انسان شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔" (نئے عہدنامے کی چھٹی کتاب، باب ۳) ایسی حالت میں کوئی شخص آخر کس لئے عمل کے جھنجھٹ میں پڑے گا۔ کفارہ کا عقیدہ تسلیم کرنے کے بعد وہ کونسا محرک ہے جو آدمی کو نیکی کے لئے ابھارے اور برائی سے روکنے پر مجبور کرے۔

انجیل کا یہ تضاد ہمارے نزدیک سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم کا تضاد نہیں ہے۔ مگر آج عیسائیت کے نام سے جو چیز موجود ہے وہ قطعی طور پر یہی ہے۔ آں جناب نے تو مذہب کو اس کی صحیح ترین شکل میں پیش کیا تھا۔ مگر آپ کے ماننے والے آپ کی تعلیمات کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ دوسروں کی تشریح و تعبیر میں شامل ہو کر اصل حقیقت گم ہوگئی۔ انجیل کو دیکھئے تو ایک طرف اس میں بہترین مؤثر انداز میں آخرت کا ذکر اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم

ملے گی۔ جس کو پڑھ کر آدمی کی روح بیدار ہوتی ہے اور اس کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے مگر اس کے بعد جب وہ اگلے صفحات میں سینٹ پال کا فلسفہ پڑھتا ہے تو اس کو یہ تمام چیزیں بے ضرورت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے عقیدے نے عیسائی مذہب میں عمل کی بنیاد کو اسی طرح کمزور کر دیا ہے جیسے کسی ملک کے دستور میں یہ لکھ دیا جائے کہ اگرچہ یہاں پولس اور عدالت کا نظام قائم رہے گا مگر کسی کو اس کی غلط روی پر سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ آدمی پاک باز رہنے پر قادر نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا معاملہ بھی تقریباً یہی ہے۔ بظاہر وہ صرف اخلاقی اپیل نہیں کرتا بلکہ سزا اور انعام کا بھی ایک نظریہ اپنے پاس رکھتا ہے جس کو "کرم" کہتے ہیں۔ یعنی اپنے کیے کا پھل پانا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں ایک صحیح نظریہ ہوگا۔ مگر اب تو وہ نہایت ناقص صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندو مذہب پر فلسفہ کا جو لمبا دور گذرا ہے۔ غالباً اس زمانے میں لوگوں کی ذہنی موشگافیوں نے اس کی ہیئت بدل دی۔ اور ایک صحیح چیز نے غلط شکل اختیار کر لی۔ اب یہ نظریہ جس صورت میں ہمارے سامنے ہے اس کو آواگون یا پنر جنم کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جیسا عمل کرتا ہے اسی کے لحاظ سے وہ اگلے جنموں میں اچھے یا برے جسم میں پیدا ہوتا ہے اور پیدائش کا یہ چکر برابر چلتا رہتا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے آج جو وجود انسان، حیوان، پرند، درخت، سبزی گھاس یا کیڑے مکوڑے کی شکل میں نظر آرہا ہے وہ سب پچھلے اعمال کے نتیجے میں ہے۔ پنر جنم کا یہ نظریہ معمولی اختلاف کے ساتھ ہندو مذہب کی تمام شاخوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس نظریے کے اوپر بھی ہماری تنقید وہی ہے جو عیسائیت کے سلسلے میں ہم لکھ چکے ہیں۔ یعنی اس کے اندر جو محرک ہے وہ نہایت ناقص اور محدود ہے۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ایسا ۔ور دار داعیہ پیدا نہیں کرتا جس کی رغبت سے وہ اچھائی کی طرف لپکے اور جس کا ڈر اسے رائیوں سے روکنے پر مجبور کرے۔ فرض کیجیے ایک شخص کو ایک غلط کام کے لیے بیس ہزار روپیے رشوت میں مل رہے ہیں۔ کیا صرف اس لیے وہ ملتے ہوئے فائدے کو چھوڑ ۔ے گا کہ مرنے کے بعد جب اس کا دوسرا جنم ہوگا تو اس میں وہ مچھر مکھی ہو جائے گا یا م اور ببول کی شکل میں پیدا ہوگا۔ اینٹی کرپشن قانون کے تحت ملنے والی سزا کا خوف

اگر اس کو اس عمل سے نہیں روکتا تو اگلے جنم میں کیڑا مکوڑا یا درخت بن جانے میں وہ کون سی ہولناکی ہے جو آدمی کو لرزا دے اور اس کو جرم سے باز رکھے۔ اس نظریے کے مطابق وحشیانہ جرائم کی ایک بہت بڑی سزا جو منوسمرتی میں بتائی گئی ہے وہ یہ کہ ایسا آدمی دوسرے جنم میں چنڈال کے گھر میں پیدا ہوگا۔ چنڈال سے مراد پاسی، ملاّح، دھوبی، ڈوم، چمار وغیرہ ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں ان قوموں کی یہ حالت رہی ہو۔ مگر اب تو ان کا لقب ہریجن (خدا والے) ہے۔ ان کو وقت کے دستور میں دوسرے انسانوں کے برابر درجہ حاصل ہے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بنگلوں اور کاروں میں زندگی گذارتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اچھوت لیڈر اگر الکشن میں جیت جائے تو وہ وزارت کا عہدہ حاصل کرکے برہمن آبادی کے اوپر حکومت کرتا ہے اور ان کے لئے قانون بناتا ہے۔ آخر اس طرح کے انجام میں وہ کون سا بھیانک پن ہے جو کسی کو جرم سے روکنے کا سبب بن سکے۔

اور بالفرض اگر اس سزا کی کوئی ایسی تعبیر کی جائے جس میں وہ بھیانک نظر آنے لگے تو اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ایسا خلا باقی رہتا ہے جو آدمی کے جذبات کو سرد کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر آپ ایک تباہ حال آدمی کو لیں اور اس سے پوچھیں کہ تم نے اپنے پچھلے جنم میں کیا کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ انجام بھگت رہے ہو تو وہ کچھ نہ بتا سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں آئے بھی تھے یا نہیں۔ پنر جنم کے عقیدے کے مطابق انسان کو اس کے عمل کا بدلہ دینے کا معاملہ بالکل بے خبری میں انجام پاتا ہے اور یہ بے خبری پنر جنم کی تمام شکلوں میں موجود ہوتی ہے۔ جن احساسات رکھنے والے ایک وجود نے اپنی زندگی میں ایک کام کیا تھا۔ اس کو جب اپنے اس عمل کا انجام ملتا ہے تو وہ اپنے پچھلے وجود کو بھول چکا ہوتا ہے۔ کیا ایسے ایک واقعہ کو سزا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بے ہوشی کا انجکشن دے کر کسی کی چیر پھاڑ کی جائے۔ بلکہ زیادہ ٹھیٹ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے آج کے عمل کا بدلہ کل دوسرے شخص کو ملے گا اور میری آج کی بداعمالیوں کی سزا کل کسی اور کو بھگتنی پڑے گی۔ مرنے کے بعد جب میں اپنے موجودہ شعور اور موجودہ احساسات کے ساتھ ختم ہو جاؤں گا تو اس کے بعد کی پیدائش کو میری پیدائش کیوں کہا جائے۔ پھر جس عمل کا انجام میرے بعد

دوسرے انسان کو ملنے والا ہے اس لئے آخر میں کیوں کوشش کروں اور جب بد عملی کی سزا دوسرے وجود کو بھگتنی ہے اس سے میں کیوں ڈروں۔ پنر جنم میں روح کے قالب بدلنے کو جس شکل میں پیش کیا گیا ہے ممکن ہے اس کو منطقی استدلال اور فلسفیانہ بحثوں کے ذریعہ ایک انسان کا مختلف جنم قرار دیا جاسکے مگر قطعی طور پر یہ ایک لفظی استدلال ہوگا۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ اس طرح کے مختلف جنموں کو ایک انسان کا جنم کس بنا پر کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اس نظریے کے اندر انسانی کامیابی کا جو تصور دیا گیا ہے، اس میں بھی ہمارے لئے کوئی کشش نہیں ہوسکتی۔ پنر جنم کے مطابق انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی روح مختلف قالبوں میں پیدا ہوکر ارتقار کرتی رہے یہاں تک کہ بالآخر خدا یا پرماتما کے وجود میں گم ہوجائے جس کو نجات یا نزوان کہا جاتا ہے۔ یہاں مجھے اس نظریے کے علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے بحث نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے ایک نظریے میں وہ کون سی کشش ہے جس کے لئے آدمی دنیا کے دکھ جھیلے اور زندگی بھر خواہ مخواہ ذمہ داریاں پوری کرنے اور حقوق ادا کرنے کا کھڑاگ اپنے سر مول لے۔ اس کامیابی میں انسان کو کیا ملا۔ اس کو زیادہ سے زیادہ پرماتما کی اپنی تکمیل کہا جاسکتا ہے نہ کہ کسی انسان کا ارتقار۔ پھر جس عمل کا فائدہ تمام تر دوسرے کو ملنے والا ہو اس میں آدمی کیوں محنت کرے۔ ممکن ہے کچھ مخصوص قسم کے فلسفیانہ ذوق رکھنے والے لوگوں کو اس طرح کے نامعلوم ارتقار سے دلچسپی ہو۔ مگر عام انسان جن جذبات اور جن تمناؤں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہوسکتی اور صرف یہ واقعہ فلسفۂ نزوان کے خلاف فطرت اور خلافِ واقعہ ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

اسلام

اس مختصر جائزے کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کون سا دھرم سب سے بہتر ہے۔ اس کا جواب اسلام کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ تمام خصوصیات اس کے اندر مکمل ترین شکل میں موجود ہیں جو ایسے ایک دھرم میں ہونا ضروری ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کی طرف سے میں کسی ایسی چیز کا انکشاف کرنے والا ہوں جس کی

بقیہ دنیا کو اب تک خبر نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی یہ حیثیت اپنے اصول کے نئے پن کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ جو کچھ دوسروں کے پاس بگڑی ہوئی شکل میں ہے وہ اس کو صحیح اور بے آمیز شکل میں پیش کرتا ہے۔ خدا اور آخرت کا تصور جو دوسرے مذاہب میں موجود ہے، یہی اسلام کے حل کی اصل بنیاد ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں یہ حقیقت صدیوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی تھی اور اسلام نے اس کو تمام ملاوٹوں سے صاف کر کے خالص شکل میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کی طرف دنیا کو ہم جو بلا رہے ہیں اس کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ اسلام کوئی نئی اور انوکھی چیز ہے جو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھی۔ بلکہ یہ وہی ابدی حقیقت ہے جو ہمیشہ سے انسانوں کے پاس موجود رہی ہے۔ چونکہ لوگوں نے اپنی غفلت سے اس کو مٹا دیا تھا یا اسے بدل ڈالا تھا اس لئے خدا نے اپنے آخری رسولؐ کے ذریعہ اس کو دوبارہ اپنی صحیح اور مکمل صورت میں ہمارے پاس بھیجا ہے۔

انسان کو اپنی زندگی کی تنظیم کے سلسلے میں بہت سی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ اس کے لئے ایک قانون کی ضرورت ہے، اس کے لئے ایک معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی ضرورت ہے، اس کو شادی بیاہ کے ایک متعین طریقے کی ضرورت ہے۔ لباس، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، ہر چیز میں اس کے لئے کچھ آداب و قواعد کی ضرورت ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی اس کی ایک ضرورت ہے کہ اس کا ایک سماجی تہوار ہو جس میں لوگ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوں اور اپنی جائز تمنائیں پوری کریں۔ اس طرح کی اور بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں ہیں جو زندگی گزارنے کے لئے لازمی ہیں اور ان کے متعلق بہرحال انسان کو ایک متعین شکل بتانا ضروری ہے۔

بلاشبہ یہ سب کچھ اسلام کے اندر موجود ہے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی بتائی ہوئی شکل دوسری مروجہ شکلوں کے مقابلے میں کس طرح زیادہ جامع اور زیادہ مفید ہے۔ مگر یہاں مجھے ان تمام پہلوؤں پر بحث نہیں کرنی ہے۔ جیسا کہ پچھلی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے۔ زندگی میں ان چیزوں کی ضرورت زیادہ تر عملی پہلو سے ہے نہ کہ حلِ مسئلہ کے پہلو سے۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں ایک تفصیلی ڈھانچے کا موجود ہونا بذاتِ خود زندگی کو بہتر نہیں بناتا۔ یہ سب چیزیں اگرچہ زندگی کیلئے

ضروری ہیں مگر ان کی حیثیت روح کے ساتھ جسم کی سی ہے۔ روح کے ظاہر ہونے کے لئے ایک جسم کا ہونا ضروری ہے۔ مگر کسی انسانی وجود میں اصل چیز اس کی روح ہوتی ہے نہ کہ جسم۔ اگر یہ روح نہ ہو تو جسم خواہ کتنی ہی مکمل حالت میں موجود ہو ہم اس سے انسان کا کام نہیں لے سکتے۔ اس طرح بہتر زندگی کی تعمیر کے سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کی اپنی اصلاح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو زندگی کی پوری اسکیم میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ موجود ہو تو دوسری تمام چیزیں ٹھیک ٹھیک کام کریں گی اور اگر یہ نہ ہو تو کوئی بھی خارجی نقشہ ہمارے مسائل کو حل نہیں کر سکتا۔

زندگی کے اس اہم ترین سوال کا جواب اسلام کے اندر انتہائی مکمل اور صحیح شکل میں موجود ہے۔ اسلام سب سے پہلے یہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات کوئی الل ٹپ جگہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خدا ہے جو اپنی زبردست طاقت کے ذریعہ پوری دنیا پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اس طرح وہ انسان کے اندر ایک ایسی طاقت کا عقیدہ پیدا کرتا ہے جس کی پکڑ سے انسان اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اور نہ اس سے بھاگ کر کہیں جا سکتا۔ وہ زندگی کے بارے میں یہ تصور دیتا ہے کہ وہ دو مرحلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور موجودہ مرحلہ اگلے مرحلے کی تیاری کے لئے ہے۔ ہم آج جو کچھ کریں گے اس کا اچھا یا برا بدلہ اگلی زندگی میں پائیں گے۔ اس طرح آدمی کے اندر آئندہ زندگی میں کامیاب بننے کی طلب پیدا ہوتی ہے اور دنیا کی حرص جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے اس کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب ٹرین سامنے کھڑی ہو تو کوئی شخص پلیٹ فارم کی بنچ پر جگہ حاصل کرنے کے لئے جھگڑا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو شخص دنیا کی بے ثباتی اور اگلی زندگی کی اہمیت کو سمجھ جائے اس کے لئے ناممکن ہے کہ دنیوی منافع کے لئے لوگوں سے چھین جھپٹ کرے۔

آج چمبل کی وادی (ضلع آگرہ) میں ۲۵ ہزار پولس گھیرا ڈالے پڑی ہے مگر ڈاکوؤں کا گروہ اس کے قابو میں نہیں آتا۔ اسلام فرشتوں کی ایک ایسی پولس کا تصور دیتا ہے جو ہر انسان کے دونوں کندھوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے تمام اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہی ہے۔ جو مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ یہ خیال آدمی کو اپنے تمام کھلے اور چھپے معاملات میں چوکنا کر دیتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ مستقل طور پر ایسی پولس کے پہرے میں ہے جس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی سبیل نہیں۔

دوسری دنیا کے بارے میں اسلام یہ تصور دیتا ہے کہ وہاں جنت اور جہنم ہے۔ جنت انتہائی عیش کی جگہ ہے اور جہنم بدترین عذاب کا مقام۔ وہ تمام لذیذ اور بہترین چیزیں جن کی انسان تمنا کرسکتا ہے اسلام ایک ایک کا نام لے کر بتاتا ہے کہ وہ نہایت اعلیٰ شکل میں جنت میں موجود ہوں گی۔ اور سخت ترین عذاب کی تمام صورتیں جن سے انسان آشنا ہے، ان کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ جہنم میں جانے والے شخص کو بھگتنا پڑیں گی۔ ہر وہ انسان جو پیدا ہوا ہے اس کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ان میں سے کسی ایک میں رہنا ہے۔ یہ چیز آدمی کو بے قرار کردیتی ہے اور وہ اپنے ایک ایک لمحے کو فضولیات سے بچا کر صحیح ترین کام میں لگانا شروع کردیتا ہے۔ پھر اسلام یہ بتاتا ہے کہ جس خدا کی عدالت میں تمہارا معاملہ جانے والا ہے اس پر نہ کسی کا زور ہے اور نہ کوئی سفارش وہاں سنی جانے والی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حضور اپنی زبان کھول سکے۔ یہ چیز اس کو بتاتی ہے کہ جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنا چھوڑ دے۔ اور صرف خدا سے اپنا تمام تعلق قائم کرے۔ پھر یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح پیش آئے گا کہ ہم اپنے موجودہ احساسات کے ساتھ اپنی زندگی کا شعور رکھتے ہوں گے۔ اپنی پچھلی زندگی ہر شخص کو اچھی طرح یاد ہوگی بلکہ اس کے سامنے ہوگی۔ موت اس کے لئے محض نیند کی طرح کا ایک درمیانی وقفہ ہوگا اور وہ دوسری زندگی کو اسی طرح اپنی زندگی سمجھے گا جس طرح سو کر اٹھنے والا کوئی شخص سمجھتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو اسی طرح پہچانے گا جس طرح وہ آج پہچانتا ہے۔ غرض آج ہمارا جو وجود ہے، اسی وجود کے ساتھ ہم اپنی جزا یا سزا پائیں گے۔

اس طرح اسلام کا آخرت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو آدمی کو ہلا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس نظرئے میں اس بات کی مکمل صلاحیت ہے کہ وہ سماج کی ضرورت کے مطابق نہایت فرض شناس اور دیانت دار شہری پیدا کرے اگر اس نظرئے کو کسی آبادی میں وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کو اچھی طرح بٹھا دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ حساس اور ذمے دار بن جائینگے۔ جب ایک شخص کو منتخب کرکے کسی کام پر لگا دیا جائے گا تو وہ اس احساس کے تحت اپنی ڈیوٹی کو ٹھیک ٹھیک انجام دے گا کہ اس کا جواب اسے مالک کائنات کو دینا ہے جو اس

کی تمام سرگرمیوں سے باخبر ہے، جس کی نگاہ سے اس کا کوئی چھوٹا یا بڑا کارنامہ چھپ نہیں سکتا۔

مدینے کے ایک باشندے ابومسعود انصاری کا واقعہ ہے، وہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، اتنے میں انہوں نے پیچھے سے ایک آواز سنی ـــــــ اعلم ابامسعود لله اقدر علیك منك علیه (ابومسعود! یاد رکھو اس غلام کے اوپر تم کو جتنا اختیار ہے، تمہارا خدا اس سے زیادہ تمہارے اوپر اختیار رکھتا ہے) دیکھا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ یہ فقرہ سنتے ہی ان کا حال بدل گیا۔ انہوں نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا اور بولے کہ اے خدا کے رسول! میں اس غلام کو خدا کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں پکڑ لیتی۔ (مسلم) اس طرح اسلام ایک ایسا نظریہ عطا کرتا ہے جس کے ذریعہ آپ کسی بھی شخص کو کسی بھی مقام پر ٹوک سکتے ہیں اور وہ خود اپنے فائدے کی خاطر مجبور ہوگا کہ اس کی تنبیہ پر غور کرے۔ جبکہ موجودہ نظام میں کسی کو بدعنوانی سے روکنے کے لئے صرف پولس کے دفتر میں اس کی رپورٹ درج کرائی جا سکتی ہے، ایک ایسا دفتر جو رشوت لے کر اپنا ریکارڈ جلا سکتا ہے۔ اور اگر عدالت میں بھی جانا ہوا تو ملزم کو خوب معلوم ہے کہ ایک قابل وکیل کو فیس ادا کرنے کی صلاحیت ہونا کسی بھی مقدمے کو جیتنے کی کافی ضمانت ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

اوپر کی سطروں میں میں نے اسلام کے تصورِ زندگی کو اس حیثیت سے پیش کیا ہے کہ آج ہم جن مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، ان کو وہ کس طرح حل کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی اس کی کل حیثیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کوئی فرضی نظریہ نہیں ہے جو مسائل پیش آنے کے بعد ضرورت کے طور پر گھڑ لیا گیا ہو۔ حلِ مسائل کی غرض سے ہم دنیا کو کوئی فلسفیانہ فریب نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوال کہ "زندگی کے مسائل کا حل کیا ہے" یہ بذاتِ خود کوئی الگ سوال نہیں۔ بلکہ وہ اس بڑے سوال کا جزو ہے کہ "زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے"۔ حقیقت سے مطابق ہونے ہی کا دوسرا نام مسائل کا حل ہونا ہے۔ جس نظامِ فکر کو اپنانے سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں، یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہی نظامِ فکر کائنات کی اصل حقیقت ہے اور کسی نظامِ فکر کا

اصل حقیقت ہونا خود بخود یہ معنی رکھتا ہے کہ اس سے انسانیت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

خاتمہ

اس وقت میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مقصد ذہنی طور پر آپ کو اس مقام تک پہنچانا ہے جہاں سے آپ اپنی منزل کو دیکھ سکیں۔ اور ان سوالات کا جواب پالیں جو آپ کو اور ساری انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنے لئے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کو میری بات لازماً صحیح نظر آنی چاہئے۔ میں آپ کو اختلاف کا حق دیتا ہوں۔ مگر یاد رکھئے کہ جب کسی معاملے میں آدمی کو اپنی رائے مختلف نظر آتی ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کی حقیقی رائے ہو۔ اکثر رائیں محض آدمی کے موروثی جذبات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آدمی کہتا ہے کہ "میرا خیال یہ ہے" حالانکہ وہ دراصل ماحول کا خیال ہوتا ہے جس کو وہ اپنا سمجھ کر دہرا دیتا ہے۔ عقیدے، رائیں اور تعلقات بیشتر حالات میں تاریخ اور ماحول کے اثر سے بنتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جنہوں نے فی الواقع اپنے خاندان اور اپنے گرد و پیش سے اوپر اٹھ کر خالص عقلی غور و فکر کے نتیجے میں کوئی عقیدہ اپنایا ہو، کوئی رائے قائم کی ہو یا کسی سے اپنے تعلقات جوڑے ہوں۔ اس لئے آج آپ جس عقیدے کو اپنا عقیدہ اور جس طریق زندگی کو اپنا طریق زندگی کہتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ واقعہ بھی ایسا ہی ہو۔ بہت ممکن ہے کہ ایک مخصوص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یہ چیزیں آپ کے ساتھ چمٹ گئی ہوں۔ میں آپ کو یہی معلوم کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ سوچئے کہ آپ نے جس عقیدے کو اپنا رکھا ہے وہ فی الواقع آپ کی سوچی سمجھی راہ ہے یا محض باپ دادا کی پیروی میں آپ بے سوچے سمجھے اس پر چلے جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ان دونوں کے فرق کو سامنے رکھیں گے اور وراثتی جذبات اور ماحول کے تاثرات سے الگ ہو کر اپنی راہ ڈھونڈھنے کی کوشش کریں گے تو لازماً میری تائید کریں گے اور اس وقت آپ کو صاف نظر آئے گا کہ حقیقۃً انسان کی منزل کس طرف ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ آریہ سماج الہ آباد کے ایک جلسہ میں پیش کیا گیا جو سرو دھرم سمیلن کے عنوان سے ۲۲ مئی ۱۹۶۰ کو ہوا تھا۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi 110 006

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ باسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے باسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۰ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. R N No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

December 1983
Issue No. 85

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851